

إِنَّ الدِّينَ قَرَفٌ وَكَانُوا حَرَفًا
 عَنفُ كَرَفٍ - آپ کا ان سے ذرا بھی تعلق نہیں رہا۔
 مِنْهُمْ فِي دِينِهِمْ

مذہبِ سید

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد سعد قرالدین صاحب قلم عربی
 از

حقہ حسنیہ

دوم

صَلَّوْهُ الْوَاكِلَاتِ مُحَمَّدًا شَرَفَ السَّيَادَةِ

الاسلامی سنی سہیلی کتب خانہ
 دیرینہ ضلع جہلم

إِنَّ الدِّينَ فَتَقْوَاهُ يَنْهَعُمْ وَكَانُوا شِيعَةً لِّسُنَّتِ مُحَمَّدٍ فِي شَيْءٍ
 جن کوں نے دین میں تقویٰ پیدا کیا اور ہو گئے مختلف گروہ۔ آپ کا ان سے مذہبی تعلیق نہیں ہے۔

مذہبِ اربعہ

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین صاحب قدس العزیز

تحفہ حسینیہ

حصہ دوم
 علامہ ابوالکحانات محمد اشرف الہیالوی

اہلِ سنیہ کی کثیر ترین ضلع جہلم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	تحفہ حسینیہ (جلد دوم)
مصنف	شیخ الحدیث علامہ محمد اشرف سیالوی
ترجمین و اہتمام	محمد ناصر الہاشمی
اشاعت	نومبر 2007ء
تعداد	1100
قیمت	200 روپے
ناشر	اہل السنہ پبلی کیشنز دینہ (جہلم)

ملنے کے پتے

- جامعہ غوثیہ مہریہ منیر الاسلام کالج روڈ سرگودھا فون نمبر: 0451-724695
- مکتبہ نوریہ رضویہ گلبرگ اے فیصل آباد فون نمبر: 041-626046
- فرید بک شال 38 اردو بازار لاہور فون نمبر: 042-7312173
- مکتبہ جمال کرم دربار مارکیٹ لاہور فون: 042-7324948
- احمد بک کارپوریشن راولپنڈی فون نمبر: 051-5558320
- مکتبۃ المجاہد بھیرہ شریف فون نمبر: 048-6691763
- شبیر برادر زبیدہ سنٹر اردو بازار لاہور فون نمبر: 042-7246006
- نوریہ رضویہ پبلی کیشنز 11 گنج بخش روڈ لاہور فون نمبر: 042-7313885

حرفِ آواز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ وَ عَلٰی اٰلِہٖ و

صَحْبِہٖ اٰجْمَعِیْنَ ۝ اَمَّا بَعْدُ !

حَمْدُہٗ تَعَالٰی کِتَابِ مُسْتَطَابٍ تَحْفَہٗ حُسَیْنِیَّہٗ کَا حِصَّہٗ اَوَّلِ طَبَعِ ہُو کَرِ آپ کے

ہاتھوں میں پہنچ چکا، جس میں تقیہ اور تحریفِ قرآن کے متعلق شیعہ مسلک اور اُس کا ردِ بلیغ، فضائلِ صحابہ کرام اذروئے قرآن اور احادیثِ خیر الانام اور اقوالِ ائمہ کرام علیہم الرضوان اور شیعہ تاویلات کا رد و ابطال کیا گیا اور اس کے علاوہ بہت سے ضمنی ابکات بھی ہدیہ بناظرین ہو چکے۔

اب بفضلِ تعالیٰ دوسری جلد پیش خدمت ہے، جس میں خلافت و وصیت کے موضوع پر مفصل گفتگو کی گئی ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی چوتھا خلیفہ ہونے کا اقرار اور خلفاءِ سابقین کی خلافت کے خلافتِ موعودہ ہونے کا اقرار و اعتراف حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دینا، مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے اور شیعہ تاویلات و تسویلات کا ردِ بلیغ کیا گیا ہے۔ نیز حدیثِ قرطاس کی حقیقت و ذر و روشن کی طرح آشکارا کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں حدیثِ غدیر سے اہل تشیع کے استدلال کا ابطال واضح کیا گیا ہے اور ان موضوعات کے علاوہ بھی بہت سے ابکات ہیں جو مطالعہ اور گہرے غور و خوض کے متقاضی ہیں اور ان نزاعی و اختلافی امور میں ہدایت و ارشاد کے موجب ہیں اور بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ حصہ تحفہ حُسَیْنِیَّہ کے قلب و جگر کی مانند ہے۔

اس کے بعد تیسرے حصہ میں حدیثِ منزلت اور فدک پر مفصل بحث کی جائے گی نیز مذہبِ شیعہ کا بانی کون تھا؟ شیعہ کی مذمت بزبانِ ائمہ کرام ائمہ اہل بیت امام حسین

رضی اللہ عنہ کون تھے؟ ائمہ کرام کا بروز قیامت شیعہ سے اظہارِ برأت اور بینائی جنازہ کی تکبیراتِ اربعہ، ائمہ کرام کا اپنی اولادِ امجاد کے نام خلفاءِ ثلاثہ کے ناموں پر رکھنا اور خلفاءِ ثلاثہ کے اسماء گرامی کے ساتھ موسوم لوگوں کے ساتھ اہل تشیع کا سلوک بیان کیا جائے گا۔

استاذ العلماء حضرت شیخ القرآن والحديث علامہ محمد اشرف صاحب سیالوی مدظلہ ایک سلجھے ہوئے خطیب، منجھے ہوئے ادیب ہیں۔ تعلیم و تدریس کا شعبہ ہو، یا مناظرے کا میدان، غرضیکہ ہر مرحلے پر سنجیدگی، متانت، تحمل مزاحی، بردباری اور وسیع انقباض کی کیفیات غالب رہتی ہیں۔ ہر موضوع پر پوری ذمہ داری سے دلائل و براہین کی بھرمار، ان کا قرینہ ہے۔ کھلے دل سے بات سنا اور کھلے دل سے عقدہ کشائی فرمانا، ان کا طریقہ ہے۔ چچی تلی، عالمانہ، محققانہ، منصفانہ اور مدبرانہ گفتگو، ان کا وطیرہ ہے۔ کئی کتابیں تالیف و تصنیف فرما چکے ہیں۔ کئی کتابوں کے تراجم سے عہدہ برآ ہو چکے ہیں۔ تحفہ حسینیہ کا دوسرا حصہ ہدیہ ناظرین ہے۔ تیسرا حصہ بھی جلد ہی منقذہ شہود پر آجائے گا انشاء اللہ تعالیٰ العزیز قارئین کرام خود ہی یہ اندازہ فرمائیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے علامہ موصوف مدظلہ کو کین کن خوبیوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اللہ کریم، حضرت علامہ صاحب مدظلہ کے علم و فضل اور اخلاص و عمل میں مزید برکتیں عطا فرماتے۔ آپ کا سایہ طہتِ اسلامیہ پر تادیر قائم رکھے۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات کو اپنی بارگاہِ مقدس میں شرفِ قبولیت سے نواز کر حضور نبی مکرم، سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم و صحبہ و بارک وسلم اور آل و اصحاب رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین کی رضا مندی و خوشنودی اور نگاہِ کرم کا موجب بنائے۔ آمین شتم آمین بجاو طہ و لیسین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم!

غبارِ دل و جان
غمانی غلام رسول سیالوی

۲۰ صفر المنظر ۱۴۱۱ھ

مرکزی ناظم اعلیٰ، مجلس الدعوة الاسلامیہ، پاکستان۔

فہرست حصہ دوم تحفہ حسینیہ

۱۵	بحث امامت و خلافت
۱۵	تقریبی امور، امر اول، نصب خلیفہ کا ذمہ دار کون ہے؟
۱۶	امر ثانی، عند الشیعہ امام کا عقیدہ قطعی عقیدہ ہے۔
۱۷	امر ثالث، تقریر امام میں مذہب اہل شیعہ کا بیان
۱۸	امر رابع، محل نزاع امامت کی تعریف
۱۹	ابطال عقیدہ شیعہ
۲۲	فرمان مرتضیٰ، جو مجھے چوتھا خلیفہ نہ مانے، وہ لعنتی ہے
۲۳	علماء شیعہ کی تحریف اور اس کا ردِ بلیغ
۳۱	سوادِ اعظم کا مذہب ہی مذہب مرتضیٰ ہے
۳۲	اہل شیعہ اور شورانی حکومت
۳۳	رسالہ مذہب شیعہ، شوری ذریعہ انعقادِ خلافت
۳۴	تحفہ حسینیہ، تتمہ استدلالِ اول
۳۹	مذہب شیعہ، دلیل دوم بر صحتِ شوری
۴۰	تحفہ حسینیہ، فوائد و نکات کا بیان
۴۵	حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور شوری و انتخاب
۴۶	ابن میثم کا اختلاف و نزاع اہلحاب کے بیان سے تنقیر
۴۷	اسلاف پر تنقید سے اجتناب کا لزوم از روئے فتوٰ آن
۴۸	رسالہ مذہب شیعہ، دلیل سوم بر صحتِ شوری
۴۸	تحفہ حسینیہ، تتمہ استدلال مذکور

- ۵۱ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی مجبوری و مقہودی کے دعویٰ کی لغویت
- ۵۵ بیعت مرتضوی اور جمہور اہل اسلام کا مذہب
- ۵۵ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی تنگ و دوہرائے خلافت عند الشیعہ
- ۵۶ لمحہ منکر یہ اور عمل و قول میں تضاد
- ۵۸ طلب خلافت میں عذر تاخیر اور اس کا بطلان
- ۵۹ لائق توجہ امر اسلام کی حکومت اور غیر اسلامی حکومتوں کا فرق
- ۶۰ رسالہ مذہب شیعہ: وصیت خلافت کی نفی و انکار
- ۶۱ تحفہ حسینہ: تتمہ دلیل چہارم
- ۶۲ علامہ ڈھکو صاحب کا دلائل کے جواب سے عجز اور کھوکھلے دعووں پر اکتفا
- ۶۵ تحفہ حسینہ: امام کا انتخاب کون کرتا ہے؟
- ۶۶ قول باری تعالیٰ: ما کان لہم الخیرۃ کا صحیح مفہوم
- ۶۷ خطیب خوارزم ابوالمؤید کا مذہب
- ۶۸ خلفاء ثلاثہ کی بیعت کرنے والے کون تھے اور کتنے افراد تھے؟
- ۶۹ رسالہ مذہب شیعہ: خلافت فاروقی کی حقانیت اور مشورہائے مرتضیٰ
- ۷۷ تحفہ حسینہ: تتمہ دلیل اول و بیان فوائد و نکات
- ۸۲ مذہب شیعہ: دلیل دوم
- ۸۵ " " دلیل سوم: امام ناسخ کے تحت جہاد حرام ہے۔
- ۸۶ " " تعامل مرتضیٰ رضی اللہ عنہ
- ۸۷ " " دلیل چہارم: خلافت موجودہ خلافت صدیق و فاروق ہے
- ۹۰ تحفہ حسینہ: تقریر استدلال اور کلام امیر کے فوائد و فوائد
- ۱۰۱ بادشاہ روم کا اعتراف مغلویت اور غلبہ اسلام کی شہادت

- ۱۰۴ علامہ ڈھکو صاحب کا جواب سے عجز اور بے بسی
- ۱۰۵ تعامل مرتضوی کے بیان میں غلط بیانی کا دعویٰ
- ۱۰۶ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشوروں اور تعامل کی توجیہ
- ۱۰۷ تحفہ حسینیہ، شیعہ توجیہات کا رد و ابطال
- ۱۱۵ ابن ابی الحدید کا منصفانہ فیصلہ
- ۱۱۷ خلفاء ثلاثہ کے دور میں حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے جنگوں میں شامل نہ ہونے کی وجہ
- ۱۲۰ رسالہ مذہب شیعہ، حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی دعوائے خلافت سے دستبرداری
- ۱۲۲ شیعہ تاویلات - رسالہ تنزیہ الامامیہ
- ۱۲۳ شیعہ تاویلات کا بطلان - تحفہ حسینیہ
- ۱۲۳ خلافت سے دستبرداری اور بے رغبتی کے مزید دلائل
- ۱۳۰ کیا از روئے عقل و درایت خلافت سے دستبرداری ممکن ہے؟
- ۱۳۳ نگاہ مرتضوی میں خلافت مثل سراب
- ۱۳۴ " خلافت جوتے سے بھی کم قیمت
- ۱۳۴ " خلافت بکری کے ناک کی ریش سے بھی حقیر
- ۱۳۵ " خلافت خنزیر کی ہڈی سے بھی حقیر
- ۱۳۷ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے منصب امامت کی تحقیر کا لزوم
- ۱۳۸ ضرورت امیر اور امام
- ۱۳۹ منصب امامت ناقابل انتقال ہے تو منصب کیسے ہو گیا؟
- ۱۴۰ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ پیدا نشی مظلوم
- ۱۴۱ رسالہ مذہب شیعہ، حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے وصی رسول ہونے کی حقیقت
- ۱۴۳ تحفہ حسینیہ، نثر بحث وصیت

- حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے شوری میں شامل ہونے کی شیعہ تاویل اور اس کا رد و تبلیغ ۱۴۷
- وصیت و وراثت کے الفاظ پر مشتمل روایات کا صحیح مفہوم و معنی ۱۴۸
- وصیت و خلافت پر صریح اور قطعی نص کا انکار ۱۴۹
- وصیت خلافت کے متعلق ابو جعفر نقیب بصرہ کا نظریہ ۱۵۱
- اذن و وصیت نہ ملنے کی حکمت و مصلحت ۱۵۳
- خلافت میں اختلاف و نزاع سے دور رہنے کی وصیت ۱۵۴
- الوکھی وصیت ۱۵۵
- رسالہ تہذیب الامامیہ، وصیت کے تحقق و ثبوت کا دعویٰ ۱۵۶
- تحفہ حشینیہ، ثبوت و وصیت کے دعویٰ میں اپنی کتب صحیحہ کا رد ۱۵۷
- روایات وصیت میں موجود تعارض و دور کیجئے ۱۵۸
- متفق علیہ پر عمل اور مختلف فیہ کا رد کوئی صحیح قاعدہ نہیں ہے ۱۵۹
- علامہ ڈھکو صاحب کا مجموعہ دعویٰ ۱۶۰
- انکار وصیت کے معارض روایات کی حقیقت اور سید مرتضیٰ وطوسی کا رد ۱۶۱
- وصیت خلافت کے راویوں کا حال ۱۶۲
- رسالہ مذہب شیعہ، وصی رسول ہونے کی حقیقت ۱۶۳
- حضرت علی رضی اللہ عنہ کا خلیفہ کے متعلق سوال سے اجتناب ۱۶۴
- تمتہ بحث وصیت ۱۶۵
- انکار وصیت کی روایات اور طوسی کے جوابات ۱۶۶
- ابو جعفر طوسی کی مغالطہ آفرینی اور دھوکہ دہی ۱۶۷
- رسالہ مذہب شیعہ، حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا بیعت کی پیش کش کو ۱۶۸
- شکرانا اور خلافت میں نزاع سے روکنا ۱۶۹

- تحفہ حسینیہ، حضرت عباس اور ابوسفیان کی پیشکش کے مزید ثبوت ۱۸۳
- تنقیح خطبہ اور وجہ استدلال ۱۸۴
- ازروئے تقیہ و بیعت و اطاعت ابوبکر کا بعد بان مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ۱۸۹
- شیعی شارحین پنج البلاغہ کا اضطراب ۱۹۲
- طوسی کا اعتذار اور اس کا رد بلیغ ۱۹۳
- حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے خوارج، باغیوں اور خارجیوں کے قتال کا عہد ۱۹۶
- تحفہ حسینیہ، تتمہ مبحث مذکور ۱۹۷
- حضرت امیر کی بیعت ابوبکر پر رضا و تسلیم ۱۹۸
- خطبہ مذکورہ کے فوائد کا بیان اور اثبات مذہب اہل سنت ۲۰۱
- حضرت امیر رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت پر تشدد کا ابطال ۲۰۳
- حضرت امیر کا تعامل خلفائے ثلاثہ کے ساتھ بزبان ابن ابی الحدید ۲۰۵
- ابن ابی الحدید کا عقیدہ اور علماء شیعہ کی دھاندلی ۲۰۸
- رسالہ مذہب شیعہ، ظاہری بیعت ہی حقیقی بیعت ہے ۲۱۰
- بیعت مرتضوی کے لیے مالک اشتر وغیرہ کا تشدد و جبر ۲۱۳
- بارگاہ نبوی میں خلفائے ثلاثہ کا مقام اور شان تقرب ۲۱۸
- ارشاد نبوی میں تحریف کی ناکام سعی ۲۱۹
- عظمت صدیق رضی اللہ عنہ کا بیان بزبان رسالت بموقع ہجرت ۲۲۵
- شیعی تشکیکات، روایت مذکورہ کے متعلق - رسالہ تنزیہ الامامیہ ۲۲۷
- شیعی تشکیکات و تبلیغات کا رد بلیغ - تحفہ حسینیہ ۲۲۸
- صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا اعتماد اور آپ کا اس اعتماد پر پورا اترنا - نفیس بحث - ۲۲۹

- ۲۳ علامہ طبرسی کا شیعہ افسانہ نگاری سے گریز
- ۲۲۹ اس شبہ کا ازالہ کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر سکینہ کا نزول کیوں نہ ہوا؟
- ۱۴۰ حرف شرط لانے کی حکمت اور ایثار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا تقابلی جائزہ
- ۱۴۷ اہم نکتہ، حدیث ہجرت سے خلافت صدیق کا اثبات
- ۲۴۸ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی افضلیت سلمان و ابوذر رضی اللہ عنہما پر
- ۲۴۹ شیعہ کا بیچ و تاب اور فرمانِ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی تحریف
- ۲۵۱ گروہ اصفیاء بنو امیہ کا نہیں، بلکہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تیار کر دہ ہے
- ۲۵۱ شیعہ تاویلات کا ردِ بلیغ
- ۲۵۶ کتب شیعہ میں سنی راوی کیوں اور کیسے؟
- ۲۵۹ مہوش دامادی عمر فاروق رضی اللہ عنہ برائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ
- ۲۶۱ سینہ کو بی کا موجبِ اصلی
- ۲۶۲ تتمہ بحث نکاح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا
- ۲۶۵ تزویجِ ام کلثوم کی وجہ سے حضرت امیر کی حضرت عباس پر ناراضگی
- ۲۶۸ بیوہ کی عدت اور تزویجِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا ثبوت
- ۲۷۰ نکاحِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے متعلق شیعہ تاویلات اور ثبوتِ نکاح
- ۲۷۳ عقدِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا اعتراف از سید مرتضیٰ علم الہدی
- ۲۷۴ عقدِ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا اعتراف از ابو جعفر طوسی شیخ الطائفہ
- ۲۷۸ صحیفہ جنتیہ کا ام کلثوم کی صورت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح و زفاف
- ۲۸۴ اس تاویل کا بطلان اور شیعہ کو درپیش الجھنیں
- ۲۸۸ کیا حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقدِ تزویج کے قائل جموٹے ہیں؟
- ۲۸۷ صاحبِ ناسخ التواریخ کا اعترافِ حقیقت اور اقرارِ تزویج

- شرم تم کو مگر نہیں آتی ۱
- ۲۸۸ عقد اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا میں تاویلات کی ضرورت کیوں؟
- ۲۸۹ عقد نکاح کی روایات کو موضوع کہنے کی لغویت
- ۲۹۰ علامہ ڈھکو صاحب کی توجیہات - رسالہ تنزیہ الامامیہ
- ۲۹۱ علامہ صاحب کی جملہ توجیہات کا ردِ بلیغ - تحفہ حسینہ
- ۲۹۲ از روئے درایت و روایت بنت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کا ثبوت
- ۳۰۲ اسلام میں رشتہ داری کا دار و مدار ایمان داری پر ہے
- ۳۰۴ پیر صاحب کے اول فرج غصناہ پر غصہ کی وجہ
- ۳۰۵ علامہ مجلسی کا مذہب اور ڈھکو صاحب کی غلط بیانی
- ۳۰۷ علامہ ڈھکو صاحب کی تبلیہ، ہی تبلیہ
- ۳۱۰ مشہی مؤرخ کی طرف سے ڈھکو صاحب کی تکذیب
- ۳۱۱ رسالہ مذہب شیعہ، بحث حدیث قرطاس
- ۳۱۶ تتمہ بحث قرطاس - تحفہ حسینہ
- ۳۱۸ علامہ ڈھکو صاحب کی جوابی کارروائی
- ۳۲۶ علامہ صاحب کے جوابات کا مکمل رد - تحفہ حسینہ
- ۳۳۰ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے کے محال ہونے کا مطلب؟
- ۳۳۱ کیا سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم صرف تہتر زبانیں جانتے تھے؟
- ۳۳۲ کتب اہل السنّت سے لکھنے کے متعلق ثبوت اور اس کا جواب
- ۳۳۵ نبی اُمّی کے نہ لکھنے کے بارے علمائے شیعہ کے اقوال
- ۳۳۶ ستر علوم پر دسترس اور ان میں لکھنے کی حقیقت
- ۳۳۹ امّ حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اُمّی ہونے کا مطلب
- ۳۴۰

- ۳۴۱ حدیث قرطاس کی دوسری توجیہ کے جواب میں فریب کاری
- ۳۴۲ حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ پر بہتان
- ۳۴۵ کتاب ستر العالمین شاد عبدالعزیز کی نظر میں
- ۳۴۶ امام غزالی علیہ الرحمہ نعمت اللہ جزائری شیعہ کی نظر میں
- ۳۴۹ حدیث قرطاس کی تیسری توجیہ کے جواب میں مکاری
- ۳۵۳ شیعہ کا دعویٰ ہریان دراصل ہریان ہی ہے
- ۳۵۶ حدیث قرطاس کی چوتھی توجیہ کے جواب میں حقائق پر پردہ پوشی
- کیا صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی غیبی خبر { اس شیعہ تو تم کا روپیغ }
خروج دجال کی پیشین گوئی کی مانند ہے ؟
- ۳۶۵ کیا صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اظہار خلافت
کی وجہ سے دل ٹیڑھے ہو رہے تھے ؟
- ۳۶۹ علماء شیعہ کی عداوت شیخین میں ہوش و فرد سے بیگانگی
- ۳۷۱ ائمہ المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی عداوت میں بے حیائی کی انتہا
- ۳۷۳ علامہ ڈھکو صاحب کی جاہلانہ اور بے محل تنقید
- ۳۷۴ رسالہ مذہب شیعہ: بحث حدیث غدیر اور شیعہ استدلال کا ابطال
- ۳۷۵ تتمہ حدیث غدیر - تحفہ حسینیہ
- ۳۷۶ خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور شیعہ دوستی محل نزاع
- ۳۷۷ شیعہ استدلال کی بجاہر صحت
- ۳۷۸ امیر اقل کی تحقیق کہ حدیث غدیر متواتر اور قطعی الثبوت نہیں
- ۳۷۹ امیر ثانی کی تحقیق کہ مولیٰ کی دلالت خلافت بلا فصل پر قطعی نہیں
- ۳۸۰ مولیٰ بمعنی اخیفہ بلا فصل کے قرائن کی حیثیت

- ۳۸۲ علامہ ڈھکو صاحب کی جوابی کارروائی
- ۳۸۲ تحفہ حسینیہ، علامہ موصوف کے جوابات کا ردِ مبلغ
- ۳۸۴ ڈھکو صاحب کا دعویٰ کہ مولیٰ بمعنی 'اولیٰ' بالتصرف ہے اور اس کا رد
- ۳۸۵ علامہ ڈھکو صاحب کے قائم کردہ قرآنِ عشرہ اور ان کا ابطال
- ۳۸۷ پہلا قرینہ: اَلَسْتُ اَوَّلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ اور اس کا صحیح مفہوم
- ۳۹۱ مولیٰ بمعنی محبوبِ پرستائے قرآن کا بیان
- ۳۹۲ شیعہ علماء کا منشاء غلط
- ۳۹۵ دوسرا قرینہ مولیٰ بمعنی 'اولیٰ' بالتصرف، اہتمام اور فرمانِ نبوی
- ۳۹۶ فرمانِ نبوی اور اہتمام کا پس منظر اور شیعہ دعویٰ کا رد
- ۴۰۳ تکرار اور تحصیل حاصل کے لزوم سے مغالطہ دینے کی کوشش
- ۴۰۵ کیا اعلانِ خلافتِ امیر کے بغیر کارِ نبوت اکارت ہو رہا تھا؟
- ۴۱۰ کیا قولِ باری تعالیٰ، یا ایہا الرسول بلغ الاٰیہ قدیر خم پر نازل ہوا
- ۴۱۲ بقولِ علماء شیعہ خلافتِ امیر کے اعلان میں نبوی پس و پیش
- ۴۱۴ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خوفزدہ ہونے والے توہم کا بطلان
- ۴۱۶ قولِ باری تعالیٰ، یا ایہا الرسول الاٰیہ کا شانِ نزول اور خارجی قرآن کا بیان
- ۴۲۱ شانِ نزول میں غلط فہمی کی وجہ
- ۴۲۴ چوتھا قرینہ، حارث فہری کا واقعہ
- ۴۲۷ شیعہ و سنی علماء مفسرین کے نزدیک سائل کا مصداق
- ۴۲۷ کون ہے؟ اور حارث فہری کب اور کہاں ہلاک ہوا؟
- ۴۲۹ شیعہ استدلال کی مدارِ تفسیر ثعلبی اور داعدی کی حیثیت
- ۴۳۱ پانچواں قرینہ، صحابہ کرام کی حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو مبارکبادی

- ۴۳۲ مبارک بادی وغیرہ والی روایت کی حقیقت
- ۴۳۳ اولیٰ اور مولیٰ ہونا حاکم و خلیفہ ہونے کو مستلزم نہیں
- ۴۳۶ مولیٰ بمعنی اولیٰ سے کیا ثابت ہوا؟
- ۴۳۷ چھٹا قرینہ : صحابہ کرام کو حکم دیا گیا کہ مرتضیٰ کو امیر المومنین {
رضی اللہ تعالیٰ عنہ} کے لقب سے سلام دیں !!
- ۴۳۸ امیر المومنین کے لقب سے سلام دینے والی روایت کی حیثیت
- ۴۳۹ ساتواں قرینہ : حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی منقبت اور اس کا صحیح مفہوم
- ۴۴۰ آٹھواں قرینہ : حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے دوستوں کے لیے دعائے خیر
- ۴۴۱ اور دشمنوں کے لیے دعائے ہلاکت، اور اس قرینہ کی عدم مناسبت
- ۴۴۲ ناناواں قرینہ : اعلان ولایت کے بعد تکمیل دین کی بشارت {
اس قرینہ میں اہل تشیع کی مغالطہ دہی اور خود فریبی
- ۴۴۳ قرآن مجید ایسے اہم فریضہ اور مدار اسلام کے بیان سے خاموش کیوں؟
- ۴۴۴ دسواں قرینہ : حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا اس حدیث کو {
استحقاق خلافت میں بطور دلیل پیش کرنا اور اس کا رد قرینہ -
- ۴۴۵ بیعت خلافت کے لیے ابوسفیان کا اصرار اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا انکار
- ۴۴۶ معیار صحت برائے روایات
- ۴۴۷ مولیٰ بمعنی اولیٰ میں منشاء غلط - فائدہ ۱
- ۴۴۸ مولیٰ کے معانی میں علماء شیعہ کا باہمی اختلاف - فائدہ ۲
- ۴۴۹ ابو جعفر قمی کا بے بنیاد دعویٰ
- ۴۵۰ حدیث فدیہ کی حقیقت حال اور صحیح مفہوم

تحفۂ حسینین از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عقی عنہ

بحث امامت و خلافت و فضائل خلفاء راشدین

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا اس رسالہ کی تالیف سے بنیادی مقصد خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے باہمی خو نگوار تعلقات کا بیان تھا اور اہل بیت کرام کی زبانی ان کے فضائل و مناقب کا بیان اسی مناسبت سے آپ نے حضرات ائمہ اہل بیت کی زبانی عمومی فضائل کے اثبات کے ساتھ ساتھ اصحاب ثلاثہ کی خلافت کا برحق ہونا بھی ثابت فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں کسی نص کے ورود یا وصیت وغیرہ کی بھی حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے نفی اور انکار ثابت فرمایا تاکہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم پر اہل تشیع کی طرف سے طعن و تشنیع اور ان کے ایمان و اخلاص پر اعتراض و تنقید کی بنیاد ہی ختم ہو کر رہ جائے اور یہ حقیقت ردِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ جو ترتیب خلفاء میں عملاً پائی گئی ہے وہی برحق ہے اور وہی اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مقبول اور پسندیدہ ہے جو انشاء اللہ العزیز آئندہ صفحات کے مطالعہ سے بالکل واضح ہو جائے گی لیکن یہاں پر چند امور بطور تمہید ذکر کرنے ضروری ہیں تاکہ اس مسئلہ میں اختلاف کی بنیاد اور اس کا دار و مدار واضح ہو جائے اور اس بنیاد و اساس کو ملحوظ رکھ کر اس موضوع پر قائم کردہ دلائل کا مفیدہ اور مثبت مطلب ہونا یا نہ ہونا قارئین کو معلوم ہو سکے اور اس مسئلہ میں دونوں فریق یعنی اہل سنت و الجماعت اور اہل تشیع کے موقف کی صحت و درستگی یا اس کا فساد و بطلان واضح ہو سکے، اذ اقول و علی توفیقہ اعول۔

امراول

اہل سنت کے نزدیک خلیفہ و امام کا تقرر اہل اسلام کی ذمہ داری ہے اور ان پر واجب و لازم افعال میں سے ایک اہم واجب اور لازم فعل ہے۔ اگر صحیح انتخاب کریں گے تو مستحقِ اجر و ثواب ہوں گے ورنہ مستحقِ عتاب و عقاب جبکہ اہل تشیع کے نزدیک خلیفہ و امام کا انتصاب و تقرر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور بندوں کا قطعاً

اس میں کوئی دخل نہیں۔ پوری کائنات کے افراد مل کر بھی ایک شخص کو امام اور خلیفہ نہیں بنا سکتے اور از روئے عقل اللہ تعالیٰ پر واجب ہے کہ وہ امام و خلیفہ مقرر کرے کیونکہ اس میں مخلوق کی بالعموم اور نسل انسانی کی بالخصوص بھلائی اور بہتری ہے اور ہر ایسا کام جو عباد و بلاد کے لیے خیر اور بہتر ہو وہ اللہ تعالیٰ پر واجب و لازم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو تجرید الطوسی و شرح تجرید القوشجی وغیرہ۔

علامہ طوسی نے کہا: الامام لطف فیجب نصبہ علی اللہ تعالیٰ تحصیل الغرض امام کا نصب کرنا لطف اور عنایت ہے لہذا اس کا مقرر کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے تاکہ غرض مطلوبہ حاصل ہو سکے۔ علامہ قوشجی نے اس کی شرح میں فرمایا: ذهب اهل السنة الى انه واجب علينا سماعا رالی (و ذهب الى امامية الى انه واجب على الله عقلاً واختاراه المصنف۔ اهل السنة اس طرف مائل ہیں کہ امام کا تعین ہم پر لازم ہے دلائل سمعیہ کی وجہ سے، جبکہ امامیہ کا مذہب و عقیدہ یہ ہے کہ دلائل عقلیہ کی رو سے امام کا نصب کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور یہی مضمون کشف المراد فی شرح تجرید الاعتقاد للعلامة الحلی مشتمل ہے۔ لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ بعثت انبیاء علیہم السلام سے یہ مقصد پورا ہوا یا نہ؟ پہلی صورت میں ائمہ میں لطف کا انحصار باطل ہو گیا اور دوسری صورت میں بعثت انبیاء عبث ہو گئی نعوذ باللہ اور انبیاء و رسل کی بعثت تحصیل غرض کے لیے نا کافی ٹھہری۔ لہذا اہل تشیع کا بعثت انبیاء کو عبث ہی نہ ماننا اور لطف باری تعالیٰ کا ائمہ کے تقرر میں منحصر ماننا نعوذ باطل ہو گیا۔ کما قال الطوسی فی التجرید: وانحصار اللطف فیہ معلوم للعقلاء (تجرید مع الکشف ص ۳۸)

امریثانی

شیعہ کے نزدیک امامت کا عقیدہ قطعی عقاید میں داخل ہے اور اس پر ایمان و کفر اور نجات و ہلاکت کا دار و مدار ہے حتیٰ کہ جو شخص بارہ ائمہ میں سے کسی کی امامت کا انکار

ثابت ہے۔ اسی طرح ائمہ کے حق میں بھی نام کی صراحت اور منصب امامت کی وضاحت ضروری ہے۔

امریع

جس امامت میں یہاں بحث اور کلام ہے اس سے مراد فقط روحانی مرتبہ اور اللہ تعالیٰ کا قرب نہیں ہے جو ہر دلی کو حاصل ہوتا ہے نہ محض تبلیغ احکام جو ہر عالم کر سکتا ہے بلکہ اس سے مراد ہے نیابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طور پر دینی اور دنیوی امور میں سیادت و قیادت کا قال فی شرح التقرید: ہی ریاسة عامة فی امور الدین والدنیا خلافة عن النبی اس اجمال کی تفصیل حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کی زبانی سماعت فرمائیں تاکہ اس معاملہ میں اہل السنہ اور اہل التشیع کا اجماع و اتفاق واضح ہو جائے۔

ان الامامة زمام الدین ونظام المسلمین وصلاح الدنیا وعز المؤمنین، ان الامامة رأس الاسلام التامی وفرعه السامی، بالامام تمام الصلوة والزکوة والصیام والحج والجهاد وتوفیر الفتی والصدقات وامضاء الحدود والاحکام ومنع الثغور والاطراف۔
الامام یحل حلال اللہ ویحرم حرام اللہ ویقیم حدود اللہ ویذب عن دین اللہ ویدعو الی سبیل ربہ بالحکمة والموعظة الحسنة والحجة البالغة الخ

(احتجاج للطبرسی مطبوعہ مشهد ص ۴۳۲)

بے شک امامت دین کے لیے زمام ہے اور لوگوں کو دین پر برقرار رکھنے کا موجب ہے اور اہل اسلام کے لیے ذریعہ نظم و ضبط ہے۔ دنیا کی اصلاح اور بہتری ہے اور اہل ایمان کے لیے عز و افتخار امامت اسلام کے لیے بمنزلہ سر کے ہے جو بلند و بالا ہے اور اس کی بلند مرتبت فرع ہے۔ امام کے ذریعے ہی نماز، زکوة، روزہ، اور حج کی تکمیل ہے اور اس کے ذریعے جہاد، اور اموال فنی اور غنائم و صدقات کی فراوانی ہے اور حدود و احکام کا نفاذ و اجراء اور دار اسلام کی سرحدات اور اطراف کا

تحفظ امام ہی اللہ تعالیٰ کے حلال کو حلال ٹھہراتا ہے اور اس کے حرام کو حرام قرار دیتا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کے حدود کو قائم کرتا ہے اور اس کے دین کا دفاع کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی طرف اور راہ ہدایت کی جانب حکمت بالغہ، موعظت حسنہ اور حجت غالبہ کے ساتھ دعوت دیتا ہے۔

علامہ حلی نے محقق طوسی کے اس دعویٰ پر کہ امام کا نصب کرنا لطف محض ہے دلیل قائم کرتے ہوئے کہا: اذ العلم الضروري حاصل بأن العقلاء متى كان لهم رئيس يمنعهم عن التغالب والتهاموش ويصد هم عن المعاصي ويعد هم على فعل الطاعات ويبعثهم على التناصف والتعادل كانوا الى الصلاح اقرب ومن الفساد أبعد وهذا أمر ضروري لا يشك فيه عاقل۔ (کشف المراد ص ۳۸)

یعنی اس امر کا علم بدیہی ہر ایک کو حاصل ہے کہ جب اہل عقول کے لیے ایک رئیس اور امیر ہو جو ان کو ایک دوسرے پر غلبے اور تسلط سے منع کرے اور معاصی و ذلوت سے منع کرے۔ طاعات و عبادات کے لیے آمادہ اور تیار کرے اور باہمی عدالت و انصاف پر برانگیختہ کرے تو وہ صلاح اور بہتری کے قریب تر ہوں گے اور فساد اور برائی سے بعید تر اور یہ واضح حقیقت ہے جس میں کوئی عقلمند شک و شبہ نہیں کر سکتا۔

ابطال عقیدہ شیعہ

ان معروضہ امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور عدل و انصاف کا دامن تھامتے ہوئے بتلائیں کہ کہیں کلام مجید میں اللہ تعالیٰ نے بارہ ائمہ میں سے کسی ایک کا نام تک ہی ذکر فرمایا ہے۔ جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس عقیدہ کو قرآن مجید سے ثابت کرنا ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے خلفاء اور ائمہ کے متعلق کوئی ابہام نہ چھوڑا بلکہ تصریح سے کام لیتے ہوئے خلافت و امامت ان کے لیے ثابت فرمائی اور مخلوق خدا کے لیے

لطف و عنایت کا اظہار فرمایا مگر ائمہ اہل بیت کی باری آئی، تو یہ لطف الٹا موجب فراق و انتشار اور نزاع و جدال بن گیا اور خود شیعہ دو درجن فرقوں میں بٹ گئے تاہم بقیہ طوائف اسلام چہر رسد اور بارہ میں سے جو گزر چکے ان کی اکثریت دنیوی حکومت سے محروم رہی اور جن کو یہ حکومت ملی، تو وہ صحیح عقائد اور اعمال جاری نہ کر سکے کیونکہ غبار اور رعایا کے الگ ہو جانے کا اندیشہ تھا تو ایسی صورت میں ان میں سے کسی کے حق میں امامت و خلافت کا وہ مفہوم و معنی اور تعریف سچی نہیں آتی جو شیعہ علماء نے ذکر کی ہے بلکہ امام رضا رضی اللہ عنہ نے ذکر کی ہے۔ رہا احادیث کا معاملہ تو ان میں تو اثر ثابت کرنا ناممکن ہے بلکہ اکثر احادیث اور روایات کا از روئے اصطلاح صحیح ہونا بھی محل نظر ہے چہ جائیکہ ان کا اختصاص ثابت ہو، مثلاً قول باری تعالیٰ: **وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ** میں زمین کے اندر حکومت اور اقتدار و تصرف، دین کا استحکام اور خوف کو امن میں بدلنے کا وعدہ جبکہ ان حضرات کو حکومت ہی ملی اور ملی بھی تو اپنے دین کو نافذ نہ کر سکے اور ہر وقت رعایا اور لشکریوں سے ڈرے رہے اور ان کی مرضی کے مطابق چلتے رہے اور تقیہ سے کام لیتے رہے۔ اسی لیے شیعہ علماء کی عظیم اکثریت نے اس کو صرف اور صرف حضرت مہدی علیہ السلام پر منطبق کیا ہے جبکہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خطبات سے اس کا مصداق حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ہیں جیسے کہ آئندہ اوراق میں ارشادات مرقنویہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو جائے گی۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی **"أَمَّا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا"** بھی ائمہ کے اسماء مبارکہ کی تصریح سے خالی ہے اور والذین آمنوا تمام مہاجرین و انصار کو شامل ہے اور اگر روایت ساتھ ملائیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حالت رکوع میں زکوٰۃ دی تھی وہی اس کا مصداق ہیں تو بھی قطعیت ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ روایت اخبار آحاد کے قبیل سے ہے اور استدلال کا دار و مدار اس پر ٹھہرا جب وہ قطعی الثبوت نہیں ہے تو اس سے یہ قطعی عقیدہ کیونکر ثابت ہو سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اگر یہ قید یعنی **يَوْمَ تَوَاتَوْا** الزکوٰۃ وهم راكعون اتفاقاً ہے تو جنہوں نے زکوٰۃ حالت رکوع میں

نہیں دی ان کی امامت کی نفی نہیں ہو سکتی لہذا دعویٰ اختصاص باطل ہو گیا اور اگر حترازی ہے تو جس طرح خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کی نفی ہو گی دیگر ائمہ کرام کی امامت کی بھی نفی لازم آئے گی کیونکہ حالت رکوع میں صدقہ دینا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت کیا جاتا ہے لہذا یہ دلیل بجائے بارہ ائمہ کی امامت کو ثابت کرنے کے اٹھان میں سے گیارہ کی نفی کر دے گی کیونکہ دس حضرات کے حق میں تو حالت رکوع میں صدقہ کرنا ثابت نہیں ہے اور گیارہویں گو مخفی ہیں اور احتمال ہے کہ حالت رکوع میں انہوں نے صدقہ دیا ہو لیکن یہ احتمال مقام استدلال اور عمل یقین میں کارآمد نہیں علی الخصوص جبکہ اس علامت کو امتیاز امام کے لیے بیان کیا گیا ہو تو جب ہمیں معلوم ہی نہ ہو کہ امام صاحب ہیں کہاں اور نماز کس طرح ادا فرمائی اور جب دوسرا شخص پاس نہیں ہے تو صدقہ کس کو دیا تو کس طرح یقین حاصل ہو گیا کہ وہ اس آیت کے مصداق ہیں اور اس اقیازی صفت کے ساتھ موصوف علاوہ انہیں جس طرح شان نزول میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صدقہ کرنے کو بیان کیا جاتا ہے اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں سے ایمان لانے والے حضرات کے ساتھ اہل کتاب یہود کے بائیکاٹ کرنے پر ان کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر وہ تم سے الگ ہو گئے تو اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول اور ایمان والے تمہارے معاون و مددگار ہیں لہذا تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اس صورت میں اس کا عمل نزاع سے ذرہ بھر تعلق ہی نہ رہا کیونکہ یہاں پر نہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی خلافت بلا فصل ثابت کرنی مقصود ہے بلکہ ان حضرات کی معاونت اور نصرت اسی طرح دیگر اہل ایمان کی طرف سے بھی خلافت بلا فصل کا اثبات مقصود نہیں ہے بلکہ ان کے بجائی چارے بڑا دراندہ روابط اور امداد و اعانت کا ذکر کرنا مقصود ہے۔ علاوہ انہیں اگر اس آیت کریمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کا اعلان ہو چکا تھا تو غرہ تبوک اور حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان خلافت تکرار محض ہے اور علی مخصوص حجۃ الوداع کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خطرات اور اندیشوں کا اظہار اور عصمت و حفاظت کی ضمانت کا مطالبہ کرنا بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جیسے کہ ناظرین اس بحث کا ”من کنت مولاً فعلی مولاً“

کے ضمن میں مطالعہ کریں گے۔ اسی لیے شیعہ صاحبان کو اس اشکال سے جان چھڑانے کے لیے کہنا پڑا کہ گو خلافت امیر کا تذکرہ تو اس آیت میں تھا لیکن لوگ اس کو سمجھتے نہیں تھے۔ اس لیے حجۃ الوداع میں یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ کہہ کر اس کا اعلان کرنا پڑا۔ ملاحظہ ہو شیعہ ترجمہ مقبول کا حاشیہ ص ۱۸۸ لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم ہے کہ اہل زبان جن کے محاورات کے مطابق قرآن نازل ہوا اور جن کو تعلیم اور تربیت دینے کے لیے رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا گیا تو وہ ولایت کا معنی کیوں نہ سمجھے اور انہیں اس طویل عرصہ میں سمجھایا کیوں نہ گیا اور ان سے رکوع میں زکوٰۃ دینے والی شخصیت مخفی کیسے رہ گئی۔ چنانچہ واضح ہو گیا کہ اس میں بھی کوئی تنصیف اور تخصیف ائمہ اور خلفاء کی موجود نہیں ہے۔

الغرض یہاں ان آیات پر تفصیلی بحث کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ ناظرین وقارئین کو بطور اجمال اور اختصار یہ بتلانا مقصود ہے کہ اہل تشیع کے پاس کوئی صریح اور قطعی دلیل اس دعویٰ پر نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر واجب اور فرض امر کو ان ائمہ کا تقرر کر کے ادا فرمایا اور اس طرح ہدایت خلق اور ان کی سیاست کا اہتمام فرمایا اور منصب امامت و خلافت کو صرف خاندان نبوت بالعموم اور خاندان امام حسین کے ساتھ بالخصوص مختص فرمادیا ہے۔ لہذا یہ عقیدہ عقیدہ نہیں ہے بلکہ سراسر وہم و وسوسہ ہے اور علی الخصوص جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ سب سے پہلے خلافت بلا فصل اور وصیت کا راز کھلا تو ۳۵ ہجری میں اور وہ بھی ایک یہودی نو مسلم پر تو اس کے سراسر سازش ہونے کا یقین ہو جاتا ہے اور اہل اسلام کے اندر نظریاتی آویزش پیدا کرنے کا خطرناک منصوبہ ہونے کا جزم و اذعان۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بیوہ تھا خلیفہ ہونا

لہذا صحیح عقیدہ و نظریہ یہی ہے کہ خلیفہ کا تقرر اہل اسلام کے فرائض میں سے ہے کہما قال المرتضیٰ رضی اللہ عنہ لا یدل للناس من امام برا و فاجر الخ

کہ لوگوں کے لیے اچھے یا برے امام کا موجود ہونا ضروری ہے۔ اگر صحیح امام کو مقرر کریں گے تو مستحق اجر و ثواب و در نہ مستحق عذاب و عقاب، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی حقیقت کو اپنے خطبات میں واضح کیا اور خود اسی طریق کار کے مطابق منتخب ہوئے اور اسی انتخاب کو اپنی حقانیت خلافت کی دلیل کے طور پر پیش فرمایا بلکہ یہاں تک تصریح فرمادی کہ میں چوتھا خلیفہ ہوں اور جو مجھے چوتھا خلیفہ تسلیم نہ کرے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

کما فی مناقب ابن شہر آشوب: قال امیر المومنین من لم یقل انی سابع الخلفاء فعلیہ لعنة الله۔ جلد ثالث ص ۲۵۵

علماء شیعہ کی تحریف اور اس کا ردِ دلیل

علماء شیعہ نے اس فرمانِ مرتضوی کو دیکھا تو سارے عقیدہ پہ پانی پھرتا نظر آیا لہذا انگریزوں کوٹ کس کرتاویلات و تسویلات کے درپے ہو گئے اور بڑی عجیب و غریب تعبیرات شروع کر لیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ یہاں پر حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہم کے بعد چوتھا خلیفہ مراد نہیں ہے بلکہ حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد چوتھے خلیفہ مراد ہیں کیونکہ پہلے خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں قال اللہ تعالیٰ: انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ دوسرے حضرت ہارون علیہ السلام قال اللہ حکایۃ عن موسیٰ علیہ السلام: واذ قال موسیٰ لاختہ "ہارون اخلفنی فی قومی" اور تیسرے خلیفہ حضرت داؤد علیہ السلام ہیں "قال اللہ تعالیٰ: یا داؤد انا جعلناک خلیفۃ فی الارض" اور چوتھے خلیفہ آپ ہو گئے۔ کہا قال تعالیٰ۔

"وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات یعنی علیاً یتخلقنہم فی الارض کہا استخلف الذین من قبلہم آدم و داؤد و ہارون و لیکن لہم دینہم الذی ارتضیٰ لہم یعنی الاسلام الخ۔"

(مناقب جلد سوم ص ۲۵۵)

لیکن یہ توجیہ و تاویل سراسر نفی و باطل ہے کیونکہ بحث لفظ خلیفہ اور خلافت میں نہیں بلکہ اس معنی و مفہوم میں ہے جس کا ذکر قبل از میں امام رضا رضی اللہ عنہ کی زبانی اور دیگر علماء شیعہ کی زبانی ہو چکا اور اس معنی و مفہوم کا انبیاء کرام علیہم السلام میں صرف تین میں منحصر کرنا اور غیر انبیاء علیہم السلام میں سے صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ میں منحصر کرنا یا ان کی اولاد میں بالکل باطل اور خلاف واقعہ ہے۔

اولا

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امام ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے اور بقول شیعہ وہ نبی و رسول پہلے تھے اور خلیل بھی بعد ازاں تکمیل مراتب کے طور پر ان کو امامت کا منصب عطا کیا گیا، کما قال تعالیٰ: اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ” اور اپنی اولاد کے لیے انہوں نے یہ منصب اللہ تعالیٰ سے طلب کیا تب ان کو امامت و خلافت نصیب ہوئی تو کون سا عقلمند ہوگا جو پہلے ثابت اور مستحق امامت و خلافت کا انکار کر دے اور انہما ہر لطف اس میں دوسرے شریک کیے جانے والوں کی امامت و خلافت کا اقرار و اعتراف کرے ” قال ومن ذریعتی قال لا ینال عہدی الظالمین ” اور امام رضا رضی اللہ عنہ کی تصریح کے مطابق ان کی اولاد میں حضرت اسحاق، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب بھی منسوب امامت پر فائز ہوئے کما قال تعالیٰ: وجعلنا ہما ائمة یشہدون یا امرنا و اوحینا الیہم فعل الخیرات و اقام الصلوٰۃ الایۃ (احتجاج ص ۴۳)

ثانیا

حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم نہ کیا جائے اور جس ہستی کو وہ عارضی طور پر اپنا خلیفہ بنائیں اس کو خلیفہ اللہ تسلیم کر لیا جائے کیا اس سے بڑی حماقت کا مظاہرہ بھی ہو سکتا ہے؟ حالانکہ وقتی طور پر روانگی سے قبل یا واپسی کے

بعد حضرت ہارون علیہ السلام وزارت کلیم کے منصب پر فائز تھے کہا قال تعالیٰ .
 ”واجعل لی وزیراً من اہلی ہارون اخی اشد دہ اذری“ اگر موسیٰ علیہ السلام
 کے وزیر خلیفۃ اللہ ہیں تو وہ خود کیوں اس منصب سے محروم ہیں۔

ثالثاً

حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم کیا گیا لیکن ان کے فرزند
 ارجمند جو منصب نبوت پر بھی فائز اور حضرت داؤد علیہ السلام کی نسبت عظیم ترین سلطنت
 کے مالک، جن کے زیر تصرف شرق تا غرب تھا اور جن و انس اور چہرہ پرند درند بھی بلکہ
 ہوا بھی اور ایسی حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی جو بعد میں بھی بظاہر
 کسی کو حاصل نہ ہوئی کہا قال تعالیٰ رب ہب لی ملکاً لا ینبغی لأحد من بعدی“
 نیز اولاد علی رضی اللہ عنہم میں بطور وراثت امامت و خلافت کو تسلیم کیا گیا تو حضرت
 سلیمان علیہ السلام از روئے نص قرآن حضرت داؤد علیہ السلام کے وارث ہیں کہا قال
 تعالیٰ: وورث سلیمان داؤد“ لہذا ان میں یہ امامت اور خلافت کیوں تسلیم
 نہ کی گئی۔

رابعاً

بہرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سید الانبیاء والمرسلین اور شہنشاہ عرب ہونے
 کے باوجود خلیفہ اللہ تسلیم نہیں کیا گیا حالانکہ آپ نے تبلیغ احکام اور تنفیذ حدود کا
 اعلیٰ نمونہ پیش کیا اور اس عظیم مقصد کے لیے ہر قسم کی تکلیف برداشت فرمائی تو آپ نے
 جس کے متعلق ”انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ“ فرمادیا یا ”من کنت
 مولاہ فعلی مولاہ“ تو اس کا خلیفہ اللہ ہونا کیسے ثابت ہو گیا۔ آپ مولیٰ پہلے
 ہوں گے تب حضرت علی موالی ہوں گے اور آپ پہلے خلیفہ اللہ ہوں گے تب آپ کا
 نائب خلیفہ اللہ ہوگا اور جب آپ ہی خلفاء کی فہرست سے خارج ہو گئے نفوذ باللہ

تو آپ کا وارث اور جانشین خلیفۃ اللہ کیونکر ہو سکتا ہے ؟

چامساً

حضرت طالوت کے لیے اس وقت کے پیغمبر حضرت شموئیل نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کو شرف قبولیت بخشے ہوئے حضرت طالوت کو بنی اسرائیل کی سیاست اور نگرانی کے لیے احکام شرع کے نفاذ اور جہاد و قتال کے لیے مبعوث فرمایا کما قال تعالیٰ: ان الله بعث لکم طالوت ملکاً (الی) ان الله اصطفاه علیکم وزاده بسطة فی العلم والجسم والله یؤتی ملکہ من یشاء واللہ واسع علیم۔

اور حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ نے خود انہیں ائمہ میں شمار فرمایا۔ ملاحظہ ہو احتجاج طبری ص ۳۶ لہذا انہیں ائمہ اور خلفاء میں شمار نہ کرنا سراسر دھاندلی ہے اور حکم دینہ زوری۔

سادساً

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حقیقی خلیفے اور جانشین حضرت یوشع علیہ السلام تھے حتیٰ کہ بقول شیعہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے وصال کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: انت منی بمنزلة یوشع بن نون من موسیٰ، تمہارا اور میرا وہ تعلق اور نسبت ہے جو یوشع علیہ السلام کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تعلق اور ربط و مناسبت تھی، ملاحظہ ہو مناقب ابن شہر آشوب جلد ۳ ص ۲۵۲ جب طور پر جاتے ہوئے عارضی خلافت حضرت ہارون علیہ السلام کو ملی اور وہ خلیفۃ اللہ بن گئے تو جو آپ کے وصال کے بعد تازلیست خلیفہ رہے اور جنہوں نے ملک فلسطین فتح کر کے بنو اسرائیل کی حکومت و سلطنت قائم کی اور جہاد و قتال کے ذریعے اسواں غنیمت جمع کئے اور اور احکام شرع کو نافذ کیا وہ کیونکر خلیفۃ اللہ تسلیم نہ کئے جائیں۔

سابعا

حضرت آدم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں صرف ان کی اولاد بلا واسطہ یا بالواسطہ ہی موجود تھی اور اولاد کے لیے خیر و شر اور حق و باطل کی توضیح و تشریح اگر خلافت قرار پا سکتی ہے تو کفار و مشرکین اور اقرباء و اغیار کی طرف مبعوث ہونے والے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دینے والے کیوں خلفاء اللہ تسلیم نہیں کئے جاسکتے جنہوں نے ایذا میں برداشت کیں اور شہید بھی کر دیئے گئے مگر اس فرض کی ادائیگی میں کوئی کوتاہی روا نہ رکھی اور تقیہ وغیرہ سے کام نہ لیا لہذا ہر نبی کو اللہ تعالیٰ کا خلیفہ تسلیم کرنا ضروری ہے نہ کہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کو کیونکہ جو معنی خلافت کا ان میں موجود ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام میں موجود ہے۔ اسی لیے خود شیعی روایات کے مطابق ان کو بادشاہ انبیاء میں شمار نہیں کیا گیا عن ابی جعفر قال ان الله لم يبعث الا نبیاء ملوکا فی الارض الا اربعة بعد نوح ذوالقرنین و داؤد و سلیمان و یوسف علیہم السلام۔ اور عنوان بھی خصال شیخ صدوق جلد اول ص ۲۲ میں یہی قائم کیا گیا ہے ”ملوک الانبیاء فی الارض اربعة“ یعنی انبیاء علیہم السلام میں سے زمین کے بادشاہ صرف چار ہوئے ہیں جبکہ شیخ صدوق نے ذوالقرنین کو انبیاء سے خارج کر دیا ہے تو صرف تین رہ گئے جن میں آدم علیہ السلام کا نام شمار ہی نہیں کیا گیا۔ لہذا ان میں ریاست عامہ موجود ہی نہیں تھی تو محل نزاع میں اس خلافت کا ذکر درست ہی نہیں ہو سکتا۔

عجیبہ

امام نجم نے خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ملوک الانبیاء سے نکال دیا ہے تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کس طرح ثابت کی جاسکتی ہے؟

ثامناً

جو خلافت و امامت حضرت آدم، حضرت ہارون، حضرت داؤد علیہم السلام میں ثابت ہے وہ حکومت و سلطنت کے علاوہ نبوت و رسالت کے معنی میں ہے جبکہ حضرات اہل بیت میں نبوت تسلیم کرنا کفر ہے۔ اسی لیے حضرت امام ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

عن ابی بصیر قال لی ابو عبد اللہ علیہ السلام یا ابا محمد ابراہمن یزعم انا ارباب قلت برئ اللہ منه فقال ابراہمن زعم انا انبیاء قلت برئ اللہ منه۔ (رجال الکشی ص ۲۵۲)

اے ابو محمد میں اس شخص سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جو کہے کہ ہم ارباب یعنی آلہ میں والو بصیر کہتا ہے، میں نے کہا اللہ تعالیٰ اس سے بری ہو۔ پھر آپ نے فرمایا میں ان سے بری ہوں جو کہتے ہیں کہ ہم انبیاء ہیں۔ میں نے کہا اللہ تعالیٰ ان سے بری ہے۔ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ان حضرات کی خلافت کے ساتھ جوڑنا آپ کو بھی نبی و رسول تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور صرف لفظی تبدیلی کی آڑ میں اس غلو کا مظاہرہ کیا گیا ہے جس سے امام صادق نے براءت کا اظہار کیا ہے نعوذ باللہ منہ۔

تاسعاً

علاوہ ازیں آپ کا انبیاء سابقین علیہم السلام کے ساتھ خلافت میں مرتبہ و مقام کون سا ہے اس میں نہ امت کو بحث و نزاع تھی اور نہ اس میں کلام و سخن تو اس ضمن میں اس قدر وعید و تشدید کا کوئی معنی ہی نہیں ہو سکتا تھا بلکہ یہ سراسر محل حیرت اور تعجب ہے کہ بحث تو ہے وصال مصطفوی کے بعد خلافت میں کہ اصل اور اول خلیفہ کون ہے؟ اور فتوئی لگا یا جا رہا ہے ان پر جو آپ کو انبیاء سابقین کے ساتھ ملا کر چوتھا خلیفہ تسلیم نہ کریں۔ آخر حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب۔

حضرت یوسف، حضرت سلیمان اور حضرت یوشع علیہم السلام کے بعد آپ کو کیوں خلیفہ تسلیم نہ کیا جائے؟

عاشراً

مرتبہ و مقام کے لحاظ سے عند الشیعہ آپ ان میں خلفاء سے بھی افضل ہیں اور دوسروں سے بھی سوائے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور زمانی ترتیب کے لحاظ سے جس طرح تین سے مؤخر ہونا درست ہے دس گیارہ سے مؤخر ہونا بھی درست ہے بلکہ ہزاروں سے مؤخر ہونا بھی درست اور صحیح ہے لہذا چوتھے درجہ میں تسلیم نہ کرنے والا لعنت کا حق دار کیونکر ہو سکتا ہے؟

الغرض یہ تاویل و توجیہ سراسر لغو اور باطل ہے اور ناقابل قبول والتفات بلکہ اس فرمان کا صحیح اور صریح واضح اور بے غبار معنی و مفہوم یہی ہے کہ میں امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء میں سے چوتھا برحق خلیفہ ہوں اور مجھے بلا فصل خلیفہ ماننے والا اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت کا انکار کرنے والا اللہ تعالیٰ کی لعنت کا حقدار ہے اگر شیعہ صاحبان کو اس ظاہری معنی پر ایمان لانے کی توفیق نہ ہو تو کم از کم اس قدر تسلیم کر لینے میں تو ان کے مذہب پر کوئی اثر نہیں پڑے تاکہ رعایا اور لشکریوں کی مہنوی اور خوشنودی کے لیے جس طرح آپ ان کو اس امت میں سب سے افضل قرار دیتے تھے، خیر ہذا الامة بعد نبیہا ابو بکر و عمر، اسی طرح انہیں کی دلجوئی اور تسکین کے لیے ان کو خلفاء تسلیم کر لیا اور اپنے آپ کو چوتھا خلیفہ کہہ دیا، تاکہ امیر معاویہؓ کو آپ کی رعایا اور لشکریوں کو بدظن نہ کرنے اور آپ سے برگشتہ کرنے کا موقعہ ہاتھ نہ آ سکے، اور ہمارا مدعا اس سے بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ آپ کا ظاہر مذہب جس کی ترویج و اشاعت اور تعلیم و تبلیغ آپ نے فرمائی وہ یہی تھا کہ میں خلیفہ بلا فصل نہیں ہوں بلکہ چوتھا خلیفہ ہوں اور پہلے تینوں برحق خلفاء ہیں اور جو طریقہ انتخاب ان کا ہے وہی طریقہ انتخاب میرا ہے اور جن اہل مل و عقد نے ان کو اس منصب کے لیے اہل قرار دیا انہوں نے مجھے اس منصب کا

اہلِ قرار دیا ہے اور ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے اور ان کی رضا اللہ کی رضا لہذا وہ بھی میری طرح اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ خلفاء ہیں۔

اگر باطنی نظریہ بھی یہی تھا تو چشم مار و شن دل ماشاد اور اگر درپردہ کسی دوسرے نظریہ کی تبلیغ فرماتے تھے تو اس کا جواب شیعہ برادری کی ذمہ داری ہے کہ آپ نے دوسرا اسلام کیوں جاری کیا اور ملت اسلامیہ کو افتراق و انتشار سے دو چار کیوں کیا جو ذلت و ابتری اس افتراق و انتشار کی وجہ سے ملت اسلامیہ کو درپیش ہے اس کی ذمہ داری سے ابوالائمہ کی قات کو بری کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور کیا ائمہ اور قائدین اسلام کا رویہ یہی ہونا چاہیے جو ان لوگوں نے شیر خدا رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے علاوہ ازیں ہم تو ظاہر کو دیکھ سکتے ہیں اور اسی کا اعتبار کر سکتے ہیں آپ کے دل اقدس میں کیا تھا وہ اللہ تعالیٰ جانے یا آپ جانیں۔ ظاہر کے لحاظ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک وہ برحق خلفاء تھے اور مہاجرین و انصار کا یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہی انتخاب تھا۔ کہا قال رضا المخلوق عتوان رضا المخلوق جلد و علی۔ اور یہی امر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ظاہر ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

”هو الذي جعلكم خلائف الأرض ورفع بعضكم فوق بعض درجات ليبلوكم فيما آتاكم ان ربك سريع العقاب وان الله لغفور رحيم“
 ”اور وہ خدا وہی تو ہے جس نے تم کو زمین کا متصرف بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں فوقیت دی تاکہ جو نعمت تم کو دی ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بیشک تمہارا پروردگار جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ ترجمہ مقبول اور حاشیہ میں اسی مترجم نے یوں صراحت کی ہے: ”خلائف الأرض کے معنی ہیں وہ گروہ جو پہلے گروہ کا قائم مقام ہو اور زمین میں تصرف کرے جیسے کہ اہل اسلام جو یہود و نصاریٰ کی اور مجوس کی سلطنتوں کے فاتح اور ان کے تصرف و تسلط کے قائم مقام بنے (مقبول ترجمہ ص ۲۲ سورہ انفام)“

اور یہی معنی ہوں گے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے ”وعد اللہ“

الذین آمنوا امتکم و عملوا الصالحات یتخلفنہم فی الارض (الایہ) البتہ واقع میں چونکہ یہ تصرف و تسلط مستقبل میں حاصل ہونے والا تھا تو اس حقیقت کے پیش نظر مضارع مؤکد کے ساتھ اس کو تعبیر فرمایا اور چونکہ یہ حتمی اور قطعی فیصلہ تھا اور اس کا وقوع یقینی تھا لہذا اس کو ماضی سے تعبیر کرتے ہوئے جعلکم خلافت الارض فرمایا جیسے کہیں نفع فی الصور فرمایا اور کہیں یوم ینفتح فی الصور کہا۔ لہذا اس آیت مبارکہ کی تخصیص یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کرنا غلط ہے اور خلاف واقعہ اور اسی طرح حضرت مہدی علیہ السلام کے ساتھ اس کو مخصوص ٹھہرانا بھی غلط ہے اور خلاف واقعہ بلکہ وہ تمام امراء اسلام اور خلفاء و سلاطین اس کا مصداق ہیں جنہوں نے دین اسلام کو مستحکم اور مضبوط کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور جن کے دور میں اہل اسلام کا خوف امن سے بدل گیا اور مجوس و یہود اور نصاریٰ کی حکومتوں سے کسی قسم کا اندیشہ و فکر ان کو دامن گیر نہ رہا۔

سواد اعظم کا مذہب ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مذہب ہے

نیز علامہ حلی کی کشف المراد سے یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی کہ صرف شیعہ امامیہ ہی اس کے قائل ہیں کہ ائمہ اور خلفاء کا منصوب من اللہ ہونا لازم اور ضروری ہے جبکہ دیگر تمام فرق اسلامیہ اس کو لازمی شرط قرار نہیں دیتے بلکہ دیگر ذرائع مثلاً درایت یا دعویٰ امامت اور خروج بالسیف کو بھی امامت کی دلیل قرار دیتے ہیں جس طرح کہ عباسیہ اور زیدیہ کا نظریہ ہے یا شورشی اور انتخاب کو انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ بھی قرار دیتے ہیں جس میں ان میں کے علاوہ تمام فرق اسلامیہ متفق ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ اختلاف و نزاع کی صورت میں سواد اعظم کا ساتھ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ کا دست حفظ و امان جماعت پر ہے اور اس سے علیحدہ ہونے والا جہنم کی راہ پر چلنے والا ہے اور شیطان کے راستہ پر گامزن ہے، ملاحظہ ہو۔ نیچے البلاغہ مصری جلد اول ص ۲۹۸۔

الزموا السواد الاعظم فان يد الله على الجماعة واياكم
والفرقة فان الشاذ من الناس للشيطان كما أت الشاذ
من الغنم للذئب۔ لہذا صحیح اور صواب مذہب اور نظریہ یہی ہے کہ امت کے
اہل حل و عقد ہی نصب امام اور تعیین خلیفہ کے حقدار ہیں اور یہی حقیقت حضرت
شیخ الاسلام قدس سرہ نے ارشادات مرتضویہ اور شیعہ کتب کے حوالہ سے ثابت کی
ہے لہذا اب بغور ان ارشادات کا مطالعہ کریں اور اس نظریہ کی حقانیت و صداقت کا
مشاہدہ کریں۔ واللہ الموفق للهدایۃ الی سبیل الرشاد۔

اہل تشیع اور شورعی

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب اس مسئلہ پر دلائل و شواہد پیش کرنے کی ضرورت
ہی نہیں رہی اور اہل تشیع خود عملی طور پر اس حقیقت کے معترف ہو چکے ہیں اسی لیے
اب اس انتظار کو ترک کر دیا گیا ہے کہ کب اللہ تعالیٰ بندوں پر لطف و عنایت
فرماتا ہے اور اپنے واجب اور فرض کو ادا کرتے ہوئے امام منصوص کو مبعوث فرماتا
ہے اور یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑی کہ پوشیدہ اور مخفی امام موجود ہونا نہ ہونا برابر
ہے اور اس سے مقاصد مطلوبہ حاصل نہیں ہو سکتے اس لیے خود ہی شورعی اور انتخاب
کے ذریعے ملکی اور دینی امور کی حفاظت و نگرانی اور سیاست کے لیے اور اجراء احکام
اسلام اور نفاذ حدود و تعزیرات کے لیے اپنے قائدین اور اماراء کا تعین اور تقرر شروع
کر دیا ہے اور چودہ سو سال بعد وہ نظریہ عملاً متروک ہو گیا جس کی بنا پر خلفاء راشدین
کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا گیا اور ان کے انتخاب اور تقرر کو غیر اسلامی اقدام ٹھہرایا
گیا اور ان صادقین و صدیقین اور مخلصین و فائزین کے ایمان و اخلاص پر اعتراض
کیا گیا جنہوں نے ان خلفاء کرام کا انتخاب کیا۔

والحمد لله على وضوح الحق و بطلان الباطل

رسالہ مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

شوری اور انتخاب کا ذریعہ انعقاد خلافت ہونا

دلیل اول

حضرت امیر المؤمنین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے ایک گلامی نامہ میں تصریح فرماتے ہیں جو آپ نے اپنے زمانہ خلافت میں امیر معاویہ کی طرف تحریر فرمایا:

انہ با یعنی القوم الذین یایعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما
 بایعوہم علیہ فلم یکن للشاہد ان یختاروا للغائب ان یردوا
 الشوری للمہاجرین والانصار فان اجتمعوا علی رجل وسموہ اماما
 کان ذلک للہ رضی فان تخرج من امرہم خارج بطعن او بدعة ردوہ
 الی ماخرج منہ فان ابی قاتلوہ علی اتباعہ غیر سبیل المؤمنین
 ولا للہ ماتولی۔ (ربیع البلاغہ کتاب علی)

یعنی میرے ساتھ انہی لوگوں نے بیعت کی ہے جن لوگوں نے ابوبکر و صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر و فاروق رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کی تھی۔ پس کسی حاضر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ میرے بغیر کسی دوسرے شخص کو خلیفہ بنائے اور نہ ہی کسی غائب کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ایسی خلافت کو رد کرے اور انعقاد خلافت میں، مشورہ کا حق اور انتخاب کا اختیار صرف مہاجرین و انصار ہی کو ہے پس جس آدمی پر ان کا اجماع اور اتفاق ہو جائے اور اس کو امام و امیر کے نام سے موسوم کریں تو انہیں کا اجماع اور امیر بنانا اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے پس جو شخص بھی ان کے اجماعی فیصلہ پر طعن کرتے ہوئے یا نیا راستہ اختیار کرتے ہوئے اس سے الگ ہونا چاہیے تو اس کو اسی اجماعی فیصلہ کی طرف لوٹانے کی کوشش کرو اور اگر واپس آئے اور موافقت کرنے سے انکار کرے تو اس کے خلاف جنگ کرو

اس بنیاد پر کہ اس نے مسلمانوں کے راستہ کے علاوہ دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کو ادھر ہی پھیر دیا ہے جس طرف وہ اپنی مرضی سے پھرا ہے یعنی یہ نہ سمجھو کہ وہ کسی صحیح نظریہ کے تحت مسلمانوں سے الگ ہوا ہے۔

تحفہ حسینیہ، تہمتہ استدلال

۱۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس تحریری بیان سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مہاجرین و انصار کے انتخاب اور کسی بھی شخص کو خلافت کے لیے نامزد کرنے کو نہ صرف درست اور صحیح سمجھتے ہیں بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی رضا مندی قرار دیتے ہیں۔

۲۔ آپ ان کے اجماع و اتفاق سے طے ہونے والے معاملہ کو راہ ہدایت اور راہ حق سمجھتے ہیں اور اس کی مخالفت کو گمراہی و ضلالت سمجھتے ہیں اسی لیے الگ ہونے والے کو طاعن اور بدعتی فرمایا اور اس کو ہر قیمت پر مہاجرین و انصار کے اختیار کردہ راستہ کی طرف لوٹانے کا حکم دیا۔ اگر دوسری طرف بھی ہدایت اور حقانیت کا امکان ہوتا تو اس سے پھرنا کیونکر واجب و لازم ہو سکتا تھا۔

۳۔ واپس نہ آنے والے کو آپ نے واجب القتال قرار دیا اور اہل حق کے خلاف جہاد واجب تو کجا جائز بھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا قتال و جہاد کو واجب قرار دینا بھی اس حقیقت کی بین دلیل ہے کہ ان کی مخالفت کرنا صرف غلط ہی نہیں بلکہ ناقابل برداشت اور ناقابل عفو جرم ہے اور اس کو کیفر کردار تک پہنچانے کا موجب و باعث۔

۴۔ ان کے خلاف چلنے والے کو ولاۃ اللہ مانتویٰ کہہ کر یہ بھی واضح کر دیا کہ جب جدوجہاد سعی و کوشش کے باوجود وہ واپس نہیں آتا تو سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت قاہرہ غالبہ سے اسے گمراہی کے راستہ پر ڈال دیا، اس لیے راہ راست پر چلنے کی صلاحیت اور لیاقت بھی اس سے چھن گئی ہے، جس سے واضح ہوا

کہ مہاجرین و انصار کی مخالفت صرف غلط نہیں بلکہ ضلالت ہے اور ایسی ضلالت کہ اس پر اصرار کرنے والے سے ہدایت پانے کی صلاحیتیں بھی سلب کر لی جاتی ہیں۔ اس قدر سخت موکد اور محقق ارشاد کے بعد بھی خلافت کے بذریعہ شوریٰ اور انتخاب منعقد ہونے کی صحت اور درستگی میں بحث و نزاع کی اور اختلاف و مجادلہ کی کوئی گنجائش ہو سکتی ہے؟ نیز آپ نے صرف اپنا نظریہ بیان نہیں فرمایا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کو بیان فرمایا قال اللہ تعالیٰ: ”وَمَنْ يَشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا“ جو شخص بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو گئی اور مؤمنین کی راہ کے علاوہ کسی راہ پر چل پڑے تو ہم اسے ادھر ہی پھیریں گے جدھر وہ پھرا۔ پھر اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور وہ برا ٹھکانہ ہے۔ اس آیت مقدمہ میں مخالفت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور مؤمنین کے راستہ کے ترک کرنے کو ایک ہی سطح پر رکھا گیا ہے اور دونوں کو موجب ضلالت اور جہنمی ہونے کا سبب قرار دیا گیا اور اسی آیت مبارکہ کے مضمون کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے قاتلۃ علی اتباعہ غیر سبیل المؤمنین و اولادہ اللہ ما تولى سے تعبیر فرمایا ہے۔ بقول علامہ ابن میثم بحرانی، مؤلف نہج البلاغہ نے ابتدائی حصہ حذف کر دیا ہے جو حضرت امیر المؤمنین کا دعویٰ ہے یعنی اما بعد فان بیعتی لزمتهک یا معاویۃ وانت بالشام میری بیعت کچھ پہ لازم ہو چکی ہے باوجودیکہ تو شام میں ہے اور اس دعویٰ پر آپ نے منطق کی شکل اول کے ساتھ استدلال کرتے ہوئے فرمایا ”انہ با یعی القوم الذین انتم جنس میں صغریٰ شکل اول قیاس حمل کا یہ ہے“ میرے ساتھ ان لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے خلفائ ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیعت کی ہے“ اور کبریٰ اس کا یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ یہ لوگ بیعت کر لیں دوسرے کسی شخص کو حاضر ہو یا غائب اس کے علاوہ دوسرے شخص کو امام منتخب کرنے یا خود امامت کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رہتا

اور ان کے فیصلہ کو رد کرنے کا اختیار نہیں رہتا اور صغریٰ تو واضح ہے دلیل اس پر قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ رہا کبریٰ تو اس پر دلیل دیتے ہوئے فرمایا "انما الشوری للمہاجرین والانصار فان اجتمعوا۔ الخ جس کا خلاصہ بنہ بان ابن عثیم یہ ہے۔

لانہم اہل حل وعقد من امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم فاذا اتفقت کلماتہم علی حکم من الاحکام کاجتماعہم علی بیعتہ وتسمیۃ اماما کان ذلک اجماعاً حقاً هو رضی اللہ عنہ ای مرضی لہ وسبیل المؤمنین الذی یجب اتباعہ۔ الخ

(شرح ابن میثم جلد رابع ص ۳۵۳-۳۵۴)

کیونکہ امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے اہل حل وعقد وہی (مہاجرین و انصار) ہیں ان میں کسی بھی امر اور حکم پر اتفاق ہو جائے جیسے کہ آپ کی بیعت پر اور آپ کو امام کے اسم کے ساتھ موسوم کرنے پر تو وہ اجماع برحق ہو گا اور اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ اور مؤمنین کا ایسا راستہ جس کی اتباع واجب و لازم ہے۔ لہذا اب ہر شخص پر بیعت تیرے اے معاویہ! یہ بیعت لازم ہے۔

۲۔ اور شارح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید نے بھی یہی بتلایا کہ اس کلام کا آغاز یوں

ہے اما بعد! فان بیعتی بالمدينة لزمتک وانت بالشام لانہ بایعنی القوم الخ اور آخر میں اس اضافہ کا بھی ذکر کیا ہے والمروی بعد قوله "ولاء اللہ ما تولى" واصلہ جہنم وساعات مصیراً تو اس طرح آیت کریمہ کے معنی کو مکمل طور پر آپ نے اپنے کلام میں سمودیا یعنی مؤمنین کی مخالفت کو موجب قتال و جہاد قرار دیا اور اس کے بھٹکنے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت قاہرہ کے تصرف کا نتیجہ قرار دیا اور پھر جہنم میں داخل کئے جانے کا ذکر فرمایا جو بہت برا ٹھکانا ہے (شرح حدیدی جلد ۱ ص ۳۵۴-۳۵۵)

فائدہ

اس آیت کریمہ سے استشہاد و استدلال نے واضح کر دیا کہ مولائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کلام سابق محض الزام و جہل نہیں تھا بلکہ عقلی اور نقلی بہانے کے ذریعے اپنے مدعا کو ثابت کرنا مقصود تھا ورنہ لازم آئے گا کہ اس آیت کریمہ کے بھی صرف امیر معاویہ رضی اللہ عنہ قائل تھے نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ العیاذ باللہ۔ علاوہ انہیں اگر حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ الزامی کاروائی ہوتی تو دوسرے صوبہ جات میں گورنر اور عامل مقرر کرتے وقت ان لوگوں پر اس حجت کو قائم نہ فرماتے حالانکہ جس وقت آپ نے مصر میں قیس بن سعد کو اپنا گورنر بنا کر بھیجا جب کہ یہی اہل مصر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف ہو گئے تھے اور آپ کو شہید کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عامل کو آپ کی شہادت سے بھی پہلے انہوں نے برطرف کر دیا تھا تو قیس بن سعد کو جو خلافتی آرڈر اور حکمنامہ اہل مصر کے نام لکھ کر دیا تھا اس میں بھی یہ دلیل مرقوم تھی۔

ثم ان المسلمين من بعده استخلفوا اميرين منهم صالحين
فعملا بالكتاب والسنة واجيبا السيرة ولم يعدوا السنة ثم توفيا
رحمهما الله فولى بعدهما وال احدثا فوجدت الامة عليه
مقالا فقالوا ثم نقموا فغيروا ثم جاءوني فبايعوني وانا استهدى
الله الهدى واستعينه على التقوى الخ

رکتاب الغارات (ابراہیم الثقفی شرح حدیثی ص ۵۸ جلد ۶)
پھر اہل اسلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد دو صالح امیر کیے بعد
دیگرے خلیفہ بنائے جنہوں نے کتاب و سنت کے مطابق عمل کیا اور سیرت نبویہ کو زندہ
کیا اور سنت سے تجاوز نہ کیا پھر ان کا وصال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں پر رحمت فرمائے۔
پھر ان کے بعد ایک والی بنایا گیا جس نے بعض نئے امور ایجاد کئے جن کی وجہ سے امت

اس پر معترض ہوئی اور ناراضگی کا اظہار کیا اور بالآخر اس خلافت کو بدلا دیا پھر میرے پاس آئے اور مجھ سے بیعت کی اور میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا طلب گار ہوں اور اس سے تقویٰ پر اعانت کی توفیق طلب کرتا ہوں اور اس کے علاوہ دوسرے خطبے اور خطوط جو اس معنی پر مشتمل ہیں بکثرت آپ سے منقول ہیں جن میں سے بعض کا ذکر بھی آتا ہے لہذا اس کو الزامی کاروائی قرار دینا قطعاً درست نہیں ہے۔

توجیہ الامامیہ

شارح ابن الحدید کہتا ہے کہ شیعہ نے اس کو تقیہ پر محمول کیا ہے۔ اور اس کی بنیاد اس امر کو بنایا ہے کہ آپ اگر امیر معاویہؓ کی طرف حقیقت حال لکھتے اور کہتے کہ میں خلیفہ بلا فصل تھا اور ہوں تو اس میں خلفاء سابقین پر طعن ہوتا اور جن اہل مدینہ نے ان کی بیعت کی تھی اس صورت میں ان کے بگڑنے اور ناراض ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔

وهذا القول من الامامية دعوى لوعضدها دليل لوجب ان يقال بها ويصار اليها ولكن لا دليل لهم على ما يذنبون اليه من الاصول التي تسوقهم الى حمل هذا الكلام على التقية -

در شرح حدیدی ص ۳۳، جلد ۱

امامیہ کا یہ قول محض دعویٰ ہے اگر کوئی دلیل اس کی تائید کرتی تو اس کے مطابق قول کرنا اور اس کی طرف رجوع کرنا لازم ہوتا لیکن ان کے لیے ان اصول و قواعد میں سے جو انہیں اس کلام کو تقیہ پر محمول کرنے پر مجبور کریں کوئی دلیل اور سند موجود نہیں ہے اور کلام کو بلا دلیل صارت اور احتمال ناشی عن دلیل کے بغیر ظاہری معنی سے پھیرنا اس کو باطل قرار دینے کے مترادف ہے اس لیے شیعہ صاحبان کی یہ توجیہ ناقابل قبول ہے بحمد شرف

فائدہ ۲

حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے کہ میرے ساتھ انہیں

لوگوں نے بیعت کی ہے جنہوں نے خلفاء ثلاثہ کے ساتھ بیعت کی تھی ظاہر ہے کہ آپ کے نزدیک ان کا ایمان اور ان کی امانت و دیانت محل کلام نہیں تھی ورنہ بیعت سابقہ سے اگر نفوذ بالحدود مرتد ہو چکے ہوتے اور انہیں پتہ بھی ہوتا کہ ہم ان کے نزدیک مرتد ہیں تو وہ یا بیعت نہ کرتے اور یا از سر نو اسلام میں داخل ہوتے جب توبہ کئے بغیر حضرت علی کی بیعت کی اور وہ بیعت دلیل شرعی بن گئی تو ان کا کامل الایمان ہونا اور خلفاء ثلاثہ کی بیعت کا صحیح ہونا واضح ہو گیا۔ اور حضرت امیر کا ان کے ساتھ مذہب و عقیدہ میں متفق ہونا بھی ورنہ آپؐ یہ نہ فرماتے: ”علی ما بایعوہم علیہ“ یعنی اس امر پر انہوں نے میری بیعت کی ہے جس پر ان کی بیعت کی تھی اگر مذہب مختلف ہو تو بنیاد بیعت یکساں کیوں کر ہو سکتی ہے۔

از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

مذہب شیعہ
دلیل دوم

خلافت کے انعقاد کے بارے میں حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا دو بیان بھی ملاحظہ فرمائیں اور چونکہ آپ کا یہ بیان حلفی ہے اور موکد بالقسم ہے اس لیے اس کو بالکل نظر انداز نہ فرمائیں۔

ولعمری لئن کانت الخلافة لا تنعقد حتی تحضرها عامة الناس ما إلى ذلك سبيل ولكن أهلها يحكمون علی من غاب عنها..... ثم ليس للشاهد ان يرجع ولا للغائب ان يختار الا وإني أقاتل رجلين رجلاً ادعى ماليس له وآخر منع الذي عليه الخ

(نهج البلاغة، مطبوعه ايدان خطبه نمبر ۱۷۲)

یعنی مجھے میری زندگی کی قسم کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ جب تک سب لوگ جمع ہو کر خلیفہ اور امام مقرر نہ کریں اتنے تک وہ شخص امام نہ بن سکے بلکہ صرف اہل رائے لوگ ہی اس کا فیصلہ کرنے کے اہل ہیں جو دوسرے لوگوں پر اس حکم کو نافذ کرتے ہیں۔ ان کے فیصلہ

کے بعد نہ موقعہ پر موجود شخص کو رجوع کا حق ہے اور نہ غائب کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے اور اس فیصلہ کا خلاف کرے۔ خبردار میں دو قسم کے لوگوں کے خلاف قطعی طور پر جنگ کروں گا ایک تو وہ لوگ جنہوں نے ایسی چیز کا دعویٰ کیا جس کے وہ مستحق نہیں تھے دوسرے وہ لوگ جنہوں نے کسی کا حق روک رکھا ہو۔ کوئی بھی سمجھدار انسان مولیٰ مشکل کشا کے اس حلفی بیان کے بعد خلفاء راشدین کے خلافت کے مستحق نہ ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ نہیں لڑی بلکہ ان کی اعانت فرمائی اور نصرت و امداد فرمائی ان کے ہاتھ پر بیعت فرمائی بلکہ بطیب خاطر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو رشتہ دیا اور اپنا شرف و امانادی بخشا ان کو امیر المؤمنین تسلیم فرمایا۔ ان کی شان ارفع میں سب بکنے والوں کو قتل کیا بلکہ ان کو آگ میں جلایا یعنی سبائی غالیوں کو دنا سخ التواریح بخم اس طرح ان کی اس سنت پر ان کی اولاد اطہار نے بھی عمل فرمایا جن کے حوالے گزر چکے ہیں۔

نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ خلافت کے متعلق آپ کے حق میں کوئی وصیت نہیں تھی بلکہ اس کا انعقاد صرف اہل الہدایۃ اور اہل باب صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے سے ہی ہو سکتا ہے ۱۲
 راسی لیے آپ نے انما الشوری للہاجرین والانصار الخ
 کہہ کر اس حق کو تسلیم فرمایا اور لیکن اہلہا یحکمون علی من غاب عنہا
 کہہ کر بھی اور انتہا بایعنی القوم الذین بایعوا ابابکر و عمر و عثمان
 کہہ کر اپنے حق میں ان کا فیصلہ صادر ہونا تسلیم فرمایا لہذا یہ طرز استدلال وصیت کے نہ ہونے پر بین دلیل ہے اور واضح بہان

محضر حسینی
 از ابوالحسنات محمد اشرف الستیالوی عفی عنہ

فوائد و نکات

ان دونوں عبارتوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت پر قطعاً اعتراض اور انکار نہیں تھا ورنہ آپ کا یہ استدلال اور اعلان مذاق بن کر رہ جائے گا کہ جب خود تم نے ہاجرین و انصار کے فیصلہ کو تسلیم

نہ کیا اور ان کے انتخاب کو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور رضا، المخلوق عنوان رضا الخالق
یعنی مخلوق کی رضا مندی خالق کائنات کی رضا مندی کا عنوان ہے، تسلیم نہ کیا تو دوسروں
کو اس دلیل سے کیونکر پابند کر سکتے ہو؟ لِحَوْثَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ لہذا
امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی ذات مقدسہ ایسے واضح اور لا جواب
اعتراض سے اس صورت میں بچ سکتی ہے جب اس کے مطابق آپ کا اپنا عمل بھی تسلیم
کیا جائے۔ اگر اس کا صرف یہ مقصد بیان کیا جائے کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو الزام
دینا چاہتے تھے تو یہ خلافت واقعہ ہے۔ کیونکہ انہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس
انتخاب پر ہی اعتراض تھا اور اس دعویٰ میں ہی کلام تھا جیسا کہ ابھی ذکر کیا جائے گا۔
علاوہ ازیں وہ کہہ سکتے تھے کہ میرا اب وہی نظریہ ہے جو اس وقت آپ کا تھا اگر آپ
ان کی خلافت کا انکار کر کے اور مہاجرین و انصار کے فیصلہ کو ٹھکرا کر گنہگار نہیں ہوئے
تو ہم یہ کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا؟

اب اس عبارت کا پس منظر شیعی شارحین کی زبانی سماعت فرما کہ ذرا حقیقت حال کا جائزہ
لیں شرح حدیدی میں ہے کلام امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ
عنہ کو خط لکھا جس میں یہ اعتراض کیا گیا تھا۔ فان کنت ابا حسن اثماً
تعارض علی الإمارة والمخلافۃ فامری بوصتک خلافتک لکنت قریباً
من ان تُعدّ ر فی حرب المسلمین ولکنہما صحت لک وأنی بصتہما
واہل الشام لم یبدّ خلوا فیہا ولم یرضوا بیہا فحفت اللہ
وسطواتہ واتق بأسہ ونکالہ واغمد سیفک عن
الناس۔ ج ۲۲ -

اے ابوالحسن رضی اللہ عنہ! اگر تم امارت اور خلافت پر لوگوں کے خلاف
جنگ لڑ رہے ہو تو مجھے اپنی زندگی کی قسم اگر تمہاری خلافت درست ہوتی تو تم اہل
اسلام کے خلاف جنگ لڑنے میں معذور سمجھے جانے کے قریب ہوتے لیکن خود
وہ بھی درست اور صحیح نہیں ہے اور کیونکر صحیح ہو سکتی ہے جب کہ اہل شام اس میں
شامل ہی نہیں ہوئے تو اجماع کہاں منعقد ہو گیا اور بغیر اجماع کے اس کا انعقاد کسی

کے لیے کیونکر ہو سکتا ہے؟ اور نہ ہی وہ اس پر رضا مند ہوتے ہیں لہذا اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس کی گرفت سے اور اس کی سخت گیری سے اور عذاب سے ڈرو اور اپنی تلوار کو میان میں کر لو اور لوگوں سے اس کو دور کر لو۔

جب انہوں نے اجماع کا یہ مطلب لیا کہ تمام تر لوگ حاضر ہوں اور عملی طور پر بیعت کریں تو اس کے جواب میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر خلافت کا انعقاد اس وقت تک ممکن نہ ہو جب تک عام لوگ اس میں حاضر نہ ہوں تو اس طرح کئے اجماع و اتفاق کا تو امکان ہی نہیں بلکہ یہ اہل حل و عقد کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہیں منصب خلافت کے لیے منتخب کریں اور انہیں کا فیصلہ تمام اہل اسلام اور عالم اسلام پر نافذ ہوگا۔

”بل الاعتبار فی الاجماع اتفاق اهل الحل والعقد من امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی بعض الامور وهم العلماء“ ابن میثم، ص ۳۳، ج ۳۔

لہذا واضح ہو گیا کہ اس عبارت اور سابقہ عبارات میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو الزام دینا مقصود نہیں وہ تو انقادی اجماع میں بھی اختلاف رکھتے ہیں بلکہ آپ کے پیش نظر واقعہ اور حقیقت کا بیان ہے اور اس مسئلہ میں اپنے نظریہ کا بیان مقصود ہے والحمد للہ۔

اور دوسرے مقام پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کو جو جواب لکھا اس کا خلاصہ یوں مرقوم ہے شرح حدیدی میں ہے۔ ص ۳۳، جلد ۱۰۰۔

”لان بیعتی بالمدينة لزمك وانت بالشام كما لزمك بیعة عثمان بالمدينة وانت امیر لعمر علی الشام وكما لزمك یزید اخاك بیعة عمرو وهو امیر لابی بكر علی الشام (الخ) واما قولك ان بیعتی لم تصح لان اهل الشام لم یدخلوا فیها کيف وانما هی بیعة واحدة تلزم الحاضر والغائب لا یتثنی فیها النظر ولا یستأنف فیها الخیار الخارج منها طاعن والمروی فیها مداهن“

یعنی میرے مدینہ میں ہونے کے باوجود میری بیعت تجھ پر واجب و لازم ہو چکی

باد جو داس کے کہ تو شام میں ہے جیسے کہ تجھ پر حضرت عثمان کی بیعت لازم ہو گئی جو مدینہ میں پائی گئی۔ جبکہ تو شام میں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر تھا اور جیسے تیرے بھائی زید کو امیر عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت کرنا لازم ہو گیا حالانکہ وہ شام میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی طرف سے امیر تھے دتا رہا، تیرا یہ قول کہ میری بیعت اور خلافت درست ہی نہیں کیونکہ اہل شام اس میں داخل نہیں ہوئے تو یہ تعلق اور بہانہ غلط ہے کیونکہ بیعت خلافت ایک ہی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض اہل اسلام ایک کو خلیفہ منتخب کریں اور دوسرے کسی اور کو بلکہ جب بعض نے ایک کو خلافت کیلئے چن لیا تو دوسروں پر بھی اس کی بیعت کرنا لازم ہے۔ اور حاضر و غائب سبھی اس کے پابند ہیں نہ اس میں دوبارہ غور و فکر ہو سکتا ہے اور نہ اس میں نئے سرے سے چناؤ اور انتخاب کا اختیار دیا جاسکتا ہے جو اس سے خروج کرے وہ اسلام کے فیصلہ پر طعن کرنے والا ہے۔ اور جو اس میں سوچ بچار کرنے لگے وہ بد اہنت اور دین میں تساہل و تغافل کا مرتکب ہے۔ اور یہی عبارت نہج البلاغہ مصری جلد ثانی ص ۹ پر موجود ہے۔

لَا نَهَا بَيْعَةً وَاحِدَةً لَا يَتَنَبَّأُ فِيهَا النَّظَرُ وَلَا يَسْتَأْنِفُ فِيهَا الْخِيَارُ الْخَارِجُ مِنْهَا طَاعِنٌ وَالْمَرْوِيُّ فِيهَا مَدَاهِنٌ“ لہذا روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عقیدہ و نظریہ یہی ہے کہ خلافت و امامت کے لیے انتخاب اور شور و طعن ہی واحد راستہ ہے اور اس حقیقت کو ابن ابی حدید نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے شرح حدیدی ص ۳۶ جلد ۱۲۔

وَأَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْفَصْلَ دَالٌ بِصَرِيحِهِ عَلَى كَوْنِ الْاِخْتِيَارِ طَرِيقًا إِلَى الْاِمَامَةِ كَمَا يَذْكُرُهُ اصْحَابُنَا الْمُتَكَلِّمُونَ لِأَنَّهُ اُخْتِجَ عَلَى بَيْعَةِ مَعَاوِيَةَ بِبَيْعَةِ اَهْلِ الْحُلِّ وَالْعَقْدِ لَهُ وَلَمْ يَرَأَ فِي ذَلِكَ اِجْمَاعَ الْمُسْلِمِينَ كُلِّهِمْ وَتَبَاسَهُ عَلَى بَيْعَةِ اَهْلِ الْحُلِّ وَالْعَقْدِ لَا بِكَرْقَانِهِ مَارُوعِي فِيهَا اِجْمَاعَ الْمُسْلِمِينَ لِأَنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ لَمْ يُيَاذِمْ وَلَا أَحَدًا

مِنْ أَهْلِ بَيْتِهِ وَدَارِهِ وَكَانَ عَلِيًّا وَبَنِي هَاشِمٍ وَمَنْ انْضَوِيَ
إِلَيْهِمْ لَمْ يَبَايَعُوا فِي أَقْلٍ الْأَمْرِ وَامْتَنَعُوا وَلَمْ يَتَوَقَّفِ الْمُسْلِمُونَ
فِي تَصْحِيحِ إِمَامَةِ أَبِي بَكْرٍ وَتَنْفِيذِ أَحْكَامِهِ عَلَى بَيْعَتِهِمْ وَهَذَا
دَلِيلٌ عَلَى صِحَّةِ الْاِخْتِيَارِ وَكَوْنِهِ طَرِيقًا إِلَى الْإِمَامَةِ لَا يَقْدَحُ
فِي إِمَامَتِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ امْتِنَاعُ مَعَاوِيَةَ مِنَ الْبَيْعَةِ وَ
أَهْلِ الشَّامِ -

یہ امر اچھی طرح ذہن نشین رہے کہ یہ نسل اور خط اپنے صریح معنی و مفہوم کے لحاظ
سے اس امر کی دلیل ہیں ہے کہ اختیار اور انتخاب انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ
ہے جیسے کہ ہمارے علماء متکلمین ذکر کرتے ہیں کیونکہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ
نے اپنی خلافت و امامت پر اہل حل و عقد کی بیعت سے امیر معاویہؓ کے خلاف استدلال
پیش کیا ہے اور اس میں تمام اہل اسلام کے اجماع کا لحاظ اور رعایت کو امر لازم نہیں
سمجھا اور اس کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں اہل حل و عقد کی بیعت
پر قیاس کیا کیونکہ اس میں بھی تمام تر افراد مؤمنین اور اہل اسلام کی بیعت پر انعقاد
خلافت کو موقوف نہیں کیا گیا تھا کیونکہ حضرت سعد بن عبلہؓ، ان کی اولاد اور افراد
خاندان نے بیعت نہیں کی تھی اور حضرت علی مرتضیٰؓ بنو ہاشم اور ان کے ساتھ منسلک
ہونے والوں نے بھی ابتدائی طور پر بیعت سے گریز کیا لیکن اس کے باوجود اہل اسلام
نے حضرت ابو بکرؓ کی صحت امامت اور ان کے احکام کے نفاذ کو ان حضرات کی بیعت
پر موقوف نہ سمجھا اور اس میں کسی تردد اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ اور یہ امر صحت امتیاز
و انتخاب کی دلیل ہے اور اس کے ذریعے امامت و خلافت منعقد ہونے کا بہتان
ہے اور اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا اور اہل شام کا توقف
آپ کی امامت و خلافت میں غلط انداز نہیں ہو سکتا جس طرح حضرت صدیق
رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت میں کوئی حائل واقع نہ ہوا۔

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور شوریٰ کی صحت اور اس کا ذریعہ خلافت ہونا

جب حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امت مسلمہ کی غیر خواہی اور بھلائی کے لیے اور باہمی کشت و خون اور حرب و قتال کو ختم کرنے کے لیے خلافت و امامت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دی تو اس وقت جو عہد پیمان ہوا اور جن شرائط پر یہ مصالحت انجام پذیر ہوئی۔ ان کا مطالعہ کر لو تاکہ واضح ہو جائے کہ شوریٰ اور انتخاب کا مطالبہ امام حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اگر اہل بیت کرام کے نزدیک اس کا اعتبار نہ ہوتا تو اس کا مطالبہ کیوں کرتے عبارت ملا حظہ ہو کشف الغمہ جلد اول صفحہ مطبع جدید۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ - هَذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ ابْنِ طَالِبٍ مَعَاوِيَةَ بْنَ أَبِي سَفْيَانَ صَالِحَهُ عَلَى أَنْ يَسْلَمَ عَلَيْهِ وَكَلايَةِ أَمْرِ الْمُسْلِمِينَ عَلَى أَنْ يَعْمَلَ فِيهِمْ بِكِتَابِ اللَّهِ وَسُنَّةِ رَسُولِ اللَّهِ وَسِيرَةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ دَلِيلِ مَعَاوِيَةَ بْنِ أَبِي سَفْيَانَ أَنْ يَعْهَدَ إِلَى أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ عَهْدًا أَبَدًا بِكَوْنِ الْأَمْرِ مِنْ بَعْدِهِ شُورَى بَيْنِ الْمُسْلِمِينَ الْخ
یہ وہ معاہدہ اور پیمان ہے جس پر حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے معاویہ بن سفیان کے ساتھ مصالحت کی ہے۔ انہوں نے معاویہ بن ابی سفیان کے ساتھ مصالحت کی کہ ان کو ولایت اہل اسلام اور ان کی خلافت اس شرط پر سونپی جاتی ہے کہ ان میں اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی سیرت کے مطابق عمل کرے۔ اور امیر معاویہ کو یہ حق نہیں ہوگا کہ وہ اپنے بعد کسی کے لیے وصیت کرے اور عہد و پیمان، بلکہ امر خلافت ان کے بعد اہل اسلام کے درمیان شوریٰ اور انتخاب کے ساتھ طے ہوگا۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے بھی شوریٰ پر اعتماد کیا اور اس کو انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ قرار دیا اور الولد سرلابیہ کا پورا پورا مظاہرہ کیا۔

فائدہ: نیز اس عبارت سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ خلفاء ثلاثہ

رضی اللہ عنہم کو خلفاء راشدین سمجھتے تھے ورنہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر فرماتے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ کا چونکہ اختلاف رہا لہذا یہ شرط تو قرن قیاس ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر ہو سکتی ہے تو صرف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم الی اور صاحب کشف الغمہ نے اس کو نقل کر کے اس پر سکوت اور خاموشی اختیار کی ہے جس سے صاف ظاہر کہ وہ اس کے معتقد اور قائل ہیں اور انہوں نے ابتداء کتاب میں تصریح کی ہے کہ میں ایسی روایات نقل کرتا ہوں جو سب کے نزدیک قابل قبول ہوں اور سنی شیعہ کے نظریہ و عقیدہ کے موافق، لہذا شیعہ صاحبان کو بھی اس پر ایمان لانا چاہیے اور اہل سنت کے ساتھ موافقت کرنی چاہیے تاکہ باہم اختلاف و نزاع کم ہو کہ بلکہ ختم ہو کہ ملکی سلامتی کا ضامن بن سکے اور آخرت میں بھی سب کا بھلا ہو سکے اور اسی قسم کا ایک استحسان اور پسندیدہ نظریہ ابن میثم بحرانی کا بھی ملاحظہ فرماتے چلیں

علامہ ابن میثم بحرانی اور بیان نزاع و خلافت سے تنفر

خطبہ شتشیقہ جس میں حضرات خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق بعض سخت الفاظ منسوب کئے ہیں، اہل سنت نے سرے سے اس خطبہ کی صحت اور درستگی کا ہی انکار کر دیا جیسے کہ اس کی بحث گذر چکی ہے۔ علامہ ابن میثم فرماتے ہیں کہ اگر انکار کرنے والوں کے انکار کا یہ مقصد ہے، عوام کو مطمئن کیا جائے اور ان کے اندر خیالات فاسدہ اور تصبیات ردیہ کے بھڑک اٹھنے سے ان کو بچایا جائے تاکہ امر دین میں استقامت اور استواری پیدا ہو جائے اور سب اہل اسلام ایک شاہراہ پر گامزن ہو جائیں اس لئے ان کے سامنے اس طرح ظاہر کریں کہ سرے سے صحابہ کرام علیہم الرضوان میں جو اشرف المسلمین اور سادات اہل اسلام ہیں کوئی اختلاف اور نزاع عطا ہی نہیں اور وہ باہم شیر و شکر تھے تاکہ دوسرے لوگ بھی ان کی اقتدار و اتباع کریں اور باہم متحد و متفق ہو کر رہیں تو یہ مقصد بہت اچھا ہے اور بہت ہی گہری اور باریک نظر ہے۔ اسے کاش ایسے مقاصد سامنے رکھے جاتے۔

أما المنكرون لوقوع هذا الكلام منه فيحتمل انكارهم وجهين

احدها أن يقصدوا بذلك توطئة العوام وتسكين خواطرهم عن إثارة الفتنة لتقصيات
الفاصلة ليستقيم أمر الدين ويكون الكل على نهج واحد فيظهر والهم الله لم يكن بين
الصنابة الذين هم أشرف المسلمين وساداتهم خلاف ولا نزاع ليقبضوا بالهم
من سمع ذلك وهذا مقصد حسن ونظر لطيف لو قصد -

(شرح ابن ميثم جلد اول ص ۲۵۱، وکذا فی الدرۃ النجفیة جلد اول ص ۷)

گز جانے والوں پر اعتراض و تنقید سے اجتناب کا لزوم انور قرآن

یہی حکم قرآن مجید نے دیا ہے کہ پہلی امتوں یا اس امت کے پہلے ادوار میں گزرنے
والے لوگوں پر تنقید اور اعتراض سے دور رہو اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑو اور تم اپنے
اعمال کی اصلاح اور درستگی کی سعی مسلسل کرو کیونکہ تم ان کی طرف سے جواب دہ نہیں ہو بلکہ
اپنے اعمال کی طرف سے۔

قال عز وجل: - تلك امة قد خلت لهما ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا
تستلون عما كانوا يعملون؟

وہ امت ہے جو گزر چکی ہے اس کو وہ اعمال نفع دینے والے ہیں جو اس نے کمائے اور
تمہیں وہ اعمال جو تم نے کمائے اور تم سے سوال نہیں کیا جائے گا اس کے متعلق جو وہ
کرتے تھے، اور یہی حکم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے بھی ثابت ہے قال تعالیٰ:
والذين جاءوا من بعدهم يقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذين سبقونا
بالايمان ولا تجعل في قلوبنا غلا للذين آمنوا ربنا انك رؤوف رحيم
جس کا ترجمہ اور تشریح حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ کے فرمان سے واضح کی جا چکی ہے۔
لیکن افسوس کا مقام ہے کہ خود شیعی اکابر کے اس طرز عمل اور نصیحت و وصیت کے
برعکس بعض پیٹ کے دوزخ کو پہنچنے کے واسطے ذاکر صاحبان اور مبلغ صاحبان شر
صحابہ کرام اور خلفاء راشدین اور اشرف و شرفاء امت کو ہی ہر وقت اپنے اعتراضات کا
نشانہ بنائے رکھتے ہیں اور نفرت پھیلانے اور اہل اسلام کو ایک دوسرے سے دور کرنے

کے علاوہ ان کا کوئی پیشہ ہی نہیں ہے حالانکہ انہیں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہل بیت کی عظمت اور عزت سے کوئی غرض ہے نہ صحابہ کرام علیہم الرضوان سے کوئی ذاتی تکلیف ہے اگر روزی کا یہ ذریعہ بند ہو جائے اور اس بہانے لاکھوں روپے کے ٹھیکے چکنے بند ہو جائیں تو ان کے سب جذبات حب علی اور بغض معاویہ والے ختم ہو کر رہ جائیں گے۔

مقام تعجب ہے کہ جو پیشگی رقم کا ٹھیکہ چکائے بغیر ان مقدس ہستیوں کا نام ہی نہ لے سکیں وہ محب ہیں اور جنہوں نے اپنا سب کچھ اور خود کو اسلام اور بانی اسلام کے لیے قربان کر دیا وہ دشمن ہیں؟ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

عن تثنائه مد ظہب شیعہ
ار حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز
واللیل ہوم بر صحت شوری

ناسخ التواریخ جلد ۲ حصہ ۲ کی عبارت بھی ملاحظہ کریں جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا خطبہ ہے:

أَنْتُمْ بَايَعْتُمُونِي عَلَى مَا بُوِيَ عَلَيْهِ مِنْ قَبْلِي وَإِنَّمَا الْخِيَارُ لِلنَّاسِ قَبْلَ أَنْ يَبَايَعُوا فَإِذَا بَايَعُوا فَلَا خِيَارَ لَهُمْ۔

یعنی تم لوگوں نے میرے ساتھ اسی بنیاد اور شرط پر بیعت کی ہے جس بنا پر مجھ سے پہلے خلفاء کے ساتھ بیعت کی تھی اور جزا میں نیست کہ لوگوں کو کوئی غلیفہ منتخب کرنے کا اختیار اس وقت تک ہوتا ہے جب تک کسی ایک کی بیعت نہ کریں جب کہیں تو پھر ان کے لیے کوئی اختیار باقی نہیں کہ وہ دوسرا راستہ اختیار کریں۔

تحفہ حسینین : از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

بسمہ استدلال : اگر شوری اور انتخاب ذریعہ انعقاد

خلافت ہی نہ ہوتے تو بیعت کرنے کے باوجود اختیار باقی رہتا کیونکہ بیعت کرنا نہ کرنا اور کسی کو اپنے طور پر نام اور غلیفہ نامزد کرنا نہ کرنا جب دونوں برابر ہوں اور انعقاد خلافت کا دار و مدار ہی نص اور وصیت پر ہو تو پھر جس کے حق میں نص اور وصیت ہوگی دوسرے کی بیعت کر کے بھی اس کی طرف میلان اور رجوع درست ہو گا اور جس کے حق میں نص اور وصیت نہیں ہو گا اس کے خلاف اور اعراض واجب و لازم ہو گا لہذا

واضح ہو گیا کہ انعقاد امامت و خلافت کا ذریعہ شوریٰ اور انتخاب و بیعت ہے اور ایک مرتبہ بیعت کرنے کے بعد اختیار ختم ہو جاتا ہے۔

اسی مضمون کو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ خط و کتابت میں اپنے

بار بار دہرایا۔

أما بعد: فقد علمتما وان كنتما اني لم ارد الناس حتى ارادوني ولم ابايعهم حتى بايعوني وانكم ممن ارادني وبايعني وان العامة لم تبايعني لسلطان غالب ولا لعرض حاضر فان كنتما بايعتما في طائعين فارجعا وتويا الى الله من قريب وان كنتما بايعتما في كارهين فقد جعلتالي عليكم السبيل باظهاركم الطاعة واسراركم المعصية ولعمري ما كنتما بأحق المهاجرين بالتقية والكمثان وان دفعكما هذا الامر من قبل ان تدخلا فيه كان أوسع عليكم من خروجكما منه بعد اقراركما به۔ (نہج البلاغہ مصری ج ۱۲)

اما بعد۔ تم دونوں یقیناً اس حقیقت سے باخبر ہو اگرچہ اس کو چھپاؤ اور اس کا اظہار نہ کرو۔ کہ میں نے لوگوں کی اپنے ساتھ بیعت کرانے کا ارادہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے خود میری بیعت کا ارادہ کیا۔ اور نہ میں نے ان سے بیعت لی جب تک انہوں نے اپنے طور پر بیعت نہ کی۔ اور تم بھی انہیں لوگوں میں سے ہو۔ جنہوں نے میرے ساتھ ارادت کا اظہار کیا۔ اور بیعت کی۔ علاوہ انہیں عام لوگوں نے میرے ساتھ کسی جبر و قہر اور تسلط و غلبہ کی وجہ سے بیعت نہیں کی اور نہ کسی حاضر و موجود سامان لالچ کی وجہ سے لہذا اگر تم نے بھی خوشی اور ذاتی رغبت سے بیعت کی ہے تو واپس آئیے اور فوری طور پر اللہ تعالیٰ کے حضور اس خروج سے توبہ کیجئے اور اگر تم نے بوجہ مجبوری اور ناچار بیعت کی ہے تو بھی تم نے میرے لیے اپنے اوپر مواخذہ اور گرفت کی راہ پیدا کر دی کہ اطاعت ظاہر کی اور دل میں عصیان اور بغاوت کو چھپائے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی زندگانی کی قسم تم دوسرے مهاجرین کی نسبت تقیہ و کتمان کے زیادہ

لائق اور حقدار نہیں تھے کہ ان میں سے کسی کو اس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی صرف قسم دونوں کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس امر خلافت و بیعت کو اس میں داخل ہونے سے پہلے دور کرنا تمہارے لیے زیادہ وسعت اور گنجائش رکھتا تھا نسبت تمہارے اس میں داخل ہو کر اور اقرار و بیعت کر کے پھر اس سے خارج ہونے کے۔
الغرض اس خط سے بھی حقیقت واضح ہو گئی کہ بیعت کرنے اور حلقہ ارادت میں داخل ہونے کے بعد اس کا توڑنا جائز نہیں ہے۔ اور پہلے تو اختیار اور حق خود ارادیت استعمال کیا جاسکتا ہے لیکن بعد میں اس حق کو استعمال نہیں کیا جاسکتا جیسے کہ پہلے بھی یہی مضمون گزر چکا

یعنی اس میں دوبارہ نہ اختیار دیا جاسکتا ہے اور نہ اسے سر نو غور و فکر کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ مقصد بھی نہیں کہ تم بیعت نہ کرتے خواہ دوسرے اہل اسلام کہہ لیتے تو تمہیں اختیار تھا کیونکہ اس کے متعلق بھی واضح ارشاد آچکا کہ بیعت ایک ہی ہوتی ہے جو ماضی و غائب سبھی پر لازم ہو جاتی ہے۔ لہذا مقصد صرف یہ ہے کہ میرے علاوہ کسی دوسرے کو منتخب کر لیتے تو وہ تمہارا حق تھا مجھے اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا تھا لیکن دیگر اہل حل و عقد اور اصحابِ رائے کے ساتھ شامل ہو کر مجھے خلیفہ نامزد کر کے اور بیعت کر کے اب تم اپنی مرضی کرنا چاہو اور نظام خلافت کو درہم برہم کرنا چاہو تو اس کی اجازت قطعاً نہیں دی جاسکتی اور یہی ہمارا اس مقام پر مقصد تھا جو بحدائق واضح ہو گیا۔

فائدہ اس عبارت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیعت کر لی جائے خواہ دل سے نہ بھی ہو۔ لیکن نہ تسلط اور غلبہ کے تحت کی جائے نہ کسی کے لالچ و لاسنے کی وجہ سے تو وہ دل و جان سے ہی بیعت سمجھی جائے گی اس میں یہ عذر قابل قبول نہیں کہ میں نے اوپر اوپر سے بیعت کی تھی۔ دل اور باطن سے نہیں کی تھی۔ کہا قال: فقد جعلنا لی علیکم السبیل کیونکہ احکامِ شرع کا دار و مدار ظاہر پر ہے باطن پر نہیں ہے۔ ورنہ نظام کی درستگی اور اصلاح احوال کی کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ سکتی۔

۱۵ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق میں جبر و اکراہ کے دعویٰ کی لغویت اور رضا و رغبت بیعت کا ثبوت

اسی پس منظر میں یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے خواہ چھ ماہ کے بعد بھی بیعت کی ہو لیکن وہ جبر و اکراہ والی بیعت نہیں ہو سکتی اول تو اس لیے کہ اس شیر خدا کو کوئی مجبور اور بے بس کر نہ سکتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے اگر مجبور کر کے بیعت لینی ہوتی تو ہفتہ بھی نہیں گزرنا چاہیے تھا۔ چہ جائیکہ چھ ماہ گزر نہ جاتے اور قبل انہی آپ کا اس مضمون پر مشتمل خطبہ نقل کیا جا چکا ہے کہ میں نے بیعت سے ہاتھ روک لیا لیکن جب بعض لوگوں کو مرند ہوتے دیکھا تو کہا کہ اگر اہل اسلام اور اسلام کی مدد نہ کر وں تو یہ میرے لیے بہت پریشانی کا موجب ہو گا لہذا خلافت کی خاطر اہل اسلام اور اسلام کو نظر انداز کرنا اور اپنی نصرت و اعانت سے ان کو محروم کرنا بہت زیادہ نقصان دہ ہے۔ تو میں نے ابو بکر صدیق کی بیعت کی اور پھر ان حوادث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور تعاون کیا۔

اور یہی مضمون احتجاج طبرسی میں بھی موجود ہے ”فقال ابو بکر مہلایا ابا الحسن ما نشد فیک ولا نکرہک۔“ مطبوعہ ایران مطبعہ قدیم۔ اے ابو الحسن آہستگی اور نرم روی سے کام لو ہم آپ پر بیعت کے معاملہ میں نہ تشدد کرتے ہیں۔ اور نہ جبر و اکراہ۔ اور اس مضمون کو شرح حدیدی میں با حوالہ بیان کیا گیا ہے عبارات ملاحظہ ہوں۔

(۱) لا والله لا اقبل قولک ولا ابا یعہ فقال له ابو بکر فان لم تبایعنی لم اکرہک فقال له ابو عبیدۃ یا ابا الحسن انک حدیث السن وھؤلاء مشیخۃ قریش قولک، لیس لک مثل تجربۃ ہم ومعرفۃ ہم بالامور ولا اری ابا بکر الا اقوی علی هذا الامر منك واشد احتمالا له واضطلا عاہد الخ۔

غور سے سنو دے عمر بن خطابؓ میں ابو بکر کی بیعت کے متعلق تیرے قول کو قبول کرتا ہوں

اور نہ اس کی بیعت کرتا ہوں تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا اگر آپ میری بیعت نہ کرو تو میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ تو حضرت ابو عبیدہ نے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا اے ابوالحسن آپ نو عمر ہو اور یہ تمہاری قوم قریش کے بزرگ ہیں۔ آپ کو نہ ان جیسا تجربہ ہے اور نہ ان کی مانند امور خلافت و حکومت کی معرفت۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ابو بکر صدیق آپ سے اس امر میں زیادہ قوی ہیں اور اس کے زیادہ متمحل اور حوصلہ رکھنے والے۔ قسملہ ہذا الامر وارض بہ۔ لہذا امر خلافت انہیں کو سونپئے۔ اور اس پر راضی ہو جائیے۔ فانک ان تعش وتطل عمرک فانت لہذا الامر خلیق وبہ حقیقی فی فضلک وقرابتک وسابقتک وجہادک اگر آپ زندہ رہے اور عمر شریف لمبی ہوئی تو تم بھی اس امر کے حقدار اور اہل ہو گے اپنی فضیلت کی وجہ سے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرب کی وجہ سے اور اسلام و جہاد میں سبقت کی وجہ سے۔

شرح حدیثی بحوالہ ابو بکر احمد بن عبد العزیز جوہری ج ۶ ص ۳

(۲) روی احمد بن عبد العزیز: جاء ابو سفیان الى علی علیہ السلام

فقال ولیتم علی ہذا الامر اذل بیت فی قریش۔ اما واللہ لئن شئت

لاما لنہا علی ابی فصیل خیل ورجلا۔ فقال علی علیہ السلام طالما غششت

الاسلام وأہلہ فما ضرتم شیئاً لا حاجة لنا الی خیلک ورجلک

لولا آنا رأینا ابابکر لہا أہلاً لما ترکناہ۔

احمد بن عبد العزیز جوہری نے روایت کی ہے کہ ابو سفیان حضرت علی

رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا تم نے خلافت و امامت کا معاملہ

قریش میں کمزور اور ضعیف گھرانے کے حوالے کر دیا ہے۔ بخور سے سنو اگر آپ چاہو تو

میں مدینہ منورہ کے علاقہ کو ابو بکر کے خلاف اور تمہاری اعانت میں پید لوں اور

سواروں سے بھر دوں تو آپ نے فرمایا تو نے بہت وقار اسلام اور اہل اسلام کے

ساتھ دھوکہ کیا مگر ان کو ذرہ بھر نقصان نہ پہنچا سکا۔ ہمیں تیرے گھڑ سوار و ستوں کی

ضرورت ہے اور نہ پیادوں کی اگر ہم حضرت ابوبکر کو خلافت کے قابل نہ سمجھتے تو ہم خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔ اور اس کو یہ موقعہ ہی نہ دیتے۔

(نوٹ) اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابوسفیان کا خلافت صدیقی کے خلاف یہ اقدام بھی نگاہ مرتضوی میں انہیں سابقہ اسلام کے خلاف سازشوں اور نقصان پہنچانے کی کوششوں میں سے ایک کوشش تھی۔ اگر آپ اس خلافت کو اسلام کے لیے نقصان دہ سمجھتے تو ابوسفیان سے امداد لے کر اس خلافت کو بدل دیتے اور پھر موقعہ پا کر ابوسفیان سے بھی نمٹ لیتے۔ جس طرح بقول شیعہ خلفاء ثلاثہ کے پیروکاروں کو تقیہ کے بل بوتے پر اپنے ساتھ ملائے رکھا اور اس انتظار میں رہے کہ جب میری حکومت و امارت اور خلافت و امامت مستحکم ہو جائے گی تو پھر تقیہ کا نقاب اتار کر ان کو درست کردوں گا اور جب اس طرح کا موقعہ میسر ہونے کے باوجود اس سے فائدہ اٹھانے کا تصور تک نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ آپ خلافت صدیقیہ کو اسلام کے لیے نقصان دہ اور خطرناک نہیں سمجھتے تھے۔ الغرض اس روایت سے بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نگاہ مرتضوی میں امامت و خلافت کے اہل اور نمایان ہونا اور ان کی خلافت پر مطمئن ہونا ظاہر ہے۔

(۳) قال ابوبکر: کان سعید بن خالد بن العاص من عمال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الیمن فلما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاء المدینۃ وقد بايع الناس ابا بکر فاحتبس عن ابی بکر فلم یبايعه ایاماً وقد بايع الناس واثی بنی ہاشم فقال انتم الظہر والبطن والشعار دون الدثار والعصا دون اللہا فاذا رضیتہم رضینا واذا سخطتم سخطنا حدثنونی ان کنتم بايعتم هذا الرجل قالوا نعم قال علی برد ورضاء من جماعتکم قالوا نعم قال فانا رضی ابا بکر اذا بايعتم منہ ج؟ ابوبکر جو پہری نے کہا۔ خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ من پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے عامل اور گورنر تھے جب آپ کا وصال ہو گیا تو وہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے اور لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کر چکے تھے تو انہوں

چند دن تک آپ کی بیعت نہ کی پھر بنو ہاشم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ تم ہی ہمارا سہارا ہو اور پناہ ہو بلا واسطہ قریبی اور عصائے قوت و توانائی ہو نہ کہ چھلکے اور ناقابل اعتماد اگر تم راضی ہو تو ہم بھی راضی ہو جاتے ہیں اور اگر تم اس خلافت و امامت پر راضی نہیں تو ہم بھی اس پر ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے بتلاؤ کیا تم نے بیعت کر لی ہے اس شخص کے ساتھ؟ تو انہوں نے کہا ہاں تو حضرت خالد نے کہا ٹھنڈے دل سے ضمانتی کے ساتھ تم تمام کی طرف سے؟ تو انہوں نے کہا ہاں حضرت خالد نے کہا تو اب میں بھی راضی ہوں اور بیعت کرتا ہوں جبکہ تم نے بیعت کر لی ہے۔

(۳) قال ابو بکر: لما جلس ابو بکر علی المنبر کان علی علیہ السلام والذیر وناس من بنی ہاشم فی بیت فاطمة رضی اللہ عنہا فجاء عمر الیہم فقال الذی نفسی بیدہ لتخرجن الی البیعة أو لأحرقن علیکم البیت فخرج الذیر مصلتا سیفہ فاعتنقہ رجل من الأنصار و زیاد بن لبید فبدر السیف فصاح بہ ابو بکر و هو علی المنبر اضرب بہ الحجر ثم قال ابو بکر دعوہم فسیأقی اللہ بہم قال فخرجوا الیہ بعد ذلک فبايعوہ - ص - ۵۶ - ج - ۲ -

جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ منبر شریف پر بیٹھے یعنی بیعت لینے کے لیے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور بنو ہاشم کے چند افراد بھی حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے گھر میں موجود تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ آئے کہ مجھے اس ذات اقدس کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کہ یا تو بیعت کے لیے نکلے گا یا پھر میں تم پر گھر کو جلا دوں گا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ تلوار سونتے ہوئے نکلے تو ایک انصاری آدمی نے ان کو سینے سے لگا لیا اور زیاد بن لبید نے ان کے ہاتھ سے تلوار کھینچ لی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس کو پتھر پر مار کر توڑ دو پھر فرمایا انکو اپنے حال پر رہنے دو اللہ تعالیٰ عنقریب انہیں میرے پاس لائے گا۔ جوہری کہتے ہیں مسلمہ بن عبد الرحمن نے کہا کہ ان سب نے اس کے بعد بیعت کر لی۔ انفرن جہور محدثین اور ان کے اعیان و اکابر کا مذہب یہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گوتاخ سے بیعت کی لیکن اپنی رضا و رغبت سے کی اور جبر و اکراہ اور تہدید و تشدد

کے قصے شیعہ صاحبان کا انفرادی کارنامہ ہے۔ اور جمہور کے نزدیک ناقابل اعتداد
واعتبار ملاحظہ ہو شرح حدیدی ص ۲۲-ج ۲۔

اما الذی یقولہ جمہور المحدثین واعیانہم فانہ علیہ السلام امتنع من
البيعة ستة اشهر ولزم بيته فلم يبايع حتى ماتت فاطمة علیہا السلام فلما ماتت بايع^{طوعاً}
جو کچھ جمہور اور اکابر محدثین نے کہا وہ یہی ہے کہ آپ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی تھی
اور گھر پر ہی مقیم رہے۔ یہاں تک کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا وصال ہو گیا تو ان کے
وصال کے بعد برضائے و رغبت بیعت کر لی۔ جب جمہور محدثین اور اعیان و اکابر کی
تحقیق یہی ہے اور شان مرتضوی کے شایاں اور لائق بھی یہی ہے اور آپ کے
خطبات سے بھی یہی حقیقت نمایاں اور واضح ہے کہ ایک مرتبہ جس کے ساتھ ادباً
صل و عقد اور اہل الرائے بیعت کریں پھر حاضر و غائب کو وہ بیعت لازم ہو جاتی
ہے اور اس میں نظر ثانی کی گنجائش نہیں رہتی اور انصار میں سے مختلف حضرات نے
بھی آپ کو بقول ابو بکر جوہری یہی جواب دیا کہ اب بیعت کرنے کے توڑی نہیں جاسکتی۔
ابو بکر جوہری کی پہلی روایت جو ہم نے نقل کی ہے اس کے آخر میں ہے۔

فقال بشير بن سعد لو كان هذا الكلام سمعته الانصار منك يا علي
قبل بيعتهم لأبي بكر ما اختلف عليك اثنان ولكنهم قد يبيعوا وانصرف
على الى منزله ولم يبايع ولزم بيته حتى ماتت فاطمة فبايعه ص ۱۲-ج ۶۔
بشير بن سعد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اگر انصار تمہارے یہ کلام ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے
ساتھ بیعت کرنے سے پہلے سن لیتے تو ان میں سے دو شخص بھی تمہارے حق میں
اختلاف نہ کرتے لیکن وہ بیعت کر چکے ہیں لہذا اس کو توڑا نہیں جاسکتا، اور اس کے بعد
حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے گھر کی طرف لوٹے اور بیعت نہ کی اور گھر میں ہی موجود رہے حتیٰ کہ
جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا تو آپ نے بیعت کی۔
۲۔ ابو بکر احمد بن عبد العزیز الجوہری نے ہی نقل کیا ہے۔

عن ابی جعفر محمد بن علی علیہما السلام ان علیاً حمل فاطمة علی حمار

وصار بها ليل الى بيوت الانصار۔ يسألهم النصرۃ وتسألهم فاطمة الانتصار له۔

فكانوا يقولون يا بنت رسول الله قد مضت بيعتنا لهذا الرجل لو كان ابن عمك

سبق إلينا يا بكر ما عد لنا به فقال على أكنت اترك رسول الله صلى الله عليه وسلم

ميتا في بيته لا اجهزه واخرج الى الناس انا زعمهم في سلطانه۔ شرح حدیدی۔ ج ۱۔ ص ۱۰۰۔

حضرت امام باقر کی طرف منسوب کر کے، روایت کی گئی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو گدھے پر سوار کیا اور رات کے وقت ان کو انصار کے

گھروں کی طرف لے گئے ان سے امداد و نصرت کا مطالبہ کرتے تھے اور حضرت زہرا رضی اللہ

عنہا بھی آپ کے لیے ان سے امداد و تعاون کا مطالبہ کرتی تھیں تو انصار کہتے تھے۔

اے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محنت جگر اور نور نظر ہم اس شخص یعنی ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ کی بیعت کر چکے ہیں اگر آپ کا چچا زاد بھائی ابو بکر سے پہلے ہمارے پاس

پہنچ جاتا تو ہم کسی کو ان کے برابر نہ ٹھہراتے اور انہیں کو مقدم رکھتے تو حضرت علی

المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے کہا کیا میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے گھر میں وصال

کے بعد پڑے رہنے دیتا اور آپ کی تجہیز و تکفین نہ کرتا اور لوگوں کے پاس جا کر آپ کی

سلطنت کے متعلق ان سے نزاع و اختلاف کرتا۔

الغرض یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ بیعت کے بعد وہ حضرات اس کو کسی قیمت

پر توڑنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور اس بیعت پر اس قدر مضبوطی سے قائم تھے کہ حضرت

زہرا رضی اللہ عنہا کی سفارش کے باوجود اور ان کے ہاں چل کر جانے کے باوجود انہوں

نے اس سے عدل و انحراف کو جائز نہ سمجھا۔

لمحہ فکر یہ اور فوائد روایت (۱) ان دونوں روایات سے بیعت کو توڑنے کا

عدم جواز تو واضح ہے ہی لیکن مقام غور ہے کہ اگر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ

خود لوگوں کو بیعت توڑنے پر مجبور کرتے رہے ہوں اور ہر قسم کا اخلاقی دباؤ ان پر

ڈالتے رہے ہوں تو حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کے خلاف بیعت توڑنے

کی وجہ سے ناراضگی اور خروج و بغاوت کا الزام اور پھر ان کے خلاف جہاد و قتال کا

کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایات یا روگوں کی تیار کردہ ہیں۔ احتجاج طبرسی کی روایت میں اور جوہری کی اس روایت میں صرف اتنا فرق ہے کہ جوہری نے انصار کی طرف سے اس مطالبہ کے قابل قبول نہ ہونے کی وجہ بھی نقل کی۔ یعنی بیعت کر کے توڑ نہیں سکتے لیکن طبرسی صاحب نے اس پر قلعہ چلا دی۔

باقی مضمون اور الفاظ بالکل ایک ہیں۔ بلکہ طبرسی نے اس میں مزید رنگ یہ بھرا کہ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کا ساتھ لے جانا بھی ذکر کیا۔ اور ہاجرین کے گھروں پر جانے کا بھی ذکر کر دیا۔

(۲) انصار کا بالاتفاق یہ عزم ظاہر کرنا کہ اگر پہلے ہمارے پاس آ جاتے تو ہم آپ کی بیعت کر لیتے لیکن بیعت کرنے کے بعد معذور ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی تصریح اور تنصیص اور نامزدگی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امر خلافت و امامت کے لیے نہیں پائی گئی تھی۔ ورنہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کرتے ہی کیوں۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو صرف قرابت اور خدمات اسلام کی وجہ سے عرض کر رہے ہیں کہ پہلے تشریف لاتے تو تمہارے ساتھ کوئی دوسرا شخص ہماری نظروں میں برابر نہیں ہو سکتا تھا۔ تو حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کیونکر نظر انداز کر سکتے تھے۔ اور اپنے عہد و سپہان کو رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے کیونکر مقدم سمجھ سکتے تھے۔ جبکہ اندر میں صورت بیعت ابوبکر میں دنیوی خسارہ کے ساتھ ساتھ دینی خسارہ بھی تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے میں دین اور آخرت کا نفع اور بھلا و البستہ تھا۔

اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ابن ابی الحدید نے کہا۔ قلت هذا الحديث يدل على بطلان ما يدعى من النص على أمير المؤمنين وغيره الخج. ص ۱۲!

یعنی اگر کسی بھی شخصیت کے حق میں نص وارد ہوتی تو اس کو مقام احتجاج و استدلال میں پیش کرتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی نص انصار یا ابوبکر صدیق اور ان کے معاونین اور مہنواؤں کے سامنے بیان نہیں فرمائی۔ لہذا دعویٰ تنصیص و وصیت بھی

قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ورنہ کون عقلمند ہے جو کسی کی دنیا کے لیے اپنی عاقبت اور آخرت کو تباہ کرے۔

عذر تاخیر :- رہا یہ عذر کہ میں تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر پہلے اس مسئلہ کی طرف کیونکر متوجہ ہوتا تو حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے قطعاً ایسا نہیں فرمایا کیونکہ کون نہیں جانتا کہ یہ صرف مسجد نبوی کے امام اور خطیب کا وصال نہ تھا بلکہ شہنشاہ عرب کا وصال تھا اور حکومت کے معاملات کو ایک لمحہ کے لیے بھی التوا میں رکھنا گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر کوئی حملہ آور ہو جائے۔ باغی اٹھ کھڑے ہوں وغیرہ وغیرہ تو آخر اس کا بند و بست کون کرے گا۔ اس لیے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں باپ کی وفات ہو چکی ہوتی ہے پھر بھی پہلے بیٹے کو مسند پر بٹھاتے ہیں۔ بعد میں اسی کی ذمہ داری اس کی تجہیز و تکفین کا بند و بست کیا جاتا ہے۔ حالانکہ مکمل انتظامی مشینری موجود ہوتی ہے۔ اور جس دور میں سوائے ذات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم ربط و ضبط کی اہل اسلام کے لیے کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ اس دور میں اس مسند کو خالی کیوں کر رکھا جاسکتا تھا۔ لہذا عقل سلیم اور فکر صائب کا تقاضا یہی تھا کہ پہلے جانشین کا انتخاب عمل میں آتا۔

نیز سب سے پہلے یہ مسئلہ کھڑا ہی انصار کی طرف سے ہوا تھا نہ کہ حضرات شیخین رضی اللہ عنہما کی طرف سے اور یہ حضرات تو اس انتشار و افراق کو دور کرنے کے لیے تشریف لے گئے لیکن حالات کا تقاضا یہ ہو گیا کہ فوری طور پر خلیفہ کا چناؤ عمل میں نہ آتا تو دوبارہ فتنہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ اور کچھ بھی ہو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انصار پر یہی حجت قائم کرنی چاہیے تھی کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پہلے نہیں فرما چکے تھے میرے آنے اور تمہیں کہنے کی ضرورت کیا تھی۔ تم نے آپ کے فرمان کو کیوں پس پشت ڈالا اور وہی فرمان ہر اجماع سے مقدم ہے۔

قابل غور :- دنیا میں بے شمار بادشاہتیں قبل از اسلام بھی گزریں اور اسلام کے ظہور کے بعد بھی کیا اس کی مثال کوئی مل سکتی ہے۔ کہ پہلا بادشاہ دوسرے کو

نامزد کرے۔ اور ولی عہد بنائے وصیت اس کے حق میں کرے۔ مگر لوگوں کو پتہ نہ چل سکے کہ کوئی ولی عہد ہے بھی یا نہیں۔ اور کسی کو نامزد کیا گیا ہے یا نہیں۔ اگر دنیوی بادشاہوں کے اعلان کے بعد ایسا نہیں ہوا کہ رعیت نے دوسروں کو خود ہی نامزد کر لیا ہو تو بادشاہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رعایا نے ایسا کیوں کر کیا۔ اور یہ غدار اور بہانہ انہیں کیسے ہاتھ آگیا کہ تم نے خود ہی تاخیر کر دی تھی ورنہ ہم سب پر آپ کو ہی ترجیح دیتے اور تمہیں سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بٹھاتے۔ لہذا ہر نیرو کی طرح عیاں ہو گیا کہ کوئی وصیت اور نص آپ کے متعلق موجود نہیں تھی۔

لایق توجہ :- اسلام سے پہلے بھی شخصی حکومتیں قائم تھیں اور لوگوں کو حق خود ارادیت حاصل نہیں تھا اور اگر اسلام نے بھی یہی طریقہ جاری کرنا تھا اور شخصی حکومت کی بنیاد رکھنی تھی۔ تو پھر لوگوں کے لیے اسلام میں کون سی رغبت ہو سکتی تھی۔ اس لیے یہ حیر مزاج اسلام کے ہی خلاف تھی۔ اور جس انقلاب کے لیے اس پسندیدہ دین کو آخری نبی کے ہاتھ میں دے کر بھیجا گیا تھا یا اس کی روح کے بھی سراسر خلاف تھا اس لیے کسی ایسی شخصی حکومت کی بنیاد رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ورنہ دشمنوں کو یہ شکوک و شبہات پیدا کرنے کا موقع مل سکتا کہ نبوت درسات کا اعلان محض ڈھونگ تھا۔ دراصل حکومت و سلطنت کا حصول اور اسے اپنی اولاد اور خویش و اقرباء کے لیے مختص کرنا مقصود تھا۔ پھر آپ کا رسالت و نبوت کی تبلیغ پر اجماع بھی بایں معنی ثابت ہو جاتا کہ حکومت خود بھی کی اور اولاد و اقرباء کے لیے قیامت تک اس کا بند و بست ہو گیا۔ حالانکہ آپ نے صرف اور صرف یہ مطالبہ فرمایا کہ انا قال تعالیٰ قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة فی القربی۔ کہ میں تبلیغ احکام رسالت پر کسی اجرت کا طلب گار نہیں۔ اگر کوئی چیز تم پر لازم ہے تو وہ یہ کہ میرے قریبوں کے ساتھ محبت کرنا اور مودت و الفت رکھنا۔ اگر خلافت و امامت ہی لازمی تھی تو الا المخلّفة والامامة فی القربی۔ ” بھی کہا جاسکتا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مکہ مکرمہ فتح ہونے پر جلدی وصال پانے کی خبر دے دی۔ اور آخری

تیار کی۔ کما قال تعالیٰ اذ اجاء نصر اللہ والفتح ورأیت الناس یدخنون فی دین اللہ افواجا فصبح یحمد ربک واستغفرہ اللہ کان تو اباً۔
 کیونکہ منہ بدعت حکومت و سلطنت نہیں تھا بلکہ محض تبلیغ احکام رسالت اور اللہ تعالیٰ کی راہ پر لوگوں کو گامزن کرنا تھا۔ جب وہ پورا ہوا تو فوراً اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو پاس بلا لیا تاکہ دامن نبوت و رسالت پر اس اعتراض اور وہم و وسوسہ کی غبار بھی نہ پڑنے پائے کہ حکومت و سلطنت کے لیے ہی سمجھی اہتمام کیا گیا تھا۔ اور دعویٰ نبوت کو ذریعہ حصول بنایا گیا۔

رسالہ مذہب شیعہ، از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

وصیت خلافت کی نفی پر دلائل

دلیل چہارم

ایک شخص نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عرس کیا۔ میں آپ کے ساتھ بیعت کرتا ہوں۔ جواباً شیر خدا رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

لیس ذلک الیکم انما ذلک لأهل بد ر قمن رضوا بہ فہو خلیفۃ کشف الغمہ۔ ص۔ ۲۳۔ سطر۔ ۲۶۔ مطبوعہ ایران۔

یہ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ یہ اہل بد ر حہا جرین و انصار کا حق ہے۔ پس جس پر وہ راضی ہو جائیں وہی خلیفہ ہے۔

اس روایت نے بھی کئی مشکلیں حل کر دیں جو کسی صاحب بصیرت پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

اول یہ کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت ہوتی تو شیر خدا نہ خود وصیت کے خلاف عمل فرماتے ورنہ ہی دوسروں کو اس وصیت کی مخالفت

پر مجبور کرتے۔

دوسرا خلافت کے انعقاد کے لیے اہل بدر کی رائے پر انحصار نہ فرماتے اور خلافت کا انعقاد اس میں منحصر قرار نہ دیتے۔ بلکہ وصیت کا ذکر فرماتے۔ اور اسی کے مطابق عمل ضروری اور لازمی یقین فرماتے۔

تحفہ حسینیہ: از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوتی عفرلہ۔

یہی مضمون دوسرے طرق سے بھی منقول ہے۔ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کا اختلاف و نزاع ہوا۔ تو آپ نے ان کی طرف سے مصالحت کی گفتگو اور بات چیت کے لیے آنے والوں کو فرمایا۔ ”اِنَّ النَّاسَ تَبِعُوا الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارَ وَهُمْ شُهَدَاءُ الْمُسْلِمِينَ فِي الْبِلَادِ عَلَى وَلَا تَهْمُ وَأَمْرَاءُ دِينِهِمْ فَرَضُوا بِي دَبَا يَعُوفِي وَلَسْتُ أَسْتَعْلِ انْ أَدْعُ ضَرْبَ مَعَاوِيَةَ يَحْكُمُ بِيَدِهِ عَلَى الْأُمَّةِ وَيَرْكَبُهُمْ وَيَشَوُّ عَصَاهُمْ۔“ یعنی لوگ مہاجرین و انصار کے تابع ہیں۔ اور وہی مسلمانوں کے لیے ان کے امراء اور والیان امر پر شہود و گواہ ہیں۔ اور وہ سب مجھ پر راضی ہوئے اور انہوں نے میرے ساتھ بیعت کی۔ اور میں یہ حلال نہیں سمجھتا کہ معاویہ جیسے آدمیوں کو چھوڑ دوں۔ اور وہ امت پر حکم چلائیں اور ان کے سروں پر مسلط ہوں۔ اور ان کے اتحاد و اتفاق کو پرانگندہ کر دیں۔

وہ حضرات یعنی عبیدہ سمائی، علقمہ بن قیس نخعی، عبداللہ بن عتبہ اور عامر بن عبدالقیس امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد سن کر امیر معاویہ کے پاس گئے اور آپ کا جواب ذکر کیا تو انہوں نے کہا حقیقت حال اس طرح نہیں ہے۔ آخر ہمارے ساتھ بھی مہاجرین و انصار ہیں۔ وہ کیوں ان کے ساتھ شامل نہیں ہوئے اور ان سے کیوں مشورہ اور رائے طلب نہیں کی گئی۔ فَمَا بَالُ مَنْ هَمَّنَا مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ لَمْ يَدْخُلُوا فِي هَذَا الْأَمْرِ وَيُؤَامِرُوا فِيهِ۔ وہ حضرات پھر امیر المؤمنین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اہل شام کا جواب آپ کو عرض کیا تو آپ نے فرمایا:-

و يحكم انما ذلك للبدرين دون الصحابة، ليس في الأرض بدري
الا وقد بایعنی وهو معی اوقد قام ورضی فلا یغرتکم معاویة من انفسکم
و دینکم شرح مدیدی ج ۴۔ مثلاً انقلاً عن تصرین مزاحم من کتاب الصغیر
افسوس ہے تم پر خلیفہ بنانے کا حق بدری مہاجرین انصار کو ہے۔ نہ کہ تمام مہاجرین و
انصار اور دیگر صحابہ کو اور دوسرے زمین پر کوئی بدری صحابی نہیں مگر اس نے میری
بیعت کی ہے۔ اور وہ میرے ساتھ ہے۔ یا میری مجلس سے اس وقت اٹھا جب کہ
مجھ سے راضی تھا۔ لہذا تمہیں معاویہ اپنے نفوس اور دین میں دھوکہ نہ دے۔ اور
اس کے بہکاوے میں نہ آؤ۔

الغرض آپ کا امامت و خلافت کے انعقاد کے لیے اصحاب بدر اور
بدری مہاجرین و انصار کے اجتماع و اتفاق کو اور ان کے تئوری اور انتخاب کو
معیار حق قرار دینا ظاہر اور واضح ہے۔ اور مسلم حقیقت جس میں چون و چرا کی گنجائش نہیں
ہے کہیں اس حقیقت کو عمومی الفاظ میں بیان فرمایا اور کہیں تخصیص کے ساتھ بیان فرمایا
رضاء صحابہ رضاء خداوند تعالیٰ ہے۔ اور نبی ابلاغتہ کے حوالے سے گزر چکا کہ
حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ان کے اجتماع کو اور کسی شخص کو خلیفہ نامزد کرنا
اللہ تعالیٰ کا فعل اور اس کی رضا قرار دیا گویا جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا مارنا
خدا تعالیٰ کا مارنا "وما رمیت اذ رمیت ولكن الله رمى" آپ کا بیعت لینا
اللہ تعالیٰ کا بیعت لینا ان الذین یبایعونک انما یبایعون الله" اسی طرح
آپ کے صدقہ میں صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لیے یہی اعزاز حاصل ہے کہ ان کا مارنا
اور قتل کرنا اللہ تعالیٰ کا مارنا اور قتل کرنا ہے "فلم تقتلوهم ولكن الله قتلهم"
ان کا بنوا النضیر کی کھجوروں میں سے بعض کو کاٹنا اور بعض کو برقرار رکھنا اللہ تعالیٰ کا
امر اور اس کی رضا قرار پایا۔ "وما قطعتم من لينة أو تركتموها قائمة على أصولها
فبآذن الله" کیونکہ منصب محبوبیت پر فائز ہونے کے بعد بندہ کے افعال انوار محبوبیت
کی بدولت سرزد ہوتے ہیں۔ لہذا وہ اللہ تعالیٰ کا فعل قرار پاتے ہیں۔ "کما فی الحدیث

القدسى كنت سمعه الذى يسمع به ويصوره الذى يبصر به ويده التى
يبطش بها ولسانه الذى يتكلم به وفؤاده الذى يعقل به" یعنی میں ہی اس بندہ
محبوب کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے۔ اور آنکھ ہوتا ہوں جس سے دیکھتا ہے۔ اور
ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے پکڑتا ہے۔ اور زبان جس کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ اور دل و دماغ
جس کے ساتھ سوچتا ہے علی الخصوص جبکہ صرف ایک شخص کا فیصلہ بھی نہ ہو بلکہ اخص الخواص
صحابہ کرام اس میں شامل ہوں تو پھر وہ انتخاب یقیناً اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہوگا۔ اور ان کی
رضا لانہ اللہ تعالیٰ کی رضا ہوگی۔ کیونکہ یہی وہ امت ہے جس کا طرہ امتیاز اور وجہ انفراد
امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لہذا ان کا غیر شرعی امر پر اللہ تعالیٰ کی رضا کے برعکس اور
مخالف امر پر اجماع کیوں کر ہو سکتا ہے؟ کہتم خیر ائمة اخرجت للناس تامرون
بالمعروف وتنہون عن المنکر اور یہی وہ امت ہے جس کی شہادت اور گواہی پر قیامت
کے دن انبیاء و رسل علیہم السلام کے حق میں اور ان کی ائم و اقوام کے خلاف اللہ تعالیٰ
فیصلہ فرمائے گا کما قال تعالیٰ! كذلك جعلناکم امة وسطا لتکونوا شهداء علی
الناس (الآیۃ) اگر دنیا میں اور اپنی امت میں ایک منتظم کے انتخاب میں ان سرِ ایا تقویٰ
اور کامل الایمان حضرات کا قول قابل قبول نہیں اور ان کی شہادت مردود ہے۔ تو
قیامت میں انبیاء و ائم کے معاملہ میں اس کی قبولیت کا تصور کیونکر کیا جاسکتا ہے۔
اور قرآن مجید نے ہی ان کی راہ کو راہ ہدایت قرار دیا اور اس کی خلاف ورزی کو جہنم کا
راستہ۔ اور اسی کا حوالہ حضرت امیر المؤمنین نے بھی دیا: "قاتلوه علی اتباعہ غیر سبیل
المؤمنین و وکالة اللہ ما تولى" اصلہ جہنم و ساءت مصیراً بہذا ثقلین کی شہادت اور ان کا
اتحاد و اتفاق نے واضح کر دیا کہ ان کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ اور ان کی
رضا مندی اور خوشنودی اللہ تعالیٰ کی رضا مندی اور خوشنودی ہے۔ والحمد للہ علی ذلک
مذہب شیعہ۔ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز
الغرض ان ارشادات عالیہ پر کسی قسم کا تبصرہ کرنے اور ان کی تفسیر
تشریح رکھنے اور پڑھنے کی ضرورت نہیں، خلافت کا انعقاد اور خلفاء راشدین کی
خلافت اور اس کا مدلل ثبوت اور مجاہدین و انصار کے متفقہ فیصلے سے خلفاء راشدین

علیہم السلام کی خلافت کا ثبوت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنی خلافت کی حقانیت پر خلفاء سابقین کی حقانیت خلافت کو بطور دلیل پیش کرنا اور مجاہدین و انصار جس شخص کو امام اور امیر بنائیں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کے مطابق اس کا امام اور امیر ہونا اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا یہ حکم دینا کہ جو ایسے امیر کی خلافت کا انکار کرے وہ واجب القتل ہے۔ یہ تصریحات اظہر من الشمس ہیں۔

اب ان تصریحات اور واضح ارشادات کو غلط اور غیر ناشی عن دلیل احتمالات اور نامعقول توہمات کے ساتھ بگاڑنے کی کوشش نہ فرمائی جائے ورنہ حسب تصریح صاحب کشف الغمہ حق سے روگردانی ہی ہوگی۔ اور آفتاب کو مگڑی کے جالے سے روپوش کرنے کی مثال زندہ ہوگی۔

علامہ ڈھکو صاحب کعبہ اور جواب دلائل سے گریز اور فرار

رقبہ علامہ ڈھکو صاحب نے اس فصل میں قائم کردہ دلائل میں سے صرف اس آخری عبارت کے متعلق جواب کی ناکام کوشش کی ہے۔ اور پہلی عبارات کو بالکل مفہم کر گئے اور ڈکار تک نہیں لیا۔ گویا کہ مذہب شیعہ میں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ان کو ذکر ہی نہیں کیا۔ حالانکہ کون نہیں جانتا کہ اصل حامل اہمیت عبارات وہی تھیں۔ اور دوسری عبارات ان کی تائید مزید کے طور پر پیش کی گئی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈھکو صاحب نے عملی طور پر اپنے عجز کا اعتراف کر لیا اور اپنی مجبوری و بے بسی کو تسلیم کر لیا۔ بھلا جوابی کاروائی کا یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ اصل اور اہم دلائل کو نظر انداز کر دیا جائے اور متبعا اور ضمناً ذکر کئے گئے دلائل کا جواب شروع کر دیا جائے۔ بہر کیف اب وہ جواب بدیہ ناظرین کرتے ہیں! اور پھر اس کی لغویت اور بیودگی واضح کرتے ہیں۔

تنزیہ الامامیہ از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

۱۔ شیعان حیدر کرار کا یہ عقیدہ ہے کہ نبی کی طرح امام کا مقرر کرنا بھی خداوند تعالیٰ

کے قبضہ قدرت میں ہے جس طرح تمام دنیا مل کر نبی منتخب نہیں کر سکتی اسی طرح ساری کائنات مل کر امام بھی نہیں بنا سکتی۔ ربك يخلق ما يشاء ويختار ما كان لهم الخيرة۔ اس عقیدہ کی صحت پر پیسوں عقلی و سمعی ابدہ و براہین قائم ہیں۔ لیکن ہم نے یہاں صرف یہ دکھانا ہے کہ مؤلف کشف الغمہ کی جو عبارت نقل کر کے ہمارے عقیدہ کی تردید کرنا چاہی ہے وہ درست نہیں کیونکہ یہ واقعہ اہل سنت کی کتابوں سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ کشف الغمہ ص ۲۳ پر عنوان قائم ہے۔ (قال الخطيب ابوالمؤيد الخوارزمي الخ۔

۲۔ نیز پیر صاحب کو اس قصہ پر اتنا خوش نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے کئی مشکلیں حل کر دیں بلکہ اس نے تو نئی مشکلات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ کیونکہ وہ اگر تسلیم کرتے ہیں کہ خلیفہ سازی کا حق تمام اہل بدر کو ہے تو انہیں خلفاء ثلاثہ کی خلافت سے بھی دست بردار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ ابو بکر صاحب کی بیعت صرف عمر صاحب کے بیعت کرنے سے اور بعض لوگوں کے بیعت کرنے سے عمل میں آئی۔ اور دوسرے صاحب کی بیعت پہلے صاحب کی وصیت سے اور تیسرے صاحب کی دوسرے صاحب کی مقرر کردہ کمیٹی کے رکن اعظم عبدالرحمن بن عوف کے بیعت کرنے سے وجود میں آئی۔ بنا بریں جب پہلی خلافت ہی غلط ثابت ہوئی تو اس سے دوسری خلافتوں کا اعلان روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ص ۹۹، ۱۰۰

تحفہ حسنین از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

الجواب وهو الموفق للصدق والصواب ورفق ريب المراتب

امام کا انتخاب کون کرتا ہے

امرا اول (۱) ڈھکو صاحب کا دعویٰ ہے کہ خلیفہ کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ساری کائنات مل کر بھی کسی شخص کو امام اور خلیفہ نہیں بنا سکتی مگر یہ صرف دعویٰ ہی رہا اور اسی کو حضرت شیخ الاسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات سے باطل فرمایا اور بنیادی مقصد بھی یہی تھا۔ لہذا اس سے پہلو بچانا اور بیخ البلاغت جیسے قرآن ثانی

کی عبارات کو نظر انداز کرنا اور مقام رد و قدح میں ان دلائل کے جواب سے پہلو ہتی کرنا بالکل بے جواز ہے اور اعتراف بجز و قصور کے مترادف ہے۔

۲۔ شیعیان حیدر کر دار کے عقیدہ کا بیان ہمیں مطلوب نہیں اسے دلیل کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ بتلانا مقصود ہے کہ یہ نظریہ غلط ہے۔ اگر محض کسی کا عقیدہ سن کر غلطوئیں رہنا لازم ہے تو ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ ان بندگان خدا سیدہ کا انتخاب اللہ تعالیٰ کا انتخاب ہے۔ لہذا اس پر کسی کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ اور ہماری تردید کا کیا جواز ہے۔

۳۔ ڈھکوصاحب اور اس کی برادری جو دلائل پیش کرتی ہے۔ اس میں ہی خود کائنات کے افراد خاصہ کا انتخاب ہی پیش کرتی ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو فرمایا ”اخلفنی فی قومی“ تم قوم بنی اسرائیل میں میرے نائب اور خلیفہ بنو اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا: ”أنت متنی بمنزلة هارون من موسى“ کہ تم میرے ساتھ وہی نسبت رکھتے ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کے درمیان تھی۔ لہذا دونوں خلفاء کا انتخاب بقول شیعہ برادری کائنات میں سے دو افراد کے ذریعے ہی ثابت ہوا تو اس طرز انتخاب کو کیونکر نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔

۴۔ نبی کا انتخاب بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مگر اس میں تو اختلاف نہیں۔ اختلاف ہے امام کے نصب کرنے میں لہذا مختلف فیہ میں متفق علیہ کا حوالہ دے دینا کوئی علمیت کا مظاہرہ ہے مثلاً اگر کہا جائے شیعہ اور اہل سنت اللہ تعالیٰ کو ایک مانتے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول برحق لہذا خلافت میں بھی کوئی اختلاف نہیں تو کیا یہ طرز استدلال درست ہے۔

۵۔ ڈھکوصاحب نے دبی انداز میں ایک دلیل کی طرف اشارہ کر ہی دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پیدا فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اختیار فرماتا ہے اور ان کے لیے اختیار نہیں ہے اس میں خلافت و امامت کے اختیار کی تو بات ہی نہیں ہے۔

یہاں تو تخلیق باری تعالیٰ کے انفراد اور کیفیتِ خلق اور کمیت و احوال و اطوار و اوصاف میں اس کے استقلال کا بیان ہے اور ان امور میں مخلوق کے اختیار کی نفی نہ کہ مطلق اختیار کی نفی۔ ورنہ بندوں میں اختیار ہی نہ ہو تو ان کو ایمان اور اعمال صالحہ کا پابند کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اور اعمال سیئہ سے دور رہنے کا پابند کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کو پیدا کرنے کے بعد صرف امام منتخب کرنے کا اختیار رہتا ہے دوسرا کوئی اختیار نہیں؟ اور مخلوق میں صرف امام منتخب کرنے کا اختیار نہیں باقی سب اختیار ہیں اگر ذرہ بھر عقل اور دیانت کسی میں ہو تو وہ اپنی اس دلیل پر ہزار بار روئے کہ ہماری برادری کیسے لغو اور یہودہ استدلال پیش کرتی ہے تمام عقلاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ثبوت اعم سے ثبوت اخص لازم نہیں آتا۔ جس طرح کسی شے کے انسان ثابت ہو جانے سے اس کا عقلمند ہونا ثابت نہیں ہو جاتا چہ جائیکہ مؤمن ہونا اسی طرح اللہ تعالیٰ کے با اختیار ہونے سے یہ لادم نہیں آتا کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کرنے میں ہی با اختیار ہے۔ اور مخلوق سے صرف اس انتخاب کی ہی نفی ہے۔ دوسرے جملہ اور قسمی اختیارات ان کے لیے ثابت ہیں اور مسلم۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نیابت کے لیے حضرت ہارون علیہ السلام کو منتخب فرمانا قرآن مجید سے ثابت سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوہ تبوک کے موقع پر خلفائے ثلاثہ کو ساتھ لے جانے کا اختیار اور خلیفہ رابع کو مدینہ منورہ میں نائب بنانے کا اختیار کہاں سے آگیا اور موسیٰ علیہ السلام جن ستر افراد کو اپنے ہمراہ طور کی طرف لے گئے تھے۔ ان کا اختیار اور ان کا انتخاب کس نے کیا تھا؟ قال تعالیٰ: **وَاخْتَارَ مُوسَىٰ قَوْمَهُ سَبْعِينَ مِائَةً** موسیٰ علیہ السلام ہی تھے جنہوں نے ان کا انتخاب فرمایا۔ پھر قرآن مجید نے مطلقاً اہل ایمان سے اختیار کی نفی نہیں فرمائی بلکہ اس کو مقید اور مخصوص ٹھہرایا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول حکم دے تو پھر وہ اپنے اختیار کو بروئے عمل نہیں لاسکتے نہ کہ مطلق ارشاد باری تعالیٰ ہے **مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا لِمُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَىٰ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ** لہذا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا جہاں حکم اور قضا وارد

نہ ہو تو وہاں اختیار کی بالکل نفی نہیں ہے بلکہ اسلوب کلام اور اندازہ بیان سے اس مورد اور محل و مقام کے ماسوا میں اسی آیت کریمہ سے اختیار ثابت ہو گیا اور چونکہ حاکم کا منتخب کرنا افعال مکلفین سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں اشخاص کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں اور نہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لہذا اس میں اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ بندوں کو اختیار حاصل ہے گو یا یہ ہماری دلیل بن گئی برعکس زعم شیعہ کے۔

۴۔ حضرت امام حسن عسکری کے بعد اللہ تعالیٰ کا منتخب تو دنیا پر نہ ظاہر ہوا نہ اس نے امت کے امور کی دیکھ بھال کی اور مخلوق کو حق اختیار و انتخاب ہے نہیں تو اس عرصہ میں نظام امت ظہور مہدی علیہ السلام تک کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ شہنشاہیت کی صورت میں یا حق خود ارادی کی صورت میں شہنشاہ کا تقرر کون کرے گا یا حاکم وقت کا انتخاب کون کر سکتا ہے اور اب تیرھویں امام یعنی خمینی صاحب کے دور میں انتخاب اور طریق اختیار اپنانے کا کیا جواز ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ”ماکان لہم الخیرۃ“ اہل ایران کے لیے نہیں ہے صرف صدر اول اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کے لیے تھا۔

بریں عقل و دانش بیاید گریست

۵۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ہر وقت ہر جگہ اور ہر ایک کے سامنے اپنے حقانیت خلافت کی یہی دلیل دہرائی کہ میں مہاجرین و انصار کا منتخب ہوں۔ اور جن حضرات نے خلفائ ثلاثہ کا انتخاب کیا تھا میرا انتخاب کرنے والے بھی وہی ہیں اور جن انصار نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ہر اخلاقی دباؤ کے باوجود تعاون سے معذوری ظاہر کی اور صاف جواب دیا تو ان کا موقف بھی یہی تھا کہ وہ ہمارے ہی منتخب ہیں۔ اور ہم نے ان کے ساتھ بیعت کر لی ہے۔ کیا اس دور میں یہ آیت نازل نہیں ہوئی تھی۔ یا جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا ان کو اس کا ترجمہ نہیں آتا تھا۔ یا جس معلم کتاب کو تعلیم کتاب و حکمت کے لیے مبعوث فرمایا گیا تھا انہوں نے اس بات کی تشریح نہیں کی تھی۔ اور

اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کوئی کسر چھوڑ دی تھی۔ العیاذ باللہ
 ڈھکوسا صاحب صحابہ کرام علیہم الرضوان کے ساتھ بغض یہود و عیسٰی کو ہونا
 چاہیے ان کو جتنی تکلیف ان سے پہنچی اس کا واقعی تقاضا یہی ہے۔ لیکن مسلمان کھلانے
 والوں کو اور محب اہل بیت ہونے کے مدعیوں کو اتنا بغض کیوں ہے کہ قرآن میں تحریف
 سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ اور حقائق و واقعات کو بھی ایک نظر دیکھنے کی زحمت گوارا
 نہیں کی جاتی۔ جس طرح مجھ کے آدمی کو سورج بھی روٹی معلوم ہوتا ہے ڈھکوسا صاحب
 کو بھی جہاں اختیار کی نفی نظر آئے وہیں انتخاب خلیفہ کے اختیار کی نفی ہی معلوم ہوتی ہے۔
 اگر یہاں افراد کا غلو ق میں سے انتخاب بھی مراد لیا جائے تو اس سے مراد
 رسل کرام علیہم السلام کا انتخاب اور منصب نبوت کے لیے نامزد کرنا مراد ہے یعنی یہ
 انتخاب لوگوں کے بس میں نہیں جیسا کہ تفسیر مجمع البیان میں شیعہ کے مستند مفسر طبرسی
 نے ذکر کیا ہے ملاحظہ ہو حصہ ۲۶۲ جلد ۴۔ لہذا محل نزاع میں اس کو پیش کرنے کا کوئی
 حوالہ نہیں ہے۔ نیز جن کو اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے وہ خود ہی اعلان کرتے ہیں۔
 اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پھر کیوں
 اعلان نہ فرمایا اور کیوں نہ اپنے موقف پر قائم رہے۔ دوسرے خلفاء کے ساتھ ملافت
 اور سازگارگی کا پھر کیا مطلب تھا؟ کسی پیغمبر خدا نے بھی اس طرح مخالف قوتوں کے
 ساتھ ہمنوائی فرمائی اور اپنے دعویٰ کو ترک کر کے ان کا ساتھ دیا۔ جب نہیں اور یقیناً
 نہیں تو پھر اس استدلال کی لغویت اور بیودگی روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

۸۔ علاوہ انہیں حضرت امام رضا رضی اللہ عنہ کو باموں الرشید نے خلافت دینا چاہی
 تو لینے سے انکار کر دیا۔ بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور فتویٰ و قضاء کا
 منصب نبھانے سے بھی انکار کر دیا۔ البتہ اس کا ولی عہد بننا قبول فرمایا تو
 ذرا اس راز سے بھی پردہ اٹھا دو کہ اللہ تعالیٰ امامت و خلافت کے منصب
 کے لیے منتخب کرے مگر اللہ کا منتخب امام و خلیفہ خود بھی دعویٰ نہ کرے اور
 لوگوں کو اپنی طرف نہ بلائے۔ اور صاحب اختیار اور حاکم وقت تفویض کرے

تو بھی قبول نہ کرے یہ کیسی امامت و خلافت ہے؟ پھر فکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا جو ہر عالم بلکہ مسلمان کا فریضہ ہے اس سے بھی معذرت کر دیں۔ آخر ایسا امام مقرر کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ جو صرف امتی ہونے کے تقاضوں پر بھی پورا نہ اتر سکے پھر اسی ماموں کی ولی عہدی کو قبول کر لیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کے علاوہ جب کوئی انتخاب اور اختیار و پسند کا حق نہیں رکھتا تھا تو ماموں کو یہ حق کیونکر مل گیا امام رضا نے اس کا یہ اختیار کیونکر تسلیم کر لیا۔

۹۔ ہر کھلا امام پہلے امام کی وصیت سے امام بنا اگر مخلوق کا یہ معاملہ ہی نہیں اور نہ ان کے ہاتھ میں اس طرح کا اختیار ہے تو سابقہ اماموں کو وصیت کرنے کی ضرورت کیوں پڑی۔

۱۰۔ نیز ہر امام کے دور امامت میں ان کے اہل بیت ہی مقابلہ میں دعویٰ امامت کرتے رہے ہیں کیا ائمہ کرام نے خود اپنے فرزندوں اور اقرباء کو بھی یہ مسئلہ نہیں سمجھا یا تھا حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے دور میں حضرت محمد بن حنفیہ نے امامت کا دعویٰ کیا۔ حضرت امام باقر اور امام جعفر صادق کے دور میں حضرت زید، حضرت ابراہیم اور حضرت محمد نفس زکیہ نے امامت کے دعویٰ کئے علیٰ ہذا القیاس کیا اہل بیت کو بھی اس آیت کی تشریح معلوم نہیں تھی۔ یا وہ بھی العیاذ باللہ مرتد ہو گئے تھے۔

۱۱۔ امام حسین رضی اللہ عنہ بذات خود خاموش تھے اور کوئی دعویٰ امامت کا نہ فرمایا۔ کوئیوں نے خط و کتابت شروع کی تو آپ وہاں جانے اور امامت و خلافت سنبھالنے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ کیا اس کی بھی کوئی نظیر مل سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ خاموش رہے۔ اور نہ دعویٰ کرے نہ منصب کے تقاضے پورے کرے۔ اور لوگ دعوت دیں تو منصب کا اظہار بھی کرے اور امور مملکت سنبھالتے کے لیے تیار بھی ہو جائے۔ کیا پیغمبر ان کرام کا بھی یہی دستور رہا ہے؟

۱۲۔ امام حسن رضی اللہ عنہ نے امور سلطنت اور انتظامی معاملات امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے سپرد کر دیئے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ امور سنبھالنے کے لیے منتخب فرمایا تھا اور پابند کیا تھا۔ تو انہوں نے اس کا خلاف کیوں کیا اور اگر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ امور اپنے تصرف میں رکھنے کا پابند نہیں فرمایا تھا تو پھر اختیار کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ٹھہرانا باطل ہو گیا۔ اور خلیفہ و امام کا انتخاب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں منحصر کرنا درست نہ رہا۔ اور اگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے اذن سے امیر معاویہ کو یہ امور سونپے تو پھر وہ عند اللہ امام کیوں نہ قرار پائے اور العیاذ باللہ ان کا ایمان بھی مشکوک کیونکر رہا۔

۱۳۔ حضرت مہدی علیہ السلام کو امامت دے کر اللہ تعالیٰ نے چھپ جانے کا حکم دیا۔ تو مخلوق کی بھلائی اور بہتری جو بقول شیعہ اللہ تعالیٰ پر فرض اور واجب ہے اس کی ادائیگی نہ پائی گئی اور اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تو امام کا فرض منصبی کی ادائیگی سے گریز لازم آگیا۔ اگر نبی و رسول فرض منصبی ادا نہ کرے تو نبی و رسول نہیں رہ سکتا۔ کہا قال تعالیٰ "یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک فان لم تفعل فاعرف انک رسول اللہ" اے رسول جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کر دو۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی رسالت کو ادا نہیں کیا جو امام اپنا منصبی فرض ادا نہ کرے وہ امام کیونکر رہ سکتا ہے اور پھر وہ غار میں بیٹھ کر انتظار کس کا کر رہے ہیں مرید بڑھنے کا تو کیا پیغمبر بھی اس طرح کرتے تھے یا کفر اور گمراہی کے بڑھنے کا تو ماشاء اللہ اب تو شیعہ صاحبان نہ یاد ہو رہے ہیں۔ اور خمینی صاحب نے ہدایت خلق کی ذمہ داری سنبھال رکھی ہے۔ پھر امید ہی ختم کر دینی چاہیے۔

۱۴۔ جسے اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا وہ لوگوں سے ڈر کر خاموش ہو گیا اور روپوش اور جسے لوگوں نے امام مانا وہ ڈنکے کی چوٹ روس اور لہر کی جیسی سپر طاقتوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ اور کسی مخالف قوت کو خاطر میں

نہیں لاتا۔ اندریں حالات اللہ تعالیٰ کے انتخاب کا مخلوق کے حق میں مفید ہونے کے بجائے مخلوق کا اپنا انتخاب ہی مفید رہا۔ ورنہ کہو کہ اب اسلام نہیں کفر پھیل رہا ہے۔ اور خمینی صاحب کی امامت تسلیم کرنا کفر اور گمراہی ہے۔ ۱۵۔ اگر اس وقت روحانی امامت حضرت مہدی کے پاس اور ظاہری حکومت خمینی کے پاس ہو تو کوئی حرج نہیں تو صدر اول اور دوم صحابہ میں اس کو کفر و اسلام کا معاملہ قرار دینا کیونکر درست ہو سکتا ہے۔ پس روحانی امام کا تقرر اللہ تعالیٰ کرے اور حاکم کا بندے کر لیں تو اس میں نزاع و اختلاف کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔

الغرض شیعہ صاحبان کے پاس اس پر قطعاً کوئی دلیل نہیں کہ نظام ملک اور امور سلطنت سنبھالنے کے لیے خلیفہ اور حاکم کا تقرر صرف اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے اور مخلوق اس میں دخل دینے کی مجاز نہیں ہے اور یہ ڈھکوسل صاحب اور ان کی برادری کا خالی دعویٰ ہے جس کو واقعہ اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اس کے چناؤ اور انتخاب کا اہل حل و عقد اور اصحاب رائے کے سپرد ہونا حضرت مولائے مہدی اور ابولائمہ رضی اللہ عنہ کے واضح اور صریح ارشادات سے ثابت ہو چکا جس کے بعد چون و چرا کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اسی لیے ڈھکوسل صاحب نے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے پیش کردہ دلائل کا جواب نہ دیا اور نہ ہی ان کا جواب دیا جاسکتا۔

خطیب خوارزم کون ہے

۱۔ ڈھکوسل صاحب فرماتے ہیں کشف الغمہ کی روایت چونکہ خطیب ابوالموید خوارزمی سے منقول ہے اور وہ سنی ہے۔ لہذا شیعہ کے خلاف محبت نہیں تو آپ اپنے وزیر باتدبیر اربلی صاحب سے پوچھیں کہ انہوں نے یہ لکھی کیوں ہے؟ شیعہوں کو سنی بنانے کے لیے یا سنیوں کو شیعہ بنانے کے لیے بیان حقیقت کے لیے یا اہل سنت کو الزام دینے کے لیے آخر کوئی فائدہ اس کے لکھنے کا ہے بھی۔ وہ جو کہتے ہیں میں نے سب کے ہاں مقبول بنانے کے لیے اور سب کی رائے کے موافق بنانے کے لیے یہ روایات

درج کئے ہیں تو پھر اس کو قبول کر دو اور اس کے مطابق عقیدہ رکھو یا پھر کہو کہ وزیر صاحب بذمہ سیر تھے۔ اور یخ مار تے رہے ہیں۔ اور فنون وقت اور روپیہ برباد کرتے رہے ہیں۔

۲۔ ہم نے قبل ازیں بھی ذکر کیا ہے اور پھر عرض کئے دیتے ہیں کہ یہ خطیب صاحب دراصل آپ کے ہیں اور تم نے دھوکہ یہ دیا ہوا ہے کہ شیعہ امامیہ کے علاوہ شیعہ فرقوں کے مصنفین کی کتابوں کو سنیوں کے کھاتے میں ڈال کر حوائے دے دیتے ہو۔ حالانکہ تمہارا ہی آدمی ہوتا ہے۔ مگر بارہ امامی نہیں ہوتا تو ازراہ تقیہ اس کو سنی کہہ دیا کرتے ہو۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ نے تحفہ اشاعہ شریعہ ص ۱۷ پر فرمایا کید بست و سوم۔ آنکہ شخصے از علماء زیدیہ و بعضے فرق شیعہ غیر امامیہ اشاعہ شریعہ نام برہند اول در حال او مبالغہ نمایند کہ وے از متعصبان اہل سنت است بگو بعضے از ایشان گویند کہ او از اشد نواصب بود بعد از ازاں وے نقل کنند کہ دلالت بر بطلان مذہب سنیان یا تائید مذہب امامیہ اشاعہ شریعہ نماید تا امام اخطب خوارزم کہ زیدی غالی است۔ خلاصہ مقصود یہی ہے کہ خطیب خوارزم زیدی اور غالی شیعہ ہے۔ لہذا اس سے انکار کرنا اور اسے اہل سنت کے کھاتے میں ڈالنا ہی غلط ہے۔ لہذا ڈھکوصاحب کا یہ جواب بھی اپنی عجوبہ ری اور بے بسی کا عملی اعتراف ہے؟ نیز صاحب کشف الغمہ کا طریقہ کار قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے اس سے بھی ڈھکوصاحب کی راہ فرار مسدود ہو کر رہ جاتی ہے۔

امرثانی — خلفا ثلاثہ کی بیعت کرنے والے کون تھے

ڈھکوصاحب نے خلیفہ ثانی کو ایک فرد کا انتخاب اور خلیفہ ثالث کو شورائے کمیٹی کے افراد میں سے صرف عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتخاب قرار دے کر اس روایت کی رو سے ان کی خلافت کا عدم قرار دینے کی سعی فرمائی ہے۔ اور حضرت صدیق کی خلافت کو صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور معدودے چند آدمیوں کا

انتخاب قرار دے کر اسے بھی کالعدم کرنا چاہا ہے؟ مگر ڈھکوسل صاحب یہ تو حضرت مولائے مرتضیٰ سے دریافت کرنے والی بات تھی کہ جب ہاجرین و انصار نے تینوں خلفاء کی بیعت کی تھیں تھی تو تم نے کیوں فرما دیا کہ میرے ساتھ انہوں نے بیعت کی ہے جنتوں تے ابوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیعت کی۔
 مٹی۔ اسی لیے نبج البلاغہ کی وہ عبارت بغیر جواب دیئے چھوڑ دی تھی کہ وہ سانپ کے منہ میں پھپھوند رہ کر نہ رہ جائے۔ لہذا آنکھیں بند کر کے نکل جاؤ گویا اس کتاب میں اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔

علامہ صاحب اس کو پھر ذرا غور سے پڑھو اور عینک لگا کر پڑھو یا لگی ہو تو شیشہ بدلو کر پڑھو وہاں لکھا ہے ”انہ با یعی القوم الذی با یعوا ابابکر و عمر و عثمان علی ما یعہم علیہ“ میرے ساتھ اسی قوم نے بیعت کی ہے جس قوم نے ابوبکر، عمر اور عثمان کے ساتھ بیعت کی تھی۔ آپ کی لغت میں قوم کس کو کہتے ہیں؟ نیز بقول صاحب احتجاج طبری حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جن ہاجرین و انصار کے گھروں پر خود رات کو چکر لگاتے رہے اور العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ حضرت زہراء کو بھی گدھے پر سوار کئے اور حسنین کو بھی ساتھ لے کر امداد کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ کس کے ساتھ تھے اور انہوں نے کیوں آپ کے سامنے معذوری ظاہر کی؟ آخر ایمان و امانت نام کی کوئی شے آپ کے ہاں نہیں رہ گئی اور دین و دیانت بالکل رخصت ہو چکے ہیں۔ کہ اس طرح دھاندلیوں پر اتر آئے ہو۔

حقیقت حال۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کا آغاز کیا نہ کہ صرف وہی بیعت کرنے والے تھے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام خلافت کے لیے تجویز فرمایا اور بیعت سب ہاجرین و انصار نے کی تھی۔ اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا نام تجویز فرمایا اور بیعت کا آغاز کیا ورنہ بیعت کرنے والے سبھی ہاجرین و انصار تھے حتیٰ کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی ان میں شامل تھے جیسے تصریحات گزر چکی ہیں لہذا آغاز کو انجام قرار دیدینا اور بیعت کرنے والوں کو

ایک ایک فرد میں منحصر کر دینا دن دھاڑے چوری کرنے کی ناکام کوشش ہے اور دیانت و امانت کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دینے کا بین ثبوت۔

نیز حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود شوری کیٹی میں شامل ہوئے جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا عملی اقرار اور اعتراف واضح ہو گیا۔ کیونکہ جب وہ بھی امام اور خلیفہ نہیں تھے تو ان کو بالواسطہ یا بلا واسطہ بعد والے خلیفہ کے انتخاب کا بھی کوئی حق نہیں تھا۔ لہذا آپ کا اس میں شامل ہونا ہی غلط تھا۔ اور اپنی خلافت کے دعویٰ سے دست برداری کے مترادف اور اگر وہ شمولیت صحیح تھی اور یقیناً صحیح تھی تو آپ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو تسلیم کرنا بھی ثابت ہو گیا۔ بلکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت کو بھی تسلیم کرنا کیونکہ آپ کو حضرت صدیق نے ہی نامزد فرمایا تھا لہذا آپ کی خلافت کا صحیح ہونا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے صحیح ہونے کے مترادف ہے۔ اور اسی سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آپ کے نزدیک درست ہونا بھی واضح ہو گیا کیونکہ اکثریت کا فیصلہ تسلیم کرنا واجب لازم تھا۔ ورنہ کمیٹی کے مشور کی خلاف ورزی لازم آجاتی اور جب اس میں شمولیت کر لی تو پھر مخالفت کا حق ہی ختم ہو گیا۔ لہذا یہ حقیقت تسلیم کر نی فرض و لازم ہے کہ آپ نے اکثریتی فیصلہ کو تسلیم کیا اور یہی عثمان ذی النورین کی صحت خلافت کی ضمانت ہے۔ لہذا حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عمل ہی تینوں حضرات کی خلافت کی صحت اور حقانیت کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔ جب امام اول کا عمل اور کردار اور ان کا نظریہ ان کی خلافت کے متعلق یہ ہے تو پھر چھینے چلانے اور ان حضرات کی خلافت کو دوسروں کی طرف منسوب کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی خلافت ان کی خلافت کی فرع ہے۔ وہ صحیح تو یہ صحیح اور وہ العیاذ باللہ غلط ہے تو یہ بھی غلط ہے اور یہی حقیقت حضرت مرتضیٰ کے ان ارشادات اور مشوروں سے ظاہر ہے۔ جو ابھی حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے قلم سے ذکر کئے جا رہے ہیں۔

حقانیت خلافت فاروق اور مشورہ مائے مرضی رضی اللہ عنہما

دلیل اول :-

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا عقیدہ اور نظریہ جو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے متعلق تھا بہت کچھ واضح ہو چکا ہے تاہم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مزید ارشادات اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیں اور مزید اطمینان قلب حاصل کر لیں۔
 نبج البلاغہ میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے غزوہ روم کے موقع پر مشورہ طلب کرنے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ دینے کا جن الفاظ میں تذکرہ کیا گیا ہے اس کا مطالعہ فرمائیں نبج البلاغہ خطبہ ۱۲۸ نبج البلاغہ مصری جلد اول ص ۳۱۔

قَدْ تَوَكَّلَ اللَّهُ لَاهِلِ هَذِهِ الدِّينِ بَاعِزًا زَاهِرًا وَسِتْرًا عَوْرَةً وَالَّذِي نَصَرَهُمْ وَهُمْ قَلِيلٌ لَا يَنْتَصِرُونَ مُنْعِمٌ وَهُمْ قَلِيلٌ لَا يَمْتَنِعُونَ حَتَّى لَا يَمُوتَ أَنْتَ مَتَى تَسِرْ أَوَّلِي هَذَا الْعَدُوِّ بِنَفْسِكَ وَتَلْقَمَ بِشَخْصِكَ فَتُكَبِّ لَا تُكِنِّ لِلْمُسْلِمِينَ كَانْفَقَ دُونَ أَقْصَى بِلَادِهِمْ وَلَيْسَ بَعْدَكَ مَرْجِعٌ يَرْجِعُونَ إِلَيْهِ فَا بَعَثَ إِلَيْهِمْ رَجُلًا مُجَرَّبًا وَاحْضَرَهُ مَعَهُ أَهْلَ الْبِلَاءِ وَالنَّصِيحَةِ فَإِنْ أَظْهَرَ اللَّهُ فَذَلِكَ مَا تُحِبُّ وَإِنْ تَكُنِ الْآخِرَى كُنْتَ رَدًّا لِلنَّاسِ وَمِثَابَةً لِلْمُسْلِمِينَ۔

اللہ تعالیٰ نے اس دین والوں یعنی مسلمانوں کو غلبہ دینے اور ان کی عزت کی حفاظت فرمانے کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔ وہ ذات جل و علا جس نے مسلمانوں کو ایسی حالت میں فتح و نصرت عطا فرمائی کہ مسلمان قلیل تعداد میں تھے اور قلت تعداد کی وجہ سے بظاہر فتح نہیں حاصل کر سکتے تھے اور ان کے دشمنوں کو ایسی حالت میں ان سے دور فرمایا کہ اہل اسلام بوجہ قلت تعداد ان کو دور نہیں کر سکتے تھے وہ ذات اقدس زندہ ہے نہ فوت ہوئی ہے نہ ہوگی آپ اگر بذات خود دشمن کی طرف جائیں اور اس کے خلاف جنگ میں شرکت کریں اور ایسی حالت میں آپ شہید ہو جائیں تو پھر روئے زمین پر مسلمانوں کا کوئی آسرا اور ان کی کوئی جائے پناہ نہ ہوگی آپ کے بعد ان کے لیے کوئی ملجاء و مأویٰ باقی نہیں رہے گا جس کی طرف مسلمان رجوع کر سکیں اور اس کے ساتھ

پناہ لے سکیں۔ آپ کوئی تجربہ کار آدمی دشمن کی طرف روانہ فرمادیں اور اس کے ساتھ جنگ آزمودہ لشکر بھیجیں پس اگر اللہ تعالیٰ نے فتح نصیب فرمادی تو آپ کا عین منشا یہی ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ دوسری بات ہو گئی تو آپ کی ذات تو مسلمانوں کی ملجا و ماویٰ اور ان کے لیے آسرا اور جائے پناہ موجود ہوگی۔

ہے کوئی اہل تشیع کے مذہب میں نبج البلاغہ سے زیادہ معتبر کتاب؟ جس کی تصریحات پر اہل تشیع کا اطمینان ہو سکے۔ برادران وطن اچھی طرح حضرت مولائے مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ابرشادات کا مطالعہ فرمائیں اور اس کے بعد اگر یہی ثابت ہو کہ جن ہستیوں کی خیر مولیٰ علی منار ہے ہیں جن کو مسلمانوں کا ماویٰ و ملجا قرار دے رہے ہیں۔ جن کو اہل اسلام کا آسرا اور جائے پناہ بیان فرما رہے ہیں، جن کے بعد مسلمانوں کو بے آسرا اور بے یار و مددگار یقین فرما رہے ہیں ان کی خلافت راشدہ سے پھر انکار کیوں! ان کی شان اقدس میں سب و شتم کا کیا معنی؟

ہاں اگر یہود و نصاریٰ اور مجوسی ان کی شان اقدس میں سب و شتم کریں تو ان کا حق تھا کیونکہ وہ دشمنان اسلام ہیں ان کی سلطنتوں کو دولت فاروقی نے تباہ و برباد کر دیا ان کے گرجوں کو مسجدوں میں تبدیل فرمایا۔ ان کے آتش کدوں کو ٹنڈا کیا، ان کے تمام تر دبدبے اور ہیبت کو اسلام کی چوکھٹ کے آگے سرنگوں فرمایا لیکن مسلمان زادوں کو یہ حق کہاں پہنچتا ہے کہ شیر خدا کے نظریہ کے برعکس، تاریخ عالم کی شہادت کے برخلاف صرف چند روزہ آزادی اور عشرت سے مست ہو کر اپنے بزرگوں اور پیشواؤں کا مذہب چھوڑ کر مقتدایان اسلام کے حق میں سب و شتم شروع کر دیں۔

(رسالہ مذہب شیعہ ص ۵۳ تا ۵۵)

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

تحفہ حسینیہ

بقول مؤرخ طبری وغیرہ یہ صلاح و مشورہ اس وقت کیا گیا جبکہ مسلمان لشکر کے کمانڈروں یعنی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح اور حضرت شرجیل بن حسنہ وغیرہ رضی اللہ عنہما بیت المقدس کی فتح میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے۔ اور انہوں نے

امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے استمداد اور استعانت کی تھی اس موقع پر خود آپ نے وہاں جانے کا فیصلہ کیا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ اس وقت انہوں نے کہا "لا تخرج بنفسك انك تريد عدواً کلباً" آپ خود تشریف نہ لے جائیں آپ عداوت میں حد سے متجاوزہ اور حید ساز دشمن کی طرف جارہے ہو (خدا نخواستہ اس کی عداوت سے اہل اسلام آپ جیسے امیر اور امام سے محروم نہ ہو جائیں) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "انی ابادر بجهاد العدو وموت عباس بن عبدالمطلب انکم لو فقدتم العباس لا تنتقض بکم الشر ينتقض الحبل شرم حدیدی جلد ۸ ص ۲۹ میں حضرت عباس بن عبدالمطلب کے وصال سے پہلے پہل دشمن کے ساتھ جہاد کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جب تم ان کو نہ پاؤ گے شر و فساد تمہارے اندر ٹوٹ پڑے گا جیسے کہ رسی ٹوٹ کر ہر دھاگہ علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور آپ کا وصال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت کے چھٹے سال ہوا اور اس کے بعد اہل اسلام میں شر و فساد اور بے سکونی و بے اطمینانی کا آغاز ہو گیا۔ الغرض حضرت فاروق رضی اللہ عنہ، خود تشریف لے گئے اور بغیر جنگ کے اللہ تعالیٰ نے فتح دے دی کیونکہ عیسائی علماء و رہبان اور قسین کو معلوم تھا کہ اہل اسلام کا ایک خلیفہ جس کا نام میں حروف پر مشتمل ہو گا وہ بیت المقدس کو فتح کرے گا۔ چنانچہ اس علاقہ میں موجود امراء اسلام کے نام دریافت کرتے تو کہتے یہ اس علاقہ اور شہر کو فتح نہیں کر سکتے بالآخر جب آپ تشریف لے گئے تو انہوں نے خود بخود شہر کے دروازے کھول دیئے اور جزیہ دے کر دعایا میں داخل ہو گئے۔

فوائد (۱) اس خطبہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "قَدْ تَوَكَّلَ اللَّهُ لَا هَلْ هَذَا الدِّينَ بِاعْزَازِ الْحَوْزَةِ وَاسْتِزَالِ الْعُورَةِ" اور بعض روایات میں قد تکفل۔ بھی وارد ہے پہلی صورت میں وکیل اور کارساز ہونا مراد ہوا اور دوسری صورت میں کفیل اور کفایت کہ مراد ہوا۔ ہر دو صورت میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر میں اہل اسلام اور عساکر اسلام کی عزت و آبرو اور ان کی فتح و نصرت

اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ کرم پرے رکھی تھی اور جس طرح پہلے وہ ان کی قلت اور بے سرو سامانی کے باوجود اہل اسلام کی مدد کرتا رہا ہے آج بھی لشکرِ روم کے مقابلہ میں قلتِ تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود مدد فرمائے گا کیونکہ وہ زندہ ہے اس پر موت نہیں آتی۔ اس لیے روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ آپ ان اہل ایمان و اسلام میں اور ان کے امیر و خلیفہ میں غزوہ بدر و حنین کے وقت سے اب تک کوئی تغیر و تبدل محسوس نہیں فرماتے تھے ورنہ اس وقت کی نصرتِ خداوندی اور فتح و کامرانی کا حوالہ دینے کا کیا مطلب جب کہ وہ اسلام اور ایمان بھی العیاذ باللہ باقی نہیں رہا تھا۔ اور بقولِ شیعہ سارے صحابہ کرام علیہم الرضوان مرتد ہو گئے تھے۔ اور صرف تین حالتِ ایمان پر برقرار تھے۔ جس سے دوپہر کے سورج کی طرح روشن کہ شیعہ کا مذہب باطل محض ہے۔ اور ان کا یہ قول سراسر غلط اور خلافِ حقیقت ہے۔ (۲) وہ ضمانت اور کفالت جس کا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ذکر فرمایا وہ کہاں ہے اور کس آیت سے ثابت ہے؟ تو اس کے لیے ہم آپ کو شیعہ شارح نہج البلاغہ علامہ ابن میثم بحرانی کے پاس لے چلتے ہیں دیکھو وہ کہہ رہے ہیں کہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو بالعموم اور صحابہ کرام علیہم الرضوان کو بالخصوص یہ وعدہ دیا اور فرمایا:-

خلاصة النصيحة انه ضمن اقامة هذا الدين واعزاز حوزة اهلهم وهدانا
الحكم من قوله وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم
في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذين ارتضوا
لهم وليبتلنهم من بعد خوفهم امنا الآية ٢٢

(شرح ابن میثم جلد ۳ ص ۱۶۱)

خلاصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نصیحت اور مشورہ کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دین کے قائم اور برقرار رکھنے کا اور اہل دین کی جمعیت اور ان کی حکومت کو عزت و خلیفہ دینے کا ارادہ منہو چکا ہے۔ اور یہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے مستفاد ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے تم سے اہل ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور بالضرورتین میں خلافت عطا فرمائے گا۔ جیسے کہ پہلے لوگوں کو خلافت اور حکومت عطا فرمائی اور ان کے لیے ان کے دین کو ہر حال میں مضبوط اور راسخ کرے گا جو دین ان کے لیے پسند فرمایا اور ضرور بالضرورت ان کے خوف و ہراس کے بعد انہیں امن و سکون بطور بدل عطا فرمائے گا اس سے صاف ظاہر ہے کہ نگاہ ولایت میں حضرت عمر بن الخطاب کی خلافت و حکومت اللہ تعالیٰ کی موعود خلافت ہے۔ اور جو دین اس دور میں ترقی پا رہا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ کا ان کے لیے پسند کیا ہوا دین ہے۔

کہا قال : ورضیت لکم الاسلام دنیا۔ کہ میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین و مذہب پسند کیا ہے۔ اور انہیں فارس و روم اور کسری و قیصر سے کسی قسم کا خوف و خطر باقی نہیں رہ سکتا۔ جس سے صاف ظاہر کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت خلافت الہیہ ہے اور وہ دین جس کی ترویج و اشاعت اور تقویت و ترقی کے آپ درپے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ اور چونکہ وعدہ اہل ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے ساتھ ہے لہذا اس سے آپ کے ایمان اور تقویٰ و پیرہیزگاری کی بھی ضمانت حاصل ہوگئی۔ جب قرآن مجید اور اہل بیت نے اور ثقلین نے بن کر یہ شہادت دے دی تو اس کے بعد بھی ان کی خلافت کی حقانیت و صداقت میں کسی مسلمان کے لیے شک و شبہ کی کوئی کجائش ہو سکتی ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔

(۳) حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم شہید ہو گئے تو اہل اسلام کے لیے دور دراز علاقوں کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں ہوگی اور ان کے لیے تمہارے بعد کوئی عیاد و ماوی نہیں رہے گا۔ حالانکہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس قیصر روم کے خلافت جنگ کے لیے تبوک تشریف لے گئے۔ اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت طلحہ و زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے خلاف کاروائی کے لیے بنفس نفیس تشریف لے گئے اگر رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور ولایت مآب رضی اللہ عنہ کے نائب مقرر کئے جانے کے بعد اہل اسلام کامرکز اور ان کی جمعیت اور حکومت برقرار رہ سکتی تھی تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بھی تو اس شخصیت کو نائب مقرر فرما رہے تھے۔ جن کو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تبوک کی طرف جاتے وقت نائب اور خلیفہ مقرر کیا تھا۔ پھر اس پریشانی اور اضطراب کے اظہار کا کیا مطلب کہ تمہارے بعد اہل اسلام کا بلجا و ماویٰ اور ان کی جانے پناہ کون ہوگا جس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو حسب وعدہ الہی: واللہ یعصمک من الناس لوگوں کے ہاتھوں شہید نہیں ہو سکتے تھے اور حضرت امیر اپنے آپ کو عام اہل اسلام میں سے ایک فرد سمجھتے تھے جیسے کہ فرمایا: ما کنت الا رجلاً من المهاجرین وردت کما وردوا و صدرت کما صدرت۔ الخ شرح نہج البلاغۃ لعلامة ابن میثم بحرانی جلد ۳۵۵ یعنی میں مہاجرین میں سے ایک فرد ہوں جہاں وہ وارد ہوئے ہیں میں وارد ہوا اور جہاں سے وہ لوٹے ہیں لوٹا۔ لہذا حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے وجود مسعود کو اہل اسلام کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے اور ان کی ذات ستودہ صفات کو اسلام کی ترویج و ترقی اور اہل اسلام کی جمعیت و اتحاد کا ضامن سمجھتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ آپ خود اس جنگ میں حصہ نہ لیں جس سے نگاہ ولایت میں فاروق اعظم کی عظمت اور افادیت ہر نیروز کی طرح عیاں ہے۔

۱۴) آپ نے فرمایا اگر فتح ہو گئی تو وہی تمہارا مقصود ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ شکست ہو گئی تو کنت ردء للناس و مثابة للمسلمین آپ لوگوں کے لیے معاون و مددگار اور اہل اسلام کے لیے ملجا و ماویٰ اور جائے پناہ ہوں گے جس سے صاف ظاہر ہے کہ نگاہ ولایت میں مقام فاروق یہ ہے کہ شکست خوردہ لشکر اسلام دوبارہ قوت و توانائی اور عزم جدید اور نئے حوصلے کہیں سے پا کر دوبارہ دشمن کو عبرتناک شکست دے سکتا ہے۔ تو وہ صرف آپ کی ذات ہی ہے جو شکست کو فتح اور ضعف و ناتوانی کو قوت و توانائی اور بزدلی اور کم حوصلگی کو شجاعت و بسا اہمت اور عزم و حوصلہ کے ساتھ تبدیل کرنے کی ضامن ہے اس کے بعد بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ

محبت اور عقیدت کا مدعی ان کے محمود و ممدوح کی شان میں طعن و تشنیع کے لیے کوئی راہ پاسکتا ہے۔ لاواللہ ہرگز نہیں وگرنہ وہ دعویٰ محبت و عقیدت میں سراسر کذاب ہے۔ اور اندر سے یہودی یا مجوسی ہے جن کو عساکر اسلام اور ان کے امیر کی طرف سے پہنچنے والے زخم نہ مندمل ہوئے اور نہ ہو سکتے ہیں اور نہ وہ اس کا بدلہ ان سے عملی طور پر لے سکتے ہیں اور قانون یہی ہے:-

”اذ ایسّی الانسان طال لسانہ“ جب آدمی ہاتھ کے ساتھ بدلہ لینے سے قاصر ہو تو اس کی زبان دراز نہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ گالی گلوچ پر اُتمہ آتا ہے۔ الحاصل یہ محض ایک مشورہ نہیں بلکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ رفعت پناہ میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف سے گلدستہ عقیدت و محبت ہے اور ان کے وجود مسعود کو اسلام کی سر بلندی اور ترقی کا ضامن و کفیل قرار دینا ہے۔ اور صرف اس دور میں نہیں بلکہ اپنے دورِ خلافت میں بھی ان کی خدمت میں گل ہائے عقیدت و محبت پیش فرماتے رہے۔ اور ان کی جدائی اور وفات و شہادت کو اسلام کے لیے عظیم خسارہ ناقابلِ تلافی نقصان اور نہ مندمل ہونے والا زخم قرار دیتے رہے۔ جیسے کہ فرمایا: لعمری ان مکاتلہما فی الاسلام لعظیم وان المصائب بہما الجرح فی الاسلام شدید۔ اس لیے صرف یہ کہہ کر اس ارشادِ مرتضوی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ دشمن بھی مشورہ طلب کرے تو وسیع الطرف اور عالی حوصلہ آدمی مشورہ صحیح دیتا ہے۔ لہذا آپ نے صحیح مشورہ دے دیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو عساکر اسلام اور جنودِ عمر فاروق کی فتح و نصرت کا ضامن قرار دینا، تو مشورہ کے لیے ضروری نہیں تھا اور نہ فردِ واحد کے وجود کو تمام اہل اسلام کی جمعیت و اتحاد کا ضامن اور اہل اسلام کا مرجع اور ماویٰ قرار دینا ضروری تھا۔ بلکہ صحیح جانشین اور آزمودہ کار خلیفہ کا تقرر اور مستم شخصیت کی ولی عہدی کا اعلان ان خطرات کو دور کرنے میں کارآمد ہو سکتا تھا۔ لیکن بشرطیکہ نگاہ ولایت اور مرتضوی حقیقت بین نظر میں کوئی ایسا بدل اور قائم مقام ہوتا تو! لہذا اگر تعصب کے کالے موتیے نے نظر و نگاہ کو بالکل معدوم نہ کر دیا ہو اور اس کی درستگی کی صلاحیتوں کو بھی سلب

نہ کر لیا ہو تو اس ارشاد ولایت کی حقانیت پر تاریخ عالم کے اوراق کی ہر سطر اور ہر لفظ شاہد صادق اور برہان ناطق ہے۔

آنکھ والا ترے جوہن کا تماشا دیکھے

دیدہ کو رکھو کیا آئے نظر کیا دیکھے؟

تنبیہ:- حضرت فاروق اعظم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہما کے خلیفہ ہیں جب ان کی خلافت نگاہ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں خلافت الہیہ ہے اور ان کے اور ان کے عساکر کے ایمان و اخلاص اور اصلاح و تقویٰ پر اللہ تعالیٰ گواہ ہے اور قرآن شامد ہے تو حضرت صدیق کی خلافت کے برحق ہونے اور ان کے ایمان و اخلاص میں شک کرنے کی کسی مؤمن کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔

نیز تاریخی شہادت سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ صرف بوقت ضرورت مشورۃ ہی دینے پر اکتفا نہیں فرماتے تھے بلکہ عملی تعاون بھی فرماتے تھے۔ اور شریک کار بھی تھے۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی نظر میں انتہائی معتمد علیہ بھی تھے کہ ایسے مواقع پر ان کو اپنا نائب اور قائم مقام بنایا اور آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمایا جس سے باہمی اور دوطرفہ محبت و مودت اور اخلاص و اعتماد کا بھرپور مظاہرہ ہوتا ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق حسن اعتقاد بھی یہاں سے ظاہر اور واضح ہے کہ ان کا وجود مسعود اہل اسلام کے باہمی ربط و ضبط اور اتحاد و یگانگت کا ضامن ہے۔ اور شر و فساد سے تحفظ کا۔ لہذا میرا دارالحکومت سے چلے جانا ان کی برکت سے کسی نقصان کا موجب نہیں ہو سکتا اور ان حقائق کا مشاہدہ اور واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی کوئی کم بخت بلکہ بد بخت ان میں باہم عداوت و کینہ اور دشمنی کا دعویٰ کر سکتا ہے قطعاً نہیں۔

رسالہ "نذیب شیعہ" ص ۵۵ تا ۶۰ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

دلیل دوم :- اب اہل عقل و دانش کے لیے اس کتاب میں سے حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ایک اور ارشاد بھی مطالعہ کے لیے پیش کرتا ہوں جو اسی بیخ بلاغت خطبہ نمبر ۱۴ میں مذکور ہے اور جس کا عنوان ہے (

قد استشارہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فی الشہوض

لقتال الفرس بنفسمہ یعنی جب امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فارس کے خلاف جنگ میں بذات خود شریک ہونے کا مشورہ طلب فرمایا تو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا۔

ان هذا الامر لم یکن نصرة ولا خذلاناً بکثرة ولا بقلّة و هو دین اللہ الذی اظہرہ وجندہ الذی اعدہ وامدہ... حتی بلغ ما بلغ وطلع حیثما طلع ونحن علی موعود من اللہ سبحانہ واللہ منجز وعدہ وناصر جندہ ومکان القیم بالامر مکان النظام من الخرز یجمعه ویضمہ..... فان انقطع النظام تفرّق وذهب ثم لم یجتمع بهذا فیرہ ایداء والعرب الیوم وان كانوا قلیلاً فہم کثیرون بالاسلام عزیزون بالاجتماع فکن قطیاً واستدار الریح بالعرب واصلہم دونک ناسراً للحرب فانک ان شخصت من هذا الارض انقطع علیک العرب من اطرافہا واقطارہا، حتی یكون ما تدع وراک من العورت اہم الیک متابین یدیک ان الاعاجم ان یظروا الیک یقولوا هذا اصل العرب فاذا اقتطعت صولہ استرحکم فیكون ذلک اشدّ لکبہم علیک وطمعہم فیک۔

ترجمہ: بے شک اہل اسلام کی فتح و شکست کثرت و قلت انفرادی وجہ سے کبھی نہیں ہوئی یہ اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اس کو اللہ ہی نے غالب کیا ہے اور تیار فرمایا ہے۔ اور اس کو امداد دی ہے۔ یہاں تک کہ جہاں اس دین نے پہنچنا تھا پہنچا۔ اور جہاں تک اس نے چمکنا تھا چمکا۔ اور ہم اللہ سبحانہ کے وعدے کے مطابق ہیں اور اسی پر برقرار ہیں اور اللہ سبحانہ اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے۔ اور اپنے لشکر کو فتح دینے والا ہے۔ اور مسلمانوں کے امیر کا مرتبہ ایسا ہے جیسے کہ تسبیح کے دانوں کا رشتہ اور دھاگہ جو اس کے دانوں کو اکٹھا اور اپنے اپنے مرتبہ و مقام پر رکھتا ہے۔ پس اگر وہ رشتہ ٹوٹ جائے تو پھر تمام دانے بکھر جاتے ہیں۔ پھر وہ اکٹھے نہیں ہو سکتے اور اہل اسلام اگرچہ نسبت دشمن کے تعداد میں کم ہیں مگر دولت اسلام کی وجہ سے زیادہ ہیں اور اپنے اجتماع کی وجہ سے غالب ہیں آپ قطب بن کر ایک ہی جگہ رہیں اور لشکر اسلام کی چکی کو گھمائیں اور جنگ کی آگ کو اپنے ملک سے دور رکھ کر دشمن تک پہنچائیں۔ اگر آپ بذات خود اس ملک عرب سے چلے گئے تو قبائل عرب آپ پر ہر طرف سے ٹوٹ پڑیں گے پھر مسلمانوں کی عزت و ناموس کی حفاظت آپ کو فارس کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ اہم محسوس ہوگی، عجیبی لوگ جب آپ کو کل میدان جنگ میں دیکھیں گے تو یہی کہیں گے کہ عرب کا سردار یہی ہے۔ اس کو ختم کرو تو پھر خیر سی خیر ہے۔ پھر یہ بات دشمن کو آپ کے خلاف جنگ کرنے میں سخت حیرت کر دے گی۔ اور آپ کے خلاف لڑنے میں ان کے طمع کو بڑھائے گی۔

دلیل سوم:- فروع کافی کتاب الجہاد مطبوعہ لکھنؤ ص ۶۱۳ و ۶۱۴ و ص ۶۱۵ پر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا عقیدہ اور آپ کا فتویٰ ملاحظہ ہو:-

”القتال مع غیر الامام المفروض طاعته حرام قطعاً“

ولا غزو الا مع امام عادل“

یعنی امام برحق جس کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کسی کے ساتھ مل کر جہاد کرنا

قطعاً حرام ہے۔ اور امام عادل کے سوا کسی کی اطاعت میں جہاد کرنا ہرگز جائز نہیں۔
 اس فتوے کو ذہن میں رکھ کر اور ادھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تعامل کو ملحوظ
 رکھ کر آپ کو فیصلہ کرنا ہو گا۔

اب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تعامل ملاحظہ ہو کتاب ناسخ التواریخ
 جلد دوم، حصہ دوم ص ۳۹۴۔

”در کار ہا، و لشکر کشی ہا، اور اعانت مے فرمود و رائے نکو مے داد“

یعنی امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں آپ کے ہر کام میں
 اور فوج کشی میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کی امداد و اعانت فرماتے تھے۔
 اور نیک مشورے دیتے تھے۔

اگر یہ معاونت درست ہے تو آپ کی خلافت برحق ہے۔ اور خلافت برحق
 نہیں تو معاونت صحیح نہیں ہو سکتی۔

اب منطق کی جس شکل سے بھی نتیجہ نکالا جائے۔ یہی ثابت ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ
 رضی اللہ عنہ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ برحق
 خلیفہ تھے مسلمان بھائیو!

اور نہیں تو کم از کم اتنا تو سوچو کہ اس قسم کے مشورے دوست اور خیر خواہ دیا کرتے
 ہیں یا دشمن اور لفظ قیم بالامر پر غور کرو تو اس کا ضاف معنی امیر المؤمنین ہے جو
 حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے حق میں استعمال فرما رہے
 ہیں اب یہ شور کہ مستحق خلافت نہیں تھے وغیرہ وغیرہ تو اس بات کا قطعی علم آجکل
 کے ذاکرین شیعہ کو زیادہ ہو سکتا ہے یا جناب مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو کم از کم یہ
 خیال کرنا چاہیے کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کے حالات کو
 بچشم خود ملاحظہ فرمانے والے تھے۔ اور ان کے طرزِ عمل کو ہر وقت محسوس کرتے تھے۔
 اور یہ زمانہ کتنا بعید تر ہے تو بہر صورت عینی شاہد کا بیان ہی قابل قبول
 ہو سکتا ہے؟

دلیل چہارم :- اہل تشیع کی معتبر ترین کتاب ناسخ التواریخ جلد دوم ص ۲۴۵
 میں بھی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد موجود ہے تو حضور کے یہ جملے کہ
 نحن علی موعود من اللہ سبحانہ الخ کے معنی اور تفسیر
 میں صاحب ناسخ التواریخ لکھتا ہے :-

وانیک ما بر وعدہ خداوند استادہ ایم چہ مومنان را وعدہ نہاد کہ درارض
 خلیفتی دہد چنانچہ پیشیاں را۔ و دین الیشاں را استوار دارد و خوف الیشاں را
 مبدل بایمنی فرماید تا بر ہمد اویان غلبہ جویند و خداوند بے وعدہ وفا کند و شکر خود را
 نصرت دہد و ہمانا فرمان گزار امور رشتہ را مانند کہ مہر پا، بد و پیوستہ شوند۔
 یعنی اس وقت ہم اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کھڑے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنوں
 سے وعدہ فرمایا ہے کہ زمین میں ان کو اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلیفے
 بنائے گا۔ اس طرح جیسا کہ پہلے پیغمبروں کے خلیفے بنائے تھے۔ اور ان کے دین کو
 تمکنت اور پختگی بخشے گا ان کے خوف کے بعد اس کے بدلے میں ان کے لیے
 امن دے گا۔ تاکہ مذہب عالم پر غلبہ حاصل کرے۔ اور اللہ تعالیٰ وعدہ کو وفا کرتا
 ہے۔ اور اپنے شکر کو فتح و نصرت دیتا ہے جب کہ امر کرنے والے (امیر المومنین)
 ایسے رشتہ رکھتا ہے، کی مانند اور مثل میں جس کے ساتھ دانے پیوستہ ہیں (تو جس طرح
 تسبیح کے دانوں میں انتظام اور انضباط ان کے درمیانی دھاکہ پر موقوف ہے۔
 اسی طرح اہل اسلام کا باہمی ربط ان کے امیر حضرت عمر سے وابستہ ہے سیدنا
 حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر بہ قرار
 اور قائم ہیں۔ صاحب ناسخ التواریخ اور اسی طرح باقی شراح نہج البلاغہ حضور کے
 ان جملوں کی تفسیر میں تصریح کرتے ہیں کہ حضور نے اس آیت کریمہ کی طرف اشارہ
 فرمایا ہے۔ قال اللہ تعالیٰ :-

وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات یستخلفنہم
 فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم ولیمکنن لہم دینہم

الذی ارتضیٰ لہم ولید لہم من بعد خوفہما منا ۝ یعبدونہ
لا یشرکون بے شیئاً ومن کفر بعد ذلک فاولئک ہم
الفاسقون ۔

یعنی تم میں سے مومنین اور صالحین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ ان کو
زمین میں اسی طرح خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے پیغمبروں کے صحابہ کو خلیفہ بنایا تھا۔ اور
اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کے لیے اُن کے اس دین کو استحکام اور تمکنت
بخشنے گا جس کو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے۔ اور ان کے خوف کو امن
وسلامتی کے ساتھ بدلے گا۔ وہ میری ہی عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی کو
شریک نہ بنائیں گے۔ اور ان تمام باتوں کے بعد جو انکار اور کفر کریں گے تو وہی
فاسق ہوں گے۔

حضرت شیر نواز رضی اللہ عنہ کے ان جملوں کا مطلب کہ ہم اللہ تعالیٰ کے
وعدہ پر قائم ہوئے ہیں اسی آیت وعدہ کے ترجمہ کو پیش کرتے ہیں چنانچہ
اہل تشیع کا مجتہد اعظم علامہ ابن عثیم شرح کبیر نہج البلاغہ ص ۳۲ مطبوعہ ایران
میں انہی ارشادات مرتضوی کی شرح اور تفسیر میں تصریح کرتا ہے :-

بُوعَدَ اللّٰہُ تَعَالٰی : السِّلْمِیْنَ اِلَّا سِتْخْلَافَ فِی الْاَرْضِ وَتَمْکِیْنِ
دِیْنِہِمُ الَّذِیْ اَرْتَضٰی لَہُمْ وَتَبْدِیْلَہُمْ بِخَوْفِہُمَا مَنَا کَمَا هُوَ
مَقْتَضٰی الْاٰیۃ ۔

یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد کہ ۔ نحن علی موعد من اللّٰہ
رحم اللہ تعالیٰ کی طرف سے وعدہ پر ہیں، دین مقدس اور لشکر اسلام کی فتح مندی
نے اسباب اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور اعانت اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے
کئے گئے وعدہ کو بیان فرماتا ہے۔ جو وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے بعد زمین پر خلیفہ بنانے اور ان کے اس دین کو جس پر وہ راضی ہوا
تمکنت اور استقلال بخشنے اور ان کے خوف کو امن کے ساتھ بدلنے کے متعلق

فرمایا ہے جیسے کہ وہ اس آیت کا مقتضی ہے۔

بہر صورت تمام شراحِ نبج البلاغۃ ہی تصریح کرتے ہیں کہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے امیر عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو اسی آیت استخلاف کے ساتھ برحق ثابت کیا ہے۔ اور ان کے زمانہ خلافت اور ان کے دین کو اسی آیت کریمہ کے مقتضی سے بیان فرمایا کہ وہ برحق ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس پر راضی ہے۔ واقعات بھی اسی امر کے موید ہیں کہ وہ زمانہ جو جزیرہ عرب میں بھی مخالف قبائل کی آئے دن فتنہ پردازیوں اور خطرناک سازشوں سے سخت پریشانی اور بے چینی کا زمانہ یقین کیا جاتا تھا اور ہر وقت ان کی طرف سے خوف و خطر مسلمانوں کو لاحق تھا، امیر المؤمنین عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں تمام جزیرہ عرب کو یہود و نصاریٰ سے پاک کیا گیا۔ اور تمام مخالف عنصر یا حلقہ بگوش اسلام ہوا یا ختم ہو گیا اور اسلام کی سلطنت نے بہت بڑی وسعت اختیار کی سلطنت ایران جیسی بازرعب اور پرہیزگیت حکومت نے اسلام کی چوکھٹ کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ تقریباً تمام افریقہ، مصر، شام، عراق، خراسان اور باقی تمام قبائلی علاقے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اور یوں مسلمانوں کا خوف امن کے ساتھ تبدیل ہوا اور یہ تمام تر آیت کریمہ:۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمُ
اللّٰہُ کے حرف بحرف مطابق ہوا۔

اس آیت کریمہ سے زیادہ احقیت خلافت خلفہ راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے۔ یہ غصبِ خلافت کے بے بنیاد دعوے حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی تصریحات اور ائمہ کرام کی توضیحات اور ان کے طرزِ عمل کے مقابلے میں کیا وقعت رکھتے ہیں؟

از محمد اشرف سیالوی

تحفہ حسینیہ

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے

اس ارشادِ گرامی کا معنی و مفہوم اپنی طرف سے بیان کرنے کی بجائے صاحبِ نسخ التواریخ، علامہ ابن عثیم بخرانی شارح نہج البلاغۃ اور دیگر شارح کے حوالہ سے بیان کیا اور ساتھ ہی ضمنی طور پر دو امر مزید توجہ کے لیے پیش کیے ایک ناحق خلیفہ کی معاونت اور اس کے ساتھ مل کر جہاد کرنے کی حرمت، دوسری طرف آپ کا لشکر کشی اور صلاح و مشورہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی معاونت فرمانا تاکہ واضح ہو جائے کہ یہ صرف مشورہ ہی نہیں کہ دشمن بھی پوچھے تو صحیح رائے دے دی جائے بلکہ عملی تعاون و اشتراک بھی ہے، جو ناحق خلیفہ کے ساتھ حرام ہے اور حرام کا ارتکاب حضرت ابوالائمہ رضی اللہ عنہ سے بالکل ناممکن اور بعید ترین ہے۔

لہذا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت کا برحق ہونا روز روشن کی طرح واضح ہو گیا۔ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے آپ کو قیام بالامر قرآن سے بھی یہ حقیقت واضح ہو گئی۔

تحفہ حسینیہ، از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

تقریر استدلال اور کلام امیر کے فوائد قرآنہ

اب مزید فوائد اس کلام الامیر، امیر الکلام کے ملاحظہ فرمائیں اور حقائق خلافت فاروقیہ کے دلائل و شواہد کا مشاہدہ فرمائیں۔

(۱) آپ نے فرمایا: - اِنَّ هَذَا اِلَامْرَلَمْ يَكُنْ نَصْرَهُ وَاَخَذَ لَانَهُ الْخِمْسَ جس کا مطلب یہ ہے نہ سلام کی زمانہ ماضی میں نصرت اللہ فتح مندی کا دار و مدار کثرت تعداد پر نہیں تھا۔ لہذا اب بھی اس پر دار و مدار نہیں جس سے صاف ظاہر کہ یہ اسلام جس کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ داعی ہیں اور اس کے نفاذ کے ذمہ دار ہیں یہ وہی سابقہ اسلام ہے نیا نہیں ورنہ اس کی فتح مندی کا معیار یہاں پر پایا جانا کیونکہ لازم اور ضروری ہو سکتا ہے لہذا شیعہ صاحبان کا اس اسلام کو عامہ کا عقیدہ و نظریہ کہہ کر ٹکرائنا اور اپنے آپ کو خاصہ کہہ کر اپنے لیے نیا دین ایجاد

کرنے کا اس ارشاد کی روشنی میں کوئی جواز نہیں ہے بلکہ آپ نے تصریح فرمادی :-
هُوَ دِينَ الَّذِي أَظْهَرَهُ :-

کہ یہی اللہ تعالیٰ کا دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غالب فرمایا ہے۔
 نیز یہ بھی فرمادیا کہ جس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب امام المرسل
 صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا، دورِ فاروقی اس مقصد کو بطور نیابت اور
 خلافت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کامل کرنے کا دور ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے :-
**”هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى
 الدِّينِ كُلِّهِ :-“**

اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور
 دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ اس کو سب ادیان اور مذاہب پر غالب کرے۔
 اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے :-
”هُوَ دِينَ اللَّهِ الَّذِي أَظْهَرَهُ :-“

یہ وہ دین ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے غالب فرمایا۔ اور دورِ فاروقی میں مجوسیت
 کی بھی مکر توڑ کر رکھ دی گئی۔ اور وہ علاقہ بھی شہادتِ توحید اور شہادتِ رسالت
 کی آذانوں سے اور تکبیرات کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ اور عظیم عیسائی سلطنت
 روم کو بھی کچل کر رکھ دیا جہاں صلیب اور تصاویرِ مسیح و مریم کی جگہ اللہ تعالیٰ کی
 عبادت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہونے لگی۔ الغرض آپ نے واضح
 فرمایا کہ اس مقصدِ بعثت کی تکمیل اس نائب رسول کے ہاتھوں ہوئی اور ان
 ممالک میں اسلام کو ان باطل ادیان پر غلبہ اور تسلط حاصل ہو گیا۔ اگر خدا نخواستہ اصل
 دین مٹ چکا ہوتا تو اس کے غلبہ کا ذکر کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا۔ اور موجودہ دین کو
 اللہ تعالیٰ کا دین غالب قرار دینے اور زمانہ رسالت کی طرح محض نصرتِ خدا داد
 سے اس کے منصور اور غالب ہونے کا فیصلہ دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔
 (۲) آپ نے فرمایا :-

”ہویندہ الذی امدہ واحدًا۔“

کہ تمہارا شکر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے تیار کیا ہے یعنی غلبہ اسلام کے لیے۔ اور کفر و شرک کی کمر توڑنے کے لیے۔ اور اسے مدد دی ہے۔ یعنی ملائکہ کے ساتھ بدر میں اور حنین میں عملی طور پر اور دیگر مواقع پر ان کی روحانی امداد کے ذریعے۔

اس ارشاد سے بھی صاف ظاہر کہ لشکر فاروقی اور عساکر و افواج عمر نگاہ مرتضیٰ میں اللہ تعالیٰ کے عساکر اور افواج ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر حال میں اپنے لشکر اور عساکر کی مدد فرمانے والا ہے لہذا ان افواج کے متعلق کسی بدظنی کا اور ان کے ایمان و اخلاص پر حملہ کرنے کا بھی اور ان کے ارتداد و انحراف کا تصور تک بھی کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھٹلانے کے مترادف ہے۔ لہذا تمام افواج کا کامل اور مخلص مومن ہونا ظاہر اور واضح اور جب افواج اور خدام فاروقی اس شان کے مالک ہیں تو خود مخدوم اور امیر الامراء اور قائد عساکر کا ایمان و اخلاص بھی شک و شبہ سے بالاتر ہونا یقینی ہے ورنہ ان کا فرماں بردار اور وقادار لشکر اللہ کا لشکر کیوں کر قرار پاسکتا تھا؟

(۳) حضرت امیر نے فرمایا:-

”حَتَّىٰ يَبْلُغَ مَا يَبْلُغُ وَطَلَعَ حَيْثَمَا طَلَعَ۔“

یعنی یہ دین جس بلندی پر پہنچنا تھا پہنچا اور جہاں اس کا آفتاب چمکنا تھا، چمکا۔ اس عبارت میں جو الفاظ میں نہ سما سکنے والی ترقی اور بیان سے باہر اشاعت وین بیان کی گئی ہے، اس کا اندازہ عربی اسلوب سے واقف شخص ہی کر سکتا ہے۔ یہ انداز وہاں اختیار کیا جاسکتا ہے۔ جہاں الفاظ اس مقصد کی ادائیگی سے قاصر اور عاجز ہوں۔ اور اذنان اس کے تصور اور احاطہ سے عاجز ہوں۔ جس سے صاف ظاہر کہ اسے فاروق! یہ مذہب اسلام آپ کے دور میں اس بلندی اور رفعت پر فائز ہے۔ کہ نہ میرے الفاظ میں اس کی تعبیر ممکن اور نہ ہی سامعین و حاضرین میں اس کے کما حقہ تصور اور احاطہ کی طاقت و ہمت۔ امیر المؤمنین کے اس ارشاد کے بعد بھی کوئی سوچ سکتا

ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اصل دین کو ختم کر کے رکھ دیا تھا؟ اور باطل
نیا دین جاری کر دیا تھا؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ مجبور تھے۔ اس لیے اپنے
دور میں بھی اس کو اصلی حالت میں نہ لاسکے؟ کیونکہ تمام شکر کے الگ ہو جانے
ہو جاتے اور آپ کو تنہا چھوڑ جانے کا خطرہ لاحق تھا؟ لہذا زبان پر مہر سکوت
لگائے رکھی؟

مگر اس وقت ان کو ان الفاظ کے ساتھ خراج تحسین پیش کرنا اس توہم
کو بیخ و بن سے اکھاڑنے کے لیے کافی ہے، اور خطبہ روضہ کافی کے موضوع
اور من گھڑت ہونے کا بین برہان ہے۔ جس کا تذکرہ بمعہ تبصرہ گزر رہی چکا ہے۔
(۴) آپ نے فرمایا:-

نَحْنُ عَلَى مَوْعِدٍ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ مَتَجَزِعٌ وَعْدُهُ وَنَا صِرْجَانِدَةٌ
کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدے پر قائم ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو
پورا کرنے والا ہے اور اپنے شکر کی امداد اور نصرت فرمانے والا ہے جس کی مفصل
و مکمل تشریح حضرت شیخ الاسلام کے کلام صداقت نشان اور حقیقت ترجمان میں
گزر چکی کہ اس وعدہ سے مراد وعدہ خلافت ہے۔ اور دین کی تمکین و راسخیت اور
اور خوف کو امن سے بدلنے کا وعدہ جو قرآن مجید میں صراحتہً ماکور ہے۔ اور حدیث
رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے واضح اور ثابت ہے کہ ہدایت کا دار و مدار ثقلین کی
اتباع اور پیروی پر ہے۔ لہذا دونوں کا اس پر اتفاق ثابت ہو گیا کہ خلافت فاروقیہ
اسی وعدہ کا ایفاء ہے۔ لہذا اس خلافت پر انکار و اعتراض ضلالت و گمراہی ہے
اور حضرت علی المرتضیٰ کی تکذیب بلکہ قرآن مجید اور ثقل اکبر کی تکذیب اور ذات باری
تعالیٰ پر اعتراض و تنقید ہے۔

نیز جب خلافت فاروقیہ اس وعدہ کے عملی طور پر پورا کیے جانے کی شہادت
ہے تو اس دین کو جس کی اشاعت اور ترویج و ترقی کا بیڑا حضرت عمر رضی اللہ
عنہ نے اٹھایا اس کو خدا تعالیٰ کا آخری دین اور کامل و اکمل دین تسلیم کرنا لازم

اور واجب ٹھہرا لہذا اس پر اعتراض کسی بھی مؤمن کے لیے جائز اور درست نہیں ہے۔
 ”کما سق بیانہ فی الدلیل الاول“

۵) آپ نے فرمایا:۔

”مکان القیم بالامر مکان النظام من الخرز“

یعنی اسے عمر فاروق تم امر خلافت اور امر اسلام کے قائم رکھنے والے ہو اور تمہاری وجہ سے اہل اسلام میں ربط باہم اور اتحاد و اتفاق قائم ہے۔ اور تمہاری شہادت سے یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور پھر کبھی ان میں یہ ربط و ضبط پیدا نہیں ہو سکے گا اجمالاً۔ اقوام عالم کی تاریخ پر نظر رکھنے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وقت کی اہم ترین شخصیات اور بادشاہ میدان جنگ میں کام آتے رہے۔ اور ان کے ولی عہد اور قائم مقام کے ذریعے نظام سلطنت برقرار رہا۔ مگر حضرت امیر المؤمنین جیسا حقائق شناس اس امیر اور بادشاہ اسلام کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کر رہا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا معاملہ نگاہ ولایت میں ان دنیوی امراء و سلاطین سے مختلف تھا۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی گواہی بعد کے حالات و واقعات نے دی۔ اور پھر سے اس نظام کی کامل شیرازہ بندی نہ ہو سکی۔ بلکہ باہمی افراق و انتشار نے اس خلافت حقہ کی گرفت کو کمزور کر دیا۔

الغرض حضرت امیر المؤمنین کی دور رس نگاہوں اور عواقب پر مرکوز نظروں نے یہ بتلادیا کہ غلبہ اسلام کا ضامن اور امت کے اتحاد اور یک جہتی کا ضامن بھی ایک فرد ہے۔ لہذا میں ان کو میدان جنگ میں جانے کا مشورہ کبھی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ جو منفعت ان کے پیش نظر ہے وہ دوسری صورت میں بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور جو نقصان اسلام اور اہل اسلام کا ان کے میدان جنگ میں جانے اور شہید ہو جانے سے ہو سکتا ہے اس کا کوئی تدارک نہیں ہو سکتا اور نہ آپ کا کوئی صحیح بدل ہو سکتا ہے۔ چہ جائے کہ نعم البدل۔ کیا اب بھی محبت کے مدعیوں کی محمور نگاہیں خواب غفلت

اور مستی کی نیند سے بیدار نہیں ہوئیں اور مولا علی رضی اللہ عنہ کا بیان حقیقت ترجمان ان کو پڑھنے کی توفیق نہیں ہوئی؟ اور ان کے دل و دماغ اس کو سمجھنے کی طرف مائل نہیں ہوئے۔

(۶) آپ نے فرمایا:۔

”العرب اليوم وإن كانوا قليلاً فهم كثيرون بالإسلام عزيزون بالاجتماع۔ یعنی عرب تعداد میں گولم ہیں اور قلیل مگر قوت اسلام نے ان کو عظیم اور کثیر بنا دیا ہے اور ان میں اخوت اسلامیہ کی وجہ سے جو جمیعت اور وحدت ہے۔ وہ ان کے غلبہ کی ضامن ہے۔ کیا یہ صاف اور بے غبار بیان اور واضح ترین ارشاد اس حقیقت کی بین دلیل اور روشن برہان نہیں ہے کہ عرب اور افواج عمر میں ایمان کامل اور اسلام خاص موجود ہے اور انما المؤمنون اخوة کے تحت ان میں ایمانی رشتہ کی وجہ سے کامل بھائی چارہ موجود ہے۔ اور علی الخصوص امیر المؤمنین کی ذات نے ان سب کو متحد اور منظم اور باہم مرتبط اور منظم کر دیا ہے۔ لہذا بالکل واضح ہو گیا کہ ان افواج و عساکر اسلام کے ایمان و اخلاص پر اعتراض دراصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جھٹلانا ہے۔

(۷) آپ نے فرمایا:۔

”فكن قطبا واستدرا لرحى بالاسلام“

یعنی تم چکی کے نچلے پاٹ کی میخ بن کر اپنی جگہ پر قائم رہو اور عرب جو چکی کی مانند ہیں ان کو گردش میں لاؤ اور کفر و کفار کو پس کر رکھ دو۔ اور اسلام کو غالب و سر بلند کر دو۔ اس بیان حقیقت ترجمان سے صاف ظاہر کہ چکی کی منفعت اس کے قطب سے وابستہ ہے۔ اور عربوں کی افادیت اور منفعت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے وابستہ ہے۔ اگرچہ ساری امت کی شان یہ ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے نفع کے لیے نکالی اور پیدا کی گئی ہو لیکن

جو منفعت اور افادیت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی بدولت حاصل ہوئی وہ سب سے نمایاں اور امتیازی شان کی حامل ہے اور یہی وجہ ہے کہ نگاہ نبوت و رسالت نے اسلام کی عزت و غلبہ کو ان کی ذات سے وابستہ دیکھ کر انہیں اللہ تعالیٰ سے طلب کرتے ہوئے عرض کیا:-

”اللَّهُمَّ اعْزِ الْأِسْلَامَ بِعُمَرِ بْنِ الْخَطَّابِ“

ب اے اللہ! اسلام کو عمر بن الخطاب کے ذریعے عزت و عظمت اور غلبہ قوت عطا فرما۔ الغرض نگاہ نبوت و رسالت میں وہ موجب عزت اسلام ہیں اور نگاہ ولایت میں بھی قطب الاسلام ہیں لہذا جو ان کو اس مرتبہ پر فائز نہیں سمجھتے وہ دشمن اسلام ہیں۔

(۸) حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے دوران مشورہ فرمایا کہ لشکرِ فارس اہل اسلام کے خلاف اقدام کی سوچ رہا ہے۔ لہذا انہیں پہل کرنے کا موقعہ ہی نہیں دینا چاہیے۔ تو آپ نے فرمایا:-

”فَإِنَّمَا ذَكَرْتُ مِنَ مَسِيرِ الْقَوْمِ إِلَى قِتَالِ الْمُسْلِمِينَ فَإِنَّ اللَّهَ سَبْعَانَةٌ أَكْرَهُ لِمَسِيرِهِمْ مِنْكَ وَهُوَ أَقْدَرُ عَلَى تَغْيِيرِ مَا يَكْرَهُ“

لیکن وہ جو آپ نے ذکر کیا ہے۔ یعنی قوم فارس کا قتال مسلمین کے لیے روانہ ہونا تو اللہ تعالیٰ ان کی روانگی کو آپ کی نسبت زیادہ ناپسند سمجھنے والا ہے اور وہ اپنی ناپسندیدہ چیز کو تبدیل کرنے پر بھی زیادہ قادر ہے۔ اس ارشادِ گرامی سے بھی صاف ظاہر اور بالکل واضح ہے کہ نگاہ مرتضوی میں فارسیوں کا اہل اسلام کے خلاف قدم اٹھانا اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بہت ہی ناپسندیدہ ہے۔ اگر وہ کامل مومن ہوں اور خدمتِ اسلام میں مخلص پھر تو اس ارشاد کی جقائیت مسلم ہے۔ ورنہ مرتدین اور مخالفین اسلام کے اعداء کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ناراضگی اور ناپسندیدگی کا کیا مطلب لہذا حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد بھی ان افواج اور عساکر اسلام کے ایمان اور اخلاص پر واضح دلیل ہے۔

(۹) آپ نے فرمایا :-

وَاِمَّا مَا ذَكَرْتُ مِنْ عَدُوِّهِمْ فَاِنَّا لَمُتَكِنٌ نَقَاتِلُ فِيْهَا مَضًى بِالْكَثْرَةِ
وَإِنَّمَا كُنَّا نَقَاتِلُ بِالنَّصْرِ وَالْمَعُوْنَةِ -

رہا آپ کا یہ ذکر فرمانا کہ دشمنانِ اسلام کی تعداد بہت زیادہ ہے تو یقیناً ماضی میں ہم کثرتِ تعداد کے بل بوتے پر جہاد و قتال نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف اور صرف اللہ کی نصرت و معونت اور امداد و تعاون کے ساتھ جہاد کیا کرتے تھے۔ لہذا اس ارشاد سے بھی واضح کہ جس طرح ماضی میں اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد مسلمانوں کے شامل حال رہی، اب بھی ان کو یہ اعزاز و اکرام اور فضل و کرم نصیب رہے گا۔ اگر نگاہِ مرتقنوی میں موجودہ اسلام سابق اسلام کی طرح ہے۔ اور مجاہدین اسلام سابقہ حالت پر ہیں پھر تو اس قیاس و مساوات کا جواز ہے۔ ورنہ نہیں۔ اس لیے کوئی محبِ تسلیم کرے نہ کرے مومنین اور مومنات ہونے کے دعویدار ہائیں یا نہ مانیں حضرت امیر المؤمنین ابوالائمہ سرچشمہ و لایت رضی اللہ عنہ، تو اس حقیقت کا برملا اعلان فرما رہے ہیں کہ اب بھی وہی اسلام ہے جو زمانہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں تھا۔ اور اب بھی وہی مخلص اور جان نثارانِ اسلام مصروفِ جہاد میں جو اس وقت تھے۔ لہذا فتح و نصرت ان کے اب بھی اسی طرح قدم چومے گی جس طرح ماضی میں چومتی رہی ہے۔ اس لیے علامہ امین مٹیم بحرانی نے کہا :-

” فاجابه بتذكير قتال المسلمين في صدر الاسلام فانه
كان من غير كثرة - وانما كان بنصر الله ومعونته فينبغي ان يكون
الحال الآن كذلك وبوعده الله المسلمين بالاستخلاص في الارض و
تمكين دينهم والذی اردتضی لهم وتبديلهم بنحو فهم امناء كما هو
مقتضى الآية -

کہ حضرت علی نے ان کو جواب دیتے ہوئے صدر اسلام میں اہل اسلام کے جہاد اور حرب و قتال کی کیفیت یا دولائی کہ وہ جہاد کثرتِ تعداد کی بنا پر نہیں ہوا

کہ تاہا بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معاونت پر اس کا دار و مدار تھا۔
 لہذا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے اب بھی، شایانِ شان یہی ہے کہ اسی طسوح
 فتح و نصرت حاصل ہو نیز آپ نے حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کا اہل
 اسلام کے ساتھ وعدہ خلافت یاد دلایا اور ان کے لیے اپنے پسندیدہ دین کو مضبوط
 اور راسخ کرنے کا عہد و پیمان اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کرنے کا عزم اور
 ارادہ جیسے کہ مقتضائے آیت ہے یاد دلایا اور اطمینان رکھنے اور اضطراب و
 بے چینی کو دل سے نکال دینے کا مشورہ دیا کیونکہ اس نے ہمیں نصرت و غلبہ اور
 خلافتِ ارضیہ کا وعدہ دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر وعدہ کو پورا کرنے والا ہے۔
 کیونکہ اس کی خبر کا خلاف نہیں ہو سکتا۔

وَعَدْنَا بِمَوْعِدٍ وَهُوَ النَّصْرُ وَالْغَلْبَةُ وَالْاِسْتِخْلَافُ فِي
 الْاَرْضِ كَمَا قَالَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
 لِيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ الْاَيَةُ -

(شرح ابن مہتمم جلد ثالث ص ۱۹۷ طبع جدید)

یہ ہیں فاروق اعظم کہ اسلام کی سر بلندی اور رفعت کے لیے بے چین اور مضطرب
 ہیں اور حضرت علی مرتضیٰ ان کو مطمئن اور پرسکون رکھنے کی کوشش میں ہیں جس سے
 فاروق اعظم کی شان "اشدّاء علی الکفار" ظاہر ہے اور مولائے مرتضیٰ
 کی شان "راحماء بینہم والحمد للہ"۔

(۱۰) جب حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی زبانی خلافت فاروقی کا خلافت
 موعودہ ہونا اور خلافت النبی ہونا واضح ہو گیا تو حضرت صدیق کی خلافت کا بھی
 موعودہ من اللہ ہونا اور خلافت النبیہ ہونا واضح ہو گیا۔ کیونکہ یہ خلافت خلافت
 صدیقیہ کی فرع ہے۔ اور حضرت عثمان کی خلافت کا موعودہ من اللہ ہونا بھی ظاہر
 ہو گیا کیونکہ وہ خلافت فاروقیہ کی فرع ہے۔ اور اس میں انہی مخلصین اور جانثارانِ
 اسلام نے اپنا حق خود ارادی اور خدا داد اختیار استعمال کیا۔

اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کا موعود ہونا بھی واضح ہو گیا۔ کیونکہ وہ اس ذریعہ سے ثابت ہوئی جس سے خلافت اصحاب ثلاثہ ثابت ہوئی۔

”انہ یایعنی القوم الذین یایعوا ابایکرو وعمر و عثمان علی ما یایعوہم علیہ“ لہذا شیعہ صاحبان کا آیت استخلاف کو حضرت مدی علیہ السلام کے ساتھ خاص کر دینا اور خلافت مرتضویہ کو بھی اس سے نکال دینا جیسے کہ تفسیر صافی وغیرہ میں ہے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ان دونوں ارشادات کے سراسر خلاف ہے۔ اور تفسیر قرآن میں امام اقل کے قول کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ ان کی منشا اور مرضی و پسند کے برعکس تفسیر بلکہ تحریف کرنے کے برابر کیونکہ وعدہ میں صبیحہ خطاب استعمال کیا گیا ہے۔ وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات الخ اور ظاہر ہے مخاطبین اولین صحابہ کرام علیہم الرضوان ہیں تو ان کے دور کو کس طرح نکالا جاسکتا ہے۔ جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی اور خلیفہ بلا فصل مانا جاتا ہے۔ تو کیا اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بغیر ہی وہ وصی بھی بن گئے۔ اور خلیفہ بھی ہاں اس کو عام رکھ لیا جائے اور بعد میں جن جن امراء اسلام نے اسلام کی ترویج و اشاعت اور اس کی سر بلندی اور عروج و کمال میں حصہ لیا یا لیں گے جس طرح حضرت مدی علیہ السلام ان سب کی خلافت موعودہ تسلیم کر لی جائے تو بالکل جا ہے لیکن خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو بہر حال ارشاد مرتضوی کی روشنی میں خلافت حقہ اور موعودہ من اللہ تسلیم کرنا لازم اور فرض۔



ہر قتل کی طرف سے مغلوبیت کا اعتراف اور غلبہ اسلام کا

کتاب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہونا

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ان ارشاداتِ عالیہ کی ہی تائید اور تصدیق کے طور پر ذرا ہر قتل اور قیصرِ روم کا اعتراف شکست اور مغلوبیت کا یقین اور اس فتوحات کے نہ تھمنے والے طوفانی سلسلہ کا کتب سماویہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہونا بھی ملاحظہ کرتے چلیں۔

(۱) صاحب نسخ التواریخ نے نقل کیا ہے کہ جب ہر قتل بادشاہ روم کی لڑکی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں گرفتار ہوئی اور اس نے اپنے رہبان اور بطاریق بھیج کر اس کی واپسی کی اپیل کی اور فدیہ لے کر چھوڑنے یا بطور کرامت و عنایت چھوڑنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے کہانی الحال ہم اس کو مفت میں چھوڑتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ دوبارہ اس کو تیرے محل سرائے سے گرفتار کر لیں گے جب وہ شاہزادی واپس پہنچی اور اس کے ہمراہیوں نے ہر قتل کو حضرت خالد رضی اللہ عنہ کا پیغام پہنچا یا تو اس نے حاضرین مجلس کی طرف منہ کر کے کہا:-

اے یہاں سخن است کہ روزِ نخست وقتی کہ کتاب محمد بن آدم مردم روم را گفتم سخن او بر حق است دین او بپذیرید از من بپذیرید فتنہ و ارادہ قتل من کہ دندہ زود باشد کہ دوا ہی ما از یں صعب تر گردد و اس نہ از قدرت و کرامت عربست بکہ از خداوند آسمان و زمین است ۲۱۳ ۲۱۴ جلد دوم از کتاب (م) یہ وہ بات ہے جو کہ میں نے پہلے دن کی جس وقت کہ محمد عربی کا خط میرے پاس آیا۔ میں نے رومی لوگوں کو کہا ان کی بات درست ہے۔ لہذا ان کے دین کو قبول کر لو تو تباہی و بربادی سے بچ جاؤ گے۔ جیسے کہ انہوں نے کہا ہے۔ السلام تسلیم اسلام سے آؤ گے تو بچ جاؤ گے، مگر میری بات کو انہوں نے تسلیم نہ کیا بلکہ میرے

قتل کرنے کے درپے ہو گئے بہت جلدی ہماری مشکلات اس سے بھی بڑھ جائیگی۔
اور یہ عربوں کی قدرت و طاقت اور عزت و کرامت نہیں رکھتے اتنی عظیم سلطنتوں سے
ٹکرے کر ان کو تباہ و برباد کر دیں، بلکہ آسمان و زمین کے مالک اللہ تعالیٰ کی
طرف سے ہے۔

ہرقل کا خواب اور پھر انطاکیہ سے فرار

(۲) اسی طرح ناسخ التواریخ میں ہے کہ ہرقل سویا ہوا تھا کہ اس نے خواب میں
دیکھا کہ آسمان سے ایک شخص اترتا اور اس نے ہرقل کو تخت سے نیچے گرا دیا۔ اور
تاج اس کے سر سے لے لیا اور کہا ارمن سوریتہ یعنی ملک شام سے تیری سلطنت کے
زوال کا وقت پہنچ گیا ہے۔ اور وہ کیا دیکھتا ہے کہ اس کے لشکر میں سخت آندھی چلی،
اور آگ بھڑک اٹھی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ہرقل گھبرا کر بیدار ہوا اور اس کو یقین ہو گیا کہ
میں عربوں کے مقابلے میں برقرار نہیں رہ سکتا اور اس کے بعد اپنے ہم شکل جبریل کو
لشکر کی قیادت سونپ کر رات کی تاریکی میں انطاکیہ سے قسطنطنیہ کی طرف بھاگ
نکلا اور لشکر اسلام نے انطاکیہ کو فتح کر لیا۔ اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا اور ہزاروں
رومی قیدی بنائے گئے (حصہ ۳۳ - جلد دوم، کتاب دوم)

تورات کی بشارت

(۳) اس ضمن میں کتاب دانیال علیہ السلام سے اس لشکر خداوند کے غلبہ اور
نصرت اور معونت اور خلافت الہیہ کی شان ملاحظہ کرتے چلیں۔ شاہ باہل،
بخت نصر نے خواب دیکھا جو اسے بھول گیا اس نے اپنے درباری معتبرین و حکماء
اور بیت المقدس فتح کرنے کے بعد گرفتار کئے ہوئے یہودیوں کو خبردار کیا کہ میرا
خواب بھی بتلاؤ اور اس کی تعبیر بھی دو کہ نہ سب کو قتل کر دوں گا۔ تو حضرت دانیال
علیہ السلام نے وہ خواب بھی بتلایا۔ اور اس کی تعبیر بھی۔ ملاحظہ ہو عہد نامہ قدیم یعنی تورات میں

اسے بادشاہ تو نے ایک بڑی مورت دیکھی وہ بڑی مورت جس کی رونق بے نہایت تھی۔ تیرے سامنے کھڑی ہوئی۔ اور اس کی صورت ہمیت ناک تھی۔ اس مورت کا سر خالص سونے کا تھا۔ اس کا سینہ اور اس کے بازو چاندی کے تھے۔ اس کا شکم اور اس کی رانیں تانبے کی تھیں۔ اس کی ٹانگیں لوہے کی اور اس کے پاؤں کچھ لوہے اور کچھ مٹی کے تھے۔ تو اسے دیکھتا رہا، یہاں تک کہ ایک پتھر ہاتھ لگائے بغیر ہی کاٹا گیا۔ اور اس مورت کے پاؤں پر جو لوہے اور مٹی کے تھے رگا۔ اور ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تب لوہا، اور مٹی اور تانبا اور چاندی اور سونا ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ اور تانبا ستانی کھیان کے بھوسے کی مانند ہوئے۔ اور ہوا ان کو اڑا کر لے گئی۔ یہاں تک کہ ان گلپتہ نہ چلا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو توڑا، ایک بڑا پہاڑ بن گیا۔ اور تمام زمین میں پھیل گیا وہ خواب یہ ہے اور اس کی تعبیر بادشاہ کے حلقہ زبیاں کرتا ہوں۔

اے بادشاہ! تو شہنشاہ ہے جس کو آسمان کے فدا نے بادشاہی اور توانائی اور قدرت و شوکت بخشی ہے۔ اور جہاں کہیں بنو آدم سکونت کرتے اس نے میدان کے چرندے اور ہوا کے پرندے تیرے حوالے کر کے تجھے ان سب کا حاکم بنایا ہے۔ وہ سونے کا سر تو ہی ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت برپا ہوگی جو تجھ سے چھوٹی ہوگی اور اس کے بعد ایک اور سلطنت تانبے کی ہوگی جو تمام زمین پر حکومت کرے گی۔ اور چوتھی سلطنت لوہے کی مانند مضبوط ہوگی اور جس طرح لوہا توڑ ڈالتا ہے۔ اور سب چیزوں پر غالب آتا ہے۔ ہاں جس طرح لوہا سب چیزوں کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ اور کھلتا ہے۔ اس طرح وہ ٹکڑے ٹکڑے کرے گی اور کھل ڈالے گی اور جو تو نے دیکھا کہ اس کے پاؤں اور انگلیاں کچھ تو کھار کی مٹی کی اور کچھ لوہے کی تھیں سو اس سلطنت میں تفرقہ ہوگا مگر جیسا کہ تو نے دیکھا اس میں لوہا، مٹی سے ملا ہوا تھا اس میں لوہے کی مضبوطی ہوگی اور چونکہ پاؤں کی انگلیاں کچھ لوہے کی اور کچھ مٹی کی تھیں اس لیے سلطنت کچھ قوی اور کچھ ضعیف ہوگی اور جیسا کہ تو نے دیکھا کہ لوہا مٹی سے ملا ہوا تھا۔

وہ بنی آدم آمیختہ ہوں گے۔ لیکن جیسا بوبا، مٹی سے میل نہیں کھاتا۔ ویسے ہی وہ بھی باہم میل نہ کھائیں گے۔ اور ان بادشاہوں کے ایام میں آسمان کا خدا ایک سلطنت برپا کرے گا جو تا ابد نیست نہ ہوگی۔ اور اس کی حکومت کسی دوسری قوم کے حوالہ نہ کی جائے گی۔ بلکہ وہ ان تمام مملکتوں کو ٹکڑے ٹکڑے اور نیست کرے گی۔ اور وہی ابد تک قائم رہے گی جیسا تو نے دیکھا۔ کہ وہ پتھر پاؤں لگائے بغیر پہاڑ سے کاٹا گیا۔ اور اس نے لوہے اور تانبے اور مٹی اور چاندی اور سونے کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ خدا تعالیٰ نے بادشاہ کو وہ کچھ دکھلا دیا جو آگے ہونے والا ہے۔ اور یہ خواب یقینی ہے۔ اور اس کی تعبیر یقینی ہے۔

اقول :- اس طویل اقتباس کو بار بار غور سے پڑھئے اور بتلائیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس حکومت کو پتھر سے پہاڑ کی صورت میں بخت نصر کو دکھلایا وہ کونسی ہے۔ اور دانیال علیہ السلام کے بقول جو ابدی ہے اور نیست و نابود ہونے والی نہیں وہ کون سی حکومت ہے۔ اور بخت نصر اور اس کے جانشینوں کے علاقوں پر جو حکومت غالب آئی وہ کون سی اور کیا ہے کوئی عقل سلیم کا مالک جو اس میں شک و شبہ اور تردد سے کام لے کہ وہ سلطنت سلطنت اسلام ہے جو خلافت راشدہ کے دور میں پھیل کر پہاڑ کی صورت ناقابل شکست و رنجت ہوئی اور بقول دانیال علیہ السلام اسے اللہ تعالیٰ قائم کرنے والا ہے۔ اور ہمیشہ کے لیے برقرار رکھنے والا کیونکہ چودہ صدیوں کے بعد وہ علاقے بہر حال اسلام کے زیر اقتدار ہیں اور اہل اسلام ہی ان کے حاکم ہیں گو نظام خلافت برقرار نہیں رہا۔ اور یہ گواہی تورات کے علاوہ زبور نے بھی دی۔ اور قرآن نے اس سے حمایت رہے ہوئے بیان فرمایا ہے

”وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ ”اَرْضٌ يَرِثُهَا

عِبَادِي الصَّالِحُونَ“

یعنی البتہ تحقیق ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا کہ اس زمین کے میرے صالحین کے وارث ہوں گے اور کون کہہ سکتا ہے کہ غلامان مصطفیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے

علاوہ اس زمین کے وارث صالحین بندے ہوئے لہذا خلافت راشدہ کا دور ہی اس توہرات و زبور کی شہادت کا مصداق ہے۔ اور وہ خلافت ہی خلافت موعودہ ہے۔ جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے آیت استخلاف میں فرمایا۔ اور اس کی تفسیر و تاویل حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اس خلافت کے ساتھ فرمائی لہذا کتاب اللہ اور اہل بیت کے اتفاق اور توہرات و زبور کی تائید سے اس خلافت کا خلافت حقہ ہونا ظاہر اور واضح ہو گیا اور اس کا مقصود باری تعالیٰ ہونا بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا۔

تنبیہ الامامیہ از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

جواب سے عجز اور بے بسی

نوٹ: علامہ ڈھکو صاحب نے بنیادی دلائل یعنی حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے غزوہ فارس اور غزوہ روم میں قیمتی مشوروں اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی محبت و مودت اور ارادت و عقیدت اور ان کے لشکر کو اللہ تعالیٰ کا لشکر قرار دینا اور ان کے دین و مذہب کو اللہ تعالیٰ کا دین قرار دینا اور خلافت کو خلافت موعودہ قرار دینا وغیرہ نظر انداز کر کے ضمناً اور تبعاً مذکور ایک عبارت پر جرح اور قدح شروع کر لی۔ آخر کسی کتاب کا جواب دینے اور رد کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ کہ جس کا کچھ جواب آتا ہو وہ دے دیا اور جس کا جواب نہ آتا ہو اس کو چھوڑ دیا۔ اور شیر مادر سمجھ کر مفہم کر گیا کہ گویا اس عبارت کا کتاب میں ذکر ہی نہیں تھا۔

نیج البلاغہ کی تمام تہ عبارات کے متعلق تقریباً ڈھکو صاحب کا یہی طرز عمل رہا ہے نہ کہتے ہیں حوالہ غلط ہے۔ نہ کہتے ہیں روایت ضعیف ہے۔ نہ کہتے ہیں طرز استدلال غلط ہے۔ بس مکمل خاموشی کے ساتھ تقیہ کے پردے میں گزر جاتے

ہیں جو ان کی بے بسی اور عاجزی کا کھلا اور بین ثبوت ہے۔ بہر حال ناسخ التواریخ کے ضمنی حوالہ کے متعلق جو کچھ گویا افشانی کی ہے۔ وہ ملاحظہ ہوا اور پھر اس کے جوابات ملاحظہ فرمائیں رسالہ تترہیم الامیہ از ص ۱۱۸ تا ص ۱۲۲ ملخصاً۔

پیر صاحب آف سیال شریف تحریر فرماتے ہیں۔ اب سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تعامل ملاحظہ ہو۔۔۔ درکار ہا و لشکر کشیہا اور اعانت مبفر مودوئے نیکو میداد۔

۱۱۔ پیر صاحب نے اپنی عادت شریفہ کے مطابق اس حوالہ میں جس طرح قطع و برید کی ہے۔ دجل و فریب کی دنیا میں اس کی مثال شاذ و نادر ہی ملے گی۔ (۱۲) صاحب ناسخ التواریخ فرماتے ہیں، اگرچہ شیطان حیدر کترار کے عقیدہ کے مطابق حضرت علی علیہ السلام عمر کی خلافت کو غاصبانہ سمجھتے تھے۔ لیکن (۱۳) وہ اپنی روایت بلند حوصلگی اور قوت ایمانی کی بنا پر اسلام اور مسلمانوں کی بھلائی کے کاموں میں اور لشکر کشیوں میں ان کی اعانت کرتے اور مفید مشوروں سے نوازتے تھے چنانچہ اس موقع پر جناب امیر علیہ السلام نے وہ صائب مشورہ دیا جن کا تفصیلی تذکرہ نہج البلاغہ کے خطبہ ۱۶ میں موجود ہے جسے مولف نے نقل بھی کیا ہے۔

۱۲۔ باب عقل و انصاف غور فرمائیں کہ اگر اس پس منظر میں ناسخ کی پوری عبارت پڑھی جائے۔ تو اس سے فدا انت نہ ہا بطلان واضح ہوتا ہے، یا اس کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

۱۳۔ اب رہا عبارت کا ابتدائی جملہ علی علیہ السلام بقیات مردم شیعہ اگرچہ خلافت عمر را از راہ غصب میدانست الخ کو چھوڑ کر سب در ۱۰۰ و ۱۰۰ سالہ عمر کو اعانت سے فرمود، سے استدلال کہ تا کہ اگر حضرت امیر علیہ السلام نہ انت عمر کو صحیح ہیں سمجھتے تھے تو یہ مشورہ کیوں دیا کہ تم میدان میں جاؤ کہ وہ وہاں جاتے اور مارے جاتے تو جناب امیر کی خلافت کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا۔ تو یہ استدلال بچند وجہ درست نہیں۔

اولاً

جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہوتا ہے۔ لہذا غلط مشورہ دینے کا حضرت امیر علیہ السلام کے متعلق تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا جیسے کہ کوتاہ اندیش ملاؤں کا خیال ہے کہ غلط مشورہ دے کر خلافت حاصل کر لیتے۔

ثانیاً:

بوقت مشورہ حضرت امیر کے سامنے صرف حضرت عمر کی موت و حیات کا سوال نہ تھا بلکہ اسلام کی بقا و بقا کا مسئلہ درپیش تھا اور اگرچہ اس وقت تک لوگوں نے جناب امیر کی ولایت کا اقرار نہیں کیا تھا مگر کفر اور شرک کی وادی سے نکل کر خدا کی توحید اور رسول خدا کی رسالت کا اقرار کر کے اسلام کی چار دیواری میں داخل تو ہو گئے جیسے صاحب نامی نے کہا ہے۔

در غلبہ اسلام ازیں کم نبود کہ کافران بوحضرت خدا و نبوت پیغمبر اقرار مے دارند و راہ بکوچ سلامت نزدیک مے گردند۔

ثالثاً:

مشورہ طلب کرنے یا مشورہ دینے سے حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تعلقات کو خوشگوار سمجھ لینا محض خوش فہمی ہے جس طرح عزیز مصر کا محبوب یوسف علیہ السلام کی طرقت تعبیر خواب میں رجوع تعلقات کی خوشگوار کی دلیل نہیں تھا، بلکہ یوسف علیہ السلام کے برحق نبی ہونے کی دلیل اسی طرح صائب مشورہ آپ کے امام برحق ہونے کی دلیل ہے۔

رابعاً:

چونکہ حضرت امیر غزوات نبویہ میں جناب حضرت عمر کے جنگی کارنامے دیکھ چکے تھے اس لیے اندیشہ تھا کہ وہ قرار اختیار نہ کریں اور اسلام اور اہل اسلام کی

توہین نہ ہو لہذا کسی تجربہ کار جرنیل کو بھیجنے کا مشورہ دیا جس سے ظاہر ہے کہ عمر صاحب ان صفات سے عاری تھے۔

خامساً:

اگر اصحاب ثلاثہ حضرت امیر کی نگاہ میں برحق خلیفے ہوتے تو بڑی بڑی جنگوں اور فوج کشیوں میں آپ جیسا آزمودہ کار اسلامی جرنیل کیوں شامل نہ ہوا یا کیوں شامل نہ کیا گیا؟ اب منطق کی جس شکل سے بھی نتیجہ نکالو، یہی ثابت ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں اصحاب ثلاثہ برحق خلفاء رسول نہیں تھے۔

”والحق مع علی وعلی مع الحق“

الجواب بفضل اللہ المتعال۔

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہ

تحفہ حسینیہ
جواب لاول

(۱) حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کے دو مشورے ذکر فرمائے ہیں جو پنج البلاغہ سے منقول ہیں۔ اور دو عبارتیں فروع کافی اور ناسخ اتواریح کی ذکر فرمائیں فروع کافی میں یہ مذکور ہے کہ ”القتال مع الامام الغیر المفروض طاعته حرام قطعاً۔ لا غزو الا مع امام عادل“۔ کہ ایسے امام کی معیت میں جہاد اور قتال حرام ہے اور قطعی حرام ہے جس کی اطاعت اللہ تعالیٰ نے فرض نہ کی ہو اور جہاد صرف امام عادل کے ساتھ اور اس کی معیت میں جائز ہے اس منوئی کے ساتھ پنج البلاغہ کے دو اقتباس عاکرا اور پھر نسخ اتواریح کی یہ عبارت عاکر دیکھیں تو ہر صورت میں نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مقدس نظریہ اور مذہب میں امیر المؤمنین عمر برحق خلیفہ تھے۔

اس لیے جواب میں ڈھکوسا جب کا یہ وادیلہ کہ پوری عبارت

نقل نہیں کی قطع و برید کی گئی۔ دجل و فریب سے کام لیا گیا وغیرہ اہل عقل اور رباب دانش کی نظریں پر کماہ کی حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعامل اور کردار بیان فرما رہے تھے نہ کہ مردم شعی کا عقیدہ فاسدہ تو کیا صاحب ناسخ نے اس تعامل کا اقرار کیا ہے۔ یا نہیں جب ایک طرف تعامل کا اقرار ہے تو جواب فروع کافی کی روایت کا دینا چاہئے تھا کہ جب یہ جہاد و قتال ہی مردم شعی کے عقیدہ فاسدہ میں حرام تھا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اس حرام کام میں لوگوں کو شامل کرنے اور میدان جنگ میں بھیجنے کے مشورے کیوں دیتے رہے اور خود حصہ کیوں بنتے تھے۔ لہذا ان دونوں عبارتوں کو اور بیخ البلاغہ والی عبارتوں کو سامنے رکھیں تو آپ کے مقدس نظریہ و عقیدہ میں امیر عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت برحق معلوم ہوتی ہے یا شیعہ کے نظریہ فاسدہ میں حضرت ابوالاثمہ کی عصمت ختم ہوتی ہے اور حرام کام میں آپ کی حصہ داری لازم آتی ہے جب دولوام میں سے دوسرا لازم و یقین کی نظر میں باطل ہے تو لامحالہ شق اول متعین ہو گئی اور آپ کی نظر میں خلافت نا۔ و قیہ کا برحق ہونا واضح ہو گیا۔

لمحہ فکر یہ ہے۔ دنیا ئے عدل و انصاف میں کیا اس کی کوئی نظیر ملتی ہے کہ دلیل کے اجزاء اور حصص میں سے اہم جزو اور حصہ کو نظر انداز کر کے جوابی کارروائی شروع کر لی جائے جب ایک طرف امام جعفر کا فتویٰ ہے اور دوسری طرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعامل تو نتیجہ بہر حال وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے بیان فرمایا بلکہ شعی عقیدہ کو شعی کتب کے حوالے سے ہی باطل فرمایا۔

رسالہ مذہب شیعہ کا مطلب شاید ڈھکوسا صاحب نے یہ سمجھا کہ جو کچھ ذاکر صاحبان بیان کرتے ہیں یا اوٹ پٹا لگ کشید کردہ نظریات بیان کئے جاتے ہیں شیخ الاسلام علیہ الرحمہ بھی وہی بیان کرتے آپ کا مقصد اس رسالہ کی تالیف سے صرف اور صرف یہ تھا کہ شعی کی رو سے جو صحیح عقیدہ ہونا چاہیے وہ بیان کیا جائے۔ اور انہی کلام کا یہ اور عقیدہ واضح کیا جائے۔

ڈھکو صاحب اس دجل اور فریب کاری سے کام خود لیتے ہیں اور الزام حضرت شیخ الاسلام کو دیتے ہیں ہاں کیوں نہ ہو آئینہ میں اپنی صورت ہی نظر آتی ہے۔

جواب الثانی

شق ثانی ڈھکو صاحب نے یہ ذکر کی تھی کہ اس عبارت کا مقصد یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ کیوں نہ دیا کہ میدان جنگ میں چلے جاؤ تاکہ آپ وہاں شہید ہو جاتے اور خلافت مرتضوی کے لیے راستہ ہموار ہو جاتا۔ حضرت شیخ الاسلام کے پورے کلام میں یہ طرز استدلال کہیں بھی مذکور نہیں ہے۔ بلکہ صرف اتنا قدر مذکور ہے:-

مسلمان بھائیو! اور نہیں تو اتنا کم از کم سوچو کہ اس قسم کے مشورے دوست اور خیر خواہ دیا اور لیا کرتے ہیں یا دشمن؟ ۵

جس کا مطلب اور مقصد حضرت شیخ الاسلام کی مفصل عبارت اور ہماری پیش کردہ فوائد عبارت کی طویل فہرست سے ظاہر اور واضح ہے۔ اور وہ مطلب قطعاً نہیں کہ آپ کو مشورہ دیا جاتا کہ میدان جنگ میں جاؤ تاکہ شہید ہو کر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے ذرہ خلافت ہموار کر دو اگر یہ مشورہ دینا عداوت اور دشمنی ہوتی تو اہل سنت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے اعداء میں شمار کرتے نفوذ باللہ جنہوں نے بنفس نفیس میدان جنگ میں جانے اور اطراف و اکناف کے اہل اسلام کو بھی ہمراہ لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔

اور کون عقل کا اندھا یہ کہہ سکتا ہے کہ میدان جنگ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جانا ان کے شہید ہونے کے مترادف تھا؟ اس پر کیا دلیل یا معمولی قرینہ بھی قائم ہو سکتا ہے۔ حضرت خالد جیسے خطر پسند جو نیل جو تہا ہزاروں سے لڑتے رہے میدان جنگ میں شہید نہ ہوئے تو آپ کے شہید ہونے کا یقین کس کو ہو سکتا تھا؟

بلکہ وجہ استدلال صرف اور صرف یہ تھی کہ تمہاری فتح و نصرت کا اللہ تعالیٰ ضامن ہے اور تم سے ہی اہل اسلام کا باہمی ربط و ربط ہے اور تمہارے شہید ہو جانے پر ان میں باہمی اتحاد و اتفاق برقرار نہیں رہے گا وغیرہ وغیرہ لہذا تم خود میدان جنگ میں نہ جاؤ۔ اگر اس میں ایک پہلو مصلحت اور منفعت والا ہے کہ اہل اسلام بے جگری سے لڑیں گے تو دوسرا پہلو ضرر اور نقصان والا بھی ہے۔ بلکہ وہ زیادہ خطرناک ہے۔ لہذا وزنی لئے یہی ہے کہ خود تشریف نہ لے جاؤ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مشورہ لینا اور آپ کا خلافت فاروقیہ کو اس طرح خراج عقیدت پیش کرنا دوستی کی دلیل بنایا گیا۔ اور دشمنی اور عداوت کے معدوم ہونے کی اور شیعہ ترغیبات و تخیلات کے خرابہ و باطل ہونے کی حجت اور دلیل بنایا گیا۔

لہذا جو بیماری ڈھکوسل صاحب نے کی ہے وہ اپنے توہمات اور تخیلات حمادہ کے قلعہ اور محل سرائے پر ہے نہ کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے طرز استدلال پر۔ مقام تعجب ہے کہ آپ نے ابن میثم اور ناسخ التواریخ وغیرہ کے حوالوں سے جو معافی اور مطالب حضرت امیر کی عبادت کے متعین فرمائے اور اس خلافت کو اللہ تعالیٰ کی موعود خلافت قرار دیا اور تمکین دین اور خوف کو امن سے بدلنے کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت کا اعلان فرمایا اس وجہ استدلال کو تو ہاتھ نہ لگایا اور ایک حرف بھی اس کے رد و انکار میں ذکر نہ کیا اور جو آپ نے نہ ذکر کیا نہ آپ کے ذہن میں وہ تصور و خیال تھا وہ فرض کر کے اس پر جرح و قدح شروع کر لی۔ کیا رشو قدح اور جوابی کاروائی کا طریقہ یہی ہوتا ہے؟

الغرض اس حقیقت کے واضح ہونے کے بعد ہمیں شق ثانی پر پانچ وجوہ سے ڈھکوسل صاحب کی جرح و قدح کا جواب دینے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی لیکن ارباب عقل و دانش پر ان کی سخافت اور سفاہت ظاہر کرنے کے لیے ان پر بھی مختصراً تبصرہ کیے دیتے ہیں۔

جواب نمبر ۱۔ یہ بجا کہ جس سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امن ہوتا ہے۔ اور اس کو

صحیح مشورہ دینا چاہیے۔ مگر غاصبانہ اور ظالمانہ حکومت کو حکومت اسلام اور خلافت الہیہ قرار دینا اور اس خلیفہ کے دین کو اللہ تعالیٰ کا دین اور اس کی افواج کو اللہ تعالیٰ کی فوج اور ان کی فتح و نصرت کا اللہ تعالیٰ کو ضامن قرار دینے اور نہ مائتہ رسالتاب کی طرح ملائکہ کی معاونت کی امید دلانے کا آخر کیا مطلب تھا؟ مشورہ جس امر کے متعلق تھا صرف اس پر اکتفا کیا جاتا۔

جواب غائب: ڈھکوساحب فرماتے ہیں مشورہ دیتے وقت حضرت علی المرتضیٰ کے سامنے صرف عمر صاحب کی موت و حیات کا مسئلہ نہ تھا بلکہ اسلام کی بقا و فنا کا مسئلہ تھا مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ جب شیعہ صاحبان کے نزدیک اسلام رہ ہی نہیں گیا تھا اور نہ مسلمان بلکہ ارتد الناس (اٹل شد یعنی سوائے ان افراد کے دوسرے تمام صحابہ العباد باللہ مرتد ہو چکے تھے۔ اور وہ اپنا مذہب اور دین چلا رہے تھے تو دین حق اور مذہب اسلام جب تھا ہی نہیں تو کس کی بقا کے لیے حضرت امیر علیہ السلام نے جہاد و قتال حرام ہونے کے باوجود حصہ داری اختیار فرمائی اور مجاہدین و مجاہدین اور ان کے امیر اور خلیفہ کی مدد و ثناء میں رطب اللسان ہو گئے؟

نیز شیعہ صاحبان فرماتے ہیں جس کا ولایت علی پر ایمان نہیں وہ نماز پڑھے یا نہ کرے برابر ہے۔ ملاحظہ ہو محاسن المؤمنین، قاضی نور اللہ شوشتری ج اول ص ۲۸۲ "مَنْ كُنْ يُوَالِ مِنْ الْاِثْنَيْنِ سَيَاثِرُ عِنْدَ اللَّهِ صَلَّى اَوْ نَفَىٰ۔"

اس مضمون کلام ہدایت انجام حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام است کہ سَوَاءٌ لِمَنْ خَالَفَ هَذَا الْاِمْرَ صَلَّى اَوْ نَفَىٰ، یعنی مخلوق میں سے جو شخص ولی خدا سے محبت نہیں رکھتا اللہ تعالیٰ کے نزدیک برابر ہے نماز پڑھے یا نہ کرے اور یہی مضمون ہے امام صادق کے فرمان کا کہ جو امر امامت کا مخالف ہے اس کی نماز اور نہ نابرہ ہے۔ تو جس مذہب و ملت کی وجہ سے نماز اور نہ نابرہ ہو اس میں اسلام نام کی کونسی شے ہوگی اور اس کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے؟ اگر شہادت توحید و رسالت مفید ہو تو پھر نماز نہ نا کے برابر نہیں ہو سکتی اور برابر ہے تو پھر اس

شہادت کا فائدہ نہیں ہو سکتا لہذا اس مقصد کے تحت بھی ایسے مشورے دینے کا کوئی جواز نہیں۔ اور نہ ایسی حکومت اور خلافت کو خلافت النبیہ قرار دینے کا۔

جواب نمبر ۳:- ڈھکوصا صاحب نے جنگ کے متعلق مشورہ کو عزیز مصر کے یوسف علیہ السلام سے تعبیر خواب پوچھنے پر قیاس کیا ہے۔ اس بد فہمی اور کج بحثی کا بھی کوئی علاج ہے؟ کہاں تعبیر خواب کا معاملہ جو مومن عیسائی اور یہودی سے پوچھ سکتا ہے اور کافر مومن سے اور کہاں جنگ اور حرب و قتال کا معاملہ اور اس کی تدبیریں جو اخص الخواص کے بغیر کسی پر ظاہر نہیں کی جا سکتیں۔ شاید ڈھکوصا صاحب اس صلاح و مشورہ کو بھی خواب ہی قرار دے رہے ہیں اور حضرت امیر علیہ السلام کو اس کی تعبیر دینے والا، ڈھکوصا صاحب ذرا پنک سے ہوشیار ہونے کے بعد سوچو کہ جنگی معاملات پر صلاح و مشوروں کو تعبیر خواب سے کوئی نسبت اور تعلق ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بھی مستی اور بد ہوشی میں یاد نہیں رہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر عزیز مصر نے پوچھی تھی جس نے ان کو قید کر رکھا تھا یا بادشاہ مصر نے جس نے عزیز کو معزول کر دیا تھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو منصب وزارت سونپ دیا تھا۔ علاوہ ازیں صحیح تعبیر کو دلیل نبوت بنا دیا گیا ہے۔ اور صحیح مشورہ کو دلیل امامت، سبحان اللہ حجة اسلام اور عہد العصر جو ٹھہرے ایسے لغو استدلال ذکر نہ کریں تو کیا کریں؟ کیا محض صحیح تعبیر نبوت کی دلیل ہے؟ یوں تو سارے اکمل معبرین نبی بن جائیں گے! اور اگر سارے صحیح مشورہ دینے والے امام برحق ہیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے صحیح مشوروں کو خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم قبول فرماتے رہے۔ اور قرآن مجید آپ کی موافقت میں اُترتا رہا۔ پھر آپ کی امامت پر اعتراض کیوں؟ ہر رائے کا صحیح ہونا تو وہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنے حق میں تسلیم نہیں بلکہ آپ ہمیشہ قیس بن سعد کو امارت مصر سے معزول کرنے اور حضرت محمد بن ابی بکر کو امارت سونپنے پر پکھتاتے رہے۔ اور اظہار انسوس کرتے رہے۔ اور امام حسن رضی اللہ عنہ نے بصرہ کی طرف جانے اور اصحاب جمل کے ساتھ راہ راست جنگ کرنے سے روکا مگر آپ نے نہ صرف ان کے

مشوروں کو رد کیا بلکہ خود مار کر ان کی پٹلی کو زخمی کر دیا۔ ملاحظہ ہو شرح حدیدی ص ۱۴
 لہذا جب ہر مشورہ امام کا قابل قبول ہونا ضروری نہ ہو تو اس کو دلیل امامت کیونکر
 بنا سکتے ہیں؟ اور جب خود امام کو اپنے فیصلہ پر افسوس اور کھپتا والا حق ہو تو ہر
 سوچ اور نظریہ کو دلیل امامت کیوں کر بنا سکتے ہیں؟ ڈھکڑ صاحب محض شاعری
 سے کام لینا کافی نہیں معقول و منقول دلائل و براہین پیش کرو محض سید نواز شعلی
 شاہ صاحب کا عطیہ مضمون کرنے کے لیے چند ورق سیاہ کر دینا تو کافی نہیں ہو سکتا۔
 جواب نمبر ۱: حضرت امیر کو یہ اندیشہ تھا کہ عمر صاحب کہیں راہ فرار اختیار نہ کر لیں۔
 لہذا یہ مشورہ دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل کا معاملہ تو اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔
 وہی علیم بذات الصدور ہے۔ جہاں تک اظہار کا تعلق ہے۔ اور بیان کا تو آپ نے
 اس قسم کے تاثر اور گمان کا ادنیٰ سا اشارہ بھی نہیں فرمایا۔ چہ جائیکہ تصریح فرمائی
 ہو۔ لہذا جو صاف اور واضح ارشادات ہیں اور عبارت و اشارت اور دلالت
 و اقتضائے لحاظ سے حضرت فاروق اعظم کے خدا داد کمالات اور اوصاف پر دلالت
 کرتے ہیں ان کو چھوڑ کر اس زائے خانی پر اتار آنا یہود منش سبائی ٹولہ کا ہی کام ہو
 سکتا ہے۔ کوئی منصف غیر مسلم بھی ایسی بات نہیں کہہ سکتا چہ جائے کہ مومن ہے
 ہونے کا مدعی۔

علاوہ ازیں بطور سپاہی لڑنا معلوم ہوا ہے۔ اور سپاہیوں کو لڑانا دوسرا امر
 ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص خود لڑے تو بہادری اور شجاعت کے نمایاں جوہر نہ
 نہ دکھلا سکے۔ لیکن تبا ویز اور طریق کار کے لحاظ سے کامیاب کمانڈر اور جرنیل
 ثابت ہو، جنگ کے لیے ہر فرما شمشیر زن ہونا لازم نہیں بلکہ بعض ایسے ذہین اور غور و فکر
 اور تدابیر و تجاویز سے شمشیر زنی کی نسبت زیادہ کار آمد ہوتے ہیں۔
 اور کوئی دیا نتدار افسان حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا حضرت علی
 رضی اللہ عنہ کے دور خلافت سے موازنہ کرے تو وہ اس فرق کو واضح طور پر
 محسوس کر سکتا ہے کہ کس نے انتہائی کامیابی کے ساتھ اس ذمہ داری کو نبھایا اور کونسا
 میدان کارزار سب سے جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قیصر و کسریٰ کے ساتھ مصالحت

اور مسالمت کا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ اور کونسا مقام ہے جہاں آپ کی افواج شکست اور پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اور کونسا موقعہ ہے، جہاں کمانڈروں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم اور فیصلہ کو نظر انداز کیا ہوا اور ان پر اپنی مرضی مسلط کی ہو، حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ جیسے کامیاب ترین جرنیل اور کمانڈر کو معزول کرنے پر بھی فتوحات میں کوئی فرق پڑا۔ یا ان کو محاذ آرائی کی جہالت ہوئی جب کہ مرتقنوی دور میں اس قسم کی صورت حال نظر نہیں آتی۔ آپ صفین میں جنگ بند کرنے کے حق میں نہ تھے۔ لیکن کمانڈروں اور افواج نے آپ کی مرضی کے برعکس بند کرنے پر آپ کو مجبور کیا۔ آپ حکیم پر راضی نہیں تھے مگر مجبور کیا گیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری کی ثالثی پر راضی نہ تھے مگر خواہ مخواہ ان کو ثالث بنا دیا گیا وغیرہ وغیرہ بالآخر حضرت امیر علیہ السلام کو مجبور ہو کر دعا کرنی پڑی کہ اے اللہ مجھے ان سے بہتر ساتھی عطا فرما اور ان کو مجھ سے بہترے حاکم اور مجھے اپنے پاس بلا لے۔ اس لیے یہ حقیقت تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ شیخین رضی اللہ عنہما میں روح محمدی اور نبوی پر تو اثر انداز تھا۔ اور کفر و شر کے دنیا میں انقلاب برپا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو منتخب فرمایا تھا۔ جس طرح رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر حقیقت میں نگاہ یہ فیصلہ دینے پر مجبور نظر آتی ہے۔ کہ انہوں نے حق نیابت اور خلافت ادا کر دیا۔ اور زمانہ اس قسم کے ناہمین اور خلفاء کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اور اسی فرق اور امتیاز سے مجبور ہو کر شیعہ صاحبان نے آیت استخلاف کو صرف حضرت محمدی علیہ السلام میں محصور اور محدود کر دیا اور خلافت مرتقنوی کو اس سے نکال دیا۔

عجیبہ: آدالوں میں اب دور محمدی میں بجائے ان کی خلافت کے اعلان کے سیدنا حضرت علی مرتقنی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کا اعلان ہوا اور آیت استخلاف سے ان کو خارج کر دیا جائے اس سے بڑھ کر دور فاروقی کے رعب اور دبدبہ کا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ اعداء و زید اندیشوں کے ذہن بھی

ماؤف ہو کر رہ گئے۔ اور تقنا دوتا قضا کا شکار ہو گئے۔ نیز حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معاملہ دور نبوی میں جو رہا، اس کو چھوڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت کے موقعہ پر جو انسا نے تراشے گئے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر ان کے ابو بکر صدیق کے ساتھ بیعت کرنے کے جوڈرائے سلج گئے۔ اس کے بعد بھی ان کو بزدل اور کم حوصلہ ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ کبھی افراط کا یہ عالم کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ کو ان کے سامنے بے بس تسلیم کیا جائے۔ اور کبھی تفریط کا یہ عالم کہ بھاگ جانے کے خطرہ کے تحت میدان جنگ میں جانے سے روک دیا ہے کوئی اس پر اور سی میں معقول انسان جو اس افراط و تفریط کی دلدل سے نکل کر راہ اعتدال پر کامزن ہو۔ اور اعتراف حقیقت میں بخل سے اور بغض و عناد سے کام نہ لے۔ ابن ابی الحدید معتزلی شیعہ نے اس ضمن میں بہت اچھا کہا ہے؟

ابن ابی الحدید معتزلی شیعہ کا منصفانہ فیصلہ

كَانَ مِنْ عَنَابَةِ اللَّهِ بِهَذَا الدِّينِ أَنْ الِهِمَّ الصِّمَابَةَ مَا فَعَلُوا وَ
اللَّهُ مَتَمُّ نَوْرِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (شرح حدیدی ص ۱۱ ج ۱۰)

اللہ تعالیٰ کی اس دین کے ساتھ خاص عنایت اور اس کی ترویج و ترقی اور اس کے غائبہ و تسلط کا حتمی ارادہ تھا اور خاص توجہ کہ صحابہ کرام کو علی الترتیب شیخین رضی اللہ عنہما کو خلیفہ بنانے کا الہام فرمایا اور اللہ تعالیٰ اپنے نور اسلام کو تام اور کامل کرنے والا ہے۔ اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند ہی کریں۔

ابن ابی الحدید نے کہا کہ اول اول حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خیال تھا کہ مجھے خلیفہ نہ بنا کر انہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اور دنیا کی طرف میلان اور رغبت کی وجہ سے مجھے نظر انداز کیا ہے۔ لیکن بعد میں آپ کو اطمینان ہو گیا کہ انہوں نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ عین صواب ہے۔ اور سراسر مصلحت اور دین و

ملت کے لیے انتہائی مفید اور کارآمد اور خواہشاتِ نفس اور حرص و ہوا کے تقاضوں سے سراسر پاک اور منزہ اقدام۔

هَذَا يَقْتَضِي أَنَّ امِيرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ فِي بَدْءِ أَمْرِهِ
يُظَنُّ أَنَّ الْعَقْدَ لَغَيْرِهِ كَانَ مِنْ غَيْرِ نَظَرٍ فِي الْمَصْلَحَةِ وَإِنَّهُ لَمْ
يَقْصِدْ بِهِ إِلَّا صَدْرَ الْأَمْرِ عَنْهُ وَالْإِسْتِثْنَاءَ عَلَيْهِ فَظَهَرَ مَا ظَهَرَ
مِنْهُ مِنَ الْإِمْتِنَاعِ وَالْقُعُودِ فِي بَيْتِهِ إِلَى أَنْ صَحَّ عَتْدُهُ وَ
ثَبَّتَ فِي نَفْسِهِ أَنَّهُمْ أَصَالِيُوا فِيمَا فَعَلُوا وَ أَنَّهُمْ
لَمْ يَمِيلُوا إِلَى هَوًى وَلَا أَرَادُوا الدُّنْيَا وَ إِنَّمَا فَعَلُوا
الْأَصْلَحَ فِي ظَنُونِهِمْ - الخ

(شرح حدیثی ج نمبر ۱ ص ۱۱۶)

یعنی حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کا ابتداء میں علیحدگی اختیار کرنا اس
ظن اور گمان پر مبنی تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے عقد
خلافت اور مہاجرین و انصار کے ان کی بیعت کرنے میں مصلحت کو ملحوظ
نہیں رکھا گیا۔ اور اس کا مقصد سرت مچہ سے خلافت کو دور کرنا اور مجاہدین کو
کو ترجیح دینا ہے۔ لہذا آپ بیعت کرنے سے بھی تڑکے رہے اور گھر میں بیٹھے رہے
حتیٰ کہ آپؐ کے نزدیک بالآخر یہ حقیقت درست ثابت ہو گئی اور آپ کے
نزدیک واضح ہو گیا کہ صحابہ کرام نے جو کچھ کیا ہے۔ وہ اس میں صاحبِ الرائے
ہیں۔ اور درست سمت میں قدم اٹھانے والے۔ اور یہ اقدام انہوں نے خواہشاتِ
نفس اور دنیوی میلان اور رغبت کے تحت نہیں کیا بلکہ اپنے خیال میں جو بہتر سمجھا
وہی کیا۔ الغرض حضرت امیر رضی اللہ عنہ اپنی خوشی اور رضا مندی سے ہی
مجلس مشاورت میں شامل ہوتے اور حضراتِ خلفاء کے ساتھ پورے خلوص اور
ہمدردی اور محبت و مودت اور اتحاد و یگانگت کی فضا میں مشورے دیتے اور
ان کی خلافت کو دین اسلام کی ترویج اور ترقی کا ضامن سمجھ کر اسی لیے ان کے

وصال کو ناقابل تلافی نقصان اور اسلام کے لیے نہ مند مل ہونے والا نہ ختم قرار دیا جیسے متعدد دفعہ اس کا حوالہ گزرا چکا ہے اور ڈھکو صاحب نے اس کو شیر مادر سمجھ کر ہضم کر لیا ہے۔

جواب نمبر ۵:- ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ اگر نگاہ مرتضوی میں یہ تینوں بہ حق خلیفے تھے تو آپ جیسا آزمودہ کار حربہ نیل بڑی بڑی جنگوں اور فتوحات میں کیوں شریک نہیں ہوا۔

۱:- اس کے جواب میں پہلی چیز تو قابل غور یہ ہے کہ ڈھکو صاحب نے خود اپنا رد کر دیا۔ اور اپنے سابقہ جواب کی تردید کر دی۔ پہلے کہا کہ شہادت توحید اور شہادت رسالت کی وجہ سے لوگ کفر سے نکل کر اسلام کے قریب ہو رہے تھے لہذا اس مصلحت کو سامنے رکھ کر آپ مجالس مشاودت میں شریک ہوتے تھے۔ تو اسی مقصد کو سامنے رکھ کر آپ جہاد میں کیوں نہ شریک ہوتے رہے۔ عملی طور پر جہاد میں شامل ہونے سے یہ مصلحت بطریق احسن حاصل ہو جاتی لہذا آپ کو اس کے حصول کے لیے عملی کوششیں بھی کرنی چاہئے تھیں صرف مشوروں پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ فرمائیے ڈھکو صاحب کچھ آیا سمجھ شریف میں اگر مشورہ صحیح تھا تو عمل جہاد بھی درست تھا لہذا خود ہی حصہ لینا چاہئے تھا کیونکہ حصہ نہ لیا؟ اگر کوئی خارجی کہہ دے لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ تو کیا جواب ہو گا؟ آپ کے پاس تو یقیناً جواب نہیں ہو گا۔ لیکن ہم بھروسہ اس کام نہ بھی اس طرح بند کریں گے کہ جنگ عام سپاہی بھی لڑ سکتا ہے۔ لیکن جنگ لڑنا ہر کسی کا کام نہیں۔ اور نہ وہ فرد واحد کا کام ہوا کرتا ہے۔ بلکہ ایک مشاورتی کمیٹی ہی اس فرض کو باحسن طریق سرانجام دے سکتی ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس اہم ترین کام کو سرانجام دیا کرتے تھے۔

دب، مسیدہ کذاب جیسے جھوٹے مدعیان نبوت کے خلاف کارروائی میں اور مانعین زکوٰۃ وغیرہ کے خلاف حرب و قتال میں اگر آپ شامل نہیں ہوئے اور کفار کو اسلام کے قریب اور سلامتی کے قریب کرنے کے لیے جہاد میں آپ نے حصہ نہیں لیا تو

اعتراف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر ہو گا۔ کہ انہیں صرف اور صرف اپنی امامت و خلافت سے سروکار تھا وہ ملتی تو تلوار کبھی میان میں داخل نہ کرتے اور نہیں ملی تو اس کو میان سے باہر نہیں نکالا۔ اور نہ ہی قدم گھرتے باہر رکھا۔ شاہ لوٹ شک کا ذہن یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے منحرف ہو جائیں۔ اور تھوٹے مدعیان نبوت کے دام تزویر میں پھنس جائیں یا احکام اسلام کو مسترد کر دیں اس کے برعکس خالد بن الولید جیسے صدیقی دور کے کمانڈر انچیف کو معزول کر دیا جاتا ہے۔ تو وہ ذرا بھر طلال اور کبیدگی ظاہر کیے بغیر..... کہتا ہے میں امیر عسا کہ ہو کر وہ خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ جو ایک سپاہی کی حیثیت سے کر سکتا ہوں۔ مجھے عمدہ سے غرض نہیں خدمت اسلام سے غرض ہے۔ تو ان مجبوں کے حق میں کیوں دیکھوں۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسمان کیوں ہو؟

”ج۔ بعض دفعہ اہم شخصیات کو میدان جنگ میں نہ بھیجنا ہی عین مصلحت ہوتا ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں اپنے ہمراہ نہ لیا اور نہ ہی آخری غزوہ میں امیر عسا کہ بتایا جس کو حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں بھیجنے کا عزم فرمایا تو کیا سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کر دے؟ یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بہادری پر؟ لاؤ اللہ صرف اور صرف یہی کہا جائے گا کہ مصلحت کو ملحوظ رکھا۔ تو ان حضرات نے بھی کسی اہم مصلحت کے تحت ایسا کیا ہو گا۔

”د۔ کیا آزمودہ کار جرنیل کا صرف یہی مصروف ہے کہ اس کو جنگ کی بھٹی میں جھونکے رکھیں کیا اس کے قیمتی صلاح و مشورہ سے زیادہ فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا؟ اس لیے ان حضرات نے آپ کو وزیر خاص اور مشیر خاص بنایا۔ اور ان کے مشوروں کو اہمیت دی اور بہت زیادہ منافع و مصالح حاصل ہوئے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے اس منصب کو خود بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

ص ۱۹

”انا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً“ (نہج البلاغہ مصری ج ۱ اول)

میں تمہارے لیے وزیر کی حیثیت میں زیادہ مفید و کارآمد

پھولیا بنسبت امیر اور خلیفہ ہونے کے، اور یہ اس وقت فرمایا جبکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مہاجرین و انصار آپ کے گرد جمع ہوئے۔ اور آپ کو خلافت و امامت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی درخواست کی تو آپ نے اپنا سابقہ منصب ان کے سامنے رکھا کہ میں اُسی حالت میں بہتر ہوں بہ نسبت اس نئی ذمہ داری سنبھالنے کے کیا خلافتِ خلفاء کی حقانیت صرف اسی صورت میں آپ کی نگاہوں میں ثابت ہوتی کہ سپاہی یا کمانڈر بنائے جاتے۔ اور وزیر و مشیر ہونے کی صورت میں اس خلافت کی حقانیت ظاہر نہیں ہو سکتی تھی؟

”الحق مع علی و علی مع الحق“ بجا لیکن حقائق کا مطالعہ کرو اور واقعات کا مشاہدہ کرو کہ وہ علی مرتضیٰ اور حق جو باہم لازم و ملزوم ہیں وہ کن کے ساتھ رہے؟ کن کے مشیر اور کن کے وزیر رہے؟ منطق کے قیاس اقتراہی کی باقی سمجھی اشکال کو چھوڑ کر شکلِ اول سے ہی نتیجہ معلوم کر لو۔ حق علی کے ساتھ ہے۔ اور علی اصحاب ثلاثہ کے ساتھ ہیں لہذا حق بھی ان کے ساتھ ہے۔ الحمد للہ علی ذالک۔

ڈھکوصاحب کی بے بسی :-

لیکن پھر عرض کر دوں یہ روایت جو ناسخ التواریخ سے حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر کی تھی وہ ضمنی طور پر ذکر کی گئی تھی۔ اصل دلائل پنج البلاغہ کے خطبات تھے۔ اور اس روایت کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کے ساتھ ملا کر شیعہ اذہان کو جھنجھوڑنا مقصود تھا۔ کہ ان دونوں عبارات کا حتمی نتیجہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کا نگاہِ مرتضوی میں برحق ہونا ہے۔ مگر ڈھکوصاحب نہ فروع کافی کی عبارت کو چھیڑتے ہیں اور نہ پنج البلاغہ کی عبارات کو اور نہ ان کی تشریحات کو جو ناسخ التواریخ اور ابن مہتمم کے حواصی سے پیش کی گئیں اور قرآن مجید کی آیت اور فرمانِ مرتضوی سے اس خلافت کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے موعود ہونا اور ثقلین کی شہادت سے اس کا برحق ہونا لہذا ڈھکوصاحب کو یہ اُدھار چکانا چاہیے۔ اور اپنے بردارانِ مذہب کو

اس بارے میں تسلی کرانی چاہیے۔ کہ حضرت علی مرتضیٰ اور قرآن کیا کہتے ہیں؟ اور ہم کیا کہتے ہیں اور کیوں؟ ادھر ادھر بھاگ دوڑا اور اصل اور ایم دلائل کو چھوڑ کر ذلی اور ضنی اور جزوی چیز کو لے کر اپنے ایمان کی طرح چند اوراق سیاہ کر دینا کافی نہیں ہو سکتا۔

رسالہ مذہب شیعہ، از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دعوائے خلافت بلا فصل و ستبراری

آئیے اب ہم آپ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا کھلا فیصلہ سنائیں جس کو اہل تشیع کے مجتہد اعظم یعنی صاحب ناسخ التواریخ نے نقل کیا ہے۔ ج ۲، ص ۱۹۱
 اگر ابو بکر و عمر سزاوار نہ بودند چگونہ بیعت کردی اطاعت فرمودی و اگر لائق خلافت بودند من از ایشان کمتر و فروتر بیستم چنان باش از برائے من کہ از برائے ایشان بودی۔ یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما خلافت کے مستحق نہیں تھے تو آپ نے ان کی بیعت کس طرح کی اور ان کی فرمانبرداری کیوں کرتے رہے؟ اور اگر مستحق خلافت تھے تو میں ان سے کم نہیں ہوں۔ میرے ساتھ آپ اس طرح موافقت و معاونت کریں جس طرح کہ ان کے زمانے میں ان کے ساتھ کرتے رہے۔

فقال علی عليه السلام اما الفرقة فمعاذ الله ان افترقا
 لها بابا واسهل اليها سبيلا ولكني انما اعمت عينها الله
 ورسوله عنه واهدتك الي رسوله واما عتيق وامين
 الخطاب فان كانا اخذاما جعله رسول الله لي فانت اعلم
 بذلك والمسلمون دما لي ولهذا الامر وقد تركت
 منذ حين فاما ان لا يكون حقي بل المسلمون فيه شرع
 فقد اصاب السهم الشجرة واما ان يكون حقي دونهم
 فقد تركت لهم طيت نفسا ونفست يدي عنه استصلاحا۔

تو حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، لیکن تفرقہ اندازی تو اللہ تبارک و تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں تفرقہ اندازی کا دروازہ کھول دوں یا فتنہ کا راستہ آسان کر دوں، میں آپ کو صرف اس چیز سے منع کرتا ہوں جس چیز سے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا، اور میں آپ کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہوں۔ رہا ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کا معاملہ تو اگر انہوں نے اس چیز کو غضب کر لیا ہوتا، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے لیے مختص فرمایا تھا، تو آپ اور دوسرے اہل اسلام اس کو زیادہ جانتے نہتے اور مجھے اس خلافت کے ساتھ واسطہ ہی کیا ہے، ہمالا تک میں نے تو اس کے خیال کو بھی مدت سے ذہن سے نکال دیا ہوا ہے۔ پس خلافت کے متعلق دو ہی احتمال ہیں ایک یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلافت صرف میرا حق نہ تھا بلکہ سبھی مسلمان یعنی صحابہ کرام اس میں مساوی طور پر حصہ دار تھے، تو اس صورت میں خلافت جس کا حق تھی، اس کو مل گئی، حق بحق دار رسید۔ دوسری صورت یہ تھی کہ خلافت صرف میرا ہی حق تھا۔ دوسرے کسی شخص کا حق نہیں تھا، تو میں نے ان خلفاء کے لیے چھوڑ دی اپنی خوشی اور رضا کے ساتھ اور بطیب خاطر اپنا حق ان کو بخش دیا اور صلح و صفائی کے ساتھ ان کے حق میں دستبردار ہو گیا۔

لیجئے صاحب! یہ ہے مولیٰ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا حتمی فیصلہ۔ جب مولیٰ نے مشکل کشا کرم اللہ وجہہ الکریم فرمادیں کہ اگر صرف میرا حق تھا، تو میں نے صلح و صفائی کے ساتھ اور خوشی اور رضا کے ساتھ امر خلافت ان کو بخش دیا اور ان کے حق میں دستبردار ہو گیا اور آج کل کے ذاکروں کے یہ ٹوٹکے کہ حیدر کرار شیر خدا رضی اللہ عنہ سے صحابہ کرام نے خلافت چھین لی اور غضب کر لی۔ اب انصاف سے کہیے کہ کس کو صحیح اور درست مانا جائے۔ ذاکر لوگ اپنی لمبی لمبی اذانوں میں وصی رسول اللہ و خلیفہ بلا فصل اور خدا جانے کیا کیا گانٹھتے چلے جاتے ہیں۔ کیا اس سے حضرت

سیدنا علی مرتضیٰ اکرم اللہ وجہہ الکریم کی صاف صاف تکذیب لازم نہیں آتی؟ منبروں پر چڑھ کر شیر خدا مولا مشکل کشا رضی اللہ عنہ کو بھٹلانا اور ان کی تکذیب کرنا کس محبت اور لوائی کا تقاضا ہے۔ اگر یہی محبت ہے تو پھر دشمنی کسے کہتے ہیں؟

از محمد حسین ڈھکو صاحب

تغزیہ الامامیہ

مؤلف رسالہ نے تاریخ التواریخ جلد دوم ص ۱۹۱ سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور عثمان دؤی النورین رضی اللہ عنہ کا ایک مکالمہ نقل کیا ہے جو مشہور سنی مؤرخ واقدی متوفی ۲۳۰ھ کی کتاب الشوریٰ سے منقول ہے۔ چنانچہ صاحب تاریخ التواریخ رقمطراز ہیں :-

واقدي در کتاب شوریٰ بن عباس حدیث کند کہ عثمان علی علیہ السلام را حاضر ساخت فقال :-
نشدتک الله ان تفتح للفرقة باباً۔ الخ

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل اہل سنت کی روایت ہے جو ہمارے خلاف حجت نہیں ہو سکتی یہ تو ہے روایتی سقم!

اور اس میں روایتی سقم یہ ہے کہ اس میں حق امامت دستبردار کا ذکر ہے جو کہ ناممکن ہے کیونکہ نبوت کی طرح امامت بھی ایک عہدہ خداوندی ہے جسے وہ عطا کرے وہ شخص نہ اس سے دستبردار ہو سکتا ہے اور نہ کسی دوسرے کو دے سکتا ہے۔
الخ من یہ روایت بے جوڑ ہے اور اس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔



تحفہ حسینیہ

از ابوالحسنات محمد انشرف السیالوی عفرہ

علامہ ڈھکو صاحب نے اس روایت کے متعلق دو سقم ذکر کئے ہیں ایک یہ کہ روایت سنیوں کی ہے۔ دوسری یہ کہ خلاف عقل ہے۔ کیونکہ امامت سے دست برداری یا اس کا انتقال دوسری جگہ ممکن نہیں ہے۔ امراؤل کے متعلق گزارش ہے کہ (۱) صاحب ناسخ نے ابتداً کتاب میں تصریح کر دی تھی کہ میں سنی اور شیعہ دونوں کی متفق علیہ روایات درج کر دے گا۔ اور کوئی روایت مذہب تشیع کے خلاف ہوئی تو اس میں اپنا مذہب و مسلک واضح کر دے گا۔ لہذا صاحب ناسخ التواریخ اس روایت کو ذکر کرنے کے جب کوئی جرح و قدح نہیں کرتا تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ اس کو نہ اس میں روایتی سقم نظر آیا نہ درایتی اور نہ اس کو اپنے مذہب و مسلک کے خلاف معلوم ہوئی۔

لہذا ڈھکو صاحب کو اب یہ سقم بیان کرنے کی ضرورت کیوں پڑی؟ اگرچہ عبارت صاحب ناسخ کی پہلے ذکر ہو چکی مگر دوبارہ اس کو ملاحظہ فرمائیں ناسخ جلد اول ص ۳۵۔

معلوم باد کہ راقم حروف در تاریخ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم و آل او۔ بیشتر خبر اہل سنت را بینگار و کہ شیعہ و سنی در آن اتفاق دارند و اگر سخنی بہ خلاف عقیدت علماء امامیہ اثنا عشریہ در میان آید آنرا باز می نماید۔

۲۔ یہی مضمون و مفہوم خود بیخ البلاغہ میں مندرج آپ کے خطبات سے بھی ثابت ہے۔ لہذا روایتی سقم کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔

۳۔ قبیلہ ہند کے ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تمہیں تمہاری قوم نے خلافت اور امامت سے کیوں دور رکھا حالانکہ تم اس کے زیادہ حق دار تھے! تو آپ نے اُس کے جواب میں ارشاد فرمایا:۔ فانہا كانت اشارة شمت علیہا

نفوس قوم و سخت عنہا نفوس قوم آخرین۔ بیچ البلاغۃ مصری ص ۳۶۸ جلد اول (یعنی امارت، و خلافت ایک اعزاز و امتیاز تھا اور تفوق و برتری کا ذریعہ جس پر ایک فریق نے نخل اور حرص کا مظاہرہ کیا اور دوسرے فریق نے جود و سخا کا مظاہرہ کیا۔ اگر جبر و اکراہ سے جاتی تو اس کو جود و سخا سے تعبیر نہ کیا جاتا۔ اور اگر جود و سخا ہے۔ تو پھر جبر و اکراہ نہیں ہے۔ بلکہ عفو و درگزر ہے اور یہی واقعی کی کتاب الشوریٰ والی روایت کا مدلول و مقصود ہے۔

”ب“ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد مہاجرین و انصار نے آپ کو خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے عرض کیا تو آپ نے فرمایا۔ دعونی والتسوا غیری (اے) وات ترکتمونی فاننا کا حد کم ولعلیٰ اسمعکم و اطوعکم لمن ولیتموہ امرکم وانا لکم وزیراً خیر لکم منی امیراً۔

بیچ البلاغۃ مصری جلد اول ص ۳۱۹۔

ترجمہ :- مجھے چھوڑیے اور میرے علاوہ اس منصب کے لیے کسی دوسرے شخص کو تلاش کرو۔۔۔۔۔ اور اگر تم مجھے چھوڑو اور اس ذمہ داری کے سنبھالنے پر مجبور نہ کرو تو میں تمہاری طرح ایک فرد ہوں اور ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری نسبت اس شخص کے حکم کو زیادہ قبول کرنے والا اور زیادہ اطاعت کرنے والا ہوں گا جس کو تم امر خلافت کا متولی اور مالک بناؤ اور میرا تمہارے لیے وزیر ہونا بہ نسبت تمہارا امیر ہونے کے بہتر ہے (لہذا مجھے وزارت کے منصب پر رہنے دو اور امارت کے لیے دوسرے شخص کا انتخاب کر لو) اس ارشاد سے بھی صاف ظاہر ہے کہ آپ کا حق اگر تھا بھی تو آپ اس کے لیے نہ کوشاں ہیں اور نہ اصرار کرنے والے بلکہ دوسرے شخص کو ملنے پر رضا مند ہیں۔ اور سب سے زیادہ اطاعت امیر اور اس کی فرمانبرداری کے لیے تیار اور صرف وزارت کے منصب پر رہ کر خدمت اسلام اور اہل اسلام کے لیے تیار و آمادہ۔

سوچنے کی بات ہے کہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے بعد ان کے مرتبہ کا اور ان جیسا سابق الاسلام اور قرب مصطفویٰ پر فائز کوئی شخص نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود اگر آپ ایسے شخص کی امامت و خلافت پر رضا مند ہو رہے ہیں اور اس کی وزارت قبول کرنے پر تیار تو شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں کیوں کہ راضی نہیں ہوں گے! ”ج“ آپ نے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کی اس شکایت پر کہ ہمیں مشورہ میں شریک نہیں کیا جاتا اور ہم سے امور خلافت کی انجام دہی میں کام نہیں لیا جاتا، ارشاد فرمایا ”واللہ ما کانت لی فی الخلافة رغبة ولا فی المولاۃ اریة ولکنکم دعوتونی الیہا وحملتونی علیہا۔ نہج البلاغۃ ص ۵۱۹“ بخدا نہ مجھے خلافت میں کوئی رغبت تھی اور نہ ولایت و حکومت میں کوئی حاجت اور دلچسپی لیکن تم نے مجھے اس کی طرف بلایا اور مجھے اس پر براہِ نیختہ اور آمادہ کیا۔ اگر آپ اس خلافت و ولایت کے مدعی ہوتے اور دست بردار نہ ہوئے ہوتے تو رغبت و میلان اور دلچسپی کی نفی کیونکر فرماتے۔ اور حضرت طلحہ حضرت زبیر اور دیگر حضرات صحابہ کی طرف یہ منسوب کیوں فرماتے؟ کہ تم نے مجھے اس کی طرف بلایا اور تم نے مجھ پر یہ بوجھ ڈالا جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ سب ہاجرین و انصار کو اس استحقاق میں مساوی اور برابر سمجھتے تھے! اور اگر بالفرض اپنا حق سمجھتے تھے تو اس سے دست بردار ہو چکے تھے۔ اور اس کی خاطر کسی نزاع و اختلاف میں پڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

(د) قَابِلْتُ اِلَیَّ اَقْبَالَ الْعُزِّ الْمَطَافِلِ عَلٰی اَوْلَادِهَا تَقْوِیُونَ
الْبِیْعَةَ الْبِیْعَةَ قَبَضْتُ یَدَیْ فِی سَطْمِهَا وَتَا زَعْنُکُمْ یَدَی
فِیْ حِذْبِ مَوَّاهَا، نہج البلاغۃ ص ۳۱۲)

تم میری طرف اس طرح متوجہ ہوئے جیسے نئی نئی بچوں کو جنم دینے والی اونٹنیاں اپنے بچوں کی طرف دوڑ کر آتی ہیں جب کہ تم کہتے تھے بیعت تو بیعت تو میں نے اپنا ہاتھ بند کیا مگر تم نے اس کو کھولا۔ میں نے تم سے اپنا ہاتھ کھینچا اور چھڑایا لیکن تم نے اسے

زبردستی اپنی طرف کھینچا۔

اس ارشاد سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہے کہ آپ امارت و خلافت کے متمنی اور آرزو مند نہیں تھے بلکہ اس کو مشترکہ حق سمجھتے تھے یا اس سے دستبردار ہو چکے تھے۔

۱۵) آپ کا ارشاد گرامی ہے:-

رَضِينَا عَنْ اللَّهِ قَضَاءً وَسَلَّمْنَا لِلَّهِ أَمْرًا اتَّزَلَى الْكَذِبَ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاللَّهُ لَأَنَا أَوَّلُ مَنْ صَدَقَهُ فَلَا أَكُونُ أَوَّلَ مَنْ كَذَبَ عَلَيْهِ فَتَنَظَّرْتُ فِي أَمْرِي فَإِذَا ضَاعَتِي قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِي وَادَّ الْمِيثَاقُ فِي عُنُقِي لَغَيْرِي۔

(نہج البلاغۃ ص ۱۱۱)

ہم اللہ تعالیٰ کی اس قضیہ پر راضی ہیں اور ہم نے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا مروءہم کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے کیا تیرا خیال ہے کہ میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولوں بخدا میں پہلا شخص ہوں جس نے آپ کی تصدیق کی لہذا میں ہی پہلا ان کی تکذیب کرنے والا کیونکر ہو سکتا ہوں؟ میں نے اپنے معاملہ میں غور و فکر کیا تو ناگاہ میری طاعت میری بیعت و خلافت سے سبقت لے جا چکی تھی اور میری گردن میں دوسروں کی طاعت کا عہد و میثاق تھا۔

یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عہد لیا ہوا تھا کہ خلافت بغیر نزاع و اختلاف کے مل جائے تو بہتر و درجہ خلفاء سے اختلاف نہ کریں

کما قال ابن میثم - اِنَّهُ كَانَ مَعْمُوداً اِلَيْهِ اِنْ لَاحْتِزَاجٌ فِي اَمْرِ الْخِلَافَةِ بَلْ اِنْ حَصَلَ لَهُ بِالرَّفَقِ وَالْاَفْلَاحِ فَقَوْلُهُ نَظَرْتُ فِي اَمْرِي فَادَّ طَاعَتِي سَبَقَتْ بَيْعَتِي اِنِّي طَاعَتِي لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيمَا اَمَرَنِي بِهِ مِنْ تَرْكِ الْقِتَالِ قَدْ سَبَقَتْ بَيْعَتِي لِلْقَوْمِ فَلَا سَبِيلَ اِلَى الْاِمْتِنَاعِ مِنْهَا۔

(شرح ابن میثم جلد ثانی ص ۹۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے یہ عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ امر خلافت میں نزاع نہ کریں۔ بلکہ اگر نرمی سے اور آسانی سے مل جائے تو بہتر و نرم اس سے باز رہیں لہذا آپ کے قول میری طاعت میری بیعت سے سبقت لے جا چکی تھی کا مطلب یہ ہے کہ میرا رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنا ترک قتال و نزاع میں قوم کی بیعت سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ لہذا ان کی بیعت سے رکنا اور دور رہنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ اور ایک قول اس کی تشریح میں یہ ہے کہ :-

”الميثاق ما لزمه من بيعة - ابي بكر بعد ايقاعها - اي فاذا

ميثاق القوم قد لزمني فلم يمكنني المخالفة بعداً“

یعنی لوگوں کے ابو بکر صدیق کی بیعت کر لینے کے بعد آپ پر بیعت کرنا لازم ہو گیا تو یہی لزوم بیعت ہی ميثاق ہے۔ تو جب قوم کی طرف سے یہ عہد و ذمہ داری قبول کرنا واجب ٹھہرا تو اس کے بعد میرے لیے اس کی مخالفت کرنا ممکن نہ رہا۔ الغرض قوم کی بیعت کے بعد اپنے آپ کو پابند بیعت سمجھیں تو بھی دست برداری کا ثبوت یقینی اور اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کو پابند کر دیا گیا تھا تو پھر دست برداری کا تحقق بھی زیادہ یقینی ہو گیا۔ اور قضاء الہی پر رضا لازم ہوتی ہے اور اس کے امر و حکم کے آگے تسلیم خم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اور جب کہ خلفاء سابقین کی خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی رضا و قدر اور اس کے امر سے ہے۔ لہذا آپ پر اس کے متعلق رضا مندی اور تسلیم لازم ٹھہری تو بھی خلفاء سابقین کے لیے خلافت سے دست برداری اور اس پر مجسم تسلیم و رضا بننا ضروری ٹھہرا۔ اور اگر اس پر بھی حزن و ملال باقی رہا تو پھر رضا بالقضاء اور تسلیم امر کا دعویٰ بالکل درست نہیں ہو سکتا کیونکہ آپ نے ہی فرمایا :-

مَنْ أَصْبَحَ عَلَى الدُّنْيَا حَزِينًا فَقَدْ أَصْبَحَ لِقَضَاءِ اللَّهِ سَاطِئًا

بہج مع شرح حدیدی جلد ۱ ص ۵۲

یعنی جو شخص دنیا کے ہاتھ سے نکل جانے پر حزن و ملال کا اظہار کرے تو وہ اللہ تعالیٰ کی قضاء پر ناراض ہوا اور ناپسندیدگی کا اظہار کرنے والا ٹھہرا۔ اور تسلیم و رضا کا مطلب یہی ہوتا کہ مفید اور نافع امر درپیش ہو تو تسلیم و رضا، وگرنہ مخالفت اور نزاع بلکہ رنج و راحت، نفع و نقصان اور نعمت و نعمت ہر حال میں تسلیم و رضا سے کام لینا پڑتا ہے۔۔۔

اگر رنج و راح است و گرفت و قید
من از حق شناسم نہ اند عمر و نہ دید
دریں نوع از شرکت پوشیدہست
کہ نزدیک بیازد و دہرم نجست

لہذا سید المتاملین اور رئیس المومنین اور سلاسل اربعہ کے امام و پیشوا سے بھی اسی امر کی توقع بلکہ یقین رکھنا ضروری ہے۔

۱۰۔ جب اہل شوریٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کمرے کے لیے منتخب فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا نہج البلاغۃ جلد اول ص ۱۴۶

واللہ لا ملہم من ملہمنا مسلمین الامور المسلمین الی التماسا لاجر ذلک۔

بخدا میں عثمان کے لیے اس منصب امامت اور عہدہ خلافت کو تسلیم کروں گا، جب تک امور مسلمین صحیح طور پر سرانجام پذیر ہوتے رہیں گے اللہ تعالیٰ سے اس صبر و تسلیم کا اجر حاصل کرنے کے لیے جب آپ کی طرف سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حق میں تسلیم پائی گئی تو شیخین رضی اللہ عنہما کے حق میں بطریق اولیٰ لہذا اس پر چون و چرا کی کیا گنجائش ہے۔

۱۱۔ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور عام لوگوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کر لی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور جناب ابوسفیان نے آپ سے بیعت کرنے کا عزم ظاہر کیا اس موقع پر آپ نے فرمایا۔ نہج البلاغۃ جلد اول ص ۱۴۶۔

ایہا الناس شقوا اواج الفتن بسبقین النجاة وعزجوا عن طریق

المنافرة وضعوا تعبان المغامرة اقلع من نهض بجناح او استسلم فاراح الخ

اے لوگو فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ساتھ عبور کرو۔ اور منافرت و کدورت کے راستہ سے الگ تھلگ رہو اور شعوب و قبائل کی فوقیت و برتری والے تاجہائے مفاخرت کو سروں سے اتار دو۔ کامیاب وہ شخص ہوا جس نے اعوان و انصار سے تقویت حاصل کی۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا یا پھر اقرار و اعتراف اور تسلیم کا راستہ اختیار کیا خود بھی راحت اٹھائی اور دوسروں کو بھی راحت پہنچائی۔

هَذَا مَاءٌ آجِنٌ وَلَقَمَةٌ يَغْضُ بِهَا أَكْلَهَا وَمَجْتَنِي الثَّمَرَةَ لَغَيْرِ وَقْتُ
اِبْنَاعِهَا، كَالزَّارِعِ بَارِضٍ غَيْرِهِ۔

یہ ترش پانی ہے۔ اور گلے میں پھنس جانے والا لقمہ ہے۔ اور پکنے سے پہلے پھل کو چننے والا ایسا ہے جیسے دوسرے کی زمین میں بیج بونے والا۔ اور فصل کاشت کرنے والا۔ جب یہ حقیقت مسلم ہے کہ آپ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مقابلے میں امامت و خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور اس کو اسی طرح بے منفعت سمجھتے رہے جس طرح غیر کی زمین میں بلا اذن بیج بونا یا پھل کو پکنے اور تیار ہونے سے پہلے توڑنا تو لامحالہ ماننا پڑے گا۔ کہ آپ نے دوسرا راستہ اختیار فرمایا۔ یعنی استسليم فَاَرَاخَ۔ اعتراف و تسلیم سے کام لے کر خود بھی راحت پائی اور دوسروں کو بھی راحت پہنچائی۔ لیکن موت اور ہلاکت کے ڈر سے نہیں کیونکہ آپ تو اس کی طرف اس سے بھی زیادہ راغب تھے جتنا کہ شیر خوار بچہ ماں کے دودھ کی طرف راغب ہوتا ہے۔ بلکہ خصوصی علم اسرار کی وجہ سے جیسے کہ فرمایا بل اندھیت علی مکنون علم الحکم میں ایک پوشیدہ علم کو اپنے اندر لئے ہوئے ہوں۔ اور اس کی تشریح پہلے گزر چکی۔ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے عہد لے رکھا تھا کہ خلافت کے حصول کے لیے شیخین سے نزاع و اختلاف نہیں کرنا لہذا واضح ہو گیا کہ آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت اور عہد و پیمان کا پاس اور لحاظ فرماتے ہوئے اور اہل اسلام و اسلام کی بہتری کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور فتنوں کی آلائش سے دامن کو بچاتے ہوئے اور اپنے وقت اور باری کا انتظار کرتے ہوئے ضروری

تعاون کی پیش کش کے باوجود تسلیم و رضا اور مصالحت و مسالمت کا راستہ اختیار کیا اور اس میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھ کر جو بغیر قلبی رضا و تسلیم کے ممکن نہیں اور یہی مقصد تھا و اقدی صاحب کی کتاب شوریٰ کے حوالے کا جو اتنے خطبات مرتضویہ سے ثابت ہے جو نہج البلاغہ جیسے شیعہ کے قرآن ثانی میں موجود ہیں۔

لہذا صاحب نسخ التواریخ نے انہی حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس روایت کو متفق علیہ قرار دیا۔ اور اس پر جرح و قدح سے گریز کیا مگر علامہ ڈھکو صاحب کو چونکہ اپنے مذہبی معلومات کم ہیں کیونکہ دوسرے مشاغل زیادہ ہیں اسی لیے اسی بہانے اس روایت کا جواب دینے بلکہ جواب کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کی ٹھانی حالانکہ کوئی کتاب شیعہ صاحبان کی نہیں جو اقدی کی روایات سے پُر نہ ہو خود نہج البلاغہ میں جو خطبات مذکور ہیں یہ بھی اسی طرح لوگوں کی کتابوں سے ماخوذ اور منتخب ہیں جن میں واقعی بھی شامل ہے بعض جگہ نام کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔ بعض جگہ تصریح نہیں کی گئی۔ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ جلد اول ص ۵۶۶ من خطبة له عليه السلام خطبها بذي قار وهو متوجه الى البصرة ذكرها۔ الواقدي في كتاب الجمل۔

لہذا صرف واقدی کا نام لے کر گلو خلاصی نہیں کرائی جاسکتی ورنہ شیعہ صاحبان کی معتبر سے معتبر کتاب بھی غیر معتبر ہو کر رہ جائے گی۔

کیا از روئے عقل و روایت خلافت دستبرداری ممکن ہے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے خلافت و امامت سے دستبرداری کو خلاف عقل قرار دیتے ہوئے علت یہ بیان کی کہ امامت نبوت کی مانند اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ منصب ہے۔ نہ نبوت و رسالت سے دستبرداری ممکن نہ ہی امامت و خلافت سے یہ عقل اور روایت اور علت و دلیل دیکھ کر کیوں نہ کہوں۔

جوابات کی خدا کی قسم لا جواب کی

معلوم ہوتا ہے کہ ڈھکو صاحب نے بے عقلی کو ہی عقل اور درایت سے محرومی کو ہی درایت سمجھ رکھا ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔

(۱) جب نبوت اور امامت خدا داد عہدے ہیں تو اس سے مراد کیا ہے۔ دنیوی حکومت جس میں تنفیذ احکام شرعیہ کی قدرت و طاقت حاصل ہو۔ یا صرف تبلیغ احکام اور ارشاد و ہدایت پر مشتمل امور کا بیان۔

اگر پہلی شق مراد ہے۔ تو پھر مہرنبی کے لیے حکومت و سلطنت کا تحقق اور نبوت ہونا چاہیے۔ حالانکہ قطعاً ایسا نہیں۔ حضرت عیسیٰ حضرت یحییٰ اور حضرت زکریا علیہم السلام اور ان کے علاوہ بہت سے انبیاء علیہم السلام نبوت کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود حکمران اور مالک سلطنت نہیں تھے، بلکہ شیخ صدوق نے خلاصہ میں ذکر کیا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے صرف چار حضرات زمین میں ملوکیت اور بادشاہت پر فائز ہوئے۔ اور یہ عنوان قائم کیا؟ ملوک الانبیاء فی الارض اربعۃ، جلد اول ص ۲۲۸

حضرت شموئیل علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ سے ہمیں صاحب سلطنت اور حکمران مانگ کر دیں جس کی زیر قیادت ہم جہاد کریں۔ تو آپ نے دعا فرمائی جس کے صدقہ میں طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا گیا۔ قال اللہ تعالیٰ: "ان اللہ قد بعث بکم طالوت ملکاً"

لہذا حکومت و سلطنت نبوت و رسالت کے لیے لازم نہیں ورنہ ان حضرات کی نبوت و رسالت کا ہی انکار کرنا پڑے گا جو حکومت و سلطنت پر فائز نہ رہے ہوں تو ذرا سوچ کر بتلانا بارہ ائمہ میں سے کتنے بیچ جاہیں گے خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت کب قائم ہوئی؟ اور آپ نبی و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کب سے ہیں؟ (۲) شیعہ صاحبان کے علم الترضیٰ فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی امامت کا عرصہ تین سال ہے اگرچہ حکومت و سلطنت کا عرصہ ساڑھے چار سال ہے۔

”بتغیر سیر فان امیر المؤمنین کان وحدہ الخلیفۃ فی ہذا المدۃ
عندنا ویكون المراد من الحدیث استمرار الخلفۃ بعدی - بخلیفہ واحد
یكون مدۃ ثلاثین سنۃ وھكذا كان -

لہذا واضح ہو گیا کہ روحانی منصب علیہ امر ہے۔ اور حکومت و سلطنت اور امارت
و خلافت علیہ امر ہے۔ جس کو محروم درایت ہو گوں نے گڈ مڈ کر دیا ہے۔
(۳) سب شیعہ صاحبان غصب خلافت کا عقیدہ رکھتے ہیں اور اس وراثت کے ٹوٹے
جانے کا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف بھی اس نظریہ کی نسبت کرتے ہوئے کہا
”دترائی نہیاً“ لہذا ان میں کوئی عقل مند ہے۔ تو بتلائے کہ غصب کون سی شے
کی گئی سختی؟ روحانی مرتبہ یا حکومت و سلطنت۔ نبی و رسول شہید کیا جاسکتا ہے مگر
اس کی نبوت و رسالت نہ غصب کی جاسکتی ہے اور نہ لوٹی جاسکتی ہے، جیسے حذت
زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام، لہذا امام بھی، شہید ہو سکتا ہے، مگر اس
کا روحانی مرتبہ و مقام سلب نہیں ہو سکتا۔ البتہ حکومت و سلطنت ہی ایسی شے ہے جو
غصب ہو سکتی ہے۔ اور یہاں کلام بھی اسی حکومت و امارت میں ہے۔ اور حق
تصرف و اقتدار میں اس لیے علامہ صاحب کی یہ درایت بالکل بے بسیرتی پر
مبنی ہے۔

(۴) حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مصالحت
کر کے روحانی منصب ان کے حوالے کیا تھا یا امور حکومت و سلطنت میں تصرف کا
اختیار۔ پہلی شق کا بطلان مسلم ہے۔ لیکن دوسری کا تحقق بھی مسلم ہے۔ کیوں کہ اتفاق
اور اجتماع اسی وقت سامنے آیا جب دونوں اقتدار ایک شخص میں جمع ہو گئے۔
اور شام اور عراق اور عالم اسلام میں اقتدار حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے حوالے
ہو گیا جس کی پیشین گوئی خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

ان ابی ہذا سید و فعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتين من
المسلمین عظیمتین ” میرا یہ بیٹا سرور ہے اور بلند ہمت۔

امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بدولت اہل اسلام کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرادے گا۔
ملاحظہ ہو ناسخ التواریخ جلد پنجم کتاب دوم ص ۱۵ بحوالہ کشف الغمہ۔

نگاہ مرتضیٰ میں خلافت و امارت مثل سراب

۱۵۔ "و خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے امارت کو دنیا سے تعبیر فرمایا جو سراب کی مانند زائل ہونے والی ہے۔ یا بادل کی طرح چھٹ جانے والی ہے۔ اور صرف چند روزہ متاع ہے۔ ملاحظہ ہو نہج البلاغہ ص ۱۵۰۔

فما راعنی إلا انشغال الناس علی فلان یبایعونہ فاسکت
یدی (إلی) فخشیت ان لم انصر الا سلام و اہلہ ان
امری فیہ تلماؤہدما تكون المصیبة بہ علی عظمی
من فوت ولا یتکم الی انما متاع ایام فلا تل
یزول منها ما کان کما یزول السراب او کما یتقشع
السحاب۔

مجھے نہ گھبراہٹ میں ڈالا مگر لوگوں کے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر
مجموع و متفق ہونے نے تو میں نے پہلے پہل بیعت ہاتھ روکا مگر فتنہ ارتداد
وغیرہ کو دیکھا تو مجھے خطرہ لاحق ہوا کہ اگر میں اس وقت اسلام اور اہل اسلام
کی امداد کے لیے آگے نہ بڑھوں تو دین میں رخنہ پیدا ہو جائے گا۔ بلکہ دین کے
منہدم ہونے کا امکان ہے جس کی وجہ سے مجھ پر اس اس ولایت کی نسبت
زیادہ مصیبت ہوگی کیوں کہ ولایت و خلافت تو صرف چند روزہ کا معاملہ ہے
جو سراب کی طرح زائل ہونے والی ہے یا بادل کی طرح چھٹ جانے والی ہے

نگاہ مرتضوی میں امارت خلافت جوتے سے بھی کم قیمت

(ب) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا: تمہاری ولایت و خلافت میرے لیے میرے اس جوتے سے بھی حقیر ہے اور بے قیمت جس جوتے کی تمہاری نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے۔

قال عبد الله بن عباس رضي الله عنهما دخلتُ على أمير المؤمنين عليه السلام بذي قار وهو يَخْصِفُ نَعْلَهُ فقال لي ما قيمة هذا النعل فقلت لا قيمة لها۔ فقال عليه السلام والله لهي أحب إليّ من أمرنكم إلّا أن أقيم حقاً وأدفع باطلاً۔

(نهج البلاغة مصری جلد اول صفحہ ۹۴)

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا جب کہ آپ مقام ذی قار میں موجود تھے اور اپنا جوتا گانٹھ رہے تھے تو آپ نے مجھے فرمایا اس جوتے کی کیا قیمت ہے۔ تو میں نے عرض کیا اس جوتے کی کوئی قیمت نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ تمہاری امارت اور خلافت سے مجھے یہ جوتا زیادہ محبوب اور پیارا ہے۔ مگر یہ کہ میں اس امارت میں حق کو قائم کروں یا باطل کو دفع کروں؟

نگاہ مرتضوی میں امارت و خلافت بکری کی ناک کی ریش سے زیادہ حقیر

(ج) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:۔

أما والذي خلق الحبة وبرء النملة لولا حضور الحاضر وقيام الحجة بوجود الناصر وما أخذ الله على العالمين أن لا يقاروا علماؤنا بظالم ولا سغب مظلوم لا لقيت حبيبا

علی غار بہا و لسقیت آخرہا بکأس اولہا و کالفیتہ دنیا کم ہذہ
ازہد عندی من عفتۃ عتر۔ رنہج البلاغۃ ص ۲۲

غور سے سنو! مجھے اس ذاتِ اقدس کی قسم جس نے دانہ کو بچاڑ کر پودے اگائے۔
اور نفوسِ انسانیہ کو تخلیق فرمایا۔ اگر حاضرین اور سمیع کے طلبگار موجود نہ ہوتے اور
انصار و اعدا کے موجود ہونے سے حجت قائم اور کامل نہ ہو جاتی اور اللہ تعالیٰ کی
طرف سے اہل علم سے یہ عہد نہ لیا گیا ہوتا کہ ظالم کے ظلم اور ناحق مال کھانے پر اور
مظلوم کی بھوک اور شدت پر صبر نہ کریں بلکہ ظالم کو ظلم سے باز رکھیں اور مظلوم کی نصرت
و مدد کریں تو میں اس امارت و خلافت کی رسی اسی کی گردن پر ڈال دیتا۔ اور اس کے
آخر کو اول حصہ والے پیالے سے پلاتا یعنی وہی سلوک اب بھی کرتا جو پہلے کیا تھا
اس کو نظر انداز کرتا اور قریب نہ جاتا۔ اور تم اس کو میرے نزدیک بکری کی ناک کی
ریزش سے بھی زیادہ ناقابلِ رغبت پاتے اور حقیر و ذلیل۔

اد: "خلافت و امارت کا نگاہِ مریضوی میں خنزیر کی ہڈی حقیر ہونا،"

یہ تو پہلے ثابت ہو چکا کہ آپ نے فرمایا کہ یہ امارت اور خلافت چند روزہ متاع
دنیا ہے۔ اور یہ بھی ثابت ہو چکا کہ تمہاری یہ دنیوی حکومت میری نظر میں جوتے اور
بکری کے ناک کی ریش سے بھی حقیر ہے۔ اب سنئے کہ آپ فرماتے ہیں:-

واللہ لدنیا کم ہذہ اھون فی عینی من عراق خنزیر فی ید

مجدوم رنہج البلاغۃ مع شرح حدیدی جلد نمبر ۱ ص ۶۷

بخدا تمہاری یہ دنیا میری نگاہ میں خنزیر کی ہڈی سے بھی حقیر ہے۔ جو جذام اور
کوڑھ کی بیماری میں مبتلا شخص کے ہاتھ میں ہو۔ یہ حقارت بیان کرتے کا ایسا اسلوب
اور انداز ہے کہ شاید اس سے زیادہ بیان حقارت کے لیے کوئی دوسری تعبیر
موجود ہی نہ ہو۔

(ھ) قبل ازیں جتنی عبارات خلافت سے بے رغبتی اور ولایت سے عدم دلچسپی کی

ذکر کی جا چکی ہیں ان پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں کہیں فرمایا:۔

ما كانت لي في الخلافة رغبة ولا في الولاية اربة۔

کہیں فرمایا:۔ قبسطم يدي وقبضت وغيره وغيره۔ جن سے صاف ظاہر کہ آپ عند اللہ حاصل مرتبہ کی بات نہیں کر رہے۔ بلکہ امت محمدیہ کی ولایت امور اور نظام سلطنت اور دنیوی اعزاز و اقیانہ کی بات کر رہے ہیں۔

(د) اور یہی آپ سے قبیلہ نبواسد کے آدمی نے سوال کیا تھا کہ تمہاری قوم نے خلافت و امارت سے دور کیوں رکھا؟ تو آپ نے فرمایا:۔

كانت اشارة شمت عليها نفوس قوم وسعت عنها نفوس قوم آخرين۔

کہ خلافت و امارت ایک اعزاز و اقیانہ تھا جس پر ایک قوم نے بخل اور حرص کا اظہار کیا اور دوسرے فریق نے سخاوت اور عالی ہمتی کا یعنی نہ سائل کا سوال یہ تھا کہ اللہ

تعالیٰ کے ہاں حاصل مرتبہ و مقام سے تمہیں کیوں محروم کیا گیا اور نہ آپ نے اس کا جواب دیا۔ سوال کا تعلق بھی اسی دنیوی منصب اور عہدہ سے تھا اور جواب کا تعلق

بھی اسی سے۔ اور یہی ناسخ التواریخ کی عبارت کا مدلول و مفہوم بلکہ معنی و مقصود

ہے جس کو حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر کیا کہ اگر اس عہدہ اور منصب میں کبھی حصہ دار تھے تو حق حقدار کو پہنچا۔ اور اگر صرف میرا حق تھا ان کا نہیں تھا تو میں نے

ان کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنی خوشی اور طیب خاطر سے اور امتِ مصطفیٰ علیہ التحیۃ

والثناء کی بہتری اور بھلائی کے لیے اس سے ہاتھ اٹھالیا۔ یہی مضمون آپ کے

اس خطبہ میں موجود ہے۔ جو آپ نے امیر معاویہ کے خط کے جواب میں لکھا اور خط

لانے اور لے جانے والا ابو مسلم خولانی تھا جس کو شرح حدیدی میں نصر بن مزاحم

کی کتاب صفین کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے۔ مقصود یہی جملہ پیش خدمت ہے۔

بل عرفت ان حقى هو الكماخوذ وقد تركته لهُو تعباً ورن

شرح حدیدی جلد ۱۵ ص ۷۶۔

اللہ عنہم۔

بلکہ میں نے جانا کہ میرا حق ہی لیا گیا ہے اور تحقیق میں نے اس کو ان کیلئے چھوڑ دیا۔

اللہ تعالیٰ ان سے درگزر فرماتے۔

لہذا ان حقائق کی عظیم پوشیدگی میں بھی روایتی اور درایتی سقم دور نہ ہوتے ہوں
تو پھر آنکھوں کا کالا موتیا دور کرانے کی ضرورت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور استحقاق منصب امامت کا لزوم العیاذ باللہ

علاوہ ازیں ڈھکو صاحب کو اگر اب بھی اصرار ہے کہ امامت و خلافت نبوت
ورسالت کی مانند عمدہ ہے جس سے دست برداری اور منتقلی ممکن نہیں تو میں پوچھتا
ہوں اگر کوئی نبی و رسول کہے العیاذ باللہ کہ نبوت و رسالت سراب ہے۔ چند
روزہ عزت ہے۔ میرے جوتے سے بھی حقیر ہے۔ اور بکری کی ناک کی ریش
سے بھی نہ یادہ قابل نفرت ہے تو کیا یہ منصب نبوت اور رسالت کی توہین ہے
یا نہیں؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی توہین ہے یا نہیں؟ یقیناً یہ منصب کی بھی توہین ہے۔
اور عطا کرنے والے کی بھی توہین اس لیے کسی پیغمبر نے بھی ہزار مشکلات اور
مصائب کے باوجود ایسا کوئی لفظ اس منصب کے حق میں استعمال نہیں کیا اگر
امامت و خلافت جواہل سنت اور اہل تشیع میں محل نزاع ہے۔ وہ بھی ایسا ہی
منصب ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے عطا کیا تو یقیناً ان کلمات میں اس منصب کی بھی
توہین ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی جو کوئی عام مسلمان بھی نہیں کہہ سکتا چاہے جاسکے
ابوالائمہ اور معدن ولایت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ لہذا روز روشن کی طرح
عیال اور بالکل مستغنی عن البیان ہو گیا کہ یہاں پر جو امامت اور خلافت محل
نزاع ہے۔ وہ روحانی منصب نہیں وہ جس صحابی کو بلا فصل اور بلا واسطہ
اور براہ راست ملا۔ کیونکہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دستہ خوانِ نعمت و کرم ہر
ایک کے لیے عام تھا! عربی و عجمی اور حبشی و رومی اور فارسی و حجازی کی اس میں
کوئی تفریق نہیں تھی بس جس نے خلوص دل سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی
علامی کا طوق گلے میں ڈال لیا وہی محبوبِ خدا بن گیا۔

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى اِقْلِبْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يَحْبِبْكُمُ اللّٰهُ الْاٰیة۔

بلکہ کلام صرف اور صرف دنیوی منصب اور عہدہ میں سے جس کے تحت نفاذ اسلام اور اقامت دین کی ذمہ داری بندہ پر عائد ہوتی ہے۔ اگر صحیح معنوں میں ادا کرے تو یہ خلافت علیٰ منہاج النبوت ہے۔ اور برحق جیسے کہ خلافت خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اگر ادا نہ کرے تو عند اللہ مجرم اور قابل مواخذہ و عتاب اور مستحق عقاب و عذاب جیسے امراء جور کی امارت اور حکومت اسی لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا ضرورت امیر

اِنَّهُ لَا يَدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرٍّ اَوْ فَاجِرٍ يَعْمَلُ فِيْ امْرَتِهِ الْمُؤْمِنِ وَيُسْتَتَعُ فِيْهَا الْكَافِرُ وَيَبْلُغُ اللّٰهُ فِيْهَا الْاَجَلَ وَيَجْمَعُ بِهِ الْفِتَىٰ وَيَقَاتِلُ بِهِ الْعَدُوَّ وَتَأْمَنُ بِهِ السَّبِيلُ وَيُؤْخَذُ بِهِ لِلضَّعِيفِ مِنَ الْقَوَىٰ حَتّٰى يَسْتَرِيْحَ بَرٌّ وَّ يُسْتَرَاخَ مِنْ فَاجِرٍ۔ الخ

منج البلاغۃ مصری جلد اول ص ۶۱

یقیناً لوگوں کے لیے امیر کی ضرورت ہے نیک اور نیک ہو یا فاجر اولہ گناہگار جس کے دور امارت میں مومن عمل صالح کر سکے اور کافر و ذمی چند روزہ زندگی سے نفع اندوز ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کی اجل مقرر نہ کر پھینچائے اور اموال فقی جمع کئے جاسکیں اور دشمن کے ساتھ اسکی قیادت میں جنگ لڑی جاسکے اور راستوں کو پر امن رکھا جاسکے اور قوی و توانا سے ضعیف کا حق وصول کیا جاسکے تاکہ نیک لوگ خود راحت پائیں اور فساد و فحار سے راحت حاصل کی جاسکے اور ان کے فسق و فجور سے تحفظ حاصل ہو سکے اور یہی وجہ ہے کہ خود اہل تشیع نے اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ امام کا انتظار کر کے تھک جانے کے بعد اب خود ہی امام مقرر کر لیا۔ اور اس کی قیادت میں ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں اور نہ ختم ہونے والی جنگ شروع کر رکھی ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے خیمہی صاحب کے لیے کونسی نفس نازل فرمائی ہے اور عرش اعلیٰ سے

کوئی ندا کی گئی ہے؟ کہ بارہویں امام سے پہلے تیرہویں امام سے کام چلا لو۔
حیرت کی بات ہے کہ یہ سب کچھ چشمِ بر سے دیکھ کر بھی یہی رٹ ہے یہ عمدہ
اللہ دیتا ہے۔ یہ ناقابلِ استدرا د ہے۔ اور اس سے دست برداری ناممکن ہے۔
اس کا منتقل ہونا محال ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات احمقوں کی حجت میں
لے لے رہے ہیں:-

منصبِ امامت ناقابلِ انتقال، تو غصب کیونکر ہو گیا؟ علامہ ڈھکو صاحب اور ان کے حکیم صاحب ایک سوال

ایک طرف تو یہ دعویٰ ہے کہ امامت نبوت کی مانند ایک عمدہ خداوندی ہے۔
وہ جسے عطا کر دے وہ شخص نہ اس سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ نہ کسی دوسرے
شخص کو دے سکتا ہے۔ ص ۱۲۳۔ اور ظاہر ہے کہ جب وہ شخص خود کسی کو نہیں سکتا
تو دوسرا اس سے لے بھی کوئی نہیں سکتا۔ کیونکہ امام ہو کر اور کائنات پر تصرف کے
اختیارات کا مالک ہو کر اس میں منتقلی اور تبدیلی نہیں کر سکتا۔ تو دوسرا شخص لے
کس طرح سکتا ہے؟ لہذا غصب اور دفعِ حق وغیرہ کی جتنی روایات اپنی کتب سے
ذکر کی ہیں وہ سب غلط ہو کر رہ جائیں گی مثلاً:-

۱۔ تقصہ ہادونی الا شقیان - الخ میرے سوا دوسرے نے خلافت کا کرتے
پہن لیا اور انہوں نے میرے ساتھ ناحق جھگڑا کیا اور خلافت پر گمراہی سے
سوار ہو گئے۔ ص ۵۶ تنزیہ الامامیہ۔

(۲) ما زلت مدفوعاً عن حقی منذ قبض اللہ نبیہ علیہ السلام

علیہ السلام میں ہمیشہ اپنے حق سے دور رکھا

کیا جب سے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فوت کیا۔

(۳) اجمعوا علی منازعتی حقا کنت اولیٰ بہ من غیری۔

انہوں نے اجماع و اتفاق کیا اس حق کے چھیننے پر جس کا میں بنسبت دوسروں
کے زیادہ حق دار تھا۔

(۴) وَلَا يَخْطُرُ بِهَا لِي أَنَّ الْعَرَبَ تَزْعَجُ هَذَا لَا مَرَصَنَ
بَعْدَهُ عَنْ أَهْلِ بَيْتِهِ - میرے دل میں اس کا خیال تک نہیں آتا
کہ عرب اس امر خلافت کو آپ کے بعد ان کے اہل بیت سے منتقل
کر دیں گے۔ ص ۵۷

(۵) إِنِّي لَمَّا أَزَلْتُ مَظْلُومًا مَتَدَّ قَبْضُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
مِنْ مِيشَةِ مَظْلُومٍ رَاجِبٍ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَأَوْصَالٍ مَوَا ۷
(۶) إِنَّهُمْ أَظْلَمُوا نَاحِقَنَا - ص ۵۹ - ان دونوں نے ہمارا حق بطور ظلم اور جبر و
قہر سے لیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

الغرض حقیقی روایات اس مضمون کی ہیں یا وہ سب غلط ہیں اور یا پھر یہ
دعویٰ غلط ہے کہ اس منصب میں منتقلی متصور نہیں ہو سکتی، کیونکہ جب آپ کی امامت آپ
کے پاس رہی تو حق سے دور کیسے کیا گیا؟ جب آپ کے پاس رہی تو ظلم کیسے ہو گیا؟
جب امامت آپ سے چھن نہ سکی تو اس امر کا دوسری جگہ انتقال کیسے پایا گیا لہذا
یہ فیصلہ ان دونوں صاحبان کو کرنا ہو گا کہ اسلاف شیعہ نے جھوٹ بولا اور واقعات
کیا یا ان اخلاف نے جھوٹ بولا اور غلط دعویٰ کیا؟۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پیر الشی مظلم

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں مظلم کا لفظ استعمال کر کے تمام صحابہ
کرام کے حق میں بالعموم اور خلفائے ثلاثہ کے حق میں بالخصوص ظالم ہونے کا عقیدہ
رکھ لیا جاتا ہے۔ اور پھر طرح طرح سے سب و شتم اور گالی گلوچ کا ان کو حق دار سمجھ
لایا جاتا ہے۔ اس لیے ذرا اس روایت پر غور فرمائیں اور اس کے بعد ایک حبیب
فتویٰ تجویز کریں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

(۱) مَا زِلْتُ مَظْلُومًا مَتَدَّ وَلَدَتْنِي أُمِّي حَتَّىٰ إِنْ كَانَ عَقِيلًا
لَيَصِيبَهُ رَمْدٌ فَيَقُولُ لَا تَذَرُونِي حَتَّىٰ تَذَرُوا عَلِيًّا فَيَذَرُونِي
وَمَا بِي رَمْدٌ - (ص ۲ کتاب علل الشرائع للصدوق)

میں اس دن سے مظلوم ہوں جس دن سے مجھے میری ماں نے جہنم دیا ہے۔ میرے بھائی عقیل کی آنکھوں کو بیماری لاحق ہوتی اور وہ کتنا میری آنکھوں میں دوائی اس وقت تک نہ ڈالتا جب تک علی کی آنکھوں میں دوائی نہ ڈال لو تو گھر واسے میری آنکھوں میں دوائی ڈال دیتے حالانکہ مجھے کوئی بیماری نہیں ہوتی تھی۔

اب دریافت طلب یہ مسئلہ ہے کہ آپ ٹھہرے مظلوم اور والدین ٹھہرے ظالم تو شیخین اور والدین ظالم ہونے میں برابر ہو گئے لہذا حکم دونوں فریق کا ایک ہی ہونا چاہیے۔ ان میں تفریق روا نہیں رکھنی چاہیے۔ تو بلا امتیاز و تفریق دونوں فریق پر کیا فتویٰ عائد ہوتا ہے؟

ہے کوئی شیعہ جو اپنی روایت کے مطابق اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اپنے اعتراف کے مطابق آپ کے والدین کو ظالم کہے؟ اور اگر یہاں فتویٰ اس شرم و حیا کے تحت نہیں لگ سکتا کہ وہ حضرت علی کے والدین ہیں آپ جو کہیں سو کہیں لیکن ہم پر سکوت لازم ہے۔ تو خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ جن روایط اور ثبوتوں میں منسلک ہیں کیا ان کا بھی یہی تقاضا نہیں کہ ہم شرم و حیا سے کام لیں اور مہربان ہیں۔

مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز **حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقت**

اگر زحمت ہو تو وصیت کے بارے میں چند روایات ملاحظہ فرما لیجئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی وصیت ہرگز نہیں فرمائی اس کے ثبوت کے لیے اہل تشیع کی معتبر ترین کتاب تمحیص الشافی مطبوعہ نجف اشرف مصنفہ محقق طوسی امام الطائفہ ص ۳۳۳ جلد دوم

وقد روی عن ابی وائل والحکیم عن علی بن ابی طالب علیہ السلام أنه قيل له الا توصی بقال ما وصی رسول الله صلی الله عليه وسلم

فاوصی ولكن قال ان اراد الله خيراً فسيجمعهم على خيرهم بعد نبيرهم۔

یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے آخری وقت میں عرض کیا گیا کہ حضور اپنے قائم مقام کے لیے وصیت کیوں نہیں فرماتے؟ جواب میں فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبکہ وصیت نہیں فرمائی تو میں کیسے وصیت کروں البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بھلائی کا ارادہ فرمایا تو میرے صحابہ کا اجماع میرے بعد ان میں سے سب سے اچھے آدمی پر ہو جائے گا۔

اسی طرح ایک اور روایت بھی ملاحظہ ہو (یہی کتاب اسی صفحہ پر)

روی صعصعة بن صوخان ان ابن ملجم لعنه الله لما ضرب علياً عليه السلام دخلنا عليه فقلنا يا امير المؤمنين استخلف علينا قال لا فانا دخلنا على رسول الله صلى الله عليه وعلى آله حين ثقل فقلنا يا رسول الله استخلف علينا فقال لا اني اخات ان تتفرقوا كما تفرقت بنو اسرائيل عن هارون ولكن ان يعلم الله في قلوبكم خيراً اختار لكم۔

یعنی صعصعہ بن صوخان روایت کرتے ہیں کہ جب ابن ملجم ملعون نے حضرت علی علیہ السلام کو زخمی کیا تو ہم حضرت شیر خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور اپنا خلیفہ مقرر فرمائیں تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مرض جب زیادہ ہو گیا تو ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمارے لیے کوئی اپنا خلیفہ مقرر فرمائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہرگز نہیں مجھے اس بات کا خوف ہے کہ اگر میں خلیفہ مقرر کروں تو تم اختلاف کرو گے جیسا کہ بنی اسرائیل نے ہارون کے متعلق اختلاف کیا تھا لیکن یہ یقین رکھو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں بہتری دیکھی تو تمہارے لیے خود ہی بہتر خلیفہ مقرر کر دے گا انھ

ایک اور روایت بھی سن لیں۔ صفحہ ۳۷۲ یہی کتاب پر۔

وفي الخبر المروى عن امير المؤمنين عليه السلام لما قيل له الا

توصی ! فقال ما اوصی رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وصحبہ وسلم
فاوصی ولكن اذا اراد الله بالناس خيراً استجمعهم علی خیرهم کما
جمعهم بعد نبیهم علی خیرهم (وکنذا فی الشانی ص ۱)

یعنی حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں عرض کی گئی کہ حضور آپ وصیت کیوں نہیں
فرماتے؟ شیعہ خدا رضى اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت نہیں
فرمائی تھی تو میں کیسے وصیت کروں لیکن جب اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بھلائی کا ارادہ
کرے گا تو ان کو ان میں سے جو اچھا ہے اس پر اتفاق بخشے گا جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ
وسلم کے بعد لوگوں میں سے جو اچھا تھا اسی پر اجماع اور اتفاق بخشا تھا۔
یہی روایات شیعوں کے علم الہدی نے اپنی کتاب شانی مطبوعہ نجف اشرف

ص ۱۱ میں لکھیں۔
تحفہ حسینیہ، از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہ
تتمہ مبحث وصیت :-

ابو بکر احمد بن عبد العزیز نے اپنی سند کے ساتھ بذیل بن شریحیل سے نقل کیا
ہے کہ طلحہ بن مصرف نے ان سے دریافت کیا :-

(۱) ان الناس یقولون ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم اوصی
إلی علی علیہ السلام فقال ابو بکر یتامر علی وصی رسول الله صلی اللہ
علیہ وسلم! وذا ابو بکر رضى الله عنه) انہ وجد من رسول الله
عهداً فخرم انفسہ بہ (شرح حدیدی جلد ثانی ص ۵)

لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف
وصیت فرمائی تو انہوں نے کہا کیا ابو بکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی پر امیر بن
سکتے تھے؟ ابو بکر کی تو دلی خواہش تھی کہ وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے
عهد پاتے تو اس کو اپنے ناک کی نکیل بناتے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہوتے۔

(۲) ابو بکر احمد بن عبد العزیز الجوزیری نے ہی نقل کیا ہے کہ علی بن ہشام نے عاصم بن عمرو
بن قتادة سے نقل کیا ہے۔

لَقِيَ عَلَى عَلَيْهِ السَّلَامُ عَمْرُوقًا قَالَتْ لَعَلَّكَ عَلَى انْتِشَاكِ اللَّهِ ؟ هَلْ
اسْتَخْلَفَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ؟ قَالَ لَا -
قَالَ فَكَيْفَ تَصْنَعُ أَنْتَ وَصَاحِبُكَ ؟

قَالَ أَمَّا صَاحِبِي فَقَدْ مَضَى لِسَبِيلِهِ وَأَمَّا أَنَا فَسَاخِلَعُهُمَا مِنْ عُنُقِي
إِلَى عُنُقِكَ فَقَالَ جَدَّ عَ اللَّهُ أَنْفَ مَنْ يَتَقَذِّكَ مِنْهَا لَا وَلَكِنَّ
اللَّهُ جَعَلَنِي عَلِيًّا فَإِذَا قُمْتُ فَمَنْ خَالَفَنِي ضَلَّ
ص ۵۸ ج ثانی -

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی
تو آپ نے ان سے کہا میں تجھے اللہ تعالیٰ کے نام اقدس کا واسطہ دے کر دریافت
کرتا ہوں کیا تجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ بنایا انہوں نے کہا نہیں
تو آپ نے فرمایا تم اور تمہارے یار کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا میرے یار اور
ساعتی تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہو چکے رہا میں تو میں ابھی خلافت کا بوجھ اپنی
گردن سے اتار کر تمہارے گلے ڈالتا ہوں تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص
کی ناک کاٹے جو تمہیں اس خلافت سے دور کر دے۔ یہ مقصد نہیں لیکن اللہ تعالیٰ
نے مجھے علم حق اور دلیل صدق بنایا ہے جس وقت میں خلافت کے ساتھ قائم ہوں گا
تو جو شخص بھی میری مخالفت کرے گا گمراہ ہو جائے گا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت ہوتی تو آپ کے لیے نبی اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت پر عمل ضروری تھا۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھلا بھی
اسی میں تھا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور وصیت کے برعکس عمل سے
ان کو باز رکھا جاتا۔ لہذا حضرت عمر کے خلع پر آمادہ ہونے کے باوجود نہ آپ کا
وصیت پر عمل کرنا اور نہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے عمل کرنا اس امر کی بین دلیل
ہے کہ خلافت سے متعلق کوئی وصیت موجود نہیں تھی ورنہ صحابہ کرام کے ساتھ ساتھ
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بھی حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت لازم
آئے گی۔

نیز یہ جملہ کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی ناک کانٹے جو تمہیں خلافت سے دور کرے وصیت کے دعوے کو بیخ و بن سے اکھیڑ دیتا ہے۔ کیونکہ وعید اور سزا اور ناک کانٹے کا حق دار وہ شخص ہو گا جو خلاف شرع کرے نہ جو کہ شریعت اور حکم رسالتاً بصلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل کرے۔

(۳) فقال العباس لعلي عليه السلام: لا تدخل معهم وارفع نفسك عنهم قال اني اكره الخلاف قال اذن ترى ما تكره۔
رشرح حدیہ جلد اول ص ۱۹۱

حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا ان کے ساتھ شورائی میں شامل نہ ہونا اور اپنے آپ کو ارکانِ شورائی کی برابر ہی اور ہمہری سے بالاتر رکھنا آپ نے کہا میں مخالفت کو ناپسند کرتا ہوں۔

حضرت عباس نے فرمایا تو پھر تجھے وہی کچھ دیکھنا پڑے گا جس کو ناپسند کرتے ہو۔ سبحان اللہ وصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کو پسند کر لیں اور مخالفت فاروق کو پسند نہ کر لیں۔ یہ کیسی منطق اور دلیل ہے۔ لہذا اس سے صاف ظاہر کہ وصیت امامت و خلافت کا دعویٰ خلاف واقع اور خلاف حقیقت ہے۔

(۴) قطب راوندی نے روایت کیا کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے جب اہل شورائی کو کہا کہ اگر تم میں اختلاف پیدا ہو جائے اور میں میں تقسیم ہو جاؤ تو پھر ان تین کی اتباع کرنا جن میں عبداللہ بن جعفر بن عوف ہوں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے کہا:

ذهب الامرنا الرجل يريد ان يكون الامر في عثمان فقال علي عليه السلام وانا اعلم ذلك ولكني ادخل معهم في الشورى لان عمر قد اهلني الان للخلافة وكان قبل ذلك يقول يا ابا رسول الله صلى الله عليه وسلم قال ان النبوة

والامامة لا يجتمعان في بيت فانا ادخل في ذلك لا ظهر للناس مناقضة فعله لروايتهم (بحوالہ شرح حدیثی ص ۱۸۹ جلد اول)
 امر خلافت ہم سے چلا گیا اس شخص کا ارادہ یہ ہے کہ خلافت حضرت عثمان کے لیے موصول ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں بھی اس کو جانتا ہوں مگر اس کے باوجود میں شوریٰ میں اس لیے شامل ہو رہا ہوں کہ اب عمر بن الخطاب نے (شوریٰ میں شامل ہونے کے) مجھے خلافت کا اہل ثابت کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے کہا کرتے تھے کہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نبوت اور امامت ایک گھرانہ میں اکٹھی نہ ہوں گی تو میں اس لیے شوریٰ میں داخل ہو رہا ہوں تاکہ ان کے عمل کا روایت کے خلاف ہونا لوگوں پر ظاہر کر دوں۔

قطب راوندی رئیس شیعہ کی اس روایت میں نظر انصاف کے ساتھ غور کرو تو وصیت کے دعویٰ کی بنیاد متزلزل بلکہ نیست و نابود ہو کر رہ جاتی ہے۔
اولاً اس لیے کہ وصیت پر گواہ پیش کرنا ان کی روایت کے رد میں زیادہ دقیق تھا نسبت شوریٰ میں شامل ہو کر ان کے عمل اور ان کی روایت میں تضاد ثابت کرنے کے۔

ثانیاً محض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شوریٰ میں ان کو نامزد کرنا ہی ان کے عمل و روایت میں مناقضت ثابت کرنے کے لیے کافی تھا شمولیت کیوں ضروری سمجھی گئی؟

ثالثاً روایت بالفعل اجتماع کی نفی کہہ رہی تھی اور شوریٰ میں شامل کرنا صرف اہلیت پر دلالت کرتا تھا لہذا عمل اور روایت میں مناقضت تھی ہی نہیں۔

رابعاً

جب شامل ہونے کے باوجود خلافت نہ ملی تو آپ کی صداقت ظاہر اور

واضح ہو گئی نہ کہ مناقضت قول و فعل ۔

خامساً

کچھ بھی خصوصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنا اور کرنا ضروری تھا۔ نہ کہ صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عمل اور روایت میں تضاد ثابت کرنا اہم تھا۔ ان کا تضاد تو ثابت ہونے سے رہا۔ خود آپ کے قول اور عمل میں تضاد و مخالفت ثابت ہو گیا۔ کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلافت و امامت کی وصیت تھی تو شوریٰ میں شمولیت والا عمل اس کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ عمل صحیح ہے تو دعویٰ وصیت اس سے غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور عمل کا ثبوت تو شیعہ دینی کے اجماع سے ثابت ہے۔ بلکہ بعد میں بیعت بھی لہذا وصیت کا دعویٰ باطل ہو کر رہ گیا۔ اور تضاد ثابت کرنے والے خود تضاد کا شکار ہو کر اپنے ذہنی دعویٰ کی اہمیت بلکہ صداقت کو ختم کر بیٹھے لہذا شیعہ صاحبان کا دعویٰ وصیت یقیناً حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے عمل نے باطل کر دیا ہے اور اس کی صحت اور صداقت بالکل غلط ہو کر رہ گئی ہے۔

(۵) ابن قتیبہ نے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے منقول بعض غرائب کلام کی شرح کی۔ من جملہ غرائب کلام کے آپ کا شوریٰ کے دن یہ ارشاد بھی ہے :-

إِنَّ لَنَا حَقًّا أَنْ نَعْطَهُ نَاحِذَةً وَإِنْ مَنَعَهُ نَرْكَبُ أَعْجَابَ الْأَبْلِ وَإِنْ طَالَ السَّرَى، لَوْ عَهْدَ الْبَيْنِ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَهْدَ الْحَبَالِ دَنَا عَلَيْهِ حَتَّى نَمُوتَ أَوْ قَالَ لَنَا قَوْلًا لَا تَفْذُنَا قَوْلًا عَلَيَّ رَغْمًا. لَنْ يَسْرَعَ أَحَدٌ قَبْلِي إِلَى صَلَاةٍ رَحِمَ وَدَعَاةٍ حَقٍّ وَالْأَمْرُ إِلَيْكَ يَا ابْنَ عَوْفٍ عَلَى صَدَقِ النِّيَّةِ وَجَهْدِ التَّمَصُّعِ وَاسْتَغْفِرَ اللَّهُ لِي وَلَكُمْ۔

بحوالہ شرح حدیثی مسکۃ جلد نمبر ۱۹۔ وکتاب مسکۃ جلد اول شرح ابن

ابی الحدید الشیبی المعتزلی۔

ہمارے لیے حق ہے اگر ہمیں دیا جائے تو اس کو لے لیں گے اور اگر اس سے روک دیئے گئے تو اونٹوں کے پچھلے حصے پر سوار رہیں گے اگرچہ مسافت طویل ہی کیوں نہ ہو گئی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری طرف عہد فرماتے تو ہم اس کے نفاذ پر جرات و جلاوت سے کام لیتے حتیٰ کہ جان دے دیتے یا ہمیں کوئی فرمان دیتے تو ہم آپ کے فرمان کو نافذ کرتے۔ اپنی خواہش کے برعکس یا اپنی مشقت و تکلیف کے باوجود۔ مجھ سے کوئی شخص صلہ رحمی اور دعوت حق میں سبقت نہیں لے جاسکتا اے عبدالرحمن بن عوف! اب معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ صدق نیت اور پوری ہمدردی و خلوص کی بنا پر اس کو برنجام و د! اس خطبے میں وضاحت فرمادی کہ ہمارے حق میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی عہد و پیمان نہیں ہے۔ اور نہ ہی ایسا کوئی فرمان و رنہ ہم اس کو ہر حال میں پورا کرتے۔ خواہ جان ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔

اور جو حق آپ نے اپنا سمجھا وہ قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے ہے۔ نہ کہ وصیت کی وجہ سے اس لیے فرمایا اگر مل جائے تو ٹھیک نہ ملے تو ہر مشقت اور تکلیف برداشت کرنے کو تیار ہیں کیونکہ اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار کو زیادہ مشقت اٹھانا پڑتی ہے۔ اور یا یہ مقصد ہے کہ ہم دوسروں کے پیچھے چلنے اور ان کی اتباع کرنے پر تیار ہیں۔ جیسے اونٹ کے پچھلے حصے پر سوار اگلے حصے پر سوار ہونے والے شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اس سے بھی وصیت اور وجوب حق کی نفی ہو جاتی ہے۔

وصیت و وراثت والی روایات کا معنی و مفہوم

الغرض وصیت اور عہد کی نفی پر بہت سی روایات شاہد صادق ہیں اور جن روایات میں وصیت اور وراثت کا ذکر ہے ان کا وہ معنی نہیں جو شیخ

صاحبان نے مراد لیا ہے جیسے کہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعہ نے تصریح کی ہے۔
 قال رضى الله عنه وفيهم الوصية والوراثة اما الوصية
 فلا ريب عندنا ان علياً عليه السلام كان وصى رسول الله صلى
 الله عليه وسلم وان خالفت في ذلك من هو منسوب عندنا الى
 العناد ولسنا نغنى بالوصية النص والخلافة ولكن اموراً اخرى
 لعلها اذا لمحت كانت اشرف واجل واما الوراثة فالا مامية
 يحملونها على ميراث المال والخلافة و نحن
 نعملها على وراثة العلم۔

(ص ۱۴۹ شرح حدیدی جلد اول)

آپ نے فرمایا۔ اہل بیت میں وصیت ہے اور ان میں وراثت ہے۔ یہی
 وصیت تو اس میں ہمارے نزدیک ریب و تردد کی مجال نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ
 عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی تھے۔ اگرچہ اس میں ان لوگوں نے مخالفت
 کی جو ہمارے نزدیک عناد کی طرف منسوب ہیں لیکن وصیت سے یہ مقصود نہیں کہ
 آپ کے حق میں نص خلافت وارد ہے بلکہ دوسرے امور ہیں کہ عین ممکن ہے کہ اگر وہ
 ظاہر ہوں اور ان کا انکشاف ہو جائے۔ تو وہ خلافت سے بھی بلند و بالا معلوم ہوں۔
 اور وراثت کے لفظ سے امامیہ میراث مال اور خلافت مراد لیتے ہیں لیکن ہم اس کو
 وراثت علم پر منطبق کرتے ہیں۔

نص صریح و قطعی اور وصیت وغیرہ کا انکار

ابن ابی الحدید نے سقیفہ بنو ساعدہ میں صحابہ کرام علیہم الرضوان اور مہاجرین
 و انصار میں ہونے والے مناظرہ و مباحثہ پر مشتمل بہت سی روایات ذکر کر کے
 کے بعد کہا:۔

وَأَعْلَمُ أَنَّ الْأَخْبَارَ وَالْآثَارَ فِي هَذَا الْبَابِ كَثِيرَةٌ جَدًّا

وَمَنْ تَأَمَّلَهَا وَانصفت علم انّہ لم یکن هناك نص صریح و
مقطوع بہ لا تختلجہ الشکوک ولا تتطرق الیہ الاحتمالات
كما تزعم الامامية (إلی) ولا ریب ان المنصف
اذا سمع ما جرى لهم بعد وفاة رسول الله
صلی الله علیہ وسلم یعلم قطعاً انّہ لم یکن
هذا النص ولكن قد سبق الی النفوس و
العقول انّہ قد کان هناك تعریض و تلویح و
کنایة وقول غیر صریح وحکم غیر مبتوت وعلیہ
یصدّٰ عن التصریح بذلك امر یعلّمه ومصلحه
براعیہا او وقوف مع اذن الله تعالی فی ذلك۔

(شرح حدیدی ص ۵۹، جلد ثانی)

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین رکھئے کہ آثار و اخبار باب خلافت اور عہد
پیمان کے عدم ثبوت اور تحقیق و اثبات میں بہت زیادہ ہیں اور جو شخص ان میں
غور و تامل کرے اور انصاف سے کام لے اسے قطعی اور حتمی علم اس بات کا ہو جاتا
ہے کہ اس ضمن میں کوئی نص صریح اور قطعی موجود نہیں جس میں شکوک و شبہات اور احتمالات کی
گنجائش نہ ہو جیسے کہ امامیہ فرقہ کا دعویٰ ہے۔

ہر منصف آدمی جب وہ واقعات اور معاملات سنتا ہے جو وفات رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیش آئے۔ تو اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ امر خلافت میں
کوئی نص موجود نہیں تھی نہ ابو بکر صدیق کے لیے اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ
عنہ کے لیے لیکن نفوس و عقول اصحاب میں یہ امر سبقت لے جا چکا تھا کہ کچھ
اشارات اور تلویحات موجود ہیں اور تعریضات و کنایات اور غیر صریح اور
غیر یقینی احکام راجح سے بعض حضرات ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر
استدلال کیا اور بعض حضرات نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو راجح

اور مقدم خیال کیا۔
 اور عین ممکن ہے کہ کوئی امر مانع نگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا ہو جس کے
 تحت آپ نے تصریح نہ فرمائی ہو اور کوئی مصلحت ایسی پیش نظر ہو جس نے تصریح
 کی رخصت نہ دی ہو۔ یا آپ اللہ تعالیٰ کے اذن کے منتظر رہے ہوں۔ اور اس کا
 اذن وارد نہ ہوا۔

ابو جعفر نقیب البصرہ شیعہ کا نظریہ

اس ضمن میں رئیس اہل التشیع نقیب الاشراف لاهل البصرة کا اعتراف بھی
 ملاحظہ فرماتے جائیں :-

قلت قرأت هذا الخبر على أبي جعفر يحيى بن محمد
 العلوي الحسيني. المعروف بابن أبي زيد نقیب البصرة
 رحمة الله تعالى في سنة عشر وستمائة من كتاب
 السقيفة لاحمد بن عبد العزيز لاحمد بن عبد العزيز بن
 الجوهري قال لقد صدقت فراسة الحباب (إلى)
 فما زال يقرّر لا بن عمّه قاعدة الامر بعدة حفظاً
 لدمه ودماء اهل بيته فائهم اذا كانوا ولاية الامر
 كانت دماء هم اقرب إلى الصيانة والعصمة مما
 اذا كانوا سوقة تحت يدي وال من غيرهم فلم
 يساعدة القضاء والقدر و كان من الامر ما كان ثم
 افضى إلى ذريته فيما بعد الى ما قد علمت -

(شرح حدیدی جلد ثانی ص ۵۳)

شارح نے کہا میں نے سقیفہ میں انصار و ہاجرین کی باہمی گفتگو پر مشتمل روایت
 احمد بن عبد العزیز جوہری کی کتاب سے ابو جعفر یحییٰ بن محمد علوی حسینی المعروف

ابن ابی زید نقیب بصرہ پر پڑھ ہی رہے تھے جس میں حباب بن منذر کا یہ قول منقول ہے مینا امیر و منکر امیر ایک امیر ہم سے ہو اور ایک تم میں سے ہمیں بخدا تم پر کوئی حسد نہیں ہے۔ لیکن ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ تمہارے بعد امر خلافت کے وارث وہ لوگ ہو جائیں جن کی اولاد بھائی اور باپ دادے ہمارے ہاتھوں قتل ہوئے۔ تو حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے کہا اگر ایسا وقت آیا تو میں ان کی مخالفت کروں گا۔ اگر مجھ میں ہمت و طاقت ہوئی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا ہم امراء ہیں تو تم وزراء ہو اور امر خلافت ہمارے درمیان مشترک ہو گا۔ تو انصار نے بھی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کی اور سب سے پہلے نعمان بن بشیر کے والد حضرت بشیر بن سعد انصاری نے بیعت کی۔ تو ابو جعفر نقیب نے کہا کہ حباب بن منذر کی رائے درست نکلی کیونکہ جس امر کا انہیں خوف تھا حرہ کے موقع پر وہ پیش آگیا۔ اور انصار سے مشرکین بدر کے قتل کا بدلہ وصول کیا گیا۔ پھر انہوں نے کہا کہ یہی خوف رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا کہ اگر میرے اہل بیت بطور رعایا رہے تو ان کے لیے سخت خطرات ہیں لہذا ہمیشہ اپنے چچا زاد بھائی (حضرت علی رضی اللہ عنہ) کے لیے امارت و حکومت کا راستہ ہموار کرتے رہے تاکہ ان کا اور جملہ اہل بیت کا خون اور جانیں محفوظ رہیں لیکن قضا و قدر نے آپ کا ساتھ نہ دیا۔ اور جو ہونا تھا ہو گیا۔ اور بعد ازاں آپ کی ذریت کا معاملہ جس انجام کو پہنچا۔ وہ سچے معلوم ہی ہے۔ الغرض ابو جعفر نقیب بصرہ کے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ گو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قلبی خواہش یہی تھی کہ حکومت کی باگ ڈور حضرت علی رضی اللہ عنہ اور آپ کی اولاد کے ہاتھ میں ہو لیکن قضا و قدر نے اور اللہ تعالیٰ کے اذنی فیصلہ نے آپ کا ساتھ نہ دیا۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خواہش پاریہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ اور یہی ابن ابی الحدید نے کہا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اذن یاری تعالیٰ کے منتظر تھے۔ لیکن اذن نہ ملا۔ اس لیے آپ نے اعلان نہ فرمایا۔

اذن نہ ملنے کی حکمت و مصلحت

جب شیعہ صاحبان اس حقیقت کے مدعی ہیں اور اسے عین ایمان سمجھتے ہیں کہ قوم قریش کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قلبی کدورت تھی اور کینہ و عداوت اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی خلافت کا بھی اعلان فرمادیتے اور ان کے لیے وصیت بھی فرمادیتے تو گویا اپنے ہاتھوں اسلام کے تعمیر شدہ قلعہ میں دراڑیں ڈالنے اور اسے مسمار کرنے کی بنیاد فراہم کرتے اور وہ ہستی مقدس جو لوگوں کو حکمت کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئی تھی وہ خود خلاف حکمت اور مصلحت کیونکر کرتی۔ اور جس اسلام کی نشوونما کے لیے سینکڑوں جانوں کو قربان کیا تھا۔ اور ان کے خون سے اس مبارک درخت کی آبپاری کی تھی اس کی جڑوں پر خود ہی کلھاڑا رکھ دیتے صرف اپنی اولاد اور اپنے چچا زاد کی ممکنہ تکلیف کے پیش نظر۔

لہذا یا شیعہ صاحبان کو اس نظریہ سے دست بردار ہونا چاہئے کہ ان میں ماحماد بنہم والی صفت موجود نہیں تھی اور آپس میں بغض و کینہ موجود تھا اور علی الخصوص علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسے حسن اسلام کے ساتھ اور یا اس دعویٰ سے دست بردار ہونا چاہیے کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد کے حق میں خلافت کی وصیت اور اس کا اعلان فرمایا۔ کیونکہ یہ دونوں باتیں بہر حال جمع نہیں ہو سکتیں اور شیعہ صاحبان کو یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کا دعویٰ کرنے اور اس کے لیے طاقت استعمال کرنے سے صرف اس لیے گریز کیا کہ اسلام کو نقصان نہ پہنچے۔ تو جو حکمت علی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سمجھ آگئی وہ خود تسلیم فرمایا، اور امام الحکماء اور معلم حکمت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں سمجھ میں نہ آئی؟

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے اختلاف و نزاع سے دور رہنے کی وصیت

بلکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے کہ خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی کہ خلافت کے لیے نزاع و اختلاف سے دور رہنا جیسے کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے کلام سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

أذا الميثاق في عنقي لغیری رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ان خلفاء کی اطاعت کا حکم دیا تھا لہذا میرے لیے اس کا خلاف ممکن نہیں ہے۔ اور اسی طرح آپ نے فرمایا: مجتنبی الشرة قبل ایناعها كالزراع بأرض غیرہ کہ پھل پکینے سے پہلے توڑنا اور چننا ایسے ہے جیسے دوسرے کی زمین میں بیج بونا اور کھیتی باڑی کرنا یعنی بلا اذن و اجازت جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ ابھی میری خلافت کا وقت ہی نہیں آیا۔ تو میں قبل از وقت وصیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے برعکس کس طرح امامت و خلافت کا دعویٰ کروں؟ تفصیل عنقریب آتی ہے؟ لہذا واضح ہو گیا کہ سرور انبیاء علیہم التحیۃ والثناء نے اسلام کا تحفظ اور اس کی نشوونما اور ترویج و اشاعت کو مقدم سمجھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو ثانوی حیثیت دی۔

مقتضائے حکمت کیا تھا؟

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں دیگر قبائل کے لوگ قتل ہوئے تھے تو آپ کے قبیلہ کی عظیم شخصیات بھی دوسرے لوگوں کے ہاتھوں شہادت کے درجہ تک پہنچی تھیں۔ مثلاً حضرت ابو عبیدہ بن الحارث

حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہما اور دیگر حضرات لہذا دو طرفہ امکان کہیں کشتی اور انتقام کا موجود تھا۔ تو لامحالہ حکمت و مصلحت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں وصیت کرنے کے ایسے حضرات کو آگے لایا جاتا جن پر ہر فرق مطلب ہو سکتا تھا اور وہ خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی ذات مقدسہ تھیں اس لیے ان کے دور میں اسلام کو وہ ترقی نصیب ہوئی اور ترویج و اشاعت کہ تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے اور اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ان کے ساتھ اختلاف و نزاع سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور وصیت کے ذریعے پابند کر دیا۔ گویا اگر وصیت آپ کی طرف سے ہے تو ان حضرات کا ساتھ دینے کی اور موافقت و معاونت کی نہ کہ خود ان کے خلیفہ بلا فصل ہونے کی۔

علاوہ انہیں اس طریقہ خلافت سے جس کو شیعہ صاحبان نے اختراع کیا ہے۔ خود ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم بھی مورد طعن و تشنیع بن سکتی تھی کہ آپ کا مقصد اپنے اقربا اور اپنی اولاد کی شخصی حکومت قائم کرنا تھا۔ اور نبوت و رسالت کو اس کے حصول کے لیے ذریعہ واسطہ بنایا جس سے خود آپ کی نبوت و رسالت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ لہذا یہ طریقہ سراسر خلاف مصلحت اور منافی حکمت تھا۔ اس لیے آپ سے اس کا صادر ہونا ممکن تھا۔

انوکھی وصیت

دنیا میں جس بادشاہ اور حکمران نے کسی کو اپنا نائب اور جانشین نامزد کیا اور ولی عہد بنایا۔ کسی کے متعلق اختلاف پیدا نہ ہوا صرف حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ولی عہدی اور وصیت خلافت ہی ہے جو اہل اسلام کے لیے معتمد بن کر رہ گئی۔ اور اس میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے۔ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل دوسرا حکم آپ بیان فرما سکتے تھے۔ صرف ولی اور خلیفہ بلا فصل مقرر کرنے کا طریقہ طے نہ فرما سکے اور اس راہ میں حائل موانع اور شکوک و شبہات کو ختم نہ فرما سکے

نعمو باللہ من ذالک ۔ اور یہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات تک محدود نہیں
اولاد میں اس قدر اختلاف پیدا ہوئے کہ جس سے خود شیعہ صاحبان دو درجن فرقوں
میں تقسیم ہو کر رہ گئے جس سے صاف ظاہر کہ وصیت علانیہ کسی کے حق میں نہیں پائی
گئی ۔ ورنہ یہ اختلافات رونما نہ ہوتے اور علی الخصوص انصار کبھی حضرت علی رضی اللہ
عنہ کا ساتھ نہ چھوڑتے کیونکہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات مقدسہ سے
کونئی رنج اور تکلیف نہیں پہنچی تھی کہ ذاتی کینہ و بغض اور عناد کی وجہ سے ان کو
اس مخالفت پر کمر بستہ سمجھ لیا جائے ۔ اور اپنی دنیوی وجاہت انہوں نے ویسے مد نظر
نہیں رکھی تھی ۔ ورنہ ابو بکر صدیق کی بجائے اپنے لیے خلافت کو مختص کر لیتے ۔ اور ایسا
کم عقل کون ہو سکتا ہے کہ دین اور دنیا دونوں کو خیر باد کہہ دے ۔ بلکہ کسی کی دنیا کے
لیے اپنے دین کو قربان کر دے ۔ اور بالخصوص وہ فریق جس کی شان ایشار اور قربانی
اور خدمات اسلام و اہل اسلام کا قرآن گواہ ہو اور اگر وصیت بطور رازدار سی اور
اسرار پائی گئی ہے تو امت اس کی پابند ہی نہیں لہذا حمل نزاع میں اس کو پیش
کرنے کا کوئی جواز نہیں ۔

تمیز مہمہ الامامیہ انہ علامہ ڈھکو صاحب

۱۔ حضرت شیخ الاسلام کی ذکر کردہ وصیت کے متعلق روایات کے جواب میں
ڈھکو صاحب نے سارا زور اس پر صرف کیا ہے کہ یہ صرف اہل سنت کی روایات
میں اور جناب علم الہدی نے ان کا رد کرنے کے لیے ان کو نقل کیا ہے جبکہ
شیعہ کتب وصیت خلافت سے متعلق روایات سے بھری پڑی ہیں لہذا ان کے
مقابل ان روایات کے پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے ۔ اس لیے شیعیان
حیدر کرتا تمام تہذیبی اختلاف کے باوجود ان روایات کے منکر ہیں اور ان کا رد
کرتے ہیں جن میں وصیت خلافت کا انکار ہے ۔

۲۔ جن روایات کے ساتھ ہم استدلال کرتے ہیں وہ متفق علیہ ہیں ان کے روایت کرنے والے اور تصحیح کرنے والے خود اہل سنت بھی ہیں جس طرح شیعہ جبکہ معارضہ میں پیش کی جانے والی روایات صرف اہل سنت کی نقل کردہ ہیں نہ کہ شیعہ کی۔ یا ان کے راوی متعصب اور منحرف ہیں لہذا مقام معارضہ میں ان کے پیش کرنے کا کوئی جواز نہیں۔

تحفہ حسینیہ

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی عفرلہ

جہاں تک وصیت کے ثبوت اور تحقق کا معاملہ ہے تو اس کے متعلق آپ ابو جعفر نقیب بسرہ اور ابن ابی الحدید شعی کی رائے ملاحظہ کر چکے اؤل الذکر اس کے قائل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذاتی خیال مبارک یہ تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر دیں۔ اور وصیت فرمادیں لیکن قضا و قدر نے آپ کی موافقت نہ کی اور خداوند تعالیٰ کی قضا اور اس کی تقدیر کا تسلیم کرنا ہر مومن پر لازم ہے۔ چہ جائیکہ نبی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو تسلیم و رضا کا درس دینے کے لیے مبعوث ہوئے۔ اس لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا رضینا عن اللہ قضا، ہ وسلمنا رلہ امودہ کہ ہم اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی ہوئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کیا اور ابن ابی الحدید صاحب نے بیان کر دیا کہ کوئی ایسی نفس صریح اور حمی دلیل خلافت و وصیت کی موجود نہیں ہے۔ لہذا یہ دعویٰ علم الہدی صاحب کا کہ تمام شیعہ نفس خلافت اور وصیت کے قائل ہیں خواہ امامیہ خواہ غیر امامیہ قطعاً غلط ہے۔

نیز جن کتب سے اس ضمن میں حوالے پیش کئے جاتے ہیں وہ سنی ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ مخالف نگاری اور واقعات کی نقل بلا تعصب مذہب کے پیش کیے جاتے ہیں، ہم بھی جیسے کہ نماز شیعہ صاحبان کو ان کتب کا سہارا لینا پڑتا ہے خود واقعی کے خطبا قطع برید کر کے صاحب نہج البلاغہ نے ذکر کئے ہیں لہذا ان کتب کے وہ حوالہ جات جو مفید مطلب ہوں گے اس پر مذہب کی بنیاد رکھ لینا اور دوسروں کو غلط اور موضوع روایات کہہ دینا اور ان کے راویوں کو متعصب اور اہل بیت سے منحرف قرار

دے دینا ایسی ناروا تفریق ہے اور دھاندلی جس کا دنیا نے علم و تحقیق اور جہان
عدل و انصاف میں کوئی جواز نہیں ہے۔

پھر یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ احمد بن عبد العزیز جوہری وغیرہ
جن کے حوالے ابن ابی الحدید نے نقل کئے ہیں وہ اہل سنت ہی نہیں چہ جائیکہ
ان کو اس مذہبی تعصب میں مبتلا سمجھا جائے۔ اور فضائل اہل بیت کرام سے اہل سنت
کی کتابیں بھرن پڑی ہیں لہذا ان کے حق میں قسم کی بطنی اور طعن تشنیع کا مطلب ہی کیا
ہو سکتا ہے؟ آخر دوسری روایات جن کو متفق علیہ قرار دیا گیا ہے وہ انہیں اہل سنت
کی نہیں؟ اور ان کے راوی ان کے اہل مذہب نہیں ہیں۔

مزید برآں ہم دلائل عقل و نقل سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ وصیت خلافت کی
کوئی روایت موجود ہی نہیں اور اگر ہے تو اس کا وہ معنی ہی نہیں ہے بلکہ محض وصیت
کا لفظ دیکھ کر مطمئن ہو جانے والی بات ہے حالانکہ نزاع نہ لفظ وصیت میں ہے اور
نہ لفظ وراثت میں بلکہ اس کے مخصوص معنی میں یوں تو ساری امت وصی ہے۔ اور
وارث بھی۔ آپ نے ان کو وصیتیں بھی فرمائیں۔ اور علوم نبویہ اور آپ کی شریعت
مقدسہ ان کے پاس ہے لہذا وصی بھی ہوئے اور وارث بھی العلی وراثۃ الانبیاء
اور خود شیعہ کتب سے ہم نے بھی ثابت کیا ہے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے
بھی جیسے کہ آپ کی درج کردہ اگلی روایات سے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
نے جو وصیت فرمائی تو وہ یہی تھی کہ ان حضرات صحابہ اور خلفاء کے ساتھ اختلاف
نہ کرنا اور ان کی موافقت و معاونت کرنا۔

اس تعارض کو دور کیجئے

اگر ایک طرف یہ روایات ہوں اور دوسری طرف خلافت کی وصیت ہو تو
ان میں کھلا اور واضح تعارض ہے جس کو دور کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔
آپ خلیفہ ہیں تو دوسرے باغی اور قاسط لہذا ان کے ساتھ مقابلہ ضروری ہے اور
کم از کم عدم تعاون اور اگر موافقت اور تعاون اور ترک نزاع و ترک مناقشت

ضروری ہے۔ تو پھر خلافت کی وصیت غلط ہے۔ مثلاً کسی کو قاضی مقرر کر دیا جائے لیکن قضا اور فیصلہ کرنے سے روک دیا جائے۔ یا دوسرے قاضی کی متابعت کا پابند کر دیا جائے۔ تو کون کہے گا کہ واقعی اس کو قاضی بنا دیا گیا ہے۔ الغرض جو کچھ ثابت ہو سکے گا۔ وہ صرف اس قدر ہو گا کہ اگر ہمیں خلیفہ بنا دیا جائے۔ تو بہتر ہے۔ کیونکہ ہمارا اندراہیت و صلاحیت موجود ہے اور اس میں اہل سنت کو کیا اختلاف ہے جو آپ کو چوتھا برحق خلیفہ تسلیم کرتے ہیں اور جس میں اختلاف ہے وہ ان روایات کی موجودگی میں ثابت نہیں ہو سکتا کیونکہ خلیفے تو آپ ہوں اور اتباع دوسرے حضرات کی آپ پر لازم ہو۔ اذا الميثاق في عنق لغیرہی بالکل غیر معقول بات ہے جو عام عقل مند آدمی بھی نہیں کر سکتا چہ جائیکہ سرچشمہ عقل و دانش و معدن علم و حکمت۔ لہذا نہ تو اتر وصیت کا دعویٰ درست ہے اور نہ انکار وصیت کے راویوں پر یہ الزام ہی درست ہے۔ اور نہ ہی تمام تر شیعہ کے متعلق یہ دعویٰ ہی درست ہے۔ کہ وہ انکار وصیت کی روایات کو رد کرتے ہیں لہذا صاحب شافی کا یہ فریاد قطعاً غلط ہے۔

متفق علیہ پر عمل اور مختلف فیہ کا ترک کوئی صحیح اصل و قاعدہ نہیں

ابا صاحب شافی کا یہ دعویٰ کہ ہماری طرف سے جو روایات قاضی القضاۃ نے معنی میں نقل کی ہیں، ان میں فریقین کا اتفاق ہے اور دوسری روایات میں یا اہل سنت متفرق ہیں یا ان کے راوی متعصب اور منحرف ہیں یہ طرز استدلال ہر جگہ کام نہیں دے سکتی اور نہ ہی اس میں کوئی معقولیت ہے۔ بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہنا بالکل بجائے کہ یہ طرز یہود و نصاریٰ سے ماخوذ ہے اور ان کا عطیہ ہے۔ کیونکہ اہل اسلام کے مقابلہ میں ان کا بھی انداز ہی ہوتا ہے۔ کہ نبوت عیسیٰ موسیٰ علیہما السلام متفق علیہ ہے اور نبوت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم مختلف فیہ علیٰ ہذا القیاس فضائل و کمالات موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام متفق علیہ ہیں اور فضائل و کمالات محمدیہ مختلف فیہ لہذا عقل کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فیہ کو چھوڑ کر

متفق علیہ پر عمل کیا جائے۔ اور اس کے تقاضا کو پورا کیا جائے اگر علم الہدایے صاحب کا یہ نسخہ ہدایت تیر ہدف ہے۔ تو یہود و نصاریٰ کا کیوں نہیں اور وہ غلط ہے۔ تو یہ صحیح کیسے ہو سکتا ہے؟

اور یہی استدلال خوارج و نواصب کا بھی ہے کہ شیخین رضی اللہ عنہما کی خلافت ان کے دور میں متفق علیہ تھی اور کوئی نزاع و خلافت ان کے ساتھ خلافت کے معاملہ میں نہیں تھا۔ اگر ہوا تو برا درازہ شکر رنجی کے طور پر تھا۔ کہ ہمیں شریک مشورہ کیوں نہ کیا گیا۔ یا ان کی خلافت کے بعد غلط فہمیاں پیدا کر کے لوگوں کو بہکایا اور ورغلا یا گیا نہ کہ ان کے دور میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے دور خلافت میں نزاع و خلافت رہا اور جنگ و جدال اور قتل و قاتل تک نوبت پہنچی اور بالآخر حکیم نے آپ کی خلافت کو مخدوش کر کے ہی رکھ دیا لہذا عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فیہ کو چھوڑ کر متفق علیہ کو اختیار کیا جائے۔ تو کیا یہ استدلال درست ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اس طرز استدلال کو نص خلافت و وصیت میں کیوں حرج آخر سمجھ لیا گیا ہے۔

مختلف فیہ روایات کیوں اور کیسے؟

بسم قبل ازین اس طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ غالی شیعوں نے اپنا دین و ایمان اس کو سمجھ رکھا ہے کہ فضائل اصحاب اور ان کی حقانیت خلافت کی مقدور بھر کوئی روایت ذکر نہیں کہ فی اور کر بھی دی تو ایسی تحریف اور تغیر و تبدیل کے بعد اور قطع و برید کے بعد کہ اصل معنی و مفهوم بدل جائے یا حقیقی مقصد کسی کو سمجھ نہ آ سکے۔

نہج البلاغہ جیسی کتاب میں شریف رضی جیسے آدمی نے جو خطبات مرقنویہ پر خود قلمبندی چلائی اور عبارت میں قطع و برید کی اور جو ذکر کیں ان کی ترتیب میں ایسی گڑبڑ کی کہ ابن میثم جیسا معقول شیعہ شارح بھی چلا اٹھا اور اسے کہنا پڑا "ہذا خطبہ عجیب من السید" یہ عجیب خطبہ اور تغیر و تبدیلی ہے اور اسل عبارت جو شیخین کی

فضیلت پر دلالت کرتی تھی۔

اِنَّ مَكَانَهُمَا فِي الْاِسْلَامِ لَعَظِيْمٌ وَاِنَّ الْمَصَابِيْهَ الْجَوْعُ فِي الْاِسْلَامِ شَدِيْدٌ لِّغَنَى شَيْخِيْنَ
ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا مقام اسلام میں بہت بلند ہے اور ان کی وفات اسلام کے
لیے ناقابل تلافی نقصان اور گہرا زخم ہے اس کو بالکل چھوڑ دیا اور کہیں چاروں چار
حضرت ابو بکر یا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی فضیلت جو نہ بان مرتضیٰ رضی اللہ
عنہ سے صادر ہوئی ذکر کردی مگر نام مبارک کی جگہ فلاں کا لفظ لکھ دیا وغیرہ وغیرہ
کیا ان حرکات اور تبلیغات کے بعد بھی ان روایات کا جو شیعہ صاحبان نے خلفائے
ثلاثہ رضی اللہ عنہم کی تنقیص شان اور ان کی خلافت پر تنقید و تنقیص میں ذکر کی ہیں
کوئی وزن ہو سکتا ہے؟

مفید مدعی قوت دلیل ہے:

لہذا یہ حقیقت تسلیم کے بغیر چارہ نہیں کہ مدعی کا اثبات قوت دلیل اور اسکی
واقعیت پر ہے نہ کہ متفق علیہ ہونے پر اور جو روایات فضائل اصحاب اور ان کی صحت
خلافت میں پیش کی گئی ہیں اور وہ عبارات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے شیخین
رضی اللہ عنہما کی خلافت کو خلافت الہیہ اور متعوض من اللہ قرار دیا ہے اور اللہ
تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفاء وعد اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنہم
فی الارض من الایۃ، قرار دیا اس کے بعد وصیت اور نص خلافت حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ثابت کہ نا ان کو جھٹلانے کے مترادف
ہے اور ان پر بہتان اور افتراء پہ داندی کے بہا بہہ بلکہ اس صورت میں
ان کے حق میں قرآن کی غلط تفسیر کرنے اور خدا تعالیٰ پر بہتان باندھنے
اور افتراء کرنے کا اعتقاد لازم آئے گا لہذا ایسی روایات قطعاً غلط ہیں اور
ناقابل اعتبار اور یا ان کا وہ معنی نہیں جو شیعہ مراد لیتے ہیں شیعہ کے وصیت
وراثت کے الفاظ سے استدلال کی بالکل وہی صورت ہے جیسے کہ کوئی

کہے العیاذ باللہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے میراث ثابت ہے کما قال اللہ
تعالیٰ لِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وغیر ذلک جیسے کہ انسانوں
کے لیے ثابت ہوتی ہے لہذا دونوں وراثت کے معاملے میں برابر ہیں
نعوذ باللہ حالانکہ لفظ وراثت ثابت ہے نہ وہ معنی و مقصد جو انسانوں
میں ثبوت وراثت کے لیے ہوا کرتا ہے فتا مل حق التامل!

علامہ ڈھکو صاحب کا جھوٹا دعویٰ

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے وصیت کے متعلق پہلی دو روایات
تلخیص الشانی کے حوالے سے نقل فرمائیں جن کے متعلق ڈھکو صاحب فرماتے ہیں۔
سو قارئین پر مخفی نہ رہے کہ ان روایات کے نقل کرنے میں مولف نے کئی قسم کی خیانت
کی ہے۔

(ا) یہ بے سرو پا روایات کتاب الشانی کے ص ۱۷ پر ہیں نہ کہ تلخیص کے ص ۳۷
پر جس کا مولف نے حوالہ دیا ہے۔

(ب) پہلی روایت جو باسناد حکیم اور ابو دلال مروی ہے۔ وہ وہاں ان الفاظ کے
ساتھ موجود نہیں بلکہ اس کے الفاظ وہ ہیں جو مولف کی نقل کردہ تیسری روایت
کے ہیں۔ اور اس عنوان کی کوئی روایت ان صفحات پر نہیں ہے جس سے معلوم
ہوتا ہے کہ مولف کے پاس اصل کتاب موجود نہیں ہے۔ یا اسے دیکھنے کی
زحمت گوارا نہیں کی بلکہ مناظرہ کے کسی رسالہ یا کتاب سے نقل کرنے پر
اکتفا کیا ہے۔

الجواب هو العلم للصدق والصواب

علامہ موصوف نے خود ہی تلخیص الشانی کے مذکورہ صفحات دیکھنے کی زحمت
گوارا نہیں کی اور الزام حضرت شیخ الاسلامؒ کو دے رہے ہیں گویا
چہ دلا اور است در دے کہ بکف چہ رخ دارد

دعویٰ صاحب ذرا تکلیف فرما کر تلخیص کو دوبارہ دیکھیں یہ دونوں روایات جن میں سے پہلی ابو وائل اور حکیم سے مروی ہے اور دوسری معصم بن جھو خان سے وہ دونوں تلخیص کے ص ۳ پر موجود ہیں اور بالکل انہی الفاظ کے ساتھ جو رسالہ مذمت شیعہ میں موجود ہیں اور تیسری روایت کا صفحہ ۱۷۱ درج کیا گیا ہے اور شافی کا حوالہ دیا گیا ہے الغرض پہلی دونوں روایات شافی اور تلخیص دونوں میں موجود ہیں اگرچہ پہلی روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے مگر مفہوم ایک ہے اور اس لیے اس کو بحوالہ شافی الگ کر کے ذکر کیا گیا ہے اور چوتھی روایت صرف شافی کے صفحہ ۱۷۱ کے حوالے سے مذکور ہے۔ لہذا ان حوالہ جات میں تو کوئی خیانت نہیں صرف دعویٰ صاحب کی کاہلی اور سستی اور تغافل نے اس جھوٹے دعوے کو جنم دیا ہے۔ حوالہ پھر نوٹ فرمائیں تلخیص الشافی ص ۳ سطر نمبر ۶ سے وہ عبارت اس طرح شروع ہوتی ہے۔

فان قيل كيف تستدلون على انه استعمله بعد الوفاة بما ذكرتموه وقد روى عن ابى وائل والحكيم۔ اور سطر نمبر ۱ پر روایات کی عبارت ختم کر کے طوسی صاحب اس سوال کا جواب دیتے ہیں کہ ان روایات میں وصیت نہ کرنے اور خلیفہ نہ بنانے کی تصریح موجود ہے تو تم اپنی ذکر کردہ روایات سے بعد وصال نبوی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے خلیفہ بنائے جانے پر استدلال کیوں کر کر سکتے ہو تو اس کا پہلا جواب طوسی صاحب نے یہ دیا۔

قِيلَ لَهُ اقل ما نقول ان هذين الخبرين وما جرى مجراهما اخبار آحاد لا تعارض ما هو مقطوع على صحته۔ الخ

کہ یہ دونوں اور اس مضمون کی دوسری روایات اخبار آحاد کے قبیل سے ہیں اور وہ ہماری نقل کردہ روایات کے معارض نہیں ہو سکتیں دوسرا جواب عقلی بحث و تحقیق کے بعد یہ ذکر کیا ہے۔ اللہ سہم الا ان يكون قال ذلك على وجه التقية والا استصلاح۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ابو وائل اور حکیم کی روایتیں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت کا جو ذکر حضرت علی نے کیا وہ تقیہ کے طور پر ہوا اور رعیت کی موافقت حاصل کرنے اور ان کی دلجوئی کے لیے کیونکہ ان میں سے جمہور شیخیں کی خلافت

حقہ کے قائل تھے) اور اسی ضمن میں طوسی صاحب نے شافعی میں منقول روایت کی عبارت بھی درج کی ہے جو سطر نمبر ۱۲ سے اس طرح شروع ہوتی ہے۔

علی أن فی الخبر المروی عن امیر المؤمنین لما قیل له الاوصی فقال ما اوصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاوصی ولكن اذا اراد اللہ بالناس خیرا استجمعهم علی خیرهم كما جمعهم بعد نبیہم علی خیرهم۔

تو اب واضح ہو گیا کہ عینوں روایات تلخیص شافعی میں موجود ہیں اور ان کے جوابات وغیرہ کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ مگر ڈھکو صاحب ہیں کہ آنکھیں بند کر کے کہے جارہے ہیں تلخیص میں ان کا ذکر ہی نہیں۔ اور پھر ان الفاظ کے ساتھ مذکور نہیں حالانکہ دونوں طرح کے الفاظ سے علیحدہ علیحدہ تلخیص میں مذکور ہیں دنیا ئے علم و تحقیق میں اس قسم کے دجل و فریب اور مکاری و عیاری کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا جس قسم کی عیاری و مکاری اور دجل و فریب کاری کا علامہ ڈھکو صاحب مظاہرہ کرتے ہیں۔

معارضہ میں پیش کی گئی روایات وصیت کی حقیقت اور صاحب

شافعی اور صاحب تلخیص شافعی کا رد

صاحب شافعی علم الہدیٰ اور صاحب تلخیص طوسی صاحب نے ابو وائل اور حکیم اور مصنف بن صوحان سے منقول روایات کے معارضہ میں دو روایات اپنی کتب سے نقل کی ہیں جن کو ان مذکورہ روایات کا معارضہ قرار دے کر بزعیم خویش اہل سنت کو چاروں شانے چیت کر دیا ہے۔ اہل انصاف اور اہل باب عقل و دانش ان کا مطالعہ فرماویں اور غور کریں کہ محل نزاع و اختلاف سے انہیں کوئی واسطہ بھی ہے اور کوئی صاحب علم و دانش ایسی روایات کو معارضہ میں پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے؟

روایت اولیٰ:۔ فتہا مارواۃ ابو الجارور عن ابی جعفران امیر

المؤمنين لما حضره الذي حضر قال لا ينه الحسن 'دن مني
حتى اسر اليك ما اسر الي رسول الله صلى الله عليه وسلم
واثمتك على ما اثمتني عليه۔

کتاب الشافی ص ۳۱ و تلخیص الشافی ص ۳۲ مطبوعہ ۱۲۴۰ھ -
ابو الجارود نے امام ابو جعفر محمد بن باقر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب امیر المؤمنین
کو حاضر ہوا جو حاضر ہوا تو آپ نے اپنے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو فرمایا مجھ سے
قریب ہوتا کہ میں تمہیں بطور راز وہ چیز بتلاؤں جو مجھے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور
راز بتلائی تھی اور تمہیں اس چیز کا امین بناؤں جس کا مجھے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
نے امین بنایا تھا۔

روایت ثانیہ :-

روى حماد بن عيسى عن عمر بن شمر عن جابر عن ابي
جعفر قال اوصى امير المؤمنين الى الحسن واشهد على وصيته
الحسين ومحمدا وجميع ولده وروساء شيعته واهل بيته
ثم دفع اليه الكتاب والسلاح في خبر طويل يتضمن الامر بالوصية
في واحد بعد واحد الى ابي جعفر محمد بن علي بن الحسين بن علي۔
شافی ص ۳۱ و تلخیص ص ۳۲

حماد بن عیسیٰ نے عمر بن شمر سے اس نے جابر سے اور اس نے امام ابو جعفر سے
روایت کی ہے کہ امیر المؤمنین نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو وصیت کی اور
اس پر حضرت حسین کو، محمد بن حنفیہ اور تمام اولاد و رواساء شیعہ اور اہل بیت کو گواہ
بنایا پھر کتاب وصیت ان کے حوالے فرمائی اور ہتھیار بھی اور یہ روایت بہت
طویل ہے جس میں امام ابو جعفر محمد باقر تک کے بعد دیگرے ائمہ کے لیے وصیت کا
ذکر ہے۔

تنبیہ :- یہ حقیقت محتاج بیان نہیں کہ اہل تشیع کے دونوں چوٹی کے عالم اور

مناظر و متکلم جن دونوں روایات کو منتخب کر کے ذکر کر رہے ہیں ان سے زیادہ واضح اور سریع اور قوی روایت دوسری کوئی نہیں ہوگی ورنہ اقویٰ اور صریح ترین کو چھوڑ کر ضعیف اور غیر صریح کا انتخاب بے جواز اور قطعاً غیر موزوں ہے۔ آئیے اب ان کی حقیقت پر غور کریں اور ان کے محل نزاع سے بے جوڑ اور بے تعلق ہونے کا مشاہدہ کریں۔

(۱) پہلی روایت میں امام حسن کو قریب بلا کر بطور راز اور اسرار کچھ القاء کرنے کا ذکر ہے۔ اور امین اسرار بنانے کا حالانکہ کلام وصیت خلافت میں ہے۔ اور اس کا اعلان یہ پایا جانا ضروری تھا نہ کہ ان میں خلافت کی وصیت کرنا عقل و خرد کے ہوتے ہوئے اور بقائمی ہوش و حواس کوئی شخص ان روایات کے معارض اور مخالف اس روایت کو سمجھ سکتا ہے۔ اور اس کی موجودگی میں ان کے ساتھ استدلال ماقط ہو سکتا ہے۔ جو کچھ اس سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ سدور الاحرار قبور الاسرار کے مطابق راز ہائے درون سینہ کا آپ پر انکشاف ہے۔ اور اس کو سینہ میں محفوظ رکھنے کی وصیت اس کا ہمیں انکار نہیں بلکہ سب سلاسل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرتبط ہیں بالخصوص قادریہ و چشتیہ اور وہ سب اولیاء اللہ جو اکابرین سلاسل مذکورہ ہیں وہ ان اسرار کے امین ہیں بقدر الاستعداد اور جس میں ہماری بحث ہے وہ یہ ہے کہ اعلان کر دیا جاتا لوگوں میں نے اپنے نخت جگر حضرت حسن کو تمہارے لیے اپنے بعد امیر اور خلیفہ و امام مقرر کیا ہے۔ وہ یہاں سے ثابت نہیں لہذا یہ روایت یہاں ذکر کرنا اور اسے معارض سمجھنا قطعاً غلط ہے۔

ابوالجبار و کا حال

(۲) اس روایت کا راوی ابوالجبار و ہے۔ آئیے اس کے متعلق بھی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ اور امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں، تاکہ راوی کی شان معلوم ہونے کے بعد اس روایت کی حقیقت واضح ہو جائے۔

(۳) اس کو امام ابو جعفر محمد باقر رضی اللہ عنہ نے مرحوب کا لقب عطا فرمایا۔ اور خود ہی فرمایا مرحوب کہتے ہیں شیطان کو۔ مسماہ بذلك ابو جعفر و ذکر ان مرحوباً اسم الشیطان۔

(ب) امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے کہ ایک لونڈی گنہری جس کے پاس کوڑے کرکٹ کی ٹوکری تھی جس کو اس نے الٹ دیا۔ تو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان الله قد قلب قلب ابی الجارود كما قلبت هذه الجارية هذا القمقم فما ذنبی۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے ابو الجارود کے دل کو اس طرح الٹ دیا ہے جس طرح کہ اس لونڈی نے اس ٹوکری کو تو اس میرا کیا گناہ و قصور ہے۔

(ج) امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”ما فعل ابو الجارود اما والله لا يموت الا تائها“ ابو الجارود کا کیا حال ہے۔ بخدا وہ حیران و سرگردان ہو کر مر جاوے گا۔ (د) ابو بصیر کہتا ہے۔ امام ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے ابو الجارود و کثیر التواء اور سالم بن ابی جعفر کا ذکر کیا پھر فرمایا: کذابون مکذوبون کفار علیہم لعنة الله۔ یہ کذاب ہیں اور بہت زیادہ تکذیب کرنے والے اور جھٹلانے والے ہیں اور بڑے کافر ہیں اللہ تعالیٰ کی ان پر لعنت ہو۔ ملاحظہ فرمائی آپ نے اس راوی کی شان جو جلیل الشان ائمہ کرام کی زبانی منقول ہے۔ اس کے بعد کونسا مومن اور محب اہل بیت اس کی روایات پر اعتبار کر سکتا ہے۔ راختر جہاں کشی جلد ۱۱۱ ص ۲۰۰ ہاں شیطان اور کافر کو ضرور اس کی روایات پر اعتماد کرنا چاہئے کیونکہ ان کے ساتھ ان کو مناسبت تامہ ہے۔

دوسری روایت :-

(ا) دوسری روایت میں اگرچہ وصیت کا لفظ بھی ہے۔ اور چند حضرات کا اس وصیت پر گواہ ہونا ذکر کیا گیا ہے لیکن محل نزاع سے اس کو بھی تعلق نہیں کیونکہ اعلان عام ہونا چاہئے تھا۔ اب آپ دار آخرت کی طرف کوچ فرمانے والے ہیں۔ اور شہر کوفہ میں کونسا آپ کا محب ہو گا۔ جو حاضر خدمت نہ ہو گا۔ اس موقع پر آپ کو حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی خلافت و نیابت اور امارت و حکومت ولی عہدی اور جانشینی کا اعلان کرنا چاہئے تھا۔ لیکن صرف وصیت کرنے کا ذکر ہے۔ اور اس کی کتابت کا اور اس پر گواہ قائم کرنے کا۔ لہذا اس سے لفظ وصیت تو ثابت

ہوگا مگر : معنی وصیت کا جس میں ہمارا کلام ہے۔ اور جس کی نفی پر ابو وائل و حکیم اور معصوم بن صوفیان کی روایات دلالت کرتی ہیں ان کا اثبات اس روایت میں کہاں ہے۔

(۲) اس میں امام حسین، امام زین العابدین اور امام محمد باقر رضی اللہ عنہم کی فرداً فرداً وصیت کا بھی ذکر ہے۔ ذرا آنکھیں کھول کر اور خواب غفلت سے بیدار ہو کر تاریخ عالم اور صفحات ایام کا مشاہدہ کر کے بتلاؤ ان میں سے کوئی حاکم اسلام اور خلیفہ و حکمران ہوا ہے جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس وصیت کو محل نزاع سے کیا تعلق ہوا۔ اور اگر آپ کو ان کے انجام کی خبر نہیں تھی اور محض گمان کی بنا پر ان کے لیے وصیت خلافت فرمادی تو آپ کے علم ماکان و مایکون کا انتفاء ثابت ہو گیا۔ جو مذہب شیعہ کے سراسر خلاف ہے۔

(۳) اس روایت کا دار و مدار جابر جعفی پر ہے۔ اور وہ ایک پُر اسرار شخصیت ہے جس کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں ہو سکتا۔

جابر جعفی راوی کا حال

(۱) زرارہ کہتا ہے میں نے امام ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے احادیث جابر کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا:۔ مارا اثیتہ عند ابی قحط الامرة واحدة وما دخل علی قط۔ وہ میرے پاس تو کبھی آیا نہیں اور میں نے اسکو اپنے والد گرامی کے پاس صرف ایک دفعہ دیکھا۔

»ب« ذریعہ محاربی کہتا ہے کہ میں نے جابر جعفی اور اس کی روایات کے متعلق امام ابو عبد اللہ سے دریافت کیا۔ دو مرتبہ آپ نے جواب ہی نہ دیا۔ اور تیسری مرتبہ عرض کرنے پر فرمایا: دع ذکر جابر فان السفلة اذا سمعوا باحادیثہ تشعوا اذ قال اذا عوا۔ جابر کے ذکر کو چھوڑو کم عقل لوگ جب اس کی احادیث سنیں گے تو طعن و تشنیع کریں گے یا فرمایا کہ ان کو شائع کریں گے۔ یا فرمایا کہ ان کو شائع کریں گے۔ اور عام راوی وہ اس قابل نہیں کہ انہیں شائع اور عام کیا جائے

(ج) عمر بن شمر نے جابر سے نقل کیا ہے کہ مجھے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے ایک کتاب عطا فرمائی اور فرمایا :-

”ان انت حدثت به حتى تهلك بنو امية فعليك لعنتي
ولعنة آباءى ان امتكمت منه شيئا بعد هلاك بنى امية
فعليك لعنتي ولعنة آباءى ثم دفع الى كتابا آخر ثم قال : وهالك
هذا فان حدثت بشي من هذا فعليك لعنتي و لعنة
آباءى“

اگر تو اس کتاب کے مندرجات کو بنو امیہ کی ہلاکت سے پہلے بیان کر دے یا
ان کی ہلاکت کے بعد ان میں سے کسی کو چھپائے تو تجھ پر میری لعنت اور میرے
آباء کی طرف سے لعنت ہے۔ اور دوسری کتاب دے کر فرمایا کہ اس کو لے اور اس
میں سے کچھ بھی کبھی بیان کیا تو تجھ پر میری لعنت اور میرے آباء کی لعنت۔

(د) ایک روایت میں ہے کہ جابر کہتا ہے میرے پاس پچاس ہزار روایات ہیں جن کے
بیان کرنے کے قابل میں کسی کو نہیں سمجھتا اور دوسری میں ہے کہ ستر ہزار روایات
ایسی ہیں رجب کہ امام محمد باقر سے ایک ملاقات اور امام جعفر صادق سے ایک
بھی نہیں تو اتنا ذخیرہ کس سے حاصل کیا؟ معلوم ہوتا ہے خانہ زاد ہیں اور جعلی و
وضعی۔ الغرض جابر کہتا ہے میں نے امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا
تم نے اپنے اسرار مجھ پر منکشف کر کے مجھ پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ نہ میں
عوام کے سامنے ان کو بیان کر سکتا ہوں اور نہ ہی ضبط کر سکتا ہوں بلکہ سینہ میں سمند
کی امواج کا سا تلاطم پیدا ہو جاتا ہے تو آپ نے فرمایا :-

يا جابر اذا كان ذلك فاخرج الى الجبال فاحضن
حفيرة ودل رأسك فيها ثم قل حدثني محمد بن علي
بكنا وكنا۔ (رحال کشی ص ۱۲۹ تا ص ۱۷۱)

اے جابر جب یہ صورت حال پیش آئے تو پہاڑوں کی طرف نکل جایا کر اور
گڑھا کھود کر سر اس میں ڈال کر کہہ دیا کہ مجھے محمد بن علی نے ایسے بیان کیا۔

اس کے علاوہ بھی بہت کچھ اس کے متعلق بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ ایک ہی ملاقات میں اتنی روایات کا حصول اور اس قدر محرم راز بن جانا اور کتابائے علوم اسرار کا وارث بن جانا اور پھر ان کے متعلق لغت کے ساتھ افشاء و کتمان کی تاکید اور جوش سینہ کو دور کرنے کے لیے گڑھوں میں سر دے کر روایات بیان کرنے کی وصیت وغیرہ۔ اور پھر شان کتمان یہ کہ لوگ ان روایات کو سن کر امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے دورے آرہے ہیں الغرض اس قسم کی پراسرار شخصیت کی روایت کسی عقل مند اور طبع سلیم کے مالک کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ ہے حالت ان دونوں روایتوں کے تین کی جس کو محل نزاع و خلافت سے تعلق ہی نہیں۔ اور یہ ہے حالت ان کے راویوں کی۔ جب منتخب ترین روایات کا یہ حال ہے۔ تو دوسری روایات کا کیا حال ہو گا؟

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

(۵) علاوہ ازیں دونوں جگہ روایت کی سند حضرت امام ابو جعفر رضی اللہ عنہ پر ختم ہو جاتی ہے۔ جب کہ آپ یقیناً وصیت کے وصیت کے وقت موجود نہیں تھے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت ہجرت کے چالیسویں سال ہوئی اور آپ کی ولادت واقعہ کربلا کے کافی عرصہ بعد ہے۔ تو لا محالہ اس روایت میں انقطاع ہے۔ اور درمیان سے راوی متروک ہے۔ انما اسلام کی صداقت اپنی جگہ لیکن اصول روایت کے لحاظ سے مجال بحث موجود ہے۔

صعصعہ بن صوفان: علماء شیعہ کی نقل کردہ روایات کے راویوں کا حال ملاحظہ کر لیا۔ لیکن اس کے برعکس حضرت شیخ الاسلام کی نقل کردہ روایات کا حال ملاحظہ کریں صعصعہ بن صوفان حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مخلص خدام اور جانثاروں میں سے ہے۔ اور موقعہ پر موجود علی ہذا القیاس دیگر روایات میں بھی یہ انقطاع نہیں ہے۔ نیز حضرت صعصعہ کے متعلق ذرا اپنے اصحاب جرح و تعدیل کی رائے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) قال ابو عبد الله عليه السلام ما كان مع امير المؤمنين من يعرف حقه الا صعدة بن صوخان واصحابه۔

امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوئی بھی ایسا شخص نہیں تھا جو آپ کے حقوق کی صحیح معرفت رکھتا ہو۔ ماسوا، صدوق بن صوحان اور ان کے ساتھیوں کے مزید تفصیل کے لیے رجال کشنی ص ۲۳ تا ۲۵۔ مطالعہ کربس۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ثناء ان کے حق میں اور ان کا امیر معاویہ کے دور خلافت میں منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مدح و ثناء کرنا اور امیر معاویہ کی شان میں تغلیظ و تشدید سے کام لینا بصرحت مذکور ہے لہذا وہ روایات ایسے لوگوں کی روایات کے مقابل کیوں کر قابل قبول ہو سکتی ہیں جو صاحب ثنائی اور صاحب تلخیص ثنائی وصیت کے اثبات میں پیش کر رہے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وصی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہونے کی حقیقت

مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

روایت نمبر ۴:-

اس وصیت کے سلسلے میں ایک اور روایت بھی ملاحظہ فرمائیں۔

والمروئی عن العباس انہ خاطب امیر المؤمنین فی مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسال عن القائم بالامر بعدہ و انہ امتنع من ذلک خوفا ان یصرفہ عن اهل بیتہ فلا یعود الیہم ابدا۔ (کتاب الثانی ص ۱)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت مرض میں کہا کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کریں کہ حضور علیہ السلام کے بعد کون امیر المؤمنین ہوگا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس

خوف اور اندیشہ کے تحت نہ پوچھا کہ کہیں حضور علیہ السلام اپنے اہل بیت سے امر خلافت کو درود فرمیں۔ اور امیر نہ بنائیں تو اس تصریح کی وجہ سے پھر کبھی بھی اہل بیت میں خلافت نہیں آ سکے گی۔ وکذا فی تلخیص الشافعی ص ۳۵۲ سطر نمبر ۱۶۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے یہ ہیں وصیت اور خلافت بلا فصل کے متعلق نصوص قطعیہ جن کی تکذیب کو نہ ختم ہونے والی آذانوں میں بیان کیا جاتا ہے۔ رسالہ مذہب شیعوں کا

نہمہ بحث وصیت تحفہ حسینیہ از ابوالحسن محمد اشرف السیالوی عفی عنہ

اس مضمون و مفہوم کی روایات ابوبکر احمد بن عبد العزیز جوہری کے حوالہ سے ابن ابی الحدید معتزلی شیعہ نے شرح حدیدی میں نقل کی ہیں عبارات ملاحظہ ہوں:-

(۱) عن عبد الله بن عباس قال خرج علي عليه السلام على الناس من عند رسول الله صلى الله عليه وسلم في مرضه فقال له الناس كيف اصبحت رسول الله صلى الله عليه وسلم يا ابا حسن قال اصبحت بحمد الله بارئاً قال فاخذ العباس بيد علي ثم قال يا علي انت عبد العصا بعد ثلاث احلفت لقد رأيت الموت في وجهه واني لا اعرف الموت في وجوه بني عبد المطلب فانطلق الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا ذكر له هذا الامرات كان فينا علمنا وان كان في غيرنا اوصى بنا فقال لا افعل والله ان منعنا اليوم لا يؤتينا الناس بعدة قال فتوفى رسول الله صلى الله عليه وسلم - ذاك اليوم -

(شرح حدیدی ص ۲۵۵)

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے آپ کے مرض وصال میں تو لوگوں نے کہا اے ابوالحسن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کس حال میں صبح کی ہے؟ تو آپ نے کہا

بجاء اللہ آپ تندرست ہیں تو حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اے علی تم تین دن کے بعد ماتحت اور محکوم ہو جاؤ گے اور تمہارا یہ ذریعہ قوت و توانائی ختم ہو جائے گا) میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس میں موت کے آثار دیکھ لیے ہیں اور میں موت کے قریب ہوں عبدالمطلب کے چہروں کی حالت سے ان کی موت کو پہچان لیتا ہوں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر امر خلافت و حکومت کا تذکرہ کرو۔ اگر ہم میں سے تو اس سے ہمیں یا خبر فرماویں۔ اور قبلا نہیں اور ہمارے علاوہ دوسرے لوگوں میں سے تو انہیں ہمارے متعلق وصیت فرماویں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں اس طرح نہیں کرتا بخدا اگر آج آپ نے ہمیں حکومت و خلافت سے منع فرمایا تو آپ کے بعد لوگ ہمیں کبھی بھی حکومت و خلافت نہیں دیں گے ابن عباس فرماتے ہیں اسی روز سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان کچھ بعد اور دوری پیدا ہو چکی تھی اسی دوران آپ کی ملاقات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ہوئی تو انہیں کہا اگر تمہیں اپنے چچے کے آخری دیدار کا شوق ہو تو ان کے پاس حاضری دیجئے۔ اور میرے خیال میں آپ کے بعد تمہیں ان کی ملاقات کا موقع نہیں مل سکے گا حضرت علی رضی اللہ عنہ میری بات سن کر غمگین ہو گئے۔ اور مجھے کہا آگے چلو اور میرے لیے اذن طلب کرو۔ میں آگے چلا اور ان کے لیے اذن طلب کیا۔ اذن ملنے پر آپ اندر داخل ہوئے۔ اور دونوں نے ایک دوسرے سے معانقہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ہاتھ اور پاؤں چومنے لگا اور کہا۔ اے چچا جان مجھ سے راضی ہو جاؤ؟ اللہ تعالیٰ تم سے راضی ہو تو انہوں نے فرمایا میں راضی ہو گیا۔

ثم قال يا بن اخی اشرت عليك باشیاء ثلاثة فلم تقبل و رثیت فی عاقبتہا ما کرہت و ہا انا اشیر عليك برأی رابع فان

قبلتہ والّا نالک مانالک متاقلہ قال ماذاک یاعمر؛ قال
اشرتُ علیک فی مرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ان تسالہ فان کان الامر فینا اعطاناہ وان کان فی غیرنا
اوصی بنا فقلت اخشی ان منعناک لا یعطیناہ احدٌ
بعدک فبضت تلک الخ

(شرح حدیثی جلد ثانی ص ۳۸)

آپ نے فرمایا۔ اے میرے بھتیجے میں نے پہلے تین امور کے متعلق تمہیں مشورہ
دیا مگر تم نے قبول نہ کیا مگر ان کا انجام وہ ہوا جو تمہیں پسند نہیں تھا۔ اور غور سے سنو اب
میں چوتھا مشورہ دینے لگا ہوں۔ اور اگر اس کو قبول کرو تو بہتر درجہ جو نتیجہ پہلے نکلا اسی
طرح اس کا نتیجہ بھی برآمد ہوگا تو آپ نے کہا اے میرے چچا وہ کیا مشورے تھے۔

آپ نے فرمایا۔ میں نے مرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمہیں یہ مشورہ دیا
تھا کہ آپ سے امر خلافت کے متعلق دریافت کر لیں۔ اگر ہم میں سے تو ہمیں عطا فرمائیں
اور اگر دوسروں میں سے تو انہیں ہمارے متعلق وصیت فرمائیں تو تم نے کہا۔ مجھے خوف
واندیش ہے کہ اگر آپ ہم سے اس امر کو روک لیں تو آپ کے بعد ہمیں کوئی نہیں
دے گا۔ چنانچہ وہ وقت گزر گیا اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

نوٹ :- دوسرا مشورہ رسول محتشم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے
بعد بیعت لینے سے متعلق اور اپنی طرف سے اور ابوسفیان کی طرف سے پیش کش کا
تذکرہ جو بعد میں ذکر کیا جائے گا اور تیسرا مشورہ شوریٰ میں شامل نہ ہونے سے
متعلق تھا جس کے متعلق آپ نے فرمایا۔ مجھے اختلاف پسند نہیں اس کا تذکرہ گزر
چکا۔ اور چوتھا مشورہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معاملات میں دخل سے گریز کا
تھا اور بیع میں اپنے اموال اور مزرع میں جانے کا تاکہ ان کے قتل کی ذمہ داری
تم پر عائد نہ ہو۔ ورنہ خلافت مل گئی تو بھی اس میں تمہارے لیے کوئی خیر اور بھلائی
نہیں ہوگی چنانچہ انجام کار آپ نے فرمایا۔

واللہ لکان عتی کان یَنْظُرُ مِنْ وَرَاءِ سِتْرِ رَقِیقٍ وَاللّٰہُ
 مَانَتْ مِنْ هَذَا الْاَمْرِ شَیْئًا الْاَبْعَدُ شَرًّا لِاَخِیْرِ فِیْہِ ۔
 بخدا گویا میرے چچا باریک پردہ کے پیچھے سے اس کا انجام کار دیکھ رہے تھے۔
 بخدا میں نے امر خلافت سے جو کچھ حاصل کیا وہ شر و فساد کے بعد حاصل کیا جس
 میں کوئی خیر اور بہتری نہیں ہے۔

الغرض جو سہری اور ابن ابی الحدید کی نقل کردہ ان دونوں روایات سے بھی
 واضح ہو گیا کہ آپ کو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حالات سے قبل خبردار کیا تھا
 اور انجام کار سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ اگر تمہارا حق ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
 سے اس کا اعلان کروالو۔ اور عطا کرنے کا مطالبہ کرو۔ ورنہ مخلومی اور ماتحتی تمہارا
 مقدر بن جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر اور ہر نیروز کی طرح عیاں ہیں کہ آپ کے لیے
 نہ وصیت خلافت موجود تھی، اور نہ کوئی نص خلافت اور غدیر خم کے واقعہ پر ابھی میرا
 مہینہ بھی نہیں گزرا تھا۔ اگر اس میں اعلان خلافت ہو چکا تھا۔ اور مبارک و سلامت
 کے مژدے اور پیغام بھی دیئے جا چکے تھے۔ تو اب اس موقع پر اس امر کا فیصلہ کرنے
 کے لیے آپ نے کیوں زور دیا۔ اور اپنے وصال تک حضرت علی رضی اللہ عنہ،
 کے اس مشورہ کو قبول نہ کرنے پر اپنے ارمان و احساسات کا اظہار کیوں کیا جب کہ
 آپ کا وصال سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے اٹھارہ سال بعد
 خلافت امیر عثمانؓ کے چھٹے سال میں ہوا۔ گویا اس طویل عرصہ میں بھی آپ پر نص
 خلافت اور وصیت خلافت کا انکشاف نہیں ہوا تھا۔ اور آپ اپنے اسی موقف پر
 قائم تھے کہ تمہیں دریافت کر کے حقیقت حال معلوم کر لینی چاہئے تھی جب رسول
 خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اتنے قریبی اس وصیت سے
 بے خبر ہیں تو دوسرے مہاجرین و انصار، حضرات کو کیا خبر ہو سکتی تھی؟

لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلیفہ نہ بنانے پر انہیں ارتداد الناس الا للہ
 کے فتویٰ سے جو نوازا گیا ہے کہ سبھی العیاذ باللہ مرتد ہو گئے ہیں ماسوا میں کے تو اس

ظلم اور زیادتی اور اندھیر نگری کا کیا جواز ہے۔ نصوص کتاب اللہ اور ارشاد است
مرتضوی کے برعکس محض اس جرم میں ان پر مرتد ہونے کا فتویٰ لگ رہا ہے تو وہ
جرم ثابت بھی تو ہو۔ جب اہل بیت کو ہی معلوم نہیں خود صاحبِ امر اور خلافت
کے حقدار کو بھی اپنا استحقاق پتہ نہیں تو ابوالجبار و داور جابر جعفری جیسے کذابوں
پر یہ وحی کیسے نازل ہو گئی۔

ابو جعفر صاحب طوسی صاحب تلخیص کا جواب

(۱) صاحب تلخیص نے پہلا جواب اس روایت کا یہ دیا ہے کہ یہ خبر واحد ہے اور
خبر واحد نصوص اور احادیث متواترہ کی مخالفت پر مشتمل نہ ہو تو بھی اس کے متعلق
ہمارا مذہب معروف و مشہور ہے۔ یعنی باب عقائد میں ان کا اعتبار نہیں ہے چہ جائیکہ
وہ خبر واحد جو ان ادکۃ اور احادیث متواترہ کی مخالفت پر مشتمل ہو لہذا جس شخص
نے اس روایت کو نص خلافت کے دفاع اور معارضہ پیش کیا ہے، وہ امر لعیب کا
مرتکب ہے۔ فمن جعل هذا الخبر المروى عن العباس رحمة الله
عليه دافعاً لما يذهب اليه الشيعة من النص الذي قدم لنا على
صحته وبيننا استغاضة الرواية به فقد ابعد - اور دوسرا جواب یہ دیا
۴ علی ان الخبر اذا سلمناه وصحت الرواية به غير دافع
للنص ولا مناف له لان سواله رحمة الله عليه يحتمل ان
يكون عن حصول الامر لهم وثبوتهم في ايديهم لا عن
استحقاقه و وجوبه - علاوہ انہیں اس
روایت کو اگر تسلیم کریں اور اس روایت کی صحت مان لی جائے تو اس سے ہماری
نص خلافت کا دفاع نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس کے منافی ہے۔ کیونکہ حضرت عباس
رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سے اس امر کے
حصول کا مطالبہ کریں۔ اور اپنے ہاتھوں میں ثبوت اور استقرار کے متعلق دریافت

کریں۔ نہ کہ استحقاق اور وجوب کے متعلق اس کی مثال دے کر تو ضیح کرتے ہوئے کہا۔
مثلاً ایک شخص کسی کے نیے ایک عطیہ کا اعلان کرتا ہے۔ اور اسے غلیجہ کر کے رکھ بھی
دیتا ہے۔ پھر اس کا وقت وفات قریب آجاتا ہے۔ تو عطیہ والے کو یہ حق پہنچتا ہے
کہ وہ دریافت کرے۔

اتری ما منحتنیہ وافر دتنی بہ یحصل لی من بعدک
و یصیر الی یدی ام یحال بینی و بیته و یمنع من وصولہ الی
و رفعتک ولا یکون هذا السنوال دلیلاً علی شکہ فی الاستحقاق
بل یکون دالاً علی شکہ فی حصول الشئ الموهوب لہ و مضیرہ
الی قبضتہ و الذی یبئن صحتہ تاویلنا و بطلان ما توہموا
قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی جواب العباس علی ماوردت
بہ الروایۃ انکم المقهورون و فی روایۃ انکم المظلومون
ص ۳۵۲۔

یہ تو بتلائیے کہ جو عطیہ تم نے مجھے دیا ہے اور مجھے اس کے ساتھ ممتاز فرمایا ہے۔
کیا تمہارے بعد مجھے حاصل ہوگا؟ اور میرے ہاتھ آئے گا؟ یا میرے اور اس کے
درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی جائے گی اور تمہارے ورثاء اس کو مجھ تک پہنچنے سے
روک دیں گے جس سے قطعاً یہ لازم نہیں آتا کہ اسے اپنے استحقاق میں ٹک ہے۔
بلکہ یہ سوال صرف اس امر میں شک پر دلالت کرتا ہے کہ آیا موهوب چیز حاصل
ہوگی یا نہیں اور میرے قبضہ میں آئے گی یا نہیں؟

ہماری اس تاویل کی دلیل صحت اور مانعین کے توہم کا بطلان نبی اکرم صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ جب حضرت عباس رضی اللہ
عنہ نے آپ سے اس امر کے حصول کے متعلق دریافت کیا تو آپ نے فرمایا۔
تم مقہور و مظلوم ہو گے اور دوسری روایت میں ہے کہ تم مظلوم ہو گے!

طوسی صاحب کی مغالطہ آفرینی اور دھوکہ دہی

جواب اول کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ خبر واحد ہے۔ اور وہ باب عقائد میں تحت نہیں علی الخصوص جبکہ ادلہ قطعیہ اور روایات متواترہ کے خلاف ہو اور وصیت خلافت کی متواتر روایات کا حال آپ معلوم کر چکے ہیں اور دلائل قطعی الدلالتہ موجود نہیں جیسے کہ تصریح کر دی ہے۔ جبکہ شیعہ کے نزدیک امامت قطعی عقائد کے قبیل سے ہے۔ مثلاً انما ولیکم اللہ ورسولہ و الذین آمنوا کے ساتھ شان نزول کو نہ ملاؤ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ دیگر اہل ایمان بھی اس پر شریک ہیں اور صرف مفہوم آیت میں نہیں بلکہ واقعات نے بھی ان کا اشتراک اور شمول ثابت کر دیا ہے اور شان نزول ساتھ ملاؤ تو وہ ظنی ہے بلکہ تمام عام اخبار احمد سے بھی شان نزول میں منقول روایات کا درجہ کم ہوتا ہے۔ لہذا قطعیت کہاں سے آگئی اور اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلیل خلافت کہ نہ کس طرح درست ہو سکتا ہے جیسا کہ طوسی صاحب جیسے محقق پر مخفی نہیں اور یہ بھی اس صورت میں ہے جب ولی میں خلافت کے علاوہ دوسرا کوئی احتمال نہ ہو۔ اور خلافت بھی بلا فصل مراد ہو۔ کوئی محقق بقائمی ہوش و ہواس اور اندہی تعصب سے ہٹ کر اس قسم کی ضعیف اور پوچھ دلیل دے سکتا ہے؟ علیٰ ہذا القیاس دیگر مزعومہ دلائل کا بھی یہی حال ہے۔ اور اس کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نہ باقی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا خلافت منصوصہ موعودہ ہونا ثابت ہو چکا لہذا یہ جواب معیار تحقیق پر قطعاً پورا نہیں کرتا۔

جواب دوم کا دار و مدار اس فرق پر ہے کہ سوال استحقاق سے نہیں بلکہ حصول خلافت اور اس کے قبضہ میں آنے سے ہے۔ لیکن اس میں محقق صاحب نے اپنی ساری ذہانت و فطانت اور شان تحقیق کو مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ اور فیانت و امانت کا خون ناحق کیا ہے۔ اب ملاحظہ ہوں

اس جواب کے وجوہ بطلان ؟

(۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا آپ کا وقت وصال قریب ہے تم محکوم بن کر رہ جاؤ گے لہذا دریافت کرو کہ امیر المؤمنین اور قائم بالامر کون ہوگا ؟ جب آپ کی خلافت کا اعلان ہو چکا اور وصیت خلافت کر دی گئی تو اب قائم بالامر کے متعلق سوال کا مطلب کیا اور اس غیب کے دریافت کرنا کیا مطلب کیا ہوا کہ حق دار تو ہم ہو گئے۔ لیکن قبضہ بھی کر سکیں گے یا نہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے تھا کہ اقتدار عملی طور پر بھی ہمارے حوالے ہونا چاہئے لہذا یہ عرض کرو کہ اب اقتدار میرے حوالے فرما دو۔ اور اپنی ظاہری حیات طیبہ میں مجھے اس مسند اقتدار پر بٹھا دو۔ تاکہ کوئی احتمال نزاع باقی نہ رہے۔ اور یہی مفہوم ہے جو ہری کے حوالے سے نقل کردہ دوسری روایت کا کہ عرض کرو اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہمیں عطا کرو۔ اور نہیں تو جن کا ہے۔ انہیں ہمارے حقوق کی نگہداشت کی وصیت فرماؤ لیکن آپ نے بارگاہ رسالت میں یہ عرض کرنے سے معذرت کر دی اور دوسرا خدشہ ظاہر فرمایا۔ کہ کہیں ہمیں منع نہ کر دیا جائے اور ہمیشہ کے لیے اس منصب سے محروم نہ ہو جائیں

(۲) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ اندیشہ اور خدشہ کیوں ظاہر کیا کہ اگر آپ ہمیں خلافت نہ بخشیں تو پھر بعد میں ہمیں کوئی نہیں دے گا کیا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایفاء عہد اور شان و فاء پر آپ کو شک و شبہ تھا ؟ العیاذ باللہ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اپنے کئے ہوئے اعلان سے برگشتہ ہو جانے کا گمان تھا ؟ لہذا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس جواب کو محقق صاحب کے اختراعی احتمال سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ ان پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں وعدہ خلافتی اور سپہان شکنی کی بدگمانی اور سوء ظن کا بہتان ہے۔

(۳) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے وصال کا علم بہر حال تھا۔ ہمارا مذہب بھی یہی ہے۔ اور شیعہ صاحبان تو ہر امام کو عالم ماکان و مایکون مانتے ہیں چہ جائیکہ نبی الانبیاء

اور امام الائمہ صلی اللہ علیہ وسلم لہذا اپنے قریب وصال کا یقین ہونے کے باوجود خود آپ نے کیوں نہ ان کے مطالبہ کے بغیر ہی اپنی مسند پر بٹھا دیا۔ دنیاوی حکمران اپنی بیماری اور تکالیف کے دوران قائم مقام حکمران اور قائم مقام صدر یا وزیر اعظم نامزد کر دیتے ہیں تاکہ نظام درست رہے۔ اور متوقع امکانی خطرات میں یہ نامزدگی اور قائم مقامی کا رآمد ثابت ہو۔ لیکن یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ بحیثیت نائب حکمران اور قائم مقام بادشاہ مقرر کیا جانا تو دور کی بات ہے، شیعہ صاحبان تو نماز جیسے اہم فریضہ میں جس کی امامت کے لیے شب و روز میں پانچ دفعہ امام کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قائم مقام امام بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ خلافت کا مفاد تو اس سے بہت مختلف ہے۔ لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بادشاہ عز ہونے کے باوجود اور بیماری جیسے عذر کے باوصف یہ قائم مقامی عمل میں نہ لانا اس حقیقت کی واضح نشاندہی ہے کہ کوئی وصیت اور تنصیف آپ اس ضمن میں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ اس امر کو اللہ تعالیٰ کے فشاء اور اس کی رضا پر چھوڑنا چاہتے تھے اور امت کو اپنے امام کے انتخاب میں اور اس کے طریقوں کی تعیین میں باختیار بنانا چاہتے تھے جیسے کہ صعصعہ بن صوفیان اور ابوالطفیل وحکیم کی روایات میں اس کی تصریح موجود ہے۔ لہذا اس توجیہ کی لغویت دوپہر کے سورج سے بھی زیادہ روشن ہے۔

۴) طوسی صاحب تمثیل میں بڑی دور کی کوڑی لائے اور انہیں بڑی دور کی سو جھی ہے۔ کہ عطیہ سے ممتاز تو ہمیں کیا گیا۔ مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ حاصل بھی ہو گا یا نہاں سے ورثاء قابض ہو جائیں گے۔ تو اس کو یہ غیبی خبر پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ یوں کہنا چاہیے تھا کہ حضرت وہ عطیہ میرے حوالے کر دو تاکہ بعد میں مجھے محرومی کا منہ نہ دیکھنا پڑے آخر علم غیب کے متعلق امتحان تو مطلوب نہیں۔ اس شے کا حصول مطلوب ہے لہذا براہ راست مطلوب و مقصود امر کی استدعا کرنی چاہئے۔ لہذا اس تمثیل کی لغویت بھی واضح ہے۔

۴) مغلوب و مغلوب ہونے بلکہ مظلوم ہونے والی روایت جو ذکر کی ہے ذرا اس کے

عواقب پر بھی غور کر لیتے۔ کیا اس میں کہیں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دخل تو نہیں کہ تین ماہ قبل استحقاق بیان کر کے دوسروں کو چوکس کر دیا۔ مگر عملاً اقتدار سونپنے کا وقت آیا۔ تو کوئی علی قدم نہ اٹھایا جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلافت سے محروم ہو گئے۔ اگر آپ ظاہری حیاتِ طیبہ میں اس اختیار و اقتدار سے دست بردار ہو جاتے۔ تو نبوت و رسالت میں کوئی خلل لازم آسکتا تھا؟ جب کہ ملی زندگی میں حکومت حاصل نہ تھی بلکہ سکون و قرار سے گھر میں کوئی رہنے نہیں دیتا تھا۔ اور مدینہ منورہ میں بھی کئی سال تک حکومت و شہنشاہی کی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ لہذا اگر ظاہری حکومت کے حصول سے قبل نبوت و رسالت میں کوئی خلل اور نقص نہیں پڑا تھا۔ تو اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسی مقرب اور معظم اور محبوب ہستی کے حوالے کر دینے سے کیا خلل پڑ سکتا تھا؟ جب کہ ان کی حکومت آپ کی حکومت ہی ہوتی جیسے کہ آپ کی حکومت و سلطنت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی حکومت تھی۔ لہذا اس روایت کو اگر نصِ خلافت و وصیتِ امامت کے پس منظر میں دیکھیں تو خود ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مغلوبیت و مقہوریت اور مظلومیت مرتضیٰ میں برابرہ کی حصہ دار ہے۔ بلکہ مکمل طور پر ذمہ دار ہے۔ نفوذ باللہ من ذالک

سچ فرمایا مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم **محبك الشیء یحیی و یحیی کسی چیز کی محبت اندھا اور بہرہ کر دیتی ہے**۔ محقق صاحب کو بھی خلافت منصوصہ اور وصیت و امامت کی قطعیت ثابت کرنے کی محبت نے دیگر مفاسد لازمہ سے اندھا اور بہرہ کر دیا ہے حتیٰ کہ ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مورد الزام بنالیا اور جب یہ غلط ہے اور یقیناً غلط ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں پر کوئی نصِ خلافت تھی نہ اس کی وصیت اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن اعلان

مذہب شیعہ

از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

روایت نمبر ۵:-

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک اور فرمان بھی پڑھ لیجئے جو نہج البلاغہ خطبہ نمبر ۵ میں درج ہے جس میں تصریح ہے کہ حضرت عباس اور جناب ابوسفیان حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے دن حاضر ہو کر عرض کرنے لگے کہ ہم آپ کے ساتھ خلافت کی بیعت کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں مولیٰ علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ شَقُّوا مَوَاجِ الْفِتَنِ بِسَفَنِ النَّجَاتِ وَعَرِّجُوا
عَنْ طَرِيقِ الْمَنَافِرَةِ وَضِعُوا تِيْجَانَ الْمَفَاخِرَةِ ، افْلَحَ مَنْ نَهَضَ
بِجَنَاحِهَا وَاسْتَسْلِمَ فَارَاحَ هَذَا مَاءُ آجِنٍ قَدْ لَقِمَهُ يَفْضُ بِهَا أَكْلَهَا وَ
مَجْتَمَعُ الشُّرَةِ لَغِيرِ وَقْتَ ائْتَاَعَهَا كَالزَّارِعِ فِي أَرْضٍ غَيْرِهِ
فَإِنْ أَقْلَ يَقُولُوا حَرِّصْ عَلَى الْمَلِكِ ، وَإِنْ اسْكُتَ يَقُولُوا جَزَعْ مِنَ
الْمَوْتِ هَيْهَاتَ بَعْدَ اللَّيْتَامِ وَالنَّيِّ وَاللَّهِ لَا بِنِ ابْنِ طَالِبٍ أُنْسَ
بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ تَيْدِي أُمِّهِ ۔

پس اے لوگو! تم فتنوں کی موجوں کو نجات کی کشتیوں کے ذریعے طے کرو۔
اور منافرت و مخالفت کے طریقے چھوڑ دو۔ تکبر کے تاجوں کو پھینک دو۔ جو شخص بال و
پر کے ساتھ بلند ہوا تو فلاح پا چکا۔ یا جس نے اطاعت کر لی اس نے امن و امان حاصل
کر لی مجھے خلیفہ بنانے کی پیش کش ایک مکدہ پانی کی طرح ہے یا ایسا لقمہ ہے جو کھانے والے
کے گلے میں پھنس جائے۔ میرے خلیفہ بننے کا سوال ایسا ہے جیسے کوئی کچے پھل کو
قبل از وقت توڑے یا جیسے کوئی دوسرے کی زمین میں کھیتی باڑی کرے پس اگر میں
تمہارے کہنے کے مطابق خلافت کا دعویٰ کر دوں تو فتنہ باز لوگ کہیں گے کہ اس نے
ملک کے لیے لاپرواہی کیا اور اگر حیب رہوں تو یہی لوگ کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا حالانکہ

موت کا خوف وغیرہ میری شان سے کس قدر بعید ہے۔ اللہ کی قسم علی بن ابی طالب موت کو اپنی ماں کے دودھ کی طرف رغبت کرنے والے بچے سے بھی زیادہ پسند کرتا ہے۔

اس روایت نے بیعت میں توقف کرنے کا تخمینہ بھی اڑا دیا۔ اس خطبے کو خلاط ملط کر کے لیے شیعوں کے مجتہد اعظم نے انتہائی کوشش کی مگر شیر خدا کا واضح ارشاد نہیں چھپ سکا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت حضور کے بعد قبل از وقت کچے پھل توڑنے والے شخص کے مشابہت اور کسی دوسرے شخص کی زمین میں کھیتی شروع کر دینے والے کی مانند مثل صرف ایسی صورت میں ہی مقصور ہو سکتی ہے کہ ابھی ان کی خلافت کا زمانہ نہیں آیا۔ اور ابھی وہ خلافت کے حق دار نہیں ہوئے، اور ڈر کی وجہ سے بیعت کرنا بھی واضح ہو گیا کہ شیر خدا قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ موت سے میں نہیں ڈر سکتا۔ رسالہ مذہب شیعہ ص ۶۵-۶۶۔

نحفہ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف الیالوی غفرلہ

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسفیان کی اس پیش کش اور مشورہ کا متعدد مقامات پر ذکر ہے۔ لہذا ان تمام عبارات کا بھی مشاہدہ کرتے چلیں تاکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے جواب کی اہمیت واضح ہو سکے۔

(۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے تین مشورے تمہیں پہلے دیئے۔ لیکن تم نے تسلیم نہ کئے اور ان میں سے ایک پہلے ذکر ہو چکا اب دوسرا ذکر کیا جاتا ہے۔ فلما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اتانا ابوسفیان بن حرب تلک الساعة قد عوناک الی ان تبایعک وقلت لک ابسط یدک ابایعک ویبایعک هذا الشیخ فانان ابایعناک لم یختلف علیک احد من بنی عبد مناف و اذا ابایعک بنو عبد مناف لم یختلف علیک احد من

قریش واذا بايعتك قریش لم یختلف علیک احدٌ من العرب فقلت لنا بیجہان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شغل و لهذا الامر قلیس تخشی علیہ فلم تکیث ان سمعنا التکبیر من سقیفة بنی ساعدة فقلت یا عم ما هذا ؟ قلت ما دعوناک الیہ فا بیت قلت سبحان اللہ و یکون هذا قلت نعم، قلت افلا یرد ؟ قلت لک و هل رد مثل هذا قط۔

(ابوبکر جوہری بحوالہ شرح حدیدی جلد ثانی ص ۴۸)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا تو ابوسفیان بن حرب اس وقت ہمارے پاس آیا۔ تو ہم نے تمہیں دعوت دی کہ ہم تمہارے ساتھ بیعت کرتے ہیں اور میں نے کہا اپنا ہاتھ بڑھائیے میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور یہ شیخ بھی تمہارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے مگر ہم دونوں نے تمہارے ہاتھ پر بیعت کر دی تو جو عہد منافی ہو گا کوئی شخص تمہارے ساتھ اختلاف نہیں کرے گا اور انہوں نے بیعت کر لی تو قریش میں سے کوئی اختلاف نہیں کرے گا اور جب قریش نے بیعت کر لی تو عربوں میں سے کوئی تمہارے ساتھ اختلاف نہیں کرے گا۔ تو تم نے کہا ہم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تجہیز و تکفین میں مشغول ہیں اور اس معاملہ میں ہمیں کوئی اندیشہ اور خوف نہیں ہے۔ لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ہم نے سقیفہ بنی ساعدہ سے تکیہ کی آواز سنی تو تم نے دریافت کیا اے میرے چچا یہ کیا ہے تو میں نے کہا یہ وہ ہے کہ جس کی ہم نے آپ کو دعوت دی لیکن تم نے انکار کر دیا۔ تم نے کہا سبحان اللہ یہ ہو سکتا ہے تو میں نے کہا ہاں۔ تم نے کہا کیا اب اس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ تو میں نے کہا کیا کبھی ایسے معاملات بھی رد کئے جاسکتے ہیں اور طے ہونے کے بعد انہیں دوبارہ چھیڑا جاسکتا ہے؟

(۲) علی علیہ السلام وبعض بنی ہاشم مشتغلون باعداد جہازہ و
 غسلہ فقال العباس لعلی وھما فی النہار امدیدک آیا ینک فیقول
 الناس عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ین ابن عم رسول
 اللہ فلا یختلف علیک اثباتان فقال لہ او یطمع یا عمر فیہا طامع
 غیر ی قال مستظلم فلم یلبثا ان جاءتهما الاخبار بان الانصار
 اقدت سعداً للتبایعہ وان عمر جاء بابی بکرفبایعہ و سبق
 الانصار بالبیعہ فندم علی علیہ السلام علی تفريطہ فی امر البیعہ
 وتقاعدہ عنہا۔ (شرح حدیدی ص ۱۱)

حضرت علی اور بعض بنو ہاشم رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل
 اور تجہیز و تکفین میں مشغول تھے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ
 عنہ سے کہا۔ اپنا ہاتھ بڑھاؤ میں تمہارے ساتھ بیعت کرتا ہوں جب کہ وہ دونوں
 رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ولایت کدہ پر تھے کیونکہ جب لوگوں کو میری
 تمہارے ساتھ بیعت کا حکم ہو جائے گا تو وہ کہیں گے کہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ
 وسلم کے چچے نے آپ کے چچا زاد بھائی کے ساتھ بیعت کر لی ہے۔ لہذا دو شخصوں
 کو بھی تمہارے ساتھ اختلاف نہیں ہوگا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا
 اے چچا جان کیا اس میں میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی طمع اور امید
 رکھنے والا ہے۔ تو آپ نے کہا عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ابھی زیادہ وقت
 نہیں گزرا تھا کہ ان کو خبر ملی کہ انصار نے حضرت سعد بن عبادہ کو بیعت کرنے اور خلیفہ
 بنانے کے لیے بٹھا رکھا ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ
 عنہ کو لائے اور ان کے ساتھ بیعت کی۔ اور انصار سے بیعت میں سبقت لے گئے
 تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ بیعت کے معاملہ میں کوتاہی اور سستی کرنے پر
 نادم ہوئے۔

(۳) نبج البلاغہ کے اس خطبہ کا پس منظر بیان کرتے ہوئے ابن ابی الحدید نے ذکر کیا کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے غسل اور تجہیز و تکفین میں مصروف ہو گئے۔ اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت خلافت کر لی گئی۔ تو حضرت زبیر، جناب ابوسفیان اور مہاجرین کی ایک جماعت نے حضرت عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ علیحدگی میں ملاقات کی تاکہ اس امر میں غور و فکر کریں اور ایسا کلام کیا جو انہیں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے خلاف براہیختہ کرنے اور ابھارنے والا تھا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:-

قَدْ سَمِعْنَا قَوْلَكُمْ فَلَا لِقْلَةَ نَبْتَعِينَ يَكْمُ وَلَا لِقْلَةَ نَتْرَكْ
 آراءكم فامهلونا مزاجع الفكر الخ۔ یعنی ہم نے تمہارا قول سُن لیا نہ قلت کی وجہ سے ہم تمہارے ساتھ استعانت کرتے ہیں اور نہ تمہارے متعلق کسی بدگمانی کی وجہ سے تمہاری آراء کو نظر انداز کرتے ہیں، لہذا ہمیں مہلت دو، ہم غور و فکر کریں۔
 فَاِنْ يَكُنْ لَنَا عَنِ الْاَشْيَاءِ مَخْرُجٌ يَصْرِبْنَا وَبِهِمُ الْحَقُّ
 صَوِيرُ الْمَجْدِ جَدٍ وَتَبْسِطُ اِلَى الْمَجْدِ اَكْفَالًا نَقْبِضُهَا اَوْ
 نَبْلِغُ الْيَدِيْنِ وَاِنْ تَكُنْ الْاُخْرٰى فَلَا لِقْلَةَ فِي الْعَدُوِّ وَلَا لَوْ هُنَّ
 فِي الْاَيْدِيْ وَادَّهَ لَوْ لَا اَنَّ الْاِسْلَامَ قَيَّدَ بِالْقَتْلِ لَقَدْ كِدْتَ
 جُنَادِلَ صَخْرٍ يَسْمَعُ اصْطِكَا كَلَامًا مِنَ الْمَعْلُ الْعَلٰى۔

اگر ہمارے لیے گناہ سے بچ نکلنے کا کوئی راستہ ہوا تو ہمارے اور ان کے درمیان حق باواز بلند پکارے گا۔ اور ہم بندرگی کی طرف ہاتھ بڑھائیں گے اور پھر انہیں سمیٹیں گے نہیں جب تک غایت کو پہنچ نہ جائیں اور اگر دوسری صورت ہوئی تو نہ تعداد میں قلت اور کمی کی وجہ سے ہوگی اور نہ ہی ہاتھوں میں ضعف و ناتوانی کی وجہ سے بخدا اگر اسلام نے اظہارِ جلالت و شجاعت پر پابندی عائد نہ کر دی

ہوتی اور اس کے حدود و قیود کا یقین نہ کرویا ہوتا تو سخت پتھروں کی بارش ہوتی اور ان کی گھن گرج بلند و بالا مکانوں میں سنائی دیتی۔ اس دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنا کمر بند کھولا اور فرمایا۔ الصبر حلم والتقویٰ دین والحجة محمد والطریق الصراط ایہا الناس شقوا۔ الخ

صبر حلم اور بردباری کا نام ہے۔ اور تقویٰ و پرہیزگاری ہی دین ہے اور حجت و دلیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور راستہ جو کہ چلنے کے لائق ہے وہ صراط مستقیم ہی ہے۔ اسے لوگو! فتنوں کی امواج کو نجات کی کشتیوں کے ساتھ عبور کرو۔ الی اسٹرمات قال

تنقیح خطبہ اور وجہ استدلال:

نہج البلاغۃ کے عنوان خطبہ سے بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور عباس بن ابوسقیان رضی اللہ عنہ دونوں کا بیعت کی پیش کش کرنا ثابت ہے۔ کلام لہ لما قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وخاطبہ العباس وابوسقیان بن حرب فی ان یبا یعالہ۔

اور شارح ابن ابی الحدید کے حوالہ سے واضح ہو گیا کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور مہاجرین کی ایک جماعت نے بھی یہ پیش کش کی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تمام بنو عبدمنان پھر قریش پھر تمام عرب کی بیعت کی ضمانت دی۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس سے انکار کر دیا۔ دیگر روایات کے مطابق آپ کو غمگینی لاحق ہوئی۔ اور بیعت خلافت نہ لینے پر نادم ہوئے لیکن نہج البلاغۃ کی روایت سے واضح ہوا کہ آپ سمجھتے تھے کہ ابھی میرا بیعت لینے کا موقع ہی نہیں ہے بلکہ بیعت خلافت لینا کچا پھل توڑنے اور غیر کی زمین میں بیج بونے والی بات ہے۔ اور بنو تمیم کو کمزور سمجھ کر اور ان کو حقیر سمجھتے ہوئے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کو توڑنا اور لوگوں کو ان سے منحرف کرنا منافرت کی راہ پر چلنا ہے۔ اور جاہلیت کے

کرو کی طرح قبائلی فخر و ناز اور تفوق اور برتری کا دعویٰ کرنے کے مترادف ہے۔
 لہذا فرمایا کہ فخر و مباہات کے یہ تاج سروں سے اتار پھینکو اور ساتھ ہی یہ بھی
 واضح فرمایا کہ میں موت و ہلاکت کے ڈر سے یہ باتیں نہیں کر رہا ہوں بلکہ امت حجت
 علی مکتون علم لو بحت یہ لا اضطربتم اضطراب الارشنة فی
 الطوی البعیدۃ۔

ایک مخفی علم اور راز پر مطلع ہوں اور محیط و مشتمل کہ اگر میں اس کو ظاہر کروں
 تو تم اس طرح لرز جاؤ جیسے گہرے کنویں سے ڈول کھینچتے وقت سے لہرتے
 ہیں جس کے متعلق شامح ابن ابی الحدید کہتا ہے: ہذا اشارۃ الی الوصیۃ
 التي نص بها علیہ السلام انہ قد کان من جملہ ما الامر بترك النزاع
 فی مبداء الاختلاف علیہ۔

اس جملہ میں اس وصیت کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ
 عنہ کو مخصوص ٹھہرایا گیا۔ من جملہ دیگر امور کے اس میں یہ بھی داخل ہے
 کہ اگر تمہارے ساتھ اختلاف ہو اور خلافت بغیر نزاع کے ہاتھ نہ آ سکے تو
 نزاع اور جھگڑا نہیں کرو گے بلکہ تسلیم و رضا سے کام لو گے جس کا مفصل ذکر اس
 خطبہ کے بعد میرے حوالہ میں آ رہا ہے۔ الغرض اس خطبہ میں خلافت مرتضوی کے
 وقت کا موخر ہونا اور آپ کا اپنی باری کی انتظار میں ہونا واضح ہو گیا۔ کما قال
 ابن ابی الحدید: یرید انہ لیس ہذا الوقت هو الوقت الذی یسوغ
 لی فیہ طلب الامر وانہ لم یان بعد۔ ص ۲۱۴ ج ۱

اور وصیت ثابت ہوئی تو یہی کہ اختلاف و نزاع سے گریز کرنا لہذا وصی رسول کا
 یہ معنی نہیں کہ خلافت بلا فصل کی وصیت کی گئی بلکہ صبر اور تسلیم و رضا کی وصیت کی
 گئی بلکہ صبر اور تسلیم و رضا کی وصیت کی گئی۔ اور ترک نزاع کی نیز یہ حقیقت بھی
 واضح ہو گئی کہ اصل محرک خلافت و امارت کا معاملہ طے کرنے کے انصاف بنے اور
 حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے خلافت ان سے لی ہے۔ اور اگر یہ حضرات

سقیفہ میں جا کر اپنی خدا داد عظمت و جلالت اور رفعت و مرتبت کے ذریعے اس کو انصار سے حاصل نہ کرتے تو چوتھے درجہ میں بھی آپ کو خلافت کا ملنا ناممکن تھا چہ جائیکہ بلا فصل کا حصول اور انصار کو وصیت خلافت کا علم ہوتا یا نص خلافت معلوم ہوتی تو وہ یہ قدم بالکل نہ اٹھاتے اور جب اپنی خلافت ترک کی تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بناتے۔ نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی پیش کش صرف حضرت ابوسفیان کی طرف سے نہیں تھی۔ تاکہ اس کو اسلام دشمنی سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا بلکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات صحابہ بھی ان کے ساتھ متفق تھے اور ان میں سے کسی نے بھی آپ کے لیے نہ وصیت کا ذکر کیا اور نہ نص کا بلکہ صرف بنو تیم اور بنو عدی کی حکومت اور بنو عبد مناف پر حکمرانی کو سامنے رکھ کر اس خلافت کو کالعدم کر دئے بلکہ اس کے انعقاد سے قبل بنو عبد مناف اور بنو ہاشم کی حکومت قائم کرنے کا مشورہ دیا۔

خوف قتل وغیرہ کی وجہ ازراہ تفسیر بیعت اور اطاعت کا رد

حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ کے اس خطبے نے واضح کر دیا کہ وہ موت اور قتل کے اندیشے اور خوف کے تحت اس خلافت و امارت کو تسلیم نہیں کر رہے تھے بلکہ موت تو ان کو اس سے بھی زیادہ محبوب ہے جس قدر کہ شیر خوار بچے کو ماں کا دودھ محبوب ہوتا ہے۔ علامہ ابن عیثم اور صاحب درۃ نجفیہ نے اس کی شرح میں کہا :-

قد عرفت ان محبة الموت والانس یہ متمکن من نفوس اولیاء اللہ لكونہ وسیلة لہم الی لقاء اعظم محبوب والوصول الی اکمل مطلوب و انما کان انس بہ من الطفل تبدی امہ لان محبة الطفل للشدی و انسہ و میلہ الیہ طبعی حیوانی

معرض الزوال ومیلہ الی لقاء ربہ والوسیلۃ الیہ
میل عقلی باق فامین احدهما من الآخر۔

(ابن میثم جلد اول ص ۲۷۹)

(درۃ نجفیہ ص ۶۹)

تحقیق تو جان چکا ہے، کہ موت کی محبت و انس اولیاء اللہ کے نفوس و قلوب
میں متمکن ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ موت ان کے لیے عظیم تر محبوب اور کامل تر مطلوب
کی طرف وصول کا ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ اور بچے کی ماں کے پستان کے ساتھ مانوس
ہونے سے بھی آپ کے موت کے ساتھ زیادہ مانوس ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بچے کا
اس کی طرف میلان اور انس طبعی ہے۔ اور تقاضائے حیوانیت جو کہ معرض زوال
میں ہے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا میلان اور انس اللہ تعالیٰ کی ملاقات
اور اس کی بارگاہ میں حاضری کے ساتھ اور اس کے وسیلہ یعنی موت کے ساتھ
عقلی و روحانی اور دائمی وابدی ہے۔ لہذا ان میں۔ یا ہم کیا نسبت ہو سکتی ہے۔
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شجاعت و بہالت کی حکمت بیان کرتے ہوئے ماضی
ابن میثم نے جلد اول ص ۲۷۹ پر تحریر کیا۔

لأن المانع عن الاقدام علی الاحوال والمکارہ انما
هو خوف الموت وحب البقاء والمعارف بمعزل عن تقیۃ
الموت اذ كانت محبة الله شاغلة عن الالتفات الی کل
شیء بل ربها یكون مشتهی له لكونه وسیلۃ الی لقاء محبوبہ
الاعظم وغایتہ القصوی۔

کیونکہ ہولناک اور مشکل تر ہی امور میں اتمام اور مداخلت سے صرف موت
کا خوف اور زندگی کی آرزو اور محبت مانع ہوا کرتی ہے اور عارف کا مقام موت کے
ڈر اور خوف سے کہیں دور اور بالا تر ہوتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت اس کو
دوسری تمام اشیاء کی طرف التفات اور اشتغال سے مانع ہوتی ہے یا اوقات

موت اسے دوسری تمام اشیاء سے زیادہ مرغوب و مطلوب ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ عظیم تر محبوب امر اور انتہائی مرغوب مقصد کا ذریعہ اور وسیلہ ہوتی ہے۔ لہذا یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ آپ کا خلافت صدیقی کو تسلیم کرنا بلکہ دوسرے لوگوں کو اس کی مخالفت سے باز رکھنا اور اس کو امواج فتن میں پھیرے کھانے اور عصیت جاہلیہ کے تاج سر پہ رکھنے کے مترادف قرار دینا سراسر عصلحت اور حکمت پر مبنی تھا۔ اور اس میں کسی قسم کا ڈر اور خوف و اندیشہ شامل نہیں تھا اور نہ ہی وہ آپ کے نمایان شان تھا۔ لہذا شیعہ برادری کی وہ ساری افتراء پر دازی اور افسانہ سازی جو آپ کے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرنے کے متعلق ذکر کی گئی ہے۔ اس ارشاد سے لغو اور باطل ہو گئی کیونکہ گلے میں رہتے ڈلو کر اور گھسیٹ کر لائے جانے کے بعد کہنا میں بیعت نہ کروں تو کیا کروں گے جب انہوں نے کہا تمہارا سر قلم کر دیں گے۔ تو آپ کا حجرہ مقدسہ کی طرف منہ کر کے کہنا یا بن ام ان القوم استضعفونی وکاد یقتلوننی قوم نے مجھے ضعیف و ناتواں سمجھا اور وہ میرے قتل کے درپے ہیں۔ لہذا مجھے بیعت کرنے میں معذور سمجھنا اور اس کے بعد بیعت کر لینا۔ اس فرمان کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ آپ تو پیشگی اسی توہم کا رد کر رہے ہیں کہ میرے سکوت کو موت سے گھیر لہٹ کے ساتھ تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن بخدا یہ توہم سراسر غلط اور باطل ہے تو گویا جس امر کا توہم باگاہ و مرتضوی میں ناتواں برداشت تھا۔ اس کو مدعیان محنت نے ایک حقیقت بنا کر رکھ دیا اور مقام عرفان سے گرا دیا اور اپنے فرزند ارجمند حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ سے بھی شجاعت و بسالت میں کمتر ثابت کر دکھلا دیا اور حق کی یاسبانی اور حفاظت و نگرانی میں قربانی کے جذبات سے سراسر عاری اور غالی ثابت کر دکھا۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا ہمراہیوں ہو۔

اور اگر کسی وصیت کی وجہ سے آپ نے ان کے ساتھ حرب و قتال اور مجاہد و نزاع سے گریز کیا تھا۔ تو پھر گلے میں رہے ڈلوانے دروازے جلوانے حضرت

زیراد کی توہین و تحقیر کرانے کے بعد بیعت کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ لہذا ان امور کا سراسر افسانہ اور افتراء ہونا واضح ہو گیا والحمد للہ علیٰ ذلک۔ علاوہ انہیں جب دوسروں کو خلافت صدیق رضی اللہ عنہ کی مخالفت سے منع کر رہے ہیں تو خود اس طرح کے اقدام کیوں کر کر سکتے ہیں جو مخالفت اور ناسازگاری پر دلالت کریں۔ اور عدوت و منافرت کی علامت و دلیل ہوں یہ ایک کھلا تصناد ہے جو سر حشیم ولایت کی ذات مقدسہ سے بہت بعید ہے بلکہ ناممکن؟

شیعی شارحین کا اضطراب

ابن میثم اور صاحب درۃ نجفیہ نے حضرت امیر قدس سرہ العزیز کے اس ارشاد کی تشریح و توضیح میں کہا کہ میرے لیے خلافت کے دعویٰ کا یہ وقت نہیں اور وہ گلے میں اٹک جانے والا لقمہ اور بدبودار ترش پانی ہے۔ اور قبل از وقت کچا پھل توڑنا اور عین کی زمین میں کاشت کرنا ہے کیونکہ میرے لیے کافی ناصر و مددگار نہیں ہیں۔ تنبیہ علیٰ ان ذلک الوقت لیس وقت الطلب لهذا الامر ما لعدم ناصر اول غیر ذلک ابن میثم (جلد اول ص ۲۷۸ و ردۃ نجفیہ ص ۶۹)۔ حالانکہ حضرت عباس اور جناب ابوسفیان اور جماعت مہاجرین کی درخواست اور بیعت کے مطالبے پر آپ نے یہ جواب دیا تو آپ اگر ان کی امداد و اعانت کو ناکافی سمجھتے تھے تو صاف فرمادیتے کہ تم میں مقابلہ کی سکت نہیں اور میں تمہاری اس امداد و اعانت پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ نہ یہ کہ تم فتنہ پر دازی سے گریز کرو اور تاج مفاخرت سرور سے اتار پھینکو جبکہ مدینہ منورہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دینے کی پیش کش ہو رہی ہو۔ تو قلت ناصر کا دعویٰ کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے خطبات کو سامنے رکھیں جو قبل انہیں ذکر ہو چکے تو بھی قلت انصار کا عذر بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ بار بار تعصب سے ہٹ کر شرح کرنے کی قسین کھانے والے جب بھی مذہب نفس

اور تشیع کا حضرت امیر کے ہاتھوں بیڑا غرق ہوتا دیکھتے ہیں تو پھر اسی تعصب سے کام لینا شروع کر دیتے ہیں۔

محقق طوسی کا اعتذار اور اس کا رد

محقق طوسی نے حضرت عباس والی اس پیشکش کی توجیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ کے لیے نص موجود نہیں تھی بلکہ ایک طریق نصب خلیفہ کا اس پر نص یہ کرتا تھا اور دوسرا طریقہ شوریٰ و اختیار اور انتخاب کا تھا۔ لہذا حضرت عباس رضی اللہ عنہ دونوں طرح سے خلافت کو آپ میں منحصر اور مختص کرنا چاہتے تھے اور قوم کو التمام دینا چاہتے تھے کہ اگر آپ کا منتخب خلیفہ ہے تو ہمارا بھی منتخب ہے علاوہ ازیں ہمارا خلیفہ منصوص بھی ہے لما بلغه فعل اهل السقیفة و قصد هم الامر من جهة الاختیار اراد ان یخرج علیہم بمثل حجۃہم الخ

تحقیق الشانی ص ۳۵۲۔ علاوہ انہی دوسرا جواب یہ دیا کہ بیعت کرنا وجود نص کے خلاف نہیں دیکھو ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (حضرت) عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر تنصیف بھی کر دی اور لوگوں کو بیعت کا حکم بھی دیا اور انہوں نے بیعت کی۔

وقدر رأیناہ مع نص ابی بکر علیہ حمل الناس علی بیعتہ دعاہم الیہا فایعواہ ولم یمنع تقدم النص من البیعة ص ۳۵۲۔

رد اعتذار اور بیان حقیقت

(۱) لیکن طوسی صاحب صرف اپنی ذکر کی ہوئی روایت پر نظر رکھتے ہیں اور اس ضمن میں وارد دوسری تمام روایات سے نظر ٹھایتے ہیں۔ جس سے حقیقت حال پوری طرح واضح نہیں ہوتی۔ یہاں پر دو قسم کی روایات ہیں پہلی قسم کی وہ روایات جن میں تنصیف کے اندر ابھی انصار کا اجتماع ہوا تھا اور نہ ابو بکر صدیق کے لیے

بیعت کا کوئی امکان سامنے تھا۔ اس وقت بیعت کی پیشکش اور نبو عبد مناف اور قریش بلکہ عرب کے آپ پر متفق ہونے کا ذکر اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ کے نزدیک حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں نص موجود نہیں تھی۔ اور حقیر خلیفہ کی صورت بھی آپ کے نزدیک ہی انتخاب والی تھی۔ جس کے جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی مشغولیت کا ذکر کیا۔ اور یہ بھی کہ میرے علاوہ اسکا امیدوار کون ہے؟ مگر آپ نے فرمایا انجام دیکھ لینا۔ چنانچہ بعد میں آپ نے کہا کہ اب اس خلافت کو رد نہیں کیا جاسکتا تو انہوں نے فرمایا بعد از انعقاد اس کا رد کیونکر ممکن ہے۔ لہذا اس مضمون کی تمام روایات کو دیکھ کر پھر بنظر انصاف دیانت غور و فکر کرو تو طوسی صاحب کے جواب کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں رہ جاتی۔

۲۔ دوسری قسم کی روایات وہ ہیں جو انعقاد خلافت کے بعد اس کو مترنزل کرنے اور اس کو ختم کرنے کے متعلق پیش کش پر مشتمل ہیں جن میں حضرت عباس کے ساتھ جناب ابوسفیان حضرت زبیر اور جماعت مہاجرین بھی شامل تھے۔ لیکن ایک دفعہ خلافت کے تقرر کے بعد دوسرے شخص کی بیعت کرنے سے آیا۔ تمام محبت ہو سکتا ہے۔ اور پہلی بیعت و انتخاب کے ساتھ معارضہ و مناقضہ ہو سکتا ہے۔ قطعاً نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جس کا بار بار لوہا بصرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیر اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے سامنے اظہار کیا اور اعلان فرمایا۔ ائہا بیعة واحدة لا یشئ فیہا النظر ولا یستأنف فیہا الخبیاء وغیرہ وغیرہ اور خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی فرمایا۔ وہل سر دمثل ذلک قط۔ کہ کبھی انعقاد بیعت کے بعد اور تقرر خلافت کے بعد اس کا رد ممکن ہے؟ لہذا اس روایت پر بھی یہ جواب قطعاً منطبق نہیں ہوتا۔ اس لیے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بیعت کی پیش کش کرنا اور یہ موقع اس خلافت و امامت پر

متصرف ہونے کی تلقین کرنا اس حقیقت کی طرف مشعر ہے۔ کہ نص خلافت موجود نہیں تھی علی الخصوص جب دوسری روایات کو ساتھ ملا یا جائے جن میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے کا مشورہ دیا کہ خلافت کس کے لیے ہے۔

(۳) نیز طوسی صاحب کا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تصریح و تنصیف پر اس کو قیاس کرنا بھی کسی طرح درست نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں تنصیف اور تصریح کے ساتھ ہی بیعت کا حکم ہے اور انتقال اقتدار پایا گیا ہے۔ جب کہ بقول شیعہ صاحبان حضرت علی کے لیے خلافت کی تصریح و تنصیف تقریباً تین ماہ پہلے پائی گئی اور انتقال اقتدار کی نوبت نہ آئی۔ علاوہ ازیں حکم رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حکم ابوبکر صدیق میں جو فرق ہے۔ وہ کیونکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حکم ابوبکر کی مخالفت و موافقت دونوں محتمل ہیں جب کہ حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کسی مومن کے لیے ممکن نہ تھی علی الخصوص وہ انصار جو میزبان رسول اور میزبان مہاجرین تھے اور اپنے وطن میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو رہے تھے ان سے یہ مخالفت کیونکر ممکن تھی؟

الحاصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد میں کوئی معمولی اشارہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تقرر خلافت کا نہیں ملتا اور نہ اس جواب سے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو دیاجیرت کی بات ہے کہ صحابہ کرام کی بلاست مرتبت اور قرآن و احادیث اور ارشادات مرتضویہ سے ثابت ان کی رفعت کو کس طرح نظر انداز کر کے اور اس مضمون کی دوسری روایات کو کس طرح پس پشت ڈال کر جوابی کاروائی کی ناکام سعی کی جاتی ہے۔ اور سراسر تعصب کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اور بلا وجہ اور بلا دلیل صحابہ کرام علیہم السلام کو ظالم اور غاصب بنانے کی سعی نامتسام اور جہد نامشکور کی جاتی ہے۔

نوٹ:-۔ نہج البلاغہ کے اس خطبے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا

کی صریح نفی اور شرک نزاع و اختلاف کی وصیت کا ڈھکوسل صاحب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بالکل خاموشی سے گزر گئے ہیں۔ جو کھلا اعتراف مجرب ہے۔ اور جواب نہ بن سکنے کا عملی اقرار اور علامہ ڈھکوسل صاحب کا معمول ہی یہی ہے کہ جس دلیل اور روایت کا جواب نہ آتا ہو۔ اس سے آنکھیں بند کر کے نکل جاتے ہیں اور جہاں کچھ نہ کچھ بولنے کا امکان ہو وہاں شاعری شروع کر دیتے ہیں حالانکہ در رسالہ مذہب شیعہ، کے اندر مندرج دلائل کا جواب نہیں آتا تھا۔ تو خواہ مخواہ رو لکھنے کا تکلف ہی کیوں کر نہ تھا۔ اور ان اوراق کے سیاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی!

رسالہ مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز۔

روایت نمبر ۴ :-

سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، کا ایک اور فرمان بھی پڑھ لو۔ ناسخ التواتر بح جلد سوم کتاب ۲ ص ۵۸ پر مرقوم ہے۔

لَقَدْ عَهِدَ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَالَ يَا عَلِيُّ لَتَقَاتِلَنَّ الْفِتْنَةَ الثَّلَاثَةَ وَالْفِتْنَةُ الْبَاغِيَّةُ وَالْفِرْقَةُ الْمَارِقَةُ أَنَّهُمْ لَا إِيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ -

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا اور یہ عہد لیا کہ تم ضرور بالضرور اور ہر صورت وعدہ توڑنیوالوں، بغاوت کرنے والوں اور سرکشی کرنے والوں کے خلاف جنگ کرنا رہے شک ان کے لیے ایمان نہیں ہے ہو سکتا ہے کہ وہ باز آئیں۔

اب یا تو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو برحق تسلیم کیا جائے۔

یا حضرت امام المتقین علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ تعالیٰ عہد توڑنے والا تسلیم کیا جائے؟ ان دونوں صورتوں کے بغیر تباہی و تیسری کو کسی صورت متصور ہو سکتی ہے؟ کیونکہ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف جنگ نہیں کی بلکہ ہر معاملہ میں

ان کی امداد و اعانت کی اور کوئی قول یا فعل آپ سے ایسا ظاہر نہ ہوا جو ان کے ساتھ کسی معاملہ میں مخالفت پر بطور دلیل پیش کیا جاسکے!

تمیز مبحث مذکور تحفہ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

۱۔ اقوال :- جب کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے کلمات جو خطبہ سابقہ کے ابتداء میں سے حذف کئے گئے اور شارح ابن ابی الحدید نے ان کو نقل کیا یعنی آپ کا حضرت زبیر، جناب ابوسفیان اور جماعت ہاجرین کو یہ فرمانا فلا تفصلہ نستعین بکم واللفظہ نثرک آراءکم الخ ہم نہ تو قلت تعداد کی وجہ سے تم سے امداد و اعانت کے طلبگار ہیں اور نہ کسی بدگمانی کی وجہ سے تمہاری آراء کو نظر انداز کرتے ہیں میں ہمیں سوچنے کا موقعہ دیکھئے اور یہ معلوم کرنے کا کہ آیا از روئے شرع ہمارے لیے اس اقدام میں کوئی گناہ تو نہیں لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ان مشہور دینے والوں کی آراء پر تنقید کرتے ہوئے اس کو فتنہ کی امواج میں تھپیڑے کھلنے اور منافقت و مخالفت کی راہ چلنے اور جاہلیت کی قبائلی فوجیت و برتری کے مزعومہ تاج منفاختہ سر پہ کھنے سے تعبیر کیا اور اس اقدام کو قبل از وقت قرار دیا۔ اس سے صاف ظاہر کہ نگاہ لفظی رضی اللہ عنہ میں حضرات نہ باغی تھے اور نہ ناکث اور نہ ہی قاسط و مارق بلکہ خلاف الہیہ کے وارث و مالک جس طرح نفع علی موعود من اللہ الخ وائے خطبہ سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت فاروق اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کی بدھناء و رغبت بیعت کرنے سے اور ان کو امامت کا اہل تسلیم کرنے سے جیسے کہ سابقہ صفحات میں تفصیل و عبارات ہدیہ ناظرین ہو چکی ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک محمد اشرف غفرلہ۔

علامہ ڈھکو صاحب کا عجز اور بے بسی

نوٹ :- علامہ ڈھکو صاحب نے اس روایت اور عبارت کا جواب بھی نہیں

دیا اور معاصری کے چاولوں کی طرح مضہم کر گئے ہیں۔
روایت نمبر ۵:

خدا کے شیر کی شان میں ایک اور خطبہ نبج البلاغۃ کا ملاحظہ فرمائیں
نبج البلاغۃ مصری جلد اول ص ۸۸

رضینا عن الله قضاءك ومسلمنا الله امرأه أتراني الكذب على رسول الله
صلى الله عليه وسلم والله لا نأول من صدقة فلا نكون أول من كذب عليه
فقطرت في امرى فإذا طاعنى قد سبقت بيعتى وإذا الميثاق
في عنقى لغيرى۔

یعنی ہم اللہ تعالیٰ کی قضاء پر راضی ہو چکے اور ہم نے اللہ تعالیٰ کے امر و حکم
کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ کیا تم میرے متعلق یہ گمان کرتے ہو کہ میں رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تجوٹ بولوں گا؟ خدا کی قسم میں پہلا شخص ہوں جس نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی تھی تو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ
وسلم کو جھٹلاتے والوں میں نہیں ہو سکتا میں نے اپنی خلافت کے بارے میں پوری طرح اطمینان
خوب سمجھ لیا ہے۔ میں نے اپنے پیچھے سے لیے اطاعت کرنا اس بات پر سبقت لے لی ہے
چکا ہے کہ میں لوگوں کو بیعت کرنا شروع کر دوں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ
وسلم کا عہد و پیمان دوسروں کی اطاعت کا میرے ذمے لگ چکا ہے۔
اس خطبہ کی شرح میں اہل تشیع کے علامہ ابن میثم بحرانی ص ۱۵۸ پر
رقمطرات ہیں۔

فقطرت فإذا طاعنى قد سبقت بيعتى اى طاعنى لرسول الله
فى ما امرنى به من ترك القتال قد سبقت بيعتى للمقوم فلا سبيل
الى الامتناع منها وقوله اذا الميثاق فى عنق لغيرى اى ميثاق
رسول الله صلى الله عليه وسلم وعهد الى بعدم المشاقه و
قيل الميثاق ما الزمه من بيعه ابى بكر بعد ايقاعها اى

فمیشاق القوم قد لزمتی فلم یکننی المخالفة
بعداً -

یعنی جس بارہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے امر فرمایا تھا کہ
میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی مخالفت نہ کروں مجھے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اس قوم کی اطاعت اور ان کے ساتھ بیعت کرنے
سے قبل ہی واجب ہو چکی تھی۔ تو میرے لیے ان کی بیعت طے رہے اور
ان کی بیعت نہ کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں تھی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ،
کا یہ فرمانا کہ میرے ذمہ دوسروں کی اطاعت کا وعدہ اور عہد پہلے ہی سے
لگ چکا تھا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے وعدہ
لیا تھا کہ میں آپ کے عہد کی مخالفت نہ کروں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ میثاق نبوی
سے مراد یہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بیعت کرتے کا وعدہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لیا تھا۔ تو اس لازم اور واجب التعمیل وعدہ کے
بعد تو میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں اس کی مخالفت کروں۔

علامہ ڈھکو صاحب کی بے بسی۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کا ذکر کہ وہ اس دلیل کو بھی ڈھکو صاحب
نے ہاتھ تک نہیں لگایا اور خاموشی سے نکل گئے مگر عملاً بے بسی کا مظاہرہ کر گئے۔

تحفہ حسینیہ

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

اسی خطبہ کی شرح میں فنظریات فی امثلی الخ کے تحت شارح ابن ابی الحدید
معتزلی شیعہ نے کہا ہے۔

هذه کلمات مقطوعة من کلام ینکر فیہا مالہ بعد

وفات رسول الله صلى الله عليه وسلم وانه كان معهوداً
إليه ان لا ينازع في الامر ولا يشير فتنه بل يطلبه بالرفق
فان حصل له والا ماسك۔

(شرح حدیدی جلد ثانی ص ۲۹۶)

یعنی یہ کلمات آپ کے اس کلام سے لیے گئے ہیں جس میں آپ نے وفات
رسول اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی حالت کا ذکر کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آپ کی طرف
سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ امر خلافت میں نزاع و اختلاف سے کام نہ لینا اور نہ
فتنہ بڑھانا بلکہ نرم روی اور رفق و طاعت سے خلافت طلب کرنا مل جائے۔
تو بہتر اور نہ ملے تو اس سے رک جانا اور اعراض و روگردانی کرنا۔ قولہ

فاذا طاعتی لرسول الله اى وجوب طاعتی فحذف المضافات
واقیم المضافات الیه مقامه قد سبقت بیعتی للقوم اى وجوب
طاعة رسول الله صلى الله عليه وسلم على وجوب امتثالی
امره سابق على بیعتی لانه صلى الله عليه وسلم
امرنی پہلے۔

یعنی طاعتی الرسول اللہ میں مضاف محذوف ہے اور مضاف الیہ کو مضاف
کی جگہ قائم کیا گیا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اطاعت رسول اللہ وسلم کا وجوب و
نہی مجھ پر اور آپ کے ارشاد کی تعمیل کی رضیت میرے قوم کی بیعت کرنے سے
سبقت سے جا چکی تھی۔ لہذا میرے لیے اس سے رُکے رہنے کی وجہ جواز نہیں
تھی کیونکہ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مجھ اس کا حکم دیا تھا۔

واذا الميثاق فی عنقی لغیری اى رسول الله اخذ على
الميثاق بترك الشقاق والمنازعة فلم يجعل لی ان اتعدی
امره اداخالفت نهیه۔

دوسروں کے لیے ميثاق میری گردن میں تھا۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے مجھ پر مخالفت اور نزاع سے باز رہنے کی ذمہ داری ڈالی۔ اور عہد لیا لہذا میرے لیے آپ کے حکم سے تجاوز کرنے اور آپ کی نہی اور منع کی مخالفت کا امکان نہیں تھا۔

فوائد خطبہ اور مذہب اہل سنت کا اثبات

(۱) سبحان اللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پابند کیا گیا کہ مخالفت نہ کرنا اور فتنہ و فساد برپا نہ کرنا اور نرم روی اور اعتدال پسندی سے کام لینا حالانکہ آپ انجام کار سے باخبر تھے کہ خلافت پر ابوبکر اور عمر و عثمان رضی اللہ عنہم کو یکے بعد دیگرے اقتدار اور تصرف حاصل ہوگا۔ لیکن ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لیے پابند نہ فرمایا۔ بلکہ آپ کو ان کے لیے پابند فرمادیا جس سے صاف ظاہر کہ آپ کی نگاہ میں انہیں کی خلافت و امارت اسلام اور اہل اسلام کے لیے مفید تھی۔ اور غلبہ و قوت کا موجب اور اسی میں مصلحت اور بہتری تھی۔ اس لیے ابن ابی الحدید نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اہل اسلام پر خصوصی عنایت تھی کہ انہیں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتخاب کا اہام فرمایا۔

فكان من عناية الله تعالى بهذه الدين ان الهم الصحابة ما فعلوه والله ختم قدره ولو كره المشركون (شرح حدیثی جلد ۱ ص ۱۱۱)

تو اس دین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت تھی کہ صحابہ کرام کو الہام فرمایا اس فعل کا جو انہوں نے کیا اور اللہ تعالیٰ اپنے نور کو کامل و مکمل کرنے والا ہے اگرچہ مشرک اس کی تکمیل و تمہیم کو پسند نہ بھی کریں۔

(۲) اور اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حق میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی حقانیت بھی واضح ہو گئی۔

ادعی لی اباک و اخاک اکتب لکھ فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول
انا ولا ویابی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر۔ (مشکوٰۃ شریف)

اسے عائشہ میرے سامنے لپٹے باپ اور بھائی کو بلاتا کہ میں خلافت ان کو لکھ دوں۔
 کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی آزاد و مند اس کی آرزو کرے اور کہے میں حقدار ہوں حالانکہ
 دوسرا کوئی حق دار نہیں مگر ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کے اذلی فیصلہ قضا و قدر کے علم
 کے تحت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اور مؤمنین سوائے ابوبکر کے کسی دوسرے شخص پر
 راضی نہ ہوں گے۔ نیز فرمایا میرے بعد ابوبکر متولی خلافت ہوں گے۔ بعد ازاں عمر فاروق
 رضی اللہ عنہما۔

(۱۲) نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ آپ اپنے غلاموں کو بغیر نگران اور حکمران کے چھوڑ کر نہیں
 جا رہے تھے۔ کیونکہ آپ کے علم میں تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو ابوبکر صدیق پر متفق فرما
 دے گا اور انتظام با حسن و جوہ قائم رہے گا۔ جہاں سے اختلاف کا اندیشہ تھا ان کو
 عہد و میثاق کے ذریعے پابند فرما دیا۔ اور حضرت صدیق کے لیے زمین ہموار کر دی۔
 (۱۳) اہل تشیع کے ان دعوؤں اور اختراعی روایات کی قلعی بھی کھل گئی کہ مسجد قبا
 میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیراں وصال ابوبکر صدیق کو دیا اور پھر آپ نے
 ان کو فرمایا کہ علی پر ظہم نہ کرنا اور خلافت ان کے حوالے کر دے کیونکہ جب ظہری حیاست
 طیبہ میں آپ کو ان کی اطاعت اور موافقت کا پابند فرما رہے ہیں۔ اور عہد و میثاق
 ملے رہے ہیں تو قبر انور سے باہر آکر وہ بھی مسجد قبا میں اور اکیلے صدیق اکبر کے سامنے یہ
 ارشاد فرمانے کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے۔

نہ خود اقتدار سونپتے ہیں نہ آخری خطبہ میں ان کی خلافت و امامت کا اعلان فرماتے
 ہیں نہ لوگوں کو آپ کی ولی عہدی کی بیعت کا فرمان جاری کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کو پابند اطاعت
 فرماتے ہیں اور آپ پر ان کی بیعت لازم کرتے ہیں۔ تو پھر مزار انور سے نکل کر ایسی تاکیدیں
 فرمانے کا کیا مطلب؟ لہذا مزید کی طرح عیاں ہو گیا کہ یہ یار لوگوں کے تراشے ہوئے
 افسانے ہیں جن کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ و تعلق نہیں ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اہلبیت کے ساتھ تشدد کا ابطال

(۱۵) جب جنور خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ عہد تھا اور آپ اس کے پابند تھے۔

توسیعت سے رکنا اور بیعت کی دعوت پر تلوا اٹھا کر لڑائی کے لیے آمادہ ہونا اور مالی آخر
مجبور ہو کر گلے میں رستے ڈلو کر اور گھسیٹ کر منبر نبوی کے پاس لاسے جانے سے بعد
بیعت کرنا اور اس کے ساتھ ہی گھر چلائے جانے کے افسانے اور حضرت زبیرؓ کی بیعت
عنہما کے بھی مفرد اور زخمی ہونے کے ڈرامے اور حضرت محسن کے اسقاط کے
افتراء وغیرہ کو سامنے رکھ کر بتلاؤ۔ اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھ کر بتلاؤ کہ وصیت پر
عمل اور عہد کو نبھانے اور وعدے کو پورا کرنے کا یہی انداز ہوتا ہے جو آپؐ نے اختیار فرمایا۔
لہذا واضح ہو گیا کہ یہ روایات جھوٹ اور افتراء پر مبنی ہیں

ابن ابی الحدید معتزلی شعی نے کہا:۔ فکلہ لا اصل له عند اصحابنا ولا
یجتہ عند حدیثہم ولا رواة اهل الحدیث ولا یعرھونہ وانما ہوشی
تنقرد الشیعة بنقلہ۔ شرح حدیدی جلد ثانی ص ۱۷۱ یعنی ان تمام امور کی کوئی
اصل نہیں ہمارے علماء کے نزدیک اور نہ ہی ان میں سے کوئی ایسا امور کو ثابت کرتا
ہے۔ اور نہ ہی اہل حدیث نے ان امور کو روایت کیا۔ بلکہ نہ ہی وہ ان کو جانتے ہیں۔
اور یہ ایسے امور ہیں کہ صرف شیعہ لوگ ان کی روایت کے ساتھ منفر د ہیں۔ اور وہ معاند
دشمن ہیں۔

لہذا ان کی نقل کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے۔ ان کا تو کام ہی یہی ہے کہ جہاں فضائل
صحیح روایات سے بھی ثابت ہوں ان پر فتنی چلا دیں اور نقائص و نقصان ثابت ہوں
تو اپنی طرف سے گھڑا لیے اور یہود و مجوس اور ابلیس کو خوش کرنے کی مقدور بھرسعی
سے گریز نہ کیا نعوذ باللہ من شرورہم

دوسرے مقام پر ابن ابی الحدید نے اپنے مذہب اعتزال اور تفصیلی شیعہ
ہونے کے ناطے سے اپنا مذہب مختار بیان کرتے ہوئے اور اس قسم کی روایات پر
تبصرہ کرتے ہوئے کہا:۔

فاما علی علیہ السلام فانه عندنا بمنزلة الرسول صلی
اللہ علیہ وسلم فی تصویب قوله والاحتجاج بفعله ووجوب

طاعته ومتى صغرت عنه انه برئ من احد برئامنه كاشنا
من كان ولكن الشان في تصحيح ما يروى عنه عليه السلام
فقد اكثر الكذب عليه وولدت العصبية احاديث لا اصل لها.

(شرح حدیدی ج ۲ ص ۳۵)

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقام ہمارے نزدیک آپ کے اقوال کی درستگی
اور افعال کی حجیت اور اطاعت و فرمانبرداری کے وجوب و لزوم کے لحاظ سے وہی
مقام ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان امور میں ہے۔ اور جب کسی صحیح روایت
سے ثابت ہو جائے کہ آپ نے لوگوں میں سے کسی بھی شخص سے برأت کا اظہار کیا
ہے۔ تو ہم بھی اس سے برأت اور بیزاری کا اظہار کریں گے۔ خواہ وہ کیسا بھی بظاہر
بلند و بالا مقام و مرتبہ کا آدمی کیوں نہ ہو۔ لیکن اصل معاملہ ان روایات کی صحت و
ثبوت اور واقعیت کا ہے۔ اور اس تحقیق کا کہ واقعی آپ سے یہ مروی و منقول ہے
کیونکہ آپ پر بہت زیادہ دروغ گوئی سے کام لیا گیا اور من گھڑت روایات کی آپ کی
طرف نسبت کر دی گئی اور آپ کی محبت کے جو خش اور تعصب میں بے بنیاد اور حقیقت
و واقعیت سے بالکل دور روایات کو اختراع کر لیا گیا اس لیے ہر قسم کی روایت کا
بغیر معیار صحت پر پرہیز کے اعتبار نہ کیا جاسکتا۔

اور یہ حقیقت محتاج وضاحت نہیں کہ جن کی عدالت اور دیانت اخلاص اور
نیک نیتی نصوص کتاب اور صحیح روایات و احادیث اور ارشادات مرتضویہ سے
ثابت ہو ان کے خلاف اس طرح کی بے بنیاد روایات سے الزام تراشی اور افتراء
پردازی کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتی خود امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے۔

لیس من العدل القضاء على الثقة بالظن۔

نبج البلاغۃ مع شرح ابن عیثم جلد ۵ ص ۳۵۔ یعنی یہ عدل و انصاف کے خلاف
ہے۔ کہ موثوق بہ اور معتمد علیہ شخص پر محض ظن و گمان اور تخیل و توہم کی بنا پر کوئی حکم
لگا دیا جائے جو اس کی قطعی طور پر ثابت عدالت و امانت و دیانت اور تقویٰ

و یہ ہیزگاری کے خلاف ہو) اس لیے ابن ابی الحدید نے ہی مسعودی وغیرہ کی نقل کردہ روایات جن کا تعلق حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے گھر میں بلا اجازت داخل ہونے اور آگ لگانے کے لیے لکڑیاں اکٹھے کرنے کے دعویٰ سے ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

فہو خبرٌ واحد غیر موثوق بہ ولا معول علیہ فی حق الصحابة
 بل ولا فی حق احد من المسلمین ممن ظہرت عدالتہ ص ۳۲ -
 ترجمہ:۔ وہ خبر واحد ہے اور اس پر وثوق و اعتماد نہیں نہ صرف صحابہ کرام علیہم الرضوان
 کے حق میں بلکہ کسی بھی ایسے مسلمان کے حق میں جس کی عدالت ظاہر اور واضح ہو۔
 الغرض نبج البلاغہ میں مذکور اس خطبہ اور ارشاد مرتضوی نے واضح کر دیا کہ
 آپ کا خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم سے تعاون اور ان کی امداد و اعانت اس عہد
 نبوی اور پیمان مصطفوی اور وعدہ مرتضوی کے تحت ہے۔ اور اسی عہد و پیمان کی
 تائید و تصدیق آپ کے طرز عمل اور تعامل سے ہوتی ہے ابن ابی الحدید نے قول امیر
 رضی اللہ عنہ یملک فی سرجلان محب مہرط و باہت مفر
 کے تحت کہا کہ آپ نے دو قسم کے لوگوں کی ہلاکت کا ذکر کیا ہے۔ ایک محبت میں
 حد سے تجاوز کرنے والا گروہ یعنی غالی اور اعیان و اکابر صحابہ کی تکفیر کرنے والے
 اور ان کو منافق یا فاسق کہنے والے اور دوسرے قسم کے لوگ وہ ہیں جو آپ کی
 توہین و تنقیص کرنے والے ہیں اور آپ کے ساتھ بغض رکھنے والے اور آپ کے
 ساتھ حرب و قتال سے کام لینے والے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا تعامل خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کیساتھ

(۱) اس کے بعد اپنا اعتزالی اور شعبی عقیدہ بیان کر کے کہا:

فاطما لا فاضل من المهاجرین والانصار الذین ولو
 الخلافة والامامة قبلہ فلو انہ انکرا ما متہم و غضب

عليهم وسخط فعلهم فضلاً ان يشهر عليهم سيفه او
يدعو الى نفسه لقلنا انهم من الهالكين كما
لو غضب عليهم رسول الله صلى الله عليه وسلم (الى)
ولكننا روينا رضی امامتهم وبايعهم وصلى خلفهم
وانكحهم واكل من فيهم فلم يكن لنا انتقادی فعله
ولا نتجاوز ما اشتهر عنه۔

(صحیح ۲۲۱ و ۲۲۲)

لیکن وہ اکابر اور افاضل صحابہ ماجرین و انصار جو آپ سے پہلے خلافت
وامامت کے والی ہوئے اور اس میں متصرف ہوئے خلیفہ بننے یا بنانے کے حوالہ
سے، تو اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کی امامت کا انکار کرتے اور صرف ان سے
ناراض ہی ہوتے۔ اور ان کے فعل کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے خواہ ان کے
خلافت تلوار نہ اٹھاتے۔ یا اپنی طرف لوگوں کو نہ بھی بلائے سب بھی ہم کہتے کہ وہ
افاضل و اکابر ماجرین و انصار بھی ہلاکت کے گڑھے میں گرنے والے ہیں۔ لیکن
اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے ان کی امامت و خلافت کو پسند کیا ان کے
ساتھ بیعت خلافت کی اور عہد وفا باندھا ان کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ اور
انہیں اپنے رشتے دے۔ اور ان کے دور میں حروب و قتال میں حاصل ہونے والے
اموال غنیمت کو استعمال فرمایا۔ لہذا ہمارے لیے قطعاً اور جائز نہیں کہ ہم آپ کے
فعل اور عمل سے تجاوز کریں۔ اور آپ کا ان کے ساتھ جو تعامل و تعاون مشہور
و معروف ہے۔ اس کو نظر انداز کریں۔ اور پس پشت ڈالیں۔

(۲) ابن ابی الحدید نے اپنے مشائخ معتزلہ مفسدہ شیعہ کے حوالے سے ذکر کیا۔

ان الامامة كانت لعلي عليه السلام ان رغب فيها ونزع عليها
وان اقرها، في غير ذلك وسكنت عنها تولينا ذلك الغير وقلنا
بصحة خلافتهم وامير المؤمنين لم ينزع الا ثمة

الثلاثه ولا جرد السيف ولا استخبد بالناس عليهم
فذلك ذلک علی اقرارہ لهم علی ما كانوا فيه فلذا لک
مولینا هم وقلنا فيهم بالطهاره والصلاح ولوحاربهم وجرده السيف
عليهم واستصرح العرب علی حربهم لقلنا فيهم بما
قلناه فيمن عانله هذه المعاملة من التضييق والتضليل

(ص ۹۹)

یعنی امامت در اصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی، خواہ اس میں رغبت اور
اور دلچسپی ظاہر کرتے۔ اور اس کی وجہ سے نزاع و اختلاف کرتے۔ خواہ دوسروں
میں اس کو برقرار رکھتے اور اس پر سکوت اختیار فرماتے تو اس صورت میں ہم اس شخص
سے محبت و تولی رکھتے۔ اور اس کی خلافت و امامت کو تسلیم کرتے۔ اور حقیقت حال
یہ ہے کہ امیر المؤمنین نے امثالہ کے ساتھ نزاع و اختلاف نہیں فرمایا۔ نہ ان کے
خلافت سوار میان سے نکالی۔ اور نہ لوگوں سے ان کے خلاف امداد و تعاون کا مطالبہ
کیا تو اس سے ثابت ہوا کہ آپ نے ان کو اس حالت پر برقرار رکھا اور اس کا
اقرار کیا جس میں کہ وہ تھے۔ اس لیے ہم ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کی طہارت
اور افضلیت اور صلاح و تقویٰ کے قائل ہیں۔ اور اگر اس کے برعکس آپ ان کے
ساتھ حرب و قتال اور جنگ و جدال فرماتے ان کے خلاف تلوار اٹھاتے اور عربوں
کو ان کے ساتھ جنگ پیا بھارتے تو ہم ان کے متعلق بھی وہی قول کرتے جو ہمارا
قول ان لوگوں کے متعلق ہے جن سے حضرت امیر المؤمنین رضی اللہ عنہ نے جنگ کی۔
یعنی ان کو فاسق اور گمراہ سمجھتے ہیں۔

ابن ابی الحدید شراح منہج البلاغۃ کا مذہب اور عقیدہ اور شععی علماء
کی دھاندلی

نوٹ :- اس حوالہ سے اور دیگر شرح حدیدی کے متعدد مقامات سے اور

شارح کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ وہ معتزلہ بغداد کے مسلک پر ہے اور تفصیلی شیعہ بھی ہے۔ اور اصحاب جمل اور اصحاب صفین کے حق میں گمراہی اور فسق کا قائل ہے۔ اور صرف حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہم کی مغفرت و بخشش کا قائل ہے۔ کیونکہ ان کی اپنے اقدام پر ندامت اور توبہ اس کے نزدیک ثابت ہے۔

امّا عائشہ والزبیر وطلحہ فمذاہبنا انہم اخطاوا ثم تابوا وانہم من اهل الجنة وان علیاً علیہ السلام شہدا لہم بالجنة بعد حرب الجمل ص ۲۰
اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ان کے حق میں حرب جمل کے بعد جنت کی شہادت اور گواہی دی۔ الغرض ان عقائد کو دیکھنے کے باوجود کوئی شخص اس کو سنی کہتا ہے۔ اور ہر جگہ اس کے نام کے ساتھ سنی لکھنا لازم سمجھتا ہے جس طرح کہ علامہ ڈھکو صاحب اور اس کے طبیب صاحب نے کیا ہے تو اس سے بڑھ کر فریب کی اور دجل و مکاری کیا ہو سکتی ہے؟ وہ خود جگہ جگہ اپنے معتزلی ہونے اور تفصیلی شیعہ ہونے کا اقرار کرتا ہے بلکہ اس نے تصریح کی ہے کہ ہم اصحاب صفین اور محاربین شام پر مسلمین کا لفظ بولنا بھی روا نہیں رکھتے ج ۲ ص ۱۹۱۔ اور ان کے ہمیشہ آگ میں رہنے کے قائل ہیں ج ۱ ص ۲۰ وغیرہ۔ مگر اس طرف سے اس کے سنی ہونے کی رٹ لگائی جا رہی ہے۔ اگر مطالعہ نہیں کیا تو جہالت پر مبنی دعویٰ ہے۔ اور اگر مطالعہ کیا ہے اور حقیقت حال معلوم ہے۔ پھر یہ کارستانی کی ہے۔ توبہ بدترین خیانت ہے۔ اور مجربانہ حرکت ہے۔ بحمد اللہ ہم نے اس شرح کی بین جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ اور بیسیوں مقامات پر اس کے اہل تشیع کے ساتھ متفق اور متحد عقائد کی نشاندہی کر سکتے ہیں۔ اس کے حوالہ جات اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ وہ شیعہ بھی ہے۔ اور ابن علقمی جیسے کٹر اور متعصب شیعہ اور غدار اہل سنت کا نمک خوار ہے۔ اس کا بندہ و دگاہ اور انعام یافتہ بھی اور اس کے تعمیل ارشاد میں اس نے یہ شرح لکھی جیسے کہ اس نے خود خطبہ شرح مسک میں تصریح کی ہے۔

خطبہ کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

فان مراسم المولى الوزير الاعظم والصاحب الصدر
الكبير العالم العادل المظفر المنصور المجاهد المربط
صويد الدين عضد الاسلام سيد وزراء الشرق والغرب
ابى طالب محمد بن أحمد بن محمد العلقسى (الى) لما شرفت عبيد
دولته وربيب نعمته بالاهتمام بشرح نهج البلاغة (الى)
لهذا يهنا ممكن کہ وہ کسی جگہ گنجائش ملنے کے باوجود حق نعمت ادا نہ کرتا اور اپنے دلی
نعمت اور مربی کا حق تنک خواری ادا نہ کرتا۔ اور مذہب شیعہ کی ترجمانی نہ کرتا۔
اس لیے جو کچھ اس نے لکھا ہے۔ وہ حقائق کے سامنے مجبور و بے بس ہو کر اور واقعات
کی شہادت اور گواہی کے بعد کوئی راستہ نہ ملنے کی وجہ سے لکھا ہے۔ اس لیے کم از کم
خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے حق میں اہل تشیع کو اپنے اس ترجمان مذہب کی بات تسلیم
کرنی چاہیے۔ اور اسے قطعاً اہل سنت کے زمرہ میں داخل کر کے اس کی بات کو
غیر اہم اور بے وزن نہیں کرنا چاہیے! اور نہ اپنی گلو خلاصی کے لیے بھونڈا اور بودا
انداز اختیار کرنا چاہیے۔ کیا یہ خیال تھا کہ تمہاری کتاب کو صاحب علم اور اہل مطالعہ
نہیں دیکھیں گے اور اس جبرانہ خیانت کو نہیں پکڑیں گے۔ اور انگشت بندہاں
نہیں ہوں گے۔ کہ ابن ابی الحدید آپ کیا کہتا ہے۔ اور یہ لوگ اس کے حق میں کیا
کہہ رہے ہیں لیکن سہ

اذالم تستع فاصنع ما شئت۔

رسالہ مذہب شیعہ : از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ

ظاہری بیعت ہی حقیقی بیعت ہوا کرتی ہے

اب یہ کہنا کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صرف ہاتھ سے بیعت کی تھی اور دل سے نہیں کی تھی کس قدر لغو اور بے معنی تاویل ہے کیونکہ اس کا تو یہی معنی ہوگا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور وعدہ کا ایفا، معاذ اللہ دل سے نہیں کیا اس سے زیادہ بھی کوئی کفر ہو سکتا ہے کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ کے متعلق اس قسم کے اتہامات گھڑے جائیں اور یہ کہنا کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے ڈر کر بیعت کی تھی کس قدر یہودگی ہے۔ شیر خدا قسم کھا کر کہیں کہ میں نہیں ڈر سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے "وَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا اللَّهَ" یعنی اگر تم مؤمن ہو تو اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے نہ ڈرو۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمائیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان، حکم اور وعدہ کے ماتحت ان خلفاء کی بیعت اور ان کی اطاعت کر رہا ہوں اور اس کے مقابل میں اس قسم کے ٹوٹل اور ٹخنہ شیر خدا کی شیریں اور دیری کو چھپانے کی غرض سے پیش کئے جائیں تو میں حیران ہوں کہ باوجود اس کے دعوایے محبت و تولیٰ کس نظریہ کے ماتحت ہے۔

اگر حقوڑی دیر کے لیے تسلیم بھی کر لیں کہ شیر خدا رضی اللہ عنہ نے صرف ہاتھ سے بیعت کی تھی اور دل سے نہیں کی تھی تو اس کا جواب بھی حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے کلام فیض انجام سے سن لیں دیکھیے رنج البلاغہ خطبہ نمبر ۱۷ و نسخ التواریخ جلد سوم کتاب ۲، صفحہ ۱۹۲ "يَزْعَمُ أَنَّهُ قَدْ يَأْيَعُ بِيَدِهِ وَلَمْ يَأْيَعِ بِقَلْبِهِ فَقَدْ أَقْرَبَ الْبَيْعَةَ وَادْعَى الْوَلِيْعَةَ فَلَيَاتُ عَلَيْهَا بِأَمْرٍ يَعْرِفُ وَإِلَّا فَلْيَدْخُلْ فِيمَا خَرَجَ مِنْهُ - (رنج البلاغہ مصری ص ۱۹۲ جلد اول)

یعنی زیر یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے میرے ساتھ بیعت صرف ہاتھ سے کی ہے اور دل سے بیعت نہیں کی تو یقیناً بیعت کا اقرار تو کیا اور بیعت کرنے والوں کے زمرہ میں داخل ہو گیا پس چاہیے کہ اس پر کوئی علامت اور دلیل پیش کرے جس سے اس دعویٰ کو پچا نا جاسکے ورنہ چاہیے کہ وہ بھی اس بیعت میں داخل ہو جس میں لوگ داخل ہوئے اور وہ داخل ہونے کے بعد اس سے خارج ہوا۔

من لیا حضرات صرف ہاتھ سے بیعت کرنے کی حقیقت۔ اگر شیر خدا کے نزدیک ہاتھ سے بیعت کرنا دل سے نہ کرنا بیعت کے حکم میں نہ ہوتا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اذعی الولیحۃ کیوں فرماتے اور اقربا للبیعة کا حکم کیوں لگاتے یعنی بیعت کنندگان کے زمرہ میں داخل ہونے کا اس نے دعویٰ کر لیا اور بیعت کرنے کا اقرار کر لیا۔
علامہ ڈھکوصا حب کی بے بسی:

نوٹ: اس عبارت اور وجہ استدلال کا بھی علامہ ڈھکوصا حب نے ذکر تک نہیں کیا جواب دینا تو دور کی بات ہے جس سے عملاً اعتراف عجز اور اقرار بے بسی واضح ہو گیا۔

تحفہ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفرلہ

یہ عبارت اور اس مضمون کی اور بھی بہت سی عبارات نہج البلاغہ میں موجود ہیں خصوصاً نہج البلاغہ مصری شت کی یہ عبارت قابل غور ہے۔
ان کنتمابایعماطائعین فارجعوا وتوبوا الی اللہ من قریب وان کنتمابایعما فی کارہین فقد جعلتالی علیکم السبیل باظہار ما کما الطاعة واسرار کما المعصیة ولعمری ما کنتماباحق المهاجرین بالتقیة والکتمان وان دفعکمما ہذا الامر من قبل ان تدخلانیہ کان اوسع علیکم من خروجکمما منہ بعد اقرارکمابیہ۔

یعنی اگر تم دونوں نے دلی رغبت کے ساتھ میری بیعت کی تھی تو واپس

آئیے اور جلد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کیجئے اور اگر تم نے ناپسندیدگی اور دلی نفرت و کدورت کے ساتھ بیعت کی تھی تو تم نے میرے لیے اپنے اوپر راہ انہام اور حجت پیدا کر لی بسبب تمہارے اطاعت کو ظاہر کرنے اور معصیت و نافرمانی کو چھپانے کے مجھے اپنی زندگانی کی قسم تم دونوں دوسرے مہاجرین کی نسبت تقیہ و کتمان کے زیادہ حق دار نہیں تھے (جب انہوں نے تقیہ نہیں کیا تو تمہیں کون سی مجبوری ہو سکتی تھی جس کے تحت تقیہ کرنا پڑا) تمہارا میرے امر خلافت اور بیعت کو اس میں داخل ہونے سے پہلے رد کر دینا زیادہ وسعت اور گنجائش رکھتا تھا نسبت اقرار کرنے اور بیعت کرنے کے اس میں داخل ہونے کے بعد اس میں سے نکلنے کے۔

بیعت مرتضوی کے لیے جبر و اکراہ۔

لیکن اس کے برعکس ذرا دوسرے قسم کی روایات بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں یہ تصریح ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے غلصین اور فدا م خاص تلواریں لے کر کھڑے تھے اور بیعت نہ کرنے کی صورت میں قتل کر دینے کی دھمکیاں دے رہے تھے! ابن ابی الحدید نے ابو ہلال عسکری کی کتاب الاوائل سے نقل کرتے ہوئے تفصیلاً بتائی ہیں:

(۱) اشتر نخعی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:-

ثم فبايع الناس فقد اجتمعوا لك ورغبوا فيك والله ان نكلت عنها لتعصرون عليها عينيك مرة واحدة اطمئنت اور لوگوں سے بیعت لیجئے کیونکہ وہ تمہارے لیے جمع ہوئے ہیں اور تمہاری بیعت میں ہی رغبت رکھتے ہیں بخدا اگر تم نے اس بیعت خلافت سے اب بھی اعراض کیا تو چوتھی مرتبہ اس پر آنسو بہاؤ گے۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے اور بیڑ سکن میں داخل ہوئے اور تمام لوگ جمع ہوئے اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے "لايشكان ان الامر علي"،

اور ان کو اس میں قطعاً شک و شبہ نہیں تھا کہ امر خلافت شوریٰ اور انتخاب و اختیار سے ملے ہوگا بلکہ اسی دورانِ اشتراک نے کہا کیا اب کسی کا انتظار رہے؟
 قم یا طلحة فبايع فتقاعس فقال قم یا بن صعبه و سدل سيفه
 فقام طلحة یجر رجله حتى بايع - اے طلحہ اٹھئے اور حضرت
 علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کیجئے انہوں نے توقف اور تردد کا اظہار کیا تو اشتراک
 نے کہا اٹھ اے ابن صعبہ اور ساتھ ہی تلوار سونت لی تو حضرت طلحہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے
 اٹھے اور بیعت کی۔

ثم قال قم یا زبیر واللہ لا ینازع احد الا وضربت قرطه بهذا
 السیف فقام الزبیر فبايع ثم انشال الناس علیہ فبايعوا -
 پھر کہا اے زبیر اٹھو بخدا جو بھی نزاع و اختلاف سے کام لے گا میں اس
 تلوار کے ساتھ اس کی گردن اڑا دوں گا تو حضرت زبیر اٹھے اور انہوں نے بیعت
 کی پھر سب لوگ آپ کی طرف مانل ہوئے اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔
 (۲) پہلے پہل اشتراک نے آپ کی بیعت کی۔ اپنے اوپر اوڑھا ہوا کمر اتار دیا اور
 تلوار سونت لی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کھینچ کر آپ کے ساتھ بیعت کی
 پھر حضرت زبیر اور طلحہ سے کہا۔

قوما فبايعوا ولا کنتما اللیلۃ عند عثمان فقاما یعثران فی ثیابہما لا یرجوان
 نجات حتی صفا باید یہما علی ید لا۔ اٹھو اور آپ کی بیعت کرو ورنہ آج
 رات تم بھی عثمان کے پاس پہنچے ہوئے ہو گے چنانچہ وہ دونوں اٹھے دریں حالیکہ
 اپنے کپڑوں میں پھسل رہے تھے اور گرتے پڑتے انہوں نے اپنے ہاتھ حضرت
 علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر رکھے جبکہ انہیں اپنی نجات اور خلاصی کی امید نہیں تھی۔
 (۳) ابو مخنف نے کتاب الجمل میں آپ کی بیعت کے واقعات بیان کرتے ہوئے ذکر
 کیا کہ پہلے پہل حضرت طلحہ نے بیعت کی پھر حضرت زبیر نے بعد ازاں مدینہ منورہ میں
 موجود تمام مسلمین نے ماسوا حضرت محمد بن مسلمہ حضرت عبداللہ بن عمر حضرت اسامہ

بن زید، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت کعب بن مالک، حضرت حسان بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہم کے۔

(۴) حضرت عبداللہ بن عمر کو حاضر کیا گیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بیعت کرنے کا حکم دیا تو انہوں نے کہا: ”لا ابا یح حق یبایع جمیع الناس“ جب تک سب لوگ بیعت نہ کریں میں بیعت نہیں کروں گا۔ آپ نے فرمایا مجھے اس کی ضمانت دو کہ تم یہیں رہو گے اور کہیں چلے نہیں جاؤ گے تو آپ نے کہا میں ایسی کوئی ضمانت بھی نہیں دیتا تو جناب اشتر نخعی نے کہا ”یا امیر المؤمنین“ یا امیر المؤمنین ان هذا قد امن سوطك وسيفك فدا عنی اخصی امیر المؤمنین اس کو نہ آپ کے درے کا ڈر ہے اور نہ آپ کی تلوار کا مجھے اجازت دو میں اس کی گردن اڑا دوں تو آپ نے فرمایا میں اس کو مجبور کر کے بیعت نہیں لینا چاہتا۔

رہا جب لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیعت کر لی اور حضرت عبداللہ بن عمر باقی رہ گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ بیعت کے معاملہ میں بات چیت کی مگر انہوں نے بیعت کرنے سے گریز کیا اور دوسرے دن حاضر ہو کر کھڑے ہوئے۔

”انی لك ناصح ان بیعتك لم یرض بها کلہم فلو نظرت لدینك ورددت الامر شوری بین المسلمین فقال علی علیہ السلام ویحك و هل ما كان عن طلب منی له !

”اَلَمْ یبلغك صنیعہم ؟ قم عنی یا احمق ما انت و هذا الکلام۔ یعنی میں تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں آپ کی بیعت پر سب لوگ راضی نہیں ہوئے اگر آپ اپنے دین اور تقویٰ پر نظر رکھتے ہوئے اس کو شوری پر چھوڑ دیں تاکہ اہل اسلام اپنی مرضی سے خلیفہ کا انتخاب کریں تو کتنا ہی اچھا ہو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا تیرے لیے افسوس ہے کیا جو ہوا وہ میری طلب اور خواہش پر ہوا کیا تمہیں بیعت کرنے والوں کے عمل اور طریق کار کا اس معاملہ میں علم نہیں ہے۔ اے احمق میرے پاس سے اٹھ جاؤ تمہیں ایسی گفتگو کرنے کا کیا حق ہے؟

جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اٹھ کمر چلے گئے تو تیسرے دن ایک آدمی نے آکر آپ سے عرض کیا، عبداللہ بن عمر مکہ مکرمہ کی طرف جا رہے ہیں وہ وہاں کے لوگوں کو آپ کے خلاف کر دیں گے لہذا ان کے پیچھے آدمی بھیج کر انہیں واپس بلاؤ۔
 فجاءت ام کلثوم اینتہ فسالته وضرعت الیہ فیہ وقالت یا امیر المؤمنین انما خرج الی مکة لیقیم بہا وانه لیس بصاحب سلطان ولا ہو من رجال هذا الشان وطلبت الیہ ان یقبل شفاعتہا فی امرہ لانه ابن بعلہا فاجابہا وکفت عن البعثة الیہ وقال دعوه وما اراد۔
 (شرح حدیدی ص ۱۷۱ تا ص ۱۷۲ جلد ۱)

اسی دوران آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم آمیں اور انہوں نے آپ سے سوال و مطالبہ کیا اور منت و زاری کی اور عرض کیا اے امیر المؤمنین عبداللہ بن عمر مکہ کی طرف صرف اس لیے جا رہے ہیں کہ وہاں قیام پذیر ہوں نہ وہ صاحب اقتدار ہیں اور نہ اس کی خواہش رہتی ہے والدوں سے ہیں اور ان کے حق میں شفاعت اور سفارش کے قبول کرنے کا آپ سے مطالبہ کیا کیونکہ وہ ان کے خاوند حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے مطالبہ کو پورا کیا اور حضرت عبداللہ بن عمر کے پیچھے آدمی بھیجنے سے رک گئے اور فرمایا اسے اس کی مرضی اور ارادہ پر چھوڑو۔

ابوہلال عسکری اور ابو مخنف کی یہ روایات کیا بالکل وہی منظر پیش نہیں کر رہیں جو ابو بکر صدیق کی بیعت کے وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق روایات سے ثابت کیا جاتا ہے۔ اگر وہ سچی ہیں تو جو جواب آپ کی خلافت کی حقانیت پر وارد اس اعتراض کا ہوگا کہ اجماع و اتفاق کہاں اور رضا و رغبت کہاں یہ سب کچھ اشترکی تلوار اور اس کی دھینکا مشتی سے ہوگا وہی جواب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے دیا جائے گا۔ ما ہو جوابکم فہو جوابنا! رہا نص کا دعویٰ تو یہ اس کا فعل و موقع نہیں ہے کیونکہ یہاں تو یہ دعویٰ ہے کہ تم نے بیعت کی خواہ دل سے خواہ

ظاہری طور پر لہذا اس کی پابندی لازم ہے اور خروج و بغاوت اور نقص عہد کا کوئی مجواز نہیں ہے؟

نیز بیعت مرتضوی اور بیعت صدیق میں فرق بھی ہے وہ یہ کہ حضرت صدیق کی بیعت مہاجرین و انصار نے پہلے کی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بعد میں بیعت کرنے کے لیے کہا گیا جبکہ جناب اشتر نخعی نے پہلے ہی زور شمشیر سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کو بیعت پر مجبور کر دیا اور بعد میں دوسرے حضرات نے بیعت کی۔

ہمارا مقصد حاشا و کلا یہ نہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق نہیں ہیں۔ آپ کی حقانیت خلافت ظاہرہ بھی ہمارا دین و ایمان ہے اور ہمارے نزدیک باطنی اور روحانی خلافت و امامت قیامت تک کے لیے آپ کو حاصل ہے اور کوئی ولی اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا اور اسے ارشاد و ہدایت کا حق نہیں ملتا جب تک بارگاہ مرتضوی سے اس کی منظوری نہ ہو بلکہ ہمارا کلام صرف اور صرف اس میں ہے کہ ادھر ادھر کی روایات کو سامنے رکھ کر اور ان کی حقیقت اور اصلیت معلوم کئے بغیر کسی ایسی ہستی کو طعن و تشنیع کا نشانہ نہیں بنانا چاہیے جن کی دیانت، نیک نیتی اور تقویٰ و پرہیزگاری اور اسلام و اہل اسلام کی ہمدردی اور خیر خواہی ظاہر ہو بلکہ قطعی ادلہ سے ثابت ہو۔

یہ اصحابہ کرام علیہ الرضوان کا حرب و قتال کا معاملہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ حق پرست تھے اور وہ حضرات غلط فہمی کا شکار بغیر خطا کے مرتکب لیکن خطا اجتہادی پر عذاب و عقاب اور اخروی مواخذہ نہیں ہوتا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ معاملہ لہذا اہل تشیع کی طرح نہ ہم ان کو کافر و منافق کہتے ہیں اور نہ فاسق و فاجر اور جہنمی بلکہ مرتکب خطا اور سابقہ خدمات اسلام اور بانی اسلام کی وجہ سے قابل عفو و لائق مغفرت جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا کفر من عنہم سیأتہم ولا دخلہم جہنات تجری من تحتہا الا نہار۔" الآیۃ

رسورہ آل عمران (پ) کہ میں ضرور بالضرور ان کے گناہ اور خطائیں ان سے دور کروں گا اور انہیں جہنم میں داخل کروں گا اور وہ ایسے خون ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہمارے

ماصور کو محفوظ رکھا لہذا ہم اپنی زبانوں کو ان کے ساتھ آلودہ کرنا جائز اور مناسب نہیں سمجھتے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ہم ان کے دلوں سے رنجش اور کدورت دور کر دیں گے۔ قال تعالیٰ: وَنُوعِنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرٍّ مُّقَابِلِينَ

تو ان ارشادات کے پیش نظر بارگاہ خداوندی اور حضرت رسالت پناہ اور حضرت علیؑ کی طرف سے ان سے مدد گزر ہو جائے گا اور ہم اپنی بدزبانی اور بدکلامی اور گستاخی و بے ادبی کی وجہ سے مقابلہ مواخذہ ٹھہریں گے۔ دیکھیے اہل جہل پر غلبہ حاصل ہونے کے بعد آپ نے سب سے مدد گزر کیا بلکہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کے ساتھ اسی احترام و اکرام کے ساتھ پیش آئے جیسے کہ قبل ازیں پیش آیا کرتے تھے اور اصحاب صفین کے ساتھ عظیم رِثائت قبول فرمائی اور انہیں برابر کی سطح پر رکھ لیا اگر وہ العیاذ باللہ اسلام و ایمان سے خارج ہو چکے تھے تو ثالثی فیصلہ پر رضامندی کا کیا مطلب؟ اور جنگ و جدال سے ہاتھ روکنے کا کیا محل و موقع تھا؟ اسی لیے اہل سنت کا موقف یہ ہے:

وَنَكَفَ عَنْ ذِكْرِ الصَّعَابَةِ لَا بِخَيْرٍ (شرح عقائد نسفی) کہ ہم ذکر صحابہ علیہم السلام سے کف لسان اور سکوت اختیار کریں گے مگر خیر اور بھلائی کے ساتھ اور ان کے معاملہ کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کریں گے اور یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے۔

”اقبلوا ذوی الہثیات عشر اثم فایعثر منہم عاثر الا وید اللہ بیدہ یرفعہ“

رنج مع شرح ابن میثم ص ۲۳۸ جلد خامس) بزرگ لوگوں کی لغزشوں اور خطاؤں سے مدد گزر کر دیکھو کہ ان میں سے جو بھی لغزش اور ٹھوکر کھاتا ہے اللہ تعالیٰ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اس کو اٹھاتا اور بلند فرماتا ہے۔

خطا، بزرگاں مگر فتن خطاست

نیز خدائے عادل کی بارگاہ میں میزان عدالت کے ذریعے ہی فیصلے ہوں گے تو ان حضرات صحابہ کرام علیہم السلام کی بھرتوں، راہِ خدا اور رضا رسول میں بیانیہ والی ایذاؤں اور جہاد و قتال اور عقائد صحیحہ و اعمالِ صالحہ کو کیونکر نظر انداز کر جائیگا۔ کہا قال تعالیٰ: فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ جو شخص بھی ذرہ سمیت کسی نیک عمل کی جائزہ لے گا۔ اس کی جزا اور ثواب ضرور پائے گا۔

مذہب شیعہ

از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

بارگاہ نبوی میں خلفائے ثلاثہ کا مقام اور شانِ قرب

کتاب معانی الاخبار ص ۱۱ مطبوعہ ایران مصنفہ ابن بابویہ قمی کا مطالعہ فرماویں
کیونکہ یہ کتاب بھی مذہب اہل تشیع میں مائتہ ناز ہے اور ان کے نزدیک بے حد معتبر۔
عن الحسن بن علی رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلم ان ابا بکر منی بمنزلة السمع وان عمر منی بمنزلة
البصر وان عثمان منی بمنزلة الفؤاد (وکنزانی تفسیر الامام الحسن العسکری)
یعنی امام عالی مقام سیدنا حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا کہ ابوبکر میرے لیے بمنزلہ میرے سمع مبارک یعنی کان کے ہیں اور عمر میرے لیے
بمنزلہ میری آنکھ کے ہیں (عمر میری آنکھ ہیں) اور عثمان بمنزلہ میرے دل کے ہیں یعنی
عثمان میرا دل ہیں اور اسی طرح امام حسن عسکری نے اپنی تفسیر میں ذکر کیا ہے۔
اب امام عالی مقام امام حسن رضی اللہ عنہ روایت فرماتے فرماتے والے بول
اور پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام ان مقدس اور منور ہستیوں کو اپنی سمع مبارک، بصر مقدس
اور دل منور کی منزلت بخشیں تو کیا ان مقدس ہستیوں کی شان اقدس میں سب و شتم
براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں سب و شتم نہیں اور کیا
ان کا ادب و احترام اور ان کی محبت براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کا ادب و احترام اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں؟ کچھ تو سوچیں
اور غور و فکر سے کام لیں۔ (رسالہ مذہب شیعہ ص ۶۹)

علامہ ڈھکوصاحب کا اظہارِ عجز۔

نوٹ۔ علامہ ڈھکوصاحب نے اس روایت کا بھی جواب نہیں دیا اور یوں کہ اس کو نظر انداز کیا ہے کہ گویا ”رسالہ مذہب شیعہ“ میں اس کا ذکر ہی نہیں تھا جس سے اس کی عاجزی اور بے بسی نمایاں اور واضح ہے۔ علامہ صاحب نے صرف اسی روایت اور حوالہ پر قلم اٹھایا جس کا کچھ نہ کچھ جواب بزعِ خویش دے سکتے تھے اور جن کا جواب نہیں آتا تھا ان کا نام ہی نہیں اور ذکر کرنا گوارا نہیں کیا۔ اگر رد لکھنے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر یہ تکلف کیوں کیا؟

تتمتہ بحث

از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

تحفہ حسینیہ

ارشاد نبوی میں تحریف کی سعی ناکام

روایت کا مقصودی حصہ تو آپ دیکھ چکے اور وجہ استدلال بھی ”اب ذرا شیعہ صاحبان کی اس روایت میں تحریف کی کوشش بھی ملاحظہ فرمادیں اور سبائی زہنیت کا مظاہرہ اور الولد سرلابیہ کا نمونہ بھی ملاحظہ فرمادیں۔“

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی طرف حضرت علی بن محمد بن علی رضی اللہ عنہ کے واسطے سے یہ منسوب کیا،

”قال فلما كان الغد دخلت إليه وعندة امير المؤمنين وابوبكر وعمر وعثمان فقلت له يا ابا عبد الله سمعتك تقول في اصحابك هؤلاء قولاً فها هو؟ فقال عليه السلام نعم ثم اشار بيده اليهم فقال هم السمع والبصر والفؤاد وسيسئلون عن ولاية وصي هذا واشار إلى علي بن ابي طالب صلوات الله عليه ثم قال ان الله يقول ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسئولا ثم قال

عليه السلام وعزة ربي ان جميع امتي لموقوفون يوم القيامة ومستولون عن ولايته
وذلك قول الله عز وجل "وقفوهم انهم مسئولون" (معاني الاخبار ص ۱۱)

جب دوسرا دن ہوا تو میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر
ہوا اور آپ کے پاس حضرت امیر المؤمنین اور حضرت ابو بکر اور فاروق اور عثمان
ذوالنورین رضی اللہ عنہم حاضر تھے میں نے عرض کیا میں نے آپ کو اپنے اصحاب
کے متعلق ایک بات کرتے ہوئے سنا وہ کیا ہے؟ تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
فرمایا ہاں۔ پھر ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا یہ سمع و بصر اور فواد میں یعنی کان، نگاہ
اور قلب و روح اور ان سے میرے اس وصی کے متعلق دریافت کیا جائے گا اور
حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ فرمایا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:
ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسئولا۔ بے شک کان آنکھ
اور دل سبھی سے اس کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ پھر فرمایا مجھے اپنے رب کی
عزت کی قسم قیامت کے دن میری ساری امت کھڑی کر دی جائے گی اور علیؑ کی
ولایت کے متعلق ان سے سوال کیا جائے گا اور یہ ہے قول اللہ تعالیٰ کا۔
انہیں روکو بے شک وہ سوال کئے جانے والے ہیں۔

فوائد روایت

- (۱) اس روایت میں دوبارہ ان تینوں حضرات کو علی الترتیب سمع و بصر اور قلب و
حکمر سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے تاکید اکید اور تائید و تقویت میں اضافہ ہو گیا۔
- (۲) ان حضرات پر قرآن مجید کی آیت چسپاں کر کے ان کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے لیے سمع و بصر اور قلب و حکم ہونا ثابت کیا گیا اور وہ بھی خود سرور عالم صلی اللہ
علیہ وسلم کی طرف سے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں اور حضرت علیؑ کی
شہادت کے ساتھ جس سے ان کی یہ شان گویا اللہ تعالیٰ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم
اور ائمہ کرام کے نزدیک بھی مسلم ہو گئی کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کان،

آنکھ اور دل مقدس ہیں۔

(۳) ان تینوں حضرات سے جمع ساری امت کے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں اللہ تعالیٰ لاکھوں اولیاء کے متعلق سوال کرے اور ان کے دور کی امت سے دریافت کرے مگر سوال یہ ہے کہ وہ جواب دے سکیں گے یا نہیں تو شیعہ صاحبان جبکہ حق میں یہ فضیلت ثابت نہیں کہ وہ سمیع نبوت اور بصیر رسالت ہیں اور قلب محبوب ہے۔ اگر وہ اس منقبت اور فضیلت سے محروم ہو کر صحیح جواب دے سکیں گے تو جو اس فضیلت اور شان امتیازی کے مالک ہیں وہ کیوں جواب نہیں دے سکیں گے اور وہ ولایت جس کو نبوت و رسالت اور محبوب خدا کے سمیع و بصیر اور قلب پہچان نہ سکیں ہم اس کو ولایت تسلیم ہی نہیں کر سکتے اگر ولایت برحق ہے تو ان کی طرف سے اس کی پہچان اور اس کا جواب بھی برحق ہو گا اور پہچان اور بیان صحیح نہیں ہو گا تو ولایت ہی صحیح نہیں ہوگی البتہ باللہ۔ کیونکہ نبوت و رسالت کی آنکھ اور دل اور اس کی سمیع مبارک سے بڑھ کر حقائق شناس اور حقائق کا ترجمان کون ہو سکتا ہے۔ لہذا ان مقدس ہستیوں کی شان گھٹانے اور اس روایت میں تحریف کرنے کی سعی اور کوشش بجز اللہ ناکام ہوگئی بلکہ ان کی شان مزید قوت اور صحت کے ساتھ واضح اور ثابت ہوگئی۔ اور ہماری کتابوں میں بھی شیخین رضی اللہ عنہ کے متعلق موجود ہے ”ہذان السمع والبصر“ یہ دونوں میرے کان اور آنکھ ہیں مشکوٰۃ شریف باب فضائل صحابہ رضی اللہ عنہم۔ لہذا ان دونوں حضرات کے حق میں دونوں مذہبوں کی روایتیں اس منقبت کے بیان میں متفق ہو گئیں اور شیعہ مذہب کی روایت سے مزید فائدہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شان اقدس کا بھی حاصل ہو گیا والحمد للہ۔

تنبیہ: جب بندہ مقام محبوبیت پر فائز ہوتا ہے اور نوافل اور فرض کی وجہ سے اس کو فنا صفائی اور فنا ذاتی حاصل ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے متعلق فرماتے ہیں کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ وفودا الذی یعقل بہ۔

یعنی میں اس بندے کے کان ہوتا ہوں جن سے سنتا ہے اور آنکھیں جن سے دیکھتا ہے اور دل جس سے سوچتا اور علم حاصل کرتا ہے اور اسی طرح ہاتھوں، پاؤں اور زبان کے متعلق بھی فرمایا گیا الغرض جب عابد اور زاہد اس مقام پر فائز ہو جاتا ہے تو سید المرسل اور امام المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مقام پر فائز ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔ بلکہ آپ کی اس وصف محبوبیت میں اصالت اور دوسروں کی تبعیت میں اور آپ کے براہ راست اللہ تعالیٰ کے ان مخصوص انوار کا منظر ہونے اور دوسروں پر آپ کے عکس اور پرتو انوار کا فیضان ہونے میں کس کو شک شبہ ہو سکتا ہے اب اس عظیم شان واسے سمع و بصر اور قلب کو اس فرمان کی رو سے ان خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں موجود و متحقق دیکھ کر اور یقین کر کے بتلاؤ کہ انوار قرب اور پرتو فیوض محبوبیت کا جو ظہور یہاں پر ثابت ہو رہا ہے کیا دوسری جگہ اس شان سے ان کے ثبوت و تحقق کا کوئی امکان ہو سکتا ہے۔ مگر ۷

آنکھ والا تیرے جو بن کا تماشا دیکھے دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

اب ان جو اس نبوت کے متعلق کون سوچ سکتا ہے کہ ان کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان ولایت کی صحیح پہچان نہ ہوگی ہاں ہاں صحیح پہچان وہی ہے جو ان حضرات کے عمل اور قول سے ثابت ہے اور جو افراط و تفریط میں مبتلا اور بدعت و ثناء میں غلو یا بغض و عناد میں غلو کے شکار لوگوں نے بیان کی ہے وہ قطعاً درست نہیں ہو سکتی ہے بلکہ افراط و تفریط میں مبتلا لوگ خود حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے فرمان کے مطابق ہلاکت اور تباہی کے گڑھے میں گرنے والے ہیں

کیا قال سیہلک فی صنفان محب مفرط و مبغض و مفرط۔

مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ

» حضرت ابو بکر صدیق کی شان اقدس اور امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کا بیان چونکہ اہل تشیع ائمہ طاہرین کی اس قسم کی تصریحات کو دیکھ کر ہمیشہ سرے سے انکار کے عادی ہیں۔ اور پھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ ائمہ طاہرین سے

یہ روایت ثابت نہیں اس لیے امام عالی مقام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی روایت بھی فقط بلفظ لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب بھی امام صاحب کی اپنی تفسیر یعنی تفسیر حسن عسکری مطبوعہ ایران ۱۱۶۴ھ ۱۷۵۱ء۔

هذا وصية رسول الله صلى الله عليه وسلم لكل اصحابه وامته حين صار الى الغار ان الله تعالى اوصى اليه يا محمد ان العلى الاعلى يقرئك السلام ويقول لك ان ابا جهل والملا من قریش وبروا عليك يريدون قتلك وامران تبیت عليا وقال لك منزلته منزلة اسحاق الذبيح ابن ابراهيم الخليل يجعل نفسه لنفسك فداء وروحك لروحك وقاء وامرك ان تستصحب ابا بكر فانه ان انسك واسعدك وازرك وثبت على ما يتعهد ويعاقدك كان في الجنة من رفقاتك وفي غرفاتها من خلصائك فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم لعلي ارضيت ان اطلب فلا اوجد وتطلب فتوجد قلعله ان يبادر اليك الجبهال فيقتلوك قال بلى يا رسول الله صلى الله عليه وسلم رضيت ان يكون روحي لروحك وقاء ونفسي لنفسك فداء بل رضيت ان يكون روحي نفسي فداء لك او قريب منك او بعض الحيوانات تمنعها وهل احب الحيوة الا لتصرف بين امرك ونهيك ونصرة اصفياءك ومجاهدة اعدائك ولولا ذلك لما احب ان اعيش في الدنيا ساعة واحدة فقيل رسول الله صلى الله عليه وسلم رأسه فقال له يا ابا الحسن قد قرأ على كلامك هذا المولود باللوم المحفوظ وقرأ على ما اعد الله لك من ثوابه في دار القرار ما لم يسمع بمثله السامعون ولا رأى بمثله الراؤون ولا خطر بهال المفكرين ثم قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يكر ارضيت ان تكون معي يا ابا بكر تطلب كما اطلب وتعرف بانك انت الذي تحصلني على ما ادعيه

فتحمل عنى انواع العذاب قال ابوبكر يا رسول الله اما انا لو عشت
عمر الدنيا عذب فى جميعها اشد عذاب لا ينزل على موت مريع
ولا فرح مريع وكان ذلك فى محبتك لكان ذلك احب الى من ان
اتنعم فيها وانا۔

ممالك ملوكها فى مخالفتك وهل انا ومالى وولدى الا ذاك فقال
رسول الله صلى الله عليه وسلم لا جرم ان اطلع الله على قلبك ووجده
موافقا لما جرى على لسانك جعلك منى بمنزلة السمع والبصر والرأس
من الجسد وبمنزلة الروح من البدن كعلى الذى هو منى كذلك۔ الخ

یعنی جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہجرت کے موقع پر غار کی طرف تشریف
فرما ہوئے تو اپنے صحابہ اور اپنی امت کو یہ وصیت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف
جبریل علیہ السلام کو بھیج کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ پر رصلاۃ سلام بھیجتا ہے۔ اور فرماتا
ہے کہ ابو جہل اور کفار قریش نے آپ کے خلاف منصوبہ تیار کر لیا ہے اور آپ کے
قتل کرنے کا ارادہ کر چکے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ آپ علی المرتضیٰ کو اپنے بستر پر شب
باشی کا حکم دیں اور فرمایا ہے کہ ان کا مرتبہ آپ کے نزدیک ایسا ہے جیسا اسحاق
ذبیح کا مرتبہ تھا حالانکہ ذبیح حضرت اسماعیل ہیں مگر اہل کتاب اسحاق کو ذبیح کہتے
ہیں، حضرت علی اپنی زندگی اور روح کو تیری ذات مقدس پر فدا اور قربان
کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ ہجرت میں ابوبکر صدیق کو اپنا
ساتھی مقرر فرمائیں کیونکہ اگر وہ حضور کی رفاقت اختیار کر لیں اور حضور کے عہد و
پیمان پر پختہ کار ہو کر ساتھ دیں تو آپ کے رفقاء جنت میں سب ہوں گے اور جنت کی
نعمتوں میں آپ کے مختصین سے ہوں گے پس حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے حضرت علی کو فرمایا کہ اے علی اس بات پر راضی ہیں کہ میں طلب کیا جاؤں تو دشمن کو
نہ مل سکوں اور تم طلب کئے جاؤ تو مل جاؤ اور شاید جلدی میں تیری طرف پہنچ کر
بے خبر لوگ تجھے رشہ میں قتل کر دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ

میں راضی ہوں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہ میری روح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روح مقدس کا بچاؤ ہوا اور میری زندگی حضور کی زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی مقدس پر فدا ہو بلکہ میں اس پر بھی راضی ہوں کہ میری روح اور میری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی (رفیق) پر اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض حیوانات پر قربان اور فدا ہو۔ حضور میرا امتحان ہے۔ میں زندگی کو پسند ہی اس لیے کرتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی تبلیغ کروں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کی حمایت کروں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے خلاف جنگ کروں۔ اگر یہ نیت نہ ہوتی تو میں دنیا میں ایک ساعت بھی زندگی پسند نہ کرتا پس حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سر مبارک کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ اے ابوالحسن تیری یہی تقریر مجھے توح محفوظ کے موکلین ملائکہ نے (روح محفوظ) سے پڑھ کر سنانی ہے۔ اور جو تیری اس تقریر کا ثواب اور بدلہ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں تیرے لیے تیار فرمایا ہے وہ بھی پڑھ کر سنایا ہے وہ ثواب جس کی مثل نہ سننے والوں نے سنی ہے نہ دیکھنے والوں نے دیکھی ہے نہ ہی عقلمند انسانوں کے دماغ میں آسکتی ہے پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ اے ابابکر تو میرے ہمراہ چلنے کے لیے تیار ہے تو بھی اسی طرح تلاش اور طلب کیا جائے گا جیسا میں اور تیرے متعلق دشمنوں کو یہ یقین ہو جائے کہ تو ہی نے مجھے ہجرت کرنے اور دشمنوں کے مکر اور فریب سے بچ کر نکلنے پر آمادہ کیا ہے تو میری وجہ سے ہر قسم کی مصیبت اور دکھ برداشت کرے؟ صدیق اکبر نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر میں قیامت تک زندہ رہوں اور اس زندگی میں سخت ترین عذاب و دکھ اور مصائب میں مبتلا رہوں جس مصیبت و الم سے نہ مجھے موت بچانے کے لیے آسکے اور نہ کوئی دوسرا سبب آرام دے سکے اور یہ سب کچھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ہو تو مجھے بطیب خاطر منظور ہے اور مجھے یہ پسند نہیں کہ اتنی لمبی زندگی

ہوا اور دنیا کے بادشاہوں کا بادشاہ بن کر رہوں اور تمام نعمتیں اور آسائشیں حاصل ہوں، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت محضی ہو اور میں اور میرا مال شہر و سرکائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر قدا اور قربان ہے پس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہے۔ اور جو کچھ تو نے کہا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو تیری دلی کیفیت اور وجدان کے مطابق پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تجھے بمنزلہ میرے گوش مبارک اور بمنزلہ میری آنکھوں کے کیا ہے اور جو نسبت سر کو جسم سے ہے اللہ تعالیٰ نے تجھے اس طرح بنایا ہے اور جس طرح روح کی نسبت بدن سے ہے میرے لیے تو اسی طرح ہے جیسا کہ علی رضی اللہ عنہ میرے نزدیک ہیں۔ اگرچہ اس روایت میں فضیلت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ و دائرہ روشن سے بھی زیادہ روشن اور واضح ثابت ہے مگر اہل تشیع نے تصرف اور تحریف فی الروایات کی عادت یہاں بھی نہیں چھوڑی۔

اول یہ کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہے جب فرمایا گیا تو حرف شرط کے ساتھ یعنی اگر وہ حضرت اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اعانت و مساعدت پر کمر بستہ ہو جائیں تو وہ دنیا اور آخرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق ہیں۔ یہاں جب اللہ تعالیٰ بھی دلی کیفیات اور حالات پر مطلع ہے اور آپ نے حضرت صدیق نے حسب علم الہی وہی کچھ عرض کی جس کی وجہ سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزدیک بمنزلہ سمع مبارک و چشم مبارک اور روح مقدس ثابت ہوئے تو پھر شرطیہ جملہ صاف تحریف و تصرف فی الروایات پر دلالت کر رہا ہے۔ جو قلبی غل و غشش پر مبنی ہے۔

دوسرا روایت کے آخر میں یہ جملہ کہ و علی فوق ذلك لزيادة فضائله و شرف خصاله یعنی علی رضی اللہ عنہ۔ اس سے زیادہ ہیں کیونکہ ان کے فضائل اور شرف خصال زیادہ ہیں۔ اسے سمع و بصر اور اس و روح نبوت پناہ سے کون سی زیادتی متصور ہے۔

بہر صورت اہل تشیع کی معتبر ترین کتب بھی خلفائے راشدین کے فضائل و علو مرتبت کو اپنے اوراق میں جگہ دینے پر عجیب و غریب نظر آتے ہیں و الحسن مآشہدات بہ الاعداً ائمہ ظاہرین کے افادات کو ہر جیلے سے رد و بدل کرنے اور توڑنے موڑنے و تصرفات کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر خلفاء راشدین کی شان کو آنچ نہ آئی۔

تنزیہ الامامیہ از علامہ محمد حسین ڈھکو صاحب

امام حسن عسکری کی تفسیر سے منقول اس طویل و عریض روایت سے پیر صاحب کی تائید کی بجائے تردید ہوتی ہے۔ اس روایت میں صرف دو جملے ایسے ہیں کہ جن سے بظاہر مؤلف کی مطلب برآری ہوتی ہے لیکن اگر ذرا غور کیا جائے تو اس سے ان کے دعویٰ پر ضرب کاری پڑتی ہے۔

پہلا جملہ: امرک ان تستصحب ابابکر فانہ ان انسک واسعدک و ازک وثبت علی مایتعاہدک و یعاقدک الخ اور تمہیں حکم دیا ہے کہ ابو بکر کو آپ ہجرت میں ساتھ رکھیں۔ اگر وہ حضور کی رفاقت اختیار کر لیں الخ اور باب عقل و دانش فرمادیں اس مشروطی کلام میں پیر صاحب کے چہیتے خلیفہ کی کونسی مدح و ثنا کی گئی ہے۔ بلکہ اس سے تو سر اسر خلیفہ صاحب کی قدح ظاہر ہوتی ہے۔ اور ان کے ایمان و ایتقان، ان کی نصرت و اعانت اور عہد و پیمان پر بقاء و ثبات کو بالکل مشکوک و مشتبہ کر دیا گیا ہے۔ اور اس روایت میں ان صفات جمیدہ کے ابو بکر صاحب کے اندر پائے جانے کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں ہے بلکہ بطور جملہ شرطیہ مذکور ہے اور بموجب اذافہ الشرطیات المشروط جناب ابو بکر میں ان صفات کا نہ پایا جانا اہل علم و انصاف کے لیے اظہر من الشمس ہے۔ اگر ان میں یہ شرائط پائے جاتے تو پھر یہ اگر مگر کی تکرار نہ ہوتی۔

دوسرا جملہ: ان اطلع اللہ علی قلبک و وحیدہ موافقا لما جری علی لسانک الخ ہے اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ اگر خداوند عالم تیری دلی کیفیت پر مطلع ہوا اور اسے

تیرے زبانی اظہار عقیدت کے موافق پایا تو تجھے بمنزلہ میرے کان آنکھ، سر اور روح کے قرار دے گا۔ جس طرح حضرت علی کو مجھ سے ہی منزلت حاصل ہے۔

اس جملہ میں بھی مثل سابق حرف شرطان موجود ہے۔ جس سے خلیفہ صاحب کی وفاداری اور اظہار ارادت و عقیدت مستتبہ اور مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔
(۳) اس جملے کا یہ ترجمہ کہنا یقیناً اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہے مترجم کی جہالت یا تجاہل کی کھلم کھلا دلیل ہے۔ ورنہ ان حرف تحقیق اور ان حرف شرط میں جو نمایاں فرق ہے وہ مبتدی طلبہ بھی جانتے ہیں۔

(۴) تفسیر امام حسن عسکری کی نسبت کی صحت میں ہمیشہ علماء کرام کے درمیان اختلاف رہا ہے محققین کی تحقیق یہ ہے کہ یہ نسبت صحیح نہیں ہے لہذا جب تک اس کتاب کے مندرجات کی دوسری روایات معتمدہ سے تائید نہ ہو جائے اس وقت تک قابل اعتبار نہیں۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۲۹ تا ۱۳۱

تحفہ حسینیہ از محمد اشرف السیالوی غفرلہ

علامہ صاحب موصوف نے ابلیس کو خوش کرنے کے لیے پوری کوشش صرف کی ہے اور مقبولان بارگاہ خداوند تعالیٰ اور محبوبان بارگاہ رسالت و آباء اور ولایت چاہ کی نشان اقدس جہاں سے بھی ثابت ہوتی نظر آئے اپنی امکانی کوشش کے ذریعے اس کو مسخ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور انہی ناپاک کوششوں میں سے ایک یہ بھی ہے ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دشمنی اپنی جگہ مگر دشمن بھی خاندانی ہو تو اس کی دشمنی بھی کسی منابطہ اور اخلاقی تقاضوں کے تحت ہوا کرتی ہے۔ لیکن کینہ دشمن ہو تو وہ دشمنی میں کسی منابطہ اخلاق اور اصول پرستی سے کام نہیں لیتا۔ بد قسمتی سے ڈھکوسل صاحب بھی صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ہی دشمنوں میں سے ہیں۔

اب ذرا علمی لحاظ سے اس جوابی کوشش کا تجزیہ پیش کرتا ہوں اور رباب

عقل و دانش کو دعوتِ غور و فکر دیتا ہوں کہ وہ اس پس منظر میں میری سابقہ گزارش کا جائزہ لیں۔ ڈھکوصاحب نے چار سوال یہاں اٹھائے ہیں ایک کا تعلق حضرت شیخ الاسلام کی ذات سے ہے اور تین کا تعلق روایت اور اس سے استدلال کرنے کے ساتھ ہے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ اور محبوب اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اعتقاد

پہلا سوال: یہ جملہ شرطیہ ہے اور شرطی کلام میں حضرت ابو بکر صدیق کے لیے کوئی وجہ فضیلت ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ لائقِ قدح اور اعتراف ہے اور مشروط خوبیاں ان میں مشکوک اور مشتبہ ہو کر رہ گئی ہیں بلکہ اہل علم اور انصاف کے نزدیک وہ خوبیاں نہیں پائی گئیں اور جب شرط نہ پائی گئی تو مشروط بھی نہ پایا گیا لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ قصیدہ شرطیہ سے آپ کی خوبیاں مشکوک کیونکر ہوئیں۔

۱) کیا اللہ تعالیٰ نے جو انہیں ساتھ رکھنے اور رفیق سفر بنانے کا حکم دے دیا وہ بھی مشروط تھا قطعاً نہیں اور جب وہ حکم مشروط نہیں تھا تو واضح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک آپ میں یہ شرائط موجود اور متحقق تھے ورنہ اتنے طویل اور انتہائی خطرناک سفر میں ایسے شخص کو ساتھ ہی بنانے کا حکم کیونکر دیا جاسکتا تھا جو نہ مونس و غمخوار ہو اور نہ ہمدرد و معاون ہو۔ اللہ تعالیٰ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محبوب جس کو ساتھ رکھنے کا حکم دے رہا ہے یقیناً وہ ان سب اوصاف کے ساتھ موصوف سے ورنہ یہ محبت کا تقاضا نہ ہوا بلکہ مزید آپ کو پریشانی میں مبتلا کرنے والا معاملہ ہو گیا۔ ایک تو وطن، گھر بار اور کعبہ معظمہ جیسی جگہ سے دوری دوسرا ایسا ساتھ رکھنے کا حکم جو کسی بھی وقت عہد شکنی کے جان لیوا بن سکتا ہو۔ نعوذ باللہ۔ بلکہ اس حکم کے بعد یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا رفیق عطا فرمایا جو مکمل طور پر سامانِ راحت و تسکین مہیا کرنے والا تھا۔ اور اس کی رفاقت میں ہر غم و اندوہ اور بوجہ اور گرانی کا فورہ ہو جانے والی تھی۔

۲۔ عملی طور پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو رفیق سفر بنایا اور سائے تین سو میل کا طویل اور کٹھن سفر طے کیا اس دوران سواریاں مہیا کرنے والا کون تھا؟ خورد و نوش کا سامان مہیا کرنے والا کون تھا؟ اور دشمنوں کی دیکھ بھال اور تاک اور تار رکھنے والا کون تھا؟ دو مہینے کے قریب وقت اس سفر میں صرف ہوا بمع غار والے وقت کے اس سارے عرصے میں ہر ممکنہ خدمت کرنے والا سوائے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کوئی نہیں تھا تو حقائق اور واقعات نے شرط کا تحقق واضح کر دیا کہ آپ نے حق مؤانتہ بھی ادا کیا اور تعاون و امداد کی بھی ہر امکانی کوشش کی اور عہد وفا اور پیمان اخلاص کو پوری طرح بنھایا لہذا مشروط اور جزاء کا تحقق یعنی جنت میں بھی آپ کا رفیق ہونا اور اس کے بالا خانوں میں آپ کے مخلص صحابہ اور امتیوں میں سے ہونا بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا ڈھکوسل صاحب کی مثال ایسے ہی ہے جیسے انہیں کہا جائے اگر سورج طلوع ہو گیا تو دن ہو جائے گا اور وہ کہتے ہیں یہاں تو دن ہونے کو مشروط کر دیا گیا ہے طلوع آفتاب سے لہذا دن ہونے کا کوئی یقین نہیں کیونکہ ان شرطیہ ہے۔ دوسرا آنکھ والا شخص آئے اور کہے علامہ صاحب صرف ان کو ہی نہ دیکھتے رہو عین شمس کو بھی دیکھ لو وہ عیان ہے اور دیکھو سارا جہان روشن ہے مگر وہ کہتے ہیں نہیں نہیں کتاب میں اور قول میں ان شرطیہ ہے لہذا سورج طلوع ہونے کا معاملہ بھی مشکوک ہے اور دن موجود ہونے کا بھی اگر دن موجود ہوتا تو پھر اگر مگر کی ضرورت کیا تھی۔

صدق شرطیہ کا دار و مدار اور نتیجہ کا معیار

۳۔ جو امور بطور قضا یا شرطیہ ذکر کئے جائیں ان میں شرط و مقدم کے تحقق سے جزاء اور تالی کا تحقق معلوم کر لیا جاتا ہے۔ یا مشروط اور تالی کے عدم اور انتفاء سے مقدم اور شرط کا انتفاء معلوم کر لیا جاتا ہے۔ نہ کہ ان کا معاملہ ہمیشہ معلق اور مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ جاتا ہے لہذا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ہجرت کے دوران

موانست اور امداد و معاونت اور تائید و تقویت اور آپ کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق جنت ہونے میں تلازم ثابت اور مشاہدہ اور حسن سے حضرت صدیق کی وفاء شرط ثابت لہذا جزاء بھی قطعی اور حتمی طور پر ثابت۔ اس مقام پر ڈھکوصاحب کا یہ کہہ دینا کہ ارباب علم اور انصاف کے نزدیک ابوبکر صاحب میں ان صفات کا نہ پایا جانا اظہر من الشمس ہے ایک ایسا دعویٰ ہے جس کو کوئی شخص بقائمی ہوش و حواس زبان پر نہیں لاسکتا بلکہ آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کا اندھا ہی اس قسم کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ ڈھکوصاحب کو بتلانا چاہیے کہ کونسی بے وقائی ابوبکر صدیق نے کی اور کس جگہ امداد و تعاون کو ترک کیا اور کہاں سامان انس و محبت لوٹ لیا محل نزاع میں بدعت کا دعویٰ کرنا پھر اہل علم کہلانا اور مناظر اعظم ہونے بلکہ مجتہد اور محبت اسلام ہونے کا دعویٰ کرنا ہے

بسوخت عقل ز حیرت کہ اس چہ بوا بعجبی است

ہر طالب علم اس حقیقت سے باخبر ہے کہ اختلافی مسئلہ نظری ہوتا ہے اور وہاں دعویٰ بدعت باطل ہوتا ہے۔

(۴) بیوی، بچیوں اور بچوں کو اہل مکہ کے پاس چھوڑ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جانے والا ابوبکر صدیق دیکھ رہا تھا کہ میری اولاد اور عزت کے لیے کیا کیا خطرات ہیں اور خود میرے لیے کیا کیا خطرات ہیں جن کی طرف خود سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی توجہ دلائی کہ جس طرح ہمیں طلب کیا جائے گا تمہیں طلب کیا جائے گا بلکہ یہ سمجھا جائے گا کہ ان کو نبوت کا دعویٰ کرنے پر اگر آمادہ اور براہِ نگیختہ کیا ہے تو ابوبکر صدیق نے اور تمہیں میری وجہ سے انواع و اقسام کی تکالیف برداشت کرنا پڑیں گی۔ لہذا سوچ لو اور اچھی طرح غور و فکر کرو جس کے جواب میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ میں قیامت تک زندہ رہوں اور ہر عذاب اور مصیبت مجھ پر ٹوٹ پڑے نہ موت آئے تاکہ راحت ملے اور نہ فرحت و سرور کی کوئی ساعت نصیب ہو جس سے غموں کی نہ ختم ہونے والی سیاہ رات میں مسرت کی کوئی جھلک

نظر آسکے مگر بایں ہمہ ہوا تمہاری محبت میں تو یہ زندگی مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میں قیامت تک زندہ رہوں اور ہر نعمت مجھے عیسر اور حاصل ہو اور میں دنیا کے بادشاہوں کا بادشاہ ہوں لیکن آپ کی معیت اور رفاقت نصیب نہ ہو اور نہ محبت و عشق میں خود میری اولاد اور میرا مال سب آپ پر قربان ہونے کے لیے ہی تو ہیں کیا ان حالات میں اس عمل اور اس اقرار و اعتراف اور اظہار و اعلان کے بعد بھی کوئی عقل سے بہرہ و انصاف کی دولت سے مشرف شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ ایسا فدائی اور جانثاران شرائط پر پورا نہیں اترتا تھا۔

یہ تو ہو سکتا تھا کہ محبت و عقیدت اور ایمان و اخلاص کے باوجود حالات کی سنگینی کے تحت ابو بکر صدیق معذرت کر لیتے اور رخصت و اجازت لے لیتے اور اعلیٰ درجہ کے فدائیوں کا کردار ادا نہ کر سکتے لیکن العیاذ باللہ ایمان اور اخلاص بھی نہ رکھتے ہوں اور محبت و الفت بھی نہ ہو مگر بلا وجہ اہل مکہ کو اور قریش کو اپنا بھی دشمن بنالیں اور اپنی بیوی بچیوں کا بھی خیال نہ رکھیں کسی عقل مند اور صاحب انصاف کا عقل و انصاف اس کو جائز نہیں رکھ سکتا آخر ایسے مؤمن بھی تھے جنہوں نے ہجرت بھی نہ کی تھی جن کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **الذین ارضوا اللہ واسعة فتها جروا فیہا۔** کیا تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی زمین یعنی مدینہ منورہ میں گنجائش نہ تھی کہ تم بھی ہجرت کر کے اس میں جا بیٹے تو اگر ابو بکر صدیق سرایا اخلاص اور محبت و فائز ہوتے اور ان کا سارا گھرانہ شمع رسالت کا پرہ و اندہ نہ ہوتا تو سفر ہجرت کی رفاقت کیونکر ممکن ہوتی۔

(۵) آئیے ذرا ناسخ التواریخ سے اس واقعہ ہجرت کی ایک دو جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں تاکہ وفادار عہد اور پیمان اخلاص کی تکمیل کا قدرے اندازہ ہو سکے اور وہ وہ بھی دشمن صدیق کی زبان سے قلم سے۔

(۱) حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کی گرمی میں طیلسان سراقہ پر رکھے ابو بکر صدیق کے ہاں تشریف لائے اور فرمایا: گھر کو اپنوں اور بیگانوں سے خالی

کراد تو ابو بکر صدیق نے عرض کیا۔ بانی امت و امی یا رسول اللہ در خانہ جہنم
و دود ختر من کہ یکے از آہنا نیز اہل قست کس نے باشد آنحضرت فرمود خداوند
باری مرا اذن ہجرت داد ابو بکر گفت الصحبۃ یا رسول اللہ یعنی میخوایم مصاحب
تو باشیم آنحضرت فرمود چہنیں باشد ابو بکر از شادی بگریست ص ۳۱ ناخ اتوایح
جلد اول کتاب دوم۔

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں گھر میں میرے علاوہ اور میری دو بچیوں کے
علاوہ کوئی فرد نہیں اور ان بچیوں میں سے ایک آپ کی بیوی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے فرمایا خدا تعالیٰ نے مجھے ہجرت کی اجازت دے دی ہے۔ حضرت ابو بکر
نے عرض کیا میں آپ کی مصاحبت اور رفاقت کا طلب گار ہوں آپ نے فرمایا ایسے
ہی ہو گا یہ سن کر حضرت ابو بکر کے خوشی سے آنسو جھلک پڑے جس سے صاف ظاہر
ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو ابو بکر صدیق کی ذات پر مکمل اعتماد اور اعتبار
تھا اور وہ گویا اسی انتظار میں تھے لہذا مژدہ سنانے کے لیے آپ خود تشریف
لے گئے اور شرف رفاقت کا مژدہ سن کر حضرت صدیق کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔
(۲) صاحب منہج الصادقین کہتا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت پر ابو بکر صدیق
کے گھر سے ہی روانہ ہوئے یعنی بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلا یا اور خود
حضرت صدیق اکبر کے گھر پر ٹھہرے اور پچھلی رات کو قوتال سے غار ثور کی طرف
روانہ ہوئے۔ امیر المؤمنین را بر جاسے خود بخوابانید و خزانہ ابو بکر بر رفاقت او
بیروں آمدہ بدال غار توجہ نمود ص ۶۰ جلد چہارم)

مفسر شیعہ فتح اللہ کاشانی کے اس اعتراض کے بعد بھی چون و چرا کی کوئی گنجائش
ہو سکتی ہے؟

(۳) حضرت مجاہد سے مروی ہے کہ تین دن رات غار میں ہی قیام رہا اور عروہ کہتے
ہیں کہ ابو بکر کے غلام عامر بن فہیرہ بھیڑ بکریوں کو غار کے دروازے پر سے جاتے
اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ان کا دودھ نوش

قراتے۔ اور قنادہ کہتے ہیں کہ عبدالرحمن بن ابی بکر صبح اور شام خفیہ طور پر آتے اور دونوں حضرات کے لیے کھانا لے جاتے تفسیر منہج الصادقین جلد چہارم ص ۲۶۱۔

(۴) پہلا کھانا جو تیار کر کے ان راہروان منزل شوق کو دیا گیا وہ ابو بکر صدیق کی محنت جگر حضرت اسماء نے تیار کیا اور کمر بند چاڑھ کر اس کے ایک حصہ کو بطور تبرک استعمال کیا اور اس میں وہ کھانا باندھا جبکہ دوسرا حصہ بطور کمر بند باندھا انہیں رو با اسماء ذات النطاقین ملقب گشت اسی وجہ سے آپ کا لقب ذات النطاقین یعنی دو کمر بند والی پڑ گیا و عبداللہ بن ابی بکر را فرمود روز در میان کفار زیستن کند و شبانگاہ خبر کفار را با ایشان بفار تور بردن اسخ ص ۳۴ اور عبداللہ بن ابی بکر کو حکم دیا کہ دن کا وقت کفار کے ہاں گزارا کریں اور شام کے وقت ان کی خبریں پہنچا لیں۔

(۵) ابو بکرؓ ہجزار درم در خانہ ذخیرہ داشت با خود حمل نمود گھر میں پانچ ہزار درہم کا ذخیرہ تھا وہ بھی سارے کا سارا ذخیرہ اپنے ساتھ لے لیا اور جب حضرت ابو قحافہ کو ہجرت کا علم ہوا اور درہم کے متعلق گمان کیا کہ سبھی اپنے ہمراہ لے گئے ہیں تو افسوس کا اظہار کیا کہ ابو بکرؓ شمارا در سختی گذاشت و آنچه داشت با خود ہمراہ برد۔ ابو بکرؓ تمہیں مشقت اور تنگدستی کی حالت میں چھوڑ گیا ہے اور جو کچھ اپنے پاس رکھا تھا وہ بھی ساتھ ہی لے گیا تو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے چند ٹھیکہ یاں کپڑوں میں لپیٹ کر ان کے سامنے رکھ کر ان کا ہاتھ اوپر رکھا کیونکہ ان کی بینائی جا چکی تھی اور کہا دیکھو گھر میں دینار و درہم موجود ہیں۔ این درست کہ ابو بکرؓ نے ما نہادہ است ابو قحافہ باور داشت۔ ناسخ جلد اول ص ۳۸۔

(۶) ابو جہل لعین جب حقیقت حال پر مطلع ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاتھوں سے لکل گئے تو سیدھا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دولت کدہ پر پہنچا اور اپنا جتنا بھی ہمراہ تھا۔ حضرت اسماء سے دریافت کیا کہ اس کا کیا حال ہے اس نے کہا اس وقت میں نمیدانم طمانچہ سخت بر روئے اوزد کہ گوشوارش بیضا دوان انما بگذشت تیرے باپ کدھر ہیں تو انہوں نے کہا میں نہیں جانتی اس نے زور وار طمانچہ ان کے چہرے پر مارا جس سے ان کے کان

چرگئے اور بانیاں گر گئیں اور پھر وہاں سے چلا گیا۔

(۴) غار سے نکل کر عازم مدینہ ہوئے تو ایک اونٹ پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر صدیق سوار ہوئے اور دوسرے پر عامر بن فہیرہ اور عبداللہ بن اریق سوار ہوئے اور راہ میں ابو بکر صدیق کے واقف لوگ ملتے۔ کیونکہ آپ اسی راستہ سے شام کی طرف بغرض تجارت جایا کرتے تھے تو وہ دریافت کرتے من معک تمہارے ساتھ کون ہیں۔ تو آپ فرماتے رجل یمدینی السبیل یعنی این مرد دلیل راہ ماست و شنودہ چنان گماں میگرد کہ قصد اوراہ مدینہ است ناسخ جلد اول ص ۳۸۔ یہ وہ شخص ہیں جو مجھے راہ دکھلاتے ہیں اور سننے والا یہ سمجھتا کہ راستہ سے آپ کی مراد مدینہ کا راستہ ہے۔ یہ شخص واقف ہیں اور ابو بکر اس راہ سے واقف نہیں ہیں جبکہ آپ کا مقصد حقیقی اللہ کی راہ ہوتا تھا یہ وہ ہستی ہے جو مجھے اللہ تعالیٰ کا راستہ دکھلانے والی ہے۔

الغرض ان واقعات سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے اس دعویٰ کی عملی دلیل اور واقعی شہادت مل جاتی ہے جس میں آپ نے کہا تھا "ہل انا و مالی و ولدی الا فداؤنی یا رسول اللہ میں خود میرا مال اور میری اولاد سب آپ پر فدا اور قربان ہیں اور یاد رہے صاحب ناسخ نے تصریح کی ہے کہ میں نے ہجرت کے متعلق جو روایات نقل کی ہیں یا آئندہ کہوں گا وہ شیعہ و سنی دونوں فریق کی متفق علیہ ہیں اور کہیں اختلاف ہوگا تو میں اپنا نظریہ واضح کر دوں گا۔ ملاحظہ ہو ص ۳۵ جلد اول۔

الغرض اس سفر کی پوری تفصیلات کتب سیر اور توارخ میں موجود ہیں یہاں صرف نمونہ کے طور پر چند عبارات مختصر عرض کی ہیں تاکہ چشم بینا اور عقل سلیم پر واضح ہو جائے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شرائط موافقت و موافقت و تعاون اور اطاعت و خدمت گزاری کی انتہا درجہ رعایت فرمائی اور ان کو کما حقہ افرمایا جب شرائط کا موجود ہونا واقعات اور مشاہدات اور عقل سلیم کی شہادت اور مخالف کے اقرار و اعتراف سے واضح ہو گیا تو اس کے بعد مشروط اور جزاء کے تحقیق و ثبوت میں شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں رہ سکتی۔

۸۔ جب غار کے سرے پر کفار کو موجود دیکھ کر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف اور ایذا دہانی کے خیال سے حزن و ملال لاحق ہوا تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”ما ظنک باثنين الله ثالثهما“ ان دو شخص کے متعلق تمہارا کیا گمان ہے جن کے ساتھ تیسری اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ ناسخ جلد اول ص ۳۵ اور اسی کے متعلق قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ”اذ يقول لصاحبه لا تحزن ان الله معنا“ جبکہ وہ اپنے یار غار سے کہہ رہے تھے تم گم گم نہ ہو بے شک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔ ذرا غور فرمائیے اللہ تعالیٰ کی معیت جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل تھی۔ اسی طرح آپ نے اس کو حضرت ابو بکر صدیق کے لیے بھی ثابت فرمایا اور اس کی گواہی دی۔ اب یہ ڈھکوسل صاحب اور اس کی برداری کا کام ہے کہ قرآن مجید سے دکھلائیں کہ اللہ تعالیٰ مشکوک اخلاص و ایمان والوں کے ساتھ ہوتا ہے یا کامل ایمان و اخلاص والوں کے ساتھ اسی طرح وہ عہد شکن اور فدر پیشہ لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے یا مجسمہ وفا و اخلاص کے ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خدمت گزاروں اور جانثاروں کے ساتھ ہوتا ہے یا ان سے جان و مال پیارے رکھنے والوں کے ساتھ

۵۔ آنکہ والا تیرے جو بن کا تماشا دیکھے دیدہ کور کو کیا آئے نظر کیا دیکھے

۹۔ فانزل الله سكينته عليه الآء اہل سنت کے نزدیک اس میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی تسکین قلب مراد ہے کیونکہ حزن و ملال آپ کو لاحق ہوا تھا لہذا اسامان تسکین بھی آپ کے لیے فرمایا کرنا چاہیے تھا۔ رہا شیعہ صاحبان کا یہ بہانہ اور غفلت کہ دوسری فائب کی ضمیریں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہیں۔ اذ يقول لصاحبه۔ لہذا یہ بھی آپ کی طرف ہی راجع ہونی چاہیے۔ مگر یہ کوئی وزنی اور موجب تر جمع عذر نہیں

(ا) کیونکہ اذہما میں دونوں کو ضمیر غائب سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک جگہ مشترکہ طور پر تعبیر کر دیا گیا اور دوسری جگہ علیحدہ علیحدہ تعبیریں پائی گئیں کیونکہ احکام علیحدہ علیحدہ تھے (ب) چلو اس کو پھوڑتے ہیں مگر جب یہ ثابت ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

ہے دل اقدس پر سکینہ نازل فرمائی اور آپ نے خود مطمئن ہونے کے بعد حضرت صدیق
رضی اللہ عنہ کو مطمئن کر دیا اور چونکہ اطمینان رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام بعینہ اطمینان صدیق تھا
اس لیے ضمیر واحد پر کتفہ فرما کر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان فنا فی الرسول لما ہر فرمادی اور
قرآن مجید میں بہت جگہ یہی اسلوب اور انداز بیان اختیار کیا گیا ہے کما قال واللہ ورسولہ
صحتہ ان یوضوہ۔ یہاں پر بھی تشبیہ کی جگہ واحد کی ضمیر اسی لیے ذکر کی گئی ہے کہ رضائے خدا
رضائے مشطوع ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رضا، رضائے خداوند تبارک تعالیٰ۔
تو اب اس میں حضرت صدیق کی ذات پر اعتراض کی کیا گنجائش ہے۔ جیسے کہ
شیعہ لوگوں نے یہاں زبان درازی سے کام لیا ہے۔ اور بد باطنی کا مظاہرہ کیا
اور اسی کی طرف ڈھکوسل صاحب زامل علم و انصاف کا حوالہ دے کر اشارہ کیا اور
حضرت صدیق کی سب قربانیوں کا خوف خدا اور خوف آخرت کو بالائے طاق رکھ کر
انکار کر دیا۔ علامہ طبری کا شیعہ افسانہ نگاری سے گریز

اس مقام پر ہم علامہ طبری کے خاندانی آدمی ہونے اور با اصول مخالف اور دشمن
ہونے کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے جنہوں نے اس قسم کے توہمات کا ذکر کرنے
سے اپنا دامن بچایا اور کہا: "وقد ذكرت الشيعة في تخصيص النبي صلى
الله عليه وسلم في هذه الآية بالسكينة كلاماً رأينا الاضراب
عن ذكره آخرى لئلا ينبتنا السبب۔ یعنی شیعہ نے سکینہ کے صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ
وسلم پر نازل کئے جانے کی تخصیص اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ شامل
نہ کرنے میں کلام کیا ہے لیکن ہم اس کے ذکر سے اعراض اور روگردانی کو نہ یادہ
موزوں اور مناسب سمجھتے ہیں تاکہ کوئی شخص ہمیں تعصب اور غلو کی طرف منسوب نہ کرے
مجمع البیان جلد سوم ص ۳۲۔

بالفرض اگر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پر سکینت کے نزول کا تذکرہ نہ کرنے سے
ان کے ایمان میں کسی کمزوری کا وہم پیدا ہوتا ہے تو کیا قول باری تعالیٰ "ان الله معنا"
سے اس قسم کے شیطانی وسوسوں کی بنیاد اکھڑ نہیں جاتی۔ علاوہ ازیں یہ سکینت تو حضرت

صدیق کے اظہار اضطراب کے بعد نازل ہوئی اس سے پہلے تو نہیں نازل ہوئی تھی تو اس وقت تک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان میں نعوذ باللہ کسی کمی اور نقص کا تو ہم کسی مومن کو ہو سکتا ہے اور جب نہیں اور یقیناً نہیں تو اس کے بعد بھی حضرت صدیق کے لیے کوئی نقص اور ضعف ایمانی کا تو ہم نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کیلئے آرام جان اور سامان تکمیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے حقیقت حال یہ ہے یہاں مقصود یہ ذکر ہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اسی لیے مکہ مکرمہ سے اخراج بھی آپ کا بیان فرمایا۔ اذ اخرجہ اذین کفر و احالاکہ صدیق اور جملہ ہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو کفار مکہ مکرمہ سے نکالا اور نصرت کی نسبت بھی آپ کی طرف کی۔ الا تنصروه فقد نصرہ اللہ حالانکہ حضرت صدیق کی بھی اللہ تعالیٰ نے امداد و نصرت فرمائی اور دورانِ ہجرت انہیں کسی حادثہ سے دوچار نہ ہونا پڑا۔ لیکن صدیق آپ کے تابع تھے اور تابع احکام میں متبوع کے ساتھ شامل اور شریک ہوتا ہے اس لیے ان کا علیحدہ ذکر نہیں پایا گیا۔ دیکھئے کلام مجید میں آدم و حوا علیہما السلام کا درخت سے کھانا اور جنت سے نکلنا مشترکہ طور پر بیان کیا ہے لیکن مقام توبہ میں صرف آدم علیہ السلام کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے کما قال تعالیٰ قتلنی اذ مرتبہ کلماتِ قتال علیہ الہ تو کیا شیخ صاحبان کے نزدیک حضرت حواری رضی اللہ عنہما نے توبہ نہیں کی تھی یا اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول نہیں فرمائی بلکہ قبول توبہ میں حضرت حواری آپ کے ساتھ یقیناً شامل تھیں مگر چونکہ آپ کے تابع تھیں لہذا علیحدہ ذکر کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہاں پر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے فنائی الرسول واسے مقام کو ملحوظ رکھا گیا ہے اسی لیے ان اللہ معنا فرمایا۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے لاکھوں بنی اسرائیل کے ساتھ ہونے کے باوجود "اذا ربی" معنی ربی، فرمایا۔ یعنی میرا رب میرے ساتھ ہے۔ کیونکہ دوسروں کو وہ معیت حاصل نہ تھی جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حاصل تھی۔ مگر فنائی الرسول کے مقام پر نازل ہونے کی وجہ سے وہی معیت صدیق کے لیے ثابت فرمائی جو سرور عالم کو حاصل تھی۔

والحمد لله علی ذلک

ایک اہم شبہ کا ازالہ

دوسری جگہوں میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ مؤمنین پر بھی سکینت کے نزول کا ذکر جیسے کہ سورہ فتح میں فرمایا: "فَأَنزَلَ اللَّهُ سُكُوتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ" جبکہ اسی سورہ توبہ میں فرمایا: "ثُمَّ أَنزَلَ اللَّهُ سُكُوتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ" تو وجہ اس کی بالکل واضح ہے کہ وہاں حکم بھی عام بیان کیا جا رہا تھا مثلاً سورہ توبہ میں پہلے فرمایا: "لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ" اور سورہ فتح میں اس کی مسلمات و منفعت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "لِيُزَادَ وَابْتِئَانًا مَعَ إِيْمَانِهِمْ" تاکہ ان کے ایمانوں میں اضافہ ہو اور "لِيَدْخُلَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتُ إِلَى آخِرَةٍ" تاکہ اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو جنات میں داخل کرے لہذا ان دونوں مقامات پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کا قصداً اور ارادہً حکم بیان کیا گیا۔ جبکہ یہاں قصداً اور ارادہً صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے اور صمیماً اور بالاتباع حضرت صدیق اکبر کا۔ اس لیے وہاں آپ اس معاملہ میں شریک ہونا بیان نہیں کیا گیا۔ کیونکہ مبلغ امور ذاتیہ کی رعایت نہیں کرتا بلکہ مقام اور مقتضی حال کی رعایت کرتا ہے۔ ماقبل میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکالے جانے کا ذکر کیا۔ "إِذَا خَرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَا فِي أَشْنِينَ" اور آپ کی ہی نصرت اور امداد کا ذکر کیا "إِنَّا نَنصُرُوهَ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ" اور آپ کے لیے ہی ملائکہ کے نزول کا ذکر کیا "وَأَيُّدَا بَجَنُودٍ لَمْ تَزُوْهَا" حالانکہ نکالے ابوبکر صدیق بھی گئے تھے اور جس طرح دوران ہجرت اللہ تعالیٰ کی نصرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل حال رہی حضرت صدیق کے بھی شامل حال رہی اور جن جنود سماویہ سے نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و تقویت کی گئی انہیں سے ابوبکر صدیق کی بھی تائید و تقویت فرمائی گئی۔ لیکن اصل مقصود چونکہ سید عرب صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ اس لیے بالخصوص آپ کا ہی ذکر فرمایا۔ اسی لیے یہاں بھی اسی اصالت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ضمیر واحد ذکر کی گئی ہے۔ اور فرمایا گیا: "فَأَنزَلَ اللَّهُ سُكُوتَهُ عَلَى رَسُولِهِ" (الایۃ)

علاوہ ان میں سورہ فتح کی آیت میں یا سورہ توبہ کی آیت میں جہاں مؤمنین پر نازل سکینت کا بیان ہے کیا ان میں حضرت ابوبکر صدیق داخل نہیں جب داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں بلکہ ان کے رئیس ہیں تو پھر اس ہر ذہ سرائی اور بیودہ گوئی کا فائدہ کیا ہو سکتا ہے سوائے بغض باطنی کے اظہار کے اور ابلیس کی رضامندی اور شاباش حاصل کرنے کے

حرف شرط لانے کی حکمت اور ایثار صدیق کا تقابلی جائزہ

(۱۰) حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایثار عظیم ہے اور اس پر ایمان لانا ہمارا فرض ہے لیکن ذرا غور کرو قبیلہ بنو ہاشم اور بنو عبدمناف کی موجودگی بھی مسلم اور ان کا قومی حمیت و عصبيت اور قبیلہ داری کے تحت ہر ممکن امداد کرنا اور دشمنوں سے تحفظ کی کوشش کرنا بھی مسلم اور کفار و مشرکین کا انتہائی بد باطنی کے باوجود فرد واحد کو شہنوں کے ذریعے شہید کرنے کی کینہ حرکت سے کوسوں دور ہونا بھی مسلم اس لیے جو غلام اور جان نثاری و جان سپاری کا مظاہرہ ان حالات میں اس قدر طویل سفر پر پختہ و اشخاص کے جانے میں ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے اس لیے اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر کوئی اہل علم اور اہل انصاف نہیں رہ سکے گا کہ جس انس و محبت اور امداد و اعانت اور خدمت گزاری اور وفاداری کا ثبوت ابوبکر صدیق نے دیا ہے اس کی مثال بلکہ نظیر ملنی مشکل بلکہ ناممکن ہے اور یہیں سے ان حرف شرط لانے کی حکمت بھی واضح ہو جائے گی کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو حتمی اور قطعی علم تھا لیکن سفر اتنا کٹھن اور صبر آزمایا تھا اور اس رفاقت میں مصائب و آلام اور تکالیف و شدائد کا سخت خطرہ تھا جس کے تحت متیقن کو معرض مشکوک میں ذکر کر دیا اور حتمی و قطعی موانعت اور وفاداری کو محتمل اور مرجوح صورت میں ذکر فرما دیا۔ اور کتنے مقامات پر قرآن مجید میں مختلف حکمتوں کے تحت اسی اسلوب بیان کو اختیار کیا گیا ہے "قال تعالیٰ ایا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ" "ایہ رسول گرامی جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اس کی تبلیغ کرو اگر تم نے تبلیغ نہ کی تو تم نے اللہ کی رسالت کی تبلیغ نہ کی اور فریقہ رسالت کو ادا نہیں کیا۔"

کیا کوئی بد باطن کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا تبلیغ رسالت فرمانا مشکوک تھا؟ قال اللہ تعالیٰ۔ ان کان للرحمن ولد فانا اول العابدین اگر رحمن تبارک و تعالیٰ کے لیے بیٹا ہو تو میں سب سے پہلا اس کا عبادت گزار ہوں گا، تو کیا یہاں بھی کوئی شقی ازلی یہ کہہ سکتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ہونا ممکن تھا اور آپ اس میں متروک تھے؟ العیاذ باللہ۔ لہذا یہاں بھی مخصوص حالات اور دل کو لرزادینے والے مصائب و شدائد کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حکیمانہ انداز اختیار فرمایا ہے۔ اور چونکہ حضرت علیؑ کے لیے اس قسم کے حالات درپیش نہیں تھے لہذا وہاں ان شرطیہ لائنوں اور اس متیقن کو صورت محتمل میں ذکر کرنے سے اجتناب فرمایا۔ بشرطیکہ کلام امام میں صحیح سند کے ساتھ کلمہ ان شرطیہ کا تحقق ثابت ہو۔ لیکن ڈھکوسا صاحب الٹی منطق کے تحت اگر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ میں ان شرائط اور صفات کمال کا پایا جانا مشکوک ہو گیا تو ڈھکوسا صاحب کو بتلانا پڑے گا کہ شک و شبہ کس کو ہوا۔ اس کلام کا متکلم اللہ تعالیٰ ہے اور مخاطب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو کیا متکلم یعنی اللہ تعالیٰ کو شک ہو گیا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہ منی لب ہیں العیاذ باللہ تعالیٰ اور جب یہ باطل ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ یہاں حرف شرط کو شک و شبہ کی وجہ سے نہیں لایا گیا بلکہ اس حکمت کے پیش نظر جو ہم نے ذکر کی ہے۔ نیز بقول ڈھکوسا صاحب اہل تشیع کا اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر علم میں سبقت لے جانا لازم آئے گا۔ کہ انہیں تو ابو بکر کی بے وفائی اور عہد شکنی کا یقین ہو گیا مگر اللہ تعالیٰ اور اس کا محبوب شک و شبہ میں ہی رہ گئے اور اگر مگرے پکڑ میں "تلاک عشرۃ کاملۃ۔ فہا تو ابرہان کو ان کنتم صادقین" بحمدہ تعالیٰ ڈھکوسا صاحب کے اس ظلمانی خیال اور توہم کا آفتاب کی مانند روشن دس وجوہ سے رد ہو گیا اور وہ تار عنکبوت سے کمزور شبہ بے نام و نشان ہو کر رہ گیا۔

۲۔ دوسرا جملہ :-

مذاکرہ ڈھکوسا صاحب کو دوسرا اعتراض یہ ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مخلصانہ اور نیا نیا مندانہ جواب میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان اطلع اللہ علی قلبک اے اگر اللہ تعالیٰ تیرے دل پر مطلع ہوا اور تیرے نہ بانی اظہار عقیدت کو دل کے مطابق پایا تو تیرا میرے ساتھ وہ تعلق قائم کر دے گا جو کان اور آنکھ، سر اور روح کو میرے بدن سے ہے۔ لہذا یہ بھی مثل سابق حرف شرط پر مشتمل ہے۔ جس سے غلیظہ صاحب کی وفاداری اور اظہار عقیدت مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس بیان شقاوت نشان اور حماقت ترجمان میں بھی ڈھکوسا صاحب نے علم و فہم اور عقل و دانش کو خیر باد کہہ کر سید الصدیقین اور رفیق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بغض و عناد اور کینہ و عداوت کا اظہار کر کے مجوس و یہود اور اپنے رومانی پیشوا جناب عبداللہ بن سبا کو خوش کرنے کی سعی نامشکور فرمائی ہے۔ را، ڈھکوسا صاحب کو سوچنا پڑے کہ ان شرطیہ کا یہاں کونسا موقعہ و محل ہے کیونکہ لاجرم کے بعد قطعی حکم بیان کیا جاتا ہے نہ کہ مشروط اور مشکوک حکم قرآن مجید میں جہاں بھی اس کا استعمال ہے اس کے بعد حرت تحقیق موجود ہے اور قطعی حکم بیان کیا گیا ہے۔

(۱) قال تعالیٰ: "لا جرم انہم فی الآخرة هم الاخسرون" سورة ہود

(۲) قال تعالیٰ: "لا جرم ان اللہ یعلم ما یسرون وما یعلنون" سورة النحل

(۳) لا جرم ان لہم النار وانہم مفرطون :-

(۴) لا جرم انہم فی الآخرة هم الخاسرون " النحل

(۵) لا جرم انما تدعوننی الیہ لیس لہ دعوة فی الدنیا ولا فی الآخرة

لہذا واضح ہو گیا کہ لاجرم کے بعد مشکوک کلام اور مشتبہ حکم کا مقام ہی نہیں ہے

اس لیے یہ ان شرطیہ نہیں ہے بلکہ ان سے جو دراصل ات تھا اور بعد میں ضمیر نشان

منسوب متصل تھی پھر حقیقتاً اس کو منہ کر دیا گیا اور آن کو آن پڑھا گیا اور

اس کے نظائر خود کلام مجید میں بہت ہیں کہ ات اور آن کو ضمیر نشان کے

حذف کرنے پر اُن اور اِن پڑھا گیا ہے اور معنی وہی حرف تحقیق والا مراد ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے۔ علم ان سیکون منکم مرضی۔ یہاں اُن کا لفظ موجود ہے اور مضارع کو بھی مضموم پڑھا جا رہا ہے حالانکہ اُن مضارع کو نصب دیتا ہے لیکن چونکہ یہ اُن دراصل اَنّہ کا مخفف ہے اور حرف تحقیق ہے نہ کہ اُن مصدر یہ ناصب فعل مضارع لہذا مضارع کو مرفوع پڑھا گیا۔ الغرض یہاں بھی اِن شرطیہ نہیں ہے بلکہ اُن ہے جو حرف تحقیق ہے۔ اور اصل عبارت یوں تھی لاجرم اَنّہ اطع اللہ علی قلبک یقیناً اور ضرور بالضرور یہی تحقیقی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دل پر مطلع ہے ایک تاکید لاجرم کے ساتھ ہو گئی دوسری حرف تحقیق کے ساتھ تیسری تکرار نسبت کے ساتھ لہذا یہاں شک و شبہ کی گرتوہم اور غبار امان کا بھی سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتمہ کر دیا ہے اور دامن صدیق کو ایسے گمہ دوغبا سے محفوظ کر دیا۔

ڈھکوصاحب کی خیانت

(۲) علامہ صاحب جب اس جملہ پر بحث کرنے لگے میں تو لاجرم کا لفظ چھوڑ دیا ہے جس کا معنی ضرور بالضرور اور خواہ مخواہ والا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ڈھکوصاحب نے تعصب اور عناد کی وجہ سے علی خیانت کا ارتکاب کیا ہے اور ناظرین کی آنکھ میں دھول چھونکنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

(۳) اگر لفظ اِن پڑھا جائے اور اس کو شرط بنا کر اس جملے کے ذریعے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اُردت و عقیدت کو اگر مشتبہ بنایا جائے تو ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا مطلع ہونا بھی مشتبہ اور مشکوک ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ مطلع ہونے والا اللہ تعالیٰ اور جس کے دل کی اطلاع اور قلب و زبان کی موافقت پر اطلاع پائی جاتی ہے وہ ابو بکر ہیں جب ابو بکر کے دل کا زبان سے موافق ہو شکوک و مشتبہ ٹھہر تو یہ شبہ اوّٰی شک کس کو ہوا۔ کیونکہ فعل باری تعالیٰ اُطْلِعَ اور وَجَدَ کو اِن شرطیہ کے ساتھ

مشروط کیا کیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نفوذ باللہ
 اس میں اشتباہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مطلع ہوا ہے یا نہیں اور البوکبر کے دل اور زبان
 ہم موافق پایا ہے یا نہیں؟ جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے علم اور اطلاع
 کے متعلق شک اور تردد ثابت ہو گیا تو بقول ڈھکوصاحب اس عبارت سے جس طرح
 نبی کریم علیہ السلام کی ذات اقدس پر اعتراض لازم آئے گا کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے
 متعلق یہ یقین نہیں کہ وہ مطلع ہے اسی طرح خود اللہ تعالیٰ کا اس جملہ شرطیہ کی وجہ
 سے مطلع ہونا مشکوک و مشتبہ ہو کر رہ گیا البیان باللہ دیکھ لیا حضرت! ڈھکوصاحب
 کو بغض صدیق رضی اللہ عنہ نے اتنا اندھا اور بہرہ کر دیا ہے کہ صدیق اکبر کے ساتھ
 ساتھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر بھی اعتراض سے گریز نہ کیا اور نہ اللہ
 رب العزت کی ذات پر اعتراض اور اس کے علم ازلی میں شک و شبہ کے وقوع و
 تحقق کو تسلیم کرنے سے گریز کیا۔

اگر کوئی کہے ان ضرب نہ پڑے علم افسوس ظلم۔ اگر زید عمر کو مارے تو وہ ظالم ہے تو
 اس میں جس طرح عمرو کے مضروب ہونے میں تردد اور شک ہو گا زید کے مضارب
 ہونے میں بھی لامحالہ شک و تردد ہو گا اور متکلم کو زید سے صدور ضرب میں تردد
 ہو گا۔ جس طرح کہ عمرو پر وقوع ضرب میں تردد ہو گا اسی طرح اگر صدیق رضی اللہ عنہ کی
 رادت و عقیدت مشکوک ہو گی تو اللہ تعالیٰ کی اس پر اطلاع بھی مشکوک ہو گی اور صاحب
 کلام کو دونوں نسبتوں قیامی اور وقوعی میں شک و تردد ہو گا۔

لہذا بغض صدیق میں وہ دھاندلی کی کہ اللہ تعالیٰ کو معاف کیا اور نہ رسالت
 صلی اللہ علیہ وسلم کو اور کیونکر نہ ہو محبوب کی عداوت اور اس پر اعتراض محب کی عداوت
 اور اس پر اعتراض ہوتا ہی ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ میں اور میرا رسول صدیق
 کے ساتھ ہیں اور ان پر اعتراض کرنے والا ہے۔ دراصل ہم پر اعتراض کرنے والا ہے۔
 تیسرا اعتراض۔

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی ذات سے متعلق تھا کہ ترجمہ میں تحریف کی ہے اور

ان شرطیہ کا ترجمہ اِن حرف تحقیق والا کر دیا ہے اور مبتدی طالب علم بھی ان کے استعمالات کا محل وقوع جانتے ہیں لہذا یہ جہل ہے یا تجاہل لیکن سہارنی گزارشات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کا ترجمہ ہی صحیح اور واقعہ کے مطابق ہے اور لا جرم کے موقعہ و محل کے مطابق اور مبتدی طالب علم تو کجا یہاں اچھے خاصے مجتہد ہونے کے مدعی بھی جہل کا شکار ہیں یا تجاہل کا اور حقیقت حال سے بالکل بیگانہ اور بے تعلق نظر آتے ہیں اور لا جرم کے مواقع استعمال سے نا بلند اور نا آشنا محسوس ہوتے ہیں۔

چوتھا اعتراض :-

اس کتاب کی نسبت حضرت امام حسن عسکری کی طرف مشکوک ہے اور محققین کے

نزدیک یہ نسبت درست نہیں ہے۔

(ا) سبحان اللہ حضرات صحابہ کرام پر اعتراض کرنا ہو تو ہر قسم کے رطب و یابس پر مشتمل اور فرضی اور وضعی کتابوں کے حوالے دینا درست بلکہ ضروری لیکن تعریفی کلمات کہیں نظر آئیں تو پھر سرے سے کتاب کی نسبت کا ہی انکار۔ چلو کتاب انہوں نے خود تصنیف نہ فرمائی ہو مگر ان کے خواص کی روایات کے ذریعے اس کو ترتیب دے دیا گیا ہو گا جس طرح فقہ جعفریہ کا خود یہی حال ہے۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے خود تو کوئی کتاب تصنیف نہیں فرمائی راویوں کے ذریعے ہی متعین کیا گیا کہ آپ کا مذہب یہ تھا۔ اور آپ کا فرمان اس طرح تھا۔ اس طرح یہاں بھی راویوں کی روایات سے تفسیری نکات کو جمع کر کے کتابی شکل دے دی گئی اس پر اتنی بڑا اعتمادی کا اظہار کرنے کا سوا بٹے اس کے دوسرا موجب و باعث کیا ہو سکتا ہے کہ وہ حکومت کا حکم کی بدقسمتی سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے یار غار اور رفیق ہجرت کی تعریف اس میں آگئی۔

(ب) نیز ڈھکڑ صاحب فرماتے ہیں کہ جب تک اس کے مندرجات کی تائید دوسری صحیح روایات سے نہ ہو جائے ان کا اعتبار نہیں مگر اس سے پہلے ہی وہ روایت تو

معانی الاخبار کے حوالے سے ذکر ہو چکی جس میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بمنزلہ سمع مبارک کے ہونا ثابت ہے اور حضرت فاروق کا آنکھ مبارک کی مانند ہونا اور حضرت ذی النورین کا دل انور کی مانند ہونا اور ظاہر ہے کہ وہ دونوں حضرات حضرت صدیق اکبر کے تابع ہیں لہذا بطریق اولیٰ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ مبارک اور دل منور کی مانند ہونا بھی واضح ہو گیا اور یہی مضمون معانی الاخبار کی صحیح اور قوی روایت سے ثابت ہو گیا جس میں تشکیک کی ڈھکے صاحب کو کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی لہذا عملی بے بسی اور عجز کا اعتراف کرتے ہوئے خاموشی سے آگے نکل گئے۔ اور جواب ہی نہ دیا بہر حال اب یہ عذر بھی ختم ہو گیا کہ دوسری کوئی روایت اس کی تائید نہیں کرتی بلکہ ثقبہ محدثین کی نقل کردہ روایت سے اس کی تائید و تصدیق ثابت ہو چکی لہذا اب اس سے استدلال ڈھکے صاحب کی اس شرط کے باوجود بھی درست ہو گیا کہ تفسیر حسن عسکری کے مندرجات کی تائید جب تک دوسری روایات نہ کریں تو ان کے ساتھ استدلال درست نہیں والحمد للہ علیٰ ذلک وصہ فی اللہ علیٰ رسولہ وآلہ وصحبہ اجمعین

(ج) علاوہ انہیں ڈھکے صاحب یہ نہیں کہہ سکے کہ کسی سنی نے یہ بات لکھ کر حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر دی ہے اگر ایسا امکان ہوتا تو ڈھکے صاحب اس کی فعلیت اور وقوع کے قطعی دعویٰ سے گریز نہ کرتے لہذا معلوم ہو گیا کہ یہ بیہوش کی تالیف تو ہے نہیں تو لامحالہ شیعہ صاحبان کی ہے لہذا ہمارا مدعا پھر بھی ثابت ہو جاتا ہے شیعہ کتب میں شیعہ مسنفین بھی یار غار اور رفیق ہجرت ہیں الصدیقین رضی اللہ عنہ کی منقبت اور حوثنا کو جگہ دیے پر مجبور نظر آتے ہیں۔

فائدہ: ساتھ ہی یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اس گروہ میں بھوٹ اور بہتان کی عادت کوٹ کوٹ کر بھری ہے کہ کتابیں لکھ کر ان کے نام پر شائع کر دیتے ہیں اور ذرا بھر شرم و حیا دامن گیر نہیں ہوتی اور کیوں نہ ہو حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ کی دعا یہی ہے کہ حوالہ بکر صدیق کو صدیق نہ کہے اللہ تعالیٰ اس کو نہ دنیا میں سچ بولنے کی

توفیق نصیب کرے اور نہ آخرت میں صادقین کے زمرہ میں داخل ہونے دے۔

نعم صديق نعم صديق نعم صديق من لم يقل له الصديق
فلا صدقه الله قولاً في الدنيا ولا في الآخرة۔

کشف الغمہ فی مناقب الائمہ الاربابی۔

نیز جب ائمہ کرام پر اس قسم کے افتراء سے گریز نہیں کرتے تو ہمارے دوسرے
علماء پرچا رہے کس شمار میں ہیں۔ لہذا اگر امام عزالی کی طرف مکر العالمین جیسی بیسوائے زمانہ
کتاب کی نسبت کر دی ہے تو یہ اسی عادت معروفہ کے عین مطابق ہے کوئی اچھنبے والی
بات نہیں ہے اور نہ ہی اس قسم کے افتراء و اتہام سے ان کی خداداد عظمت میں کوئی
خلل پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کتاب کے ذریعے مذہب اہل سنت میں کوئی خلل پیدا
ہو سکتا کیونکہ اس کی نسبت ہی غلط ہے۔

اہم نکتہ: جب ثبوت ہو چکا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کی آنکھ مبارک۔ بصر مقدس اور دل منور کی مانند ہیں اور آپ کے ساتھ
وہ نسبت رکھتے ہیں جو سر کو جسم سے ہوتی ہے اور روح کو بدن سے تو حضرت صدیق
اکبر رضی اللہ عنہ کا نیابت رسول اور خلافت مصطفویہ کے اہل ہونا بھی ظاہر اور
واضح ہو گیا، اور بقول شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس خلافت و ولایت کے لیے
اہل ہیں کہ وہ بمنزلہ نفس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں اور ان کے نفس رسول ہونیکا
ثمرہ بھی یہی ہے جیسے کہا گیا ہے کہ وہ بھی اسی طرح ہیں جیسے کہ تم مثل آنکھ، کان،
دل اور سر اور روح کے ہو لہذا حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا مستحق خلافت و
ولایت ہونا بھی اس دلیل سے واضح ہو گیا اور اسی اہلیت کی تصریح بھی اسی روایت
کے آخر میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ ص ۱۵۰۔

واذا انت مضیت علی طریقۃ جہارک ولم تتبعہا بما یسخطہ وواقیتہ
بہا اذا بشتعین ید یوکت لولایۃ اللہ مستحقا ولم یفقتنا فی تلک الجنان مستوجبا۔
اے ابوبکر جب تم ایسے طریقے پر جاری اور گامزن رہو گے جس کو تمہارا رب

پسند فرماتا ہے اور اس کے بعد تم ایسے کسی امر کا ارتکاب نہ کرو گے جو پروردگار کو ناراض کرے اور تم اسی حالت پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری دو جبکہ وہ تمہیں وفات کے بعد اٹھائے تو تم اللہ تعالیٰ کی ولایت کے مستحق ہو گے اور ان عالی جنات میں ہماری مرافقت کے حقدار۔

اور یہ حقیقت کسی سے کیونکر مخفی رہ سکتی ہے کہ جو ہستی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ قرب معنوی اور روحانی رکھتی ہو وہ ایسے طریقے پر گامزن کیونکر نہیں ہوگی اور تا دم زلیست اس پر قائم و دائم کیوں نہیں ہوگی اور جب حقیقت حال یہ ہوئی جو قبل ازیں عرض کی جا چکی ہے حضرت صدیق کی ولایت و خلافت کا استحقاق بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔

مذہب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی فضیلت حضرت سلمان اور حضرت ابوذر سے

اگرچہ اہل ایمان اور اہل عقل و درایت کے لیے اس روایت سے زیادہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی شان اور آپ کا فضل اور کیا متصور ہو سکتا ہے مگر مؤمنین کے دل کو خوش کرنے کے لیے بطور نمونہ ایک دور روایتیں اور بھی غلفائے راشدین سابقین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی فضیلت کے بارے میں اہل تشیع حضرات کی معتبر کتابوں سے پیش کرتا ہوں۔ اہل تشیع کی معتبر کتابوں میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی موجود ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سلمان منا اہل البیت۔ یعنی سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں نمونہ کے طور پر کتاب کشف العرفۃ فی معرفۃ الأئمہ مطبوعہ ایران ص ۶۷۔

وانت لو فکرت ورأیت لعلمت انه یکفیه تسبا قوله صلی اللہ علیہ وسلم سلمان منا اہل البیت۔

یعنی تو اگر فکر و ہوش سے کام لے تو یقیناً جان لے گا اور دیکھ لے گا کہ سلمان فارسی کے لیے یہی نسب نامہ کافی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ سلمان ہم میں سے ہیں اور اہل بیت میں سے ہے۔

اب ہم اہل فکر و نظر کی خدمت میں فروع کافی جلد و صحت کی عبارت پیش کرتے ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے فرق مرتبت کے متعلق وارد ہے۔

ثم من قد علمتم بعده في فضله وزهده سلمان وابوذر رضي الله عنهما.
یعنی پھر وہ شخص جس کے متعلق تمہیں علم ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد جن کا مرتبہ فضل و زہد میں ہے تو وہ سلمان فارسی اور ابوذر ہیں رضی اللہ عنہما۔ الخ

اب جن کا مرتبہ فضل و زہد میں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے بعد ہے وہ اہل بیت ہوں اور اہل مرتبہ والی ہستی کہ جن کو بمنزلہ "السمع والبصر والروح" بھی فرمایا گیا ہو وہ اہل بیت نہ ہوں تو کس قدر میٹ و صحرانی اور بے انصافی پر مشتمل ایک غلط نظریہ ہے۔
وانت لو فكرت وتدبرت ذلك لعلمت فضل ابي بكر وزهده

على جميع الصحابة ويكفيه فضلا وكمالا ومرتبة قوله صلى الله عليه وآله وصحبه وسلم لابي بكر رضي الله عنه انت مني بمنزلة السمع والبصر والروح وقد مر بيانه يدنانى.

تذہیب الامامیہ از علامہ محمد حسین ڈھکوصاحب

مؤلف محترم نے فروع کافی کی ایک عبارت کے بعض فقروں کو توڑ مروڑ کر صحابہ ثلاثہ کی مدح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر وہ سیاق و سباق اور داخلی و خارجی قرائن کو مد نظر رکھتے اور شرم و حیا کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے دیتے تو اس روایت سے ہرگز استدلال نہ کرتے۔

اس روایت کا پس منظر یہ ہے کہ بنو امیہ نے صوفیہ کی ایک جماعت تیار کی تھی جس کا طرہ امتیاز صوف کا لباس اور ترک لذائذ کرنا کہ مادی اقتدار

اہل بیت سے چھیننے کے بعد روحانی اقتدار پر بھی ڈاکہ ڈالیں پہلے پہل ان کی سرگرمیاں عوام تک محدود رہیں مگر حکومت کی سرپرستی کی وجہ سے ان کا دائرہ کار خواص تک پھیل گیا بلکہ ائمہ اہل بیت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ان کی محافل و مجالس میں جا کر ان کے لباس و روش و رفتار اور سیرت و کردار پر حملے کرنے لگے انہیں واقعات میں سے یہ واقعہ بھی ہے کہ سفیان ثوری اور چند دوسرے متصوف نے امام موصوف کے لباس فاخرہ پر اعتراض کر دیا۔

امام رضی اللہ عنہ نے اصول مناظرہ کے مطابق مسلمات غصم پیش کر کے ان کے موقف کی غلطی واضح کی کہ تمہارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے بڑا زاد ابو بکر ہے ان کے بعد تم سلمان اور ابوذر کو سب سے بڑا زاد سمجھتے ہو مگر ان کی حالت یہ تھی کہ ابو بکر و صدیق رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت صرف پانچواں حصہ راہ خدا میں خرچ کرنے کی وصیت کی اور جناب سلمان و ابوذر بھی سال بھر کا خرچہ رکھ لینے کے بعد باقی ماندہ راہ خدا میں خرچ کرتے تھے جب تمہیں ان پر اعتراض نہیں تو ہم پر اعتراض کا کیا حق ہے؟

الغرض امام علیہ السلام نے معترض کو خاموش کرنے کے لیے اس کے عقیدہ کے مطابق کلام کیا اپنا عندیہ ظاہر نہیں کیا جس کی تائید مزید جملہ ”ثم من قد علمتم بعدہ“ سے ہوتی ہے۔

جواب دیگر

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس روایت کو معتبر تسلیم نہ کیا جائے جس کی عقلانی وجہ یہ ہے کہ اس کے راوی سنی ہیں پہلا راوی ہارون بن مسلم ہے جو جبری العقیدہ تھا اور دوسرا راوی سعد بن صدقہ ہے جو عامی (سنی) تھا لہذا اس کی جواب دہی کا فریضہ ہم پر عاید ہی نہیں ہوتا۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۲۹ تا ۱۳۲۔

تحفہ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی غفر

الجواب بتوفیق ملہم الصدق والصواب

۱) علامہ ڈھکو صاحب نے بلا وجہ صوفیاء کرام کو بنوامیہ کا تیار کردہ گروہ قرار دے دیا اور انہیں اہل بیت کے روحانی اقتدار کے لیے خطرہ قرار دے دیا۔ گروہ صوفیاء بنوامیہ کا نہیں بلکہ حضرت علی مرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہ کا تیار کردہ ہے اور آپ کے علوم باطنیہ اور اسرار کا امین ہے جیسے کہ محدثین و مفسرین اور فقہاء آپ کے علوم ظاہرہ کے امین اور ترجمان ہیں اور قاضی نور اللہ شوبہ تری نے تمام اکابر صوفیاء کرام کو اپنی جماعت یعنی اثنا عشری شیعہ میں داخل کرنے کی مقدور بھر سعی نامشکورہ فرمائی ہے اور ان کی دلق پوشی اور پابریہ نہ ہونے اور ثولیدہ سر اور پراگندہ بال ہونے کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

قوے ملوک طبع کہ از روئے سلطنت	گوئی کز احترام سلاطین کشور اند
شاہان دلق پوش کہ گاہ حمایتی	زیر گلیٹان حم و خاقان قیصرند
امروز از نعیم جہاں چشم دوختند	فردا خود اند کہ شمع بفر دس نگرند
نگر بچشم خوار دریں پابوہنگاں	نزد خود عزیز تر از دیدہ سرند
آدم بہشت را بدو گندم اگر فروخت	حقا کہ اس گروہ بیک جو نمی خزند

محاسن المؤمنین جلد دوم ص ۳۰

اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فیض پانے والوں میں حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ کو بھی شمار کیا ہے اور علی الخصوص جناب کمیل بن زیاد نخعی کو اور نقشبندیہ سلسلہ کے علاوہ سب کے منبع فیوض اور سرچشمہ کمالات حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم کیا ہے لہذا اس گروہ پر ڈھکو صاحب کا یہ حملہ نیزیدی کا روانی کے زمرہ میں آتا ہے نہ کہ روحانی اقتدار چھیننے کا معاملہ تو یہ چھیننے سے نہ چھینا جاسکتا ہے اور نہ اس پر کوئی قابض ہو سکتا ہے اور ان حضرات کا کام ہی یہ تھا کہ فیض کو عام کریں جیسے کہ سرور

عالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو دولت ایمان سے مالا مال کرنے اور ان کو ننگا نہوت سے پاک کرنے کے لیے مبعوث ہوئے اور اپنے دامن سے وابستہ کر کے مقام محبوبیت و ولایت پر فائز کرنے کے لیے ”کہا قال تعالیٰ: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ“ اور یہ امر ذہن نشین رہے کہ جس طرح مال میں زکوٰۃ ہے اسی طرح علم ظاہر میں عوام کا حق ہے اور علم باطن میں خواص اور مستحقین کا اور ہر ایک صاحب ثروت اس نعمت خدا داد سے فیض رسانی کا بھی پابند ہے ”قال اللہ تعالیٰ: ومما رزقناهم ینفقون یعنی مما رزقناهم من انوار المعرفة یفیضون جو انوار معرفت ہم نے ان کو عطا کئے ہیں ان کا فیضان فرماتے ہیں اور یہ بھی یاد رہے مادی اقتدار میں بخل ہوا کرتا ہے اور اسی میں عزت سمجھی جاتی ہے لیکن روحانی نعمتیں بانٹنے سے عزت ہوتی ہے اس لیے ارباب سلاسل کی عظمتوں کے کے اب بھی قائم ہیں و الحمد للہ!

(۲) ان حضرات کا سوال امام ابو عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے یہ تھا کہ جو لباس آپ کا ہے اس طرح کا لباس آپ کے آباؤ اجداد علی الخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ نے استعمال نہیں فرمایا اور امام وقت کو ائمہ سابقین کی روش پر رہنا چاہیے لہذا یہ تو فرمائیے کہ اس کی مکت اور مصلحت کیا ہے؟ یہ ایک خاص علمی سوال تھا اور رہنمائی کے لیے اس پر حضرت امام ابو عبد اللہ کو تحقیقی جواب عطا فرمانا چاہیے تھا نہ کہ محض ٹالنے اور چپ کرانے تک محدود رہنا چاہیے تھا اسی لیے رجال کشی میں دوسرا جواب دیا گیا ہے کہ حضرت امام رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس وقت منگی اور عسرت کا دور تھا۔ اور اب دنیا نے اپنے مال و دولت کے دہانے کھول رکھے ہیں اس لیے اس سمالت اور اس حالت میں فرق کا پایا جانا بعید نہیں ہے۔ اِنَّ سُفْیَانَ الثَّوْرِیِّ دَخَلَ عَلٰی اَبِی عَبْدِ اللّٰهِ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَ عَلَیْہِ ثِیَابٌ جِیَادٌ فَقَالَ یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ اِنْ اَبَاؤُکَ لَمْ یَکُونُوْا یَلْبَسُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الثِّیَابِ فَقَالَ اِنْ اَبَاؤُکَ لَمْ یَکُونُوْا فِیْ زَمَانٍ مَّقْمَرٍ مَّقْمَرٍ وَ هٰذَا زَمَانٌ قَدِ ارْتَحَتِ الدُّنْیَا

عزالیہا فاحق اہلہا یہا ابوا رہم۔ رجال کشتی ص ۳۶

الغرض کسی مقتدر زمانہ سے ساوگی کے ترک کرنے اور آباؤ اجداد کے لباس کے معاملہ میں سنت سے اختلاف کرنے کی وجہ دریافت کرنے کو بے ادبی اور گستاخی سمجھنا عجیب سی حرکت ہے اس میں صرف اور صرف حکمت اور مصلحت کی دریافت ہی مقصود ہو سکتی ہے۔ لہذا بد ظنی کی کیا گنجائش ہے؟

(۳) تحقیقی جواب یہ ہوا جو ہم نے بحوالہ رجال کشتی ذکر کیا اور الزامی وہ ہوا جو ڈھکوسہ صاحب نے ذکر کیا اب ذرا نظر انصاف سے ان میں تطبیق کی کوشش فرمادیں کیا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا زمانہ اور حضرت ابو بکر حضرت سلمان اور حضرت ابو ذر کے زمانے مختلف ہیں کہ ان کے وسائل تھے لہذا وہ تو مال جمع کر لیتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے وسائل نہیں تھے اور لباس بھی عمدہ نہیں بنا سکتے تھے۔ علی الخصوص جبکہ حضرت صدیق کی خلافت محدود وقت اور محدود علاقہ میں تھی اور فقر و فاقہ والے علاقہ میں جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا علاقہ وسیع اور وقت خلافت بھی زیادہ پھر اس تحقیقی اور الزامی جواب میں مطابقت کیسے ہو سکتی ہے۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے ایام خلافت میں مال و دولت کی ریل پل تھی اور آپ معقول و ظائف اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب بدر کو دیتے رہے اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ لاکھوں درہم کا نذرانہ امام حسن رضی اللہ عنہ کو پیش کیا کرتے تھے لہذا اس عذر کی معقول توجیہ کوئی نہیں ہو سکتی اور یہ سب یار یوگوں کی بناوٹ ہے کہ ہر موقع جو مناسب جواب سمجھی خود تجویز کر کے اس کی نسبت ائمہ کی طرف کر دی جیسے کہ محدثین شیعہ کی عادت معروفہ ہے۔

(۴) جب سوال کرنے والے متوابعہ کے ساتھ پورا ختمہ تھے تو وہ ابو ذر اور حضرت سلمان رضی اللہ عنہما کے لیے کوئی تفصیلت ثابت کر سکتے تھے جب کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا اور جناب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا معاملہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے ساتھ معروف و مشہور ہے اپنے ان پیشواؤں کے نظریہ

کے برعکس وہ ان کو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرا درجہ فضل وزید میں کیونکر دے سکتے تھے؟ لہذا اس کو الزامی جواب کیونکر قرار دیا جاسکتا ہے؟ یا پھر ان حضرات کو بنو امیہ کا تہ جہان کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یقیناً ان کا مذہب اس جماعت سے مختلف ہے اسی لیے حضرت ابو ذر اور حضرت سلمان کے متعلق فضل وزید کے یقین کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱۵) نیز حضرت امام ابو عبد اللہ علیہ السلام نے من قد علمتہ فرمایا ہے شاید ڈھکوصاحب کو معلوم ہو گا کہ قرآن و حدیث میں اور علم کلام میں علم کا لفظ منطقی اصطلاح کے مطابق استعمال نہیں ہوتا جو ظن اور جہل مرکب کو بھی شامل ہوا کرتا ہے بلکہ یقین اور واقعی قطعی عقیدہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر الزام مقصود ہوتا تو زعم سے تعبیر فرماتے یا قول و ادعاء سے تعبیر فرماتے اور ظاہر ہے کہ اہل بیت اور قرآن و سنت کی تعبیر اور اسلوب بیان ایک جیسا ہونا چاہیے۔ لہذا علامہ موصوف کا اس کو دلیل الزامی بنانا اور اہل بیت کرام کو محض مناظرین کی سطح پر لے آنا ان کی شان اقدس میں تقصیر اور تقریط کے مترادف ہے بلکہ یہ یقینی حجت و برہان اور واقعی دلیل ہے اور مسترشدین کے لیے ہدایت و ارشاد اور صحیح رہنمائی کا اہتمام ہے۔

(۱۶) نیز علامہ ڈھکوصاحب کو یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ کلام مقیدہ میں نفی و اثبات قیود کی طرف راجع ہوا کرتے ہیں لہذا اگر ڈھکوصاحب کی یہ بیہودہ منطق اور تاویل تسلیم بھی کر لی جائے تو الزامی طریقہ جواب میں صرف ان دونوں حضرات کے حضرت ابو بکر صدیق سے مرتبہ میں مؤخر ہوئے کا ذکر کیا گیا نہ کہ سرے سے آپ کے فضل اور زید کا انکار لہذا اگر یہ الزامی جواب ہے اور حضرت امام کے نظریہ کے مطابق نہیں تو حضرت صدیق کو ان سے مقدم ماننا نہ کہ ان کو صاحب فضل اور صاحب زید تسلیم کرنا ڈھکوصاحب کا دعویٰ ہے کہ سب ائمہ مذاہب میں متفق ہیں اور امام ابو جعفر محمد بن علیؑ فرماتے ہیں: لست بمنکر فضل ابی بکر و لست بمنکر فضل عمر۔

نہ میں ابو بکر کی فضیلت کا منکر ہوں اور نہ عمر کی فضیلت کا رضی اللہ عنہما۔ لہذا نفس فضل و زہد کا مالک ہونا تو یقیناً ثابت ہے البتہ ان تینوں حضرات کے باہمی مراتب کے بیان میں حضرت امام جعفر اور جناب سفیان ثوری کے نظریہ میں قدرے فرق ثابت ہوا تو اس صورت میں بھی ڈھکوصاحب کا جواب بالکل باطل اور غلط ہو کر رہ گیا۔

(۷) نیز قرآن مجید اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی اور امام حسن، امام زین العابدین امام محمد باقر اور امام جعفر صادق کے ارشادات پہلے ذکر ہو چکے جن میں مہاجرین و انصاریں بالعموم اور بالخصوص حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے فضائل و مناقب تحقیقی انداز میں بیان ہو چکے لہذا اس کلام کو بھی انہیں ارشادات کی روشنی میں دیکھا جائے گا جب وہاں ان کے فضائل کا بیان تحقیقی انداز میں ہے تو یہاں جدلی انداز کیوں ہو گیا اور اگر جدلی ہوتا تو وہ حضرات بھی کہہ سکتے تھے جناب والا جس ابو بکر کو آپ مانتے ہی نہیں اس کی سنت کو اپنے آباء کی سنت کے مقابل کس طرح پیش کر سکتے ہو۔ اور جب انہوں نے یہ اعتراض نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مخالفین پر تو یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں محض الزامی کارروائی کر رہا ہوں پتہ نہیں ڈھکوصاحب کو کہاں سے الہام ہو گیا

(۸) علاوہ انہیں الزامی اور جدلی انداز اختیار کرنے میں سقم یہ ہے کہ حضرت امام موصوف کے لباس فاخرہ پر اعتراض کیا گیا جیسے کہ ڈھکوصاحب کا وہم ہے اور دلیل میں آپ کے آبا اکرام کا فعل اور ان کی سنت پیش کی گئی جبکہ آپ نے الزامی کارروائی میں حضرت صدیق کی وصیت کا ذکر کر دیا اس سے لباس فاخرہ کے جواز پر استدلال کیونکر درست ہو گیا وہ تب تھا جب حضرت صدیق کا ایسا لباس ذکر فرماتے اور وصیت خمس کی ہو یا قلت کی اس میں بھی وجہ استدلال کوئی نہیں جبکہ یہ واضح نہیں کیا گیا کہ ان کی مالیت کتنی تھی۔ اگر بیس، چالیس درہم ترکہ ہو اور اس میں سے پانچواں حصہ کی وصیت کر دی ہو تو اس میں اس شانہ ٹھاٹھ باٹھ پر استدلال کیسے صحیح ہو گیا۔ پھر طہنت کے نزدیک حضرت ابوذر کا مذہب معروف یہ ہے کہ وہ رات کا کھانا کھانے کے بعد صبح کے لیے ذخیرہ کر رکھنے کو بھی جائز نہیں سمجھتے تھے۔ لہذا ان کے اس عمل کو بھی

مسلمات میں سے شمار کرنا واقع کے خلاف ہے۔ یا کم از کم حضرت سفیان ثوری کے نظریہ اور معلومات کے خلاف ہے۔ اور حضرت سلمان ماثن میں امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے گورنر ہونے کے باوجود اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں سے ٹوکریاں بنا کر گزر بسر کرتے تھے۔ یہاں کے اخراجات کے ذخیرہ کرنے کی گنجائش کہاں ہو سکتی تھی۔

ملاحظہ ہو حاشیہ احتجاج طبرسی ص ۱۱۱

بہر حال نہ ہم ائمہ کی طرف ایسے پوچ جواب کی نسبت درست سمجھتے ہیں اور نہ اس کو محبت الزامیہ اور مناظرانہ انداز تسلیم کرتے ہیں۔ نہ واقعات اور حقائق اس امر کی تائید کرتے ہیں اور نہ ہی ”ثم من قد علمتم بعده فی فضله وزهده“ کا جملہ الزامی جواب ہونے کی تائید کرتا ہے۔ بلکہ حقیقت اور واقعہ کے مطابق اعتقاد جازم پر دلالت کرتا ہے لہذا اس کو محض الزامی کارروائی قرار دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ شیعہ جیسے دشمن صحابہ کی کتابوں میں بھی حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے فضائل و کمالات پر مشتمل روایات مل جاتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملہ قاسرہ کا اعجاز ہے اور ان مقدس ہستیوں کی عظمت شان کے ساتھ اعتناء و اہتمام کا ثمرہ و نتیجہ۔ واللہ اعلم بالصواب

کتب شیعہ میں سنی راوی

- جواب دیگر کا عنوان قائم کر کے علامہ صاحب نے اس روایت کو سنی راویوں کی روایت ہونے کی وجہ سے ناقابل قبول قرار دیا ہے۔ بہت خوب
- (۱) آپ تو تقیہ کے قائل تھے اور اس کے لباس میں چھپے رہتے تھے اور ہمیں مغالطہ دیتے تھے لیکن ہمارا تو یہ مذہب نہیں تھا۔ لہذا تم نے سنی راویوں سے دیدہ و دانستہ یہ روایات کیوں لے لیں جو تمہارے مذہب و مسلک کے خلاف ہیں۔ بلکہ اس پر پانی پھیرنے والی ہیں اور تمہیں لا جواب اور عاجز و بے بس کرنے والی۔
- (۲) اس کتاب پر امام ترمذی قائم آل محمد صحت العصر نے مہربانی لگا دی۔ ”هذا

کاف لشیعتنا۔ یہ کتاب ہمارے شیعوں کے لیے کافی ہے۔ جب روایات غلط تھیں اور عقیدہ کے فساد کی وجہ تو امام موصوف کی اس مہر کا مطلب کیا ہوا؟ یہی ہمارے شیعوں کی گمراہی کے لیے کافی ہے؟ نعوذ باللہ من سوء الفہم۔

”جہالت یا خیانت۔“

(۳) ہارون بن مسلم کے متعلق فرمایا وہ جبری العقیدہ تھا اور ادھر فرما دیا۔ راوی سنی ہیں کیا ڈھکوسا صاحب ابھی تک اس سے بے خبر ہیں کہ اہل سنت نہ جبری ہیں نہ قدری نہ بندے کو مختار مطلق مانتے ہیں کہ خالق افعال ہو اور نہ مجبور محض کہ مردہ بدست زندہ کی مانند ہو۔ ان کے نزدیک بندہ از روئے خلق محتاج باری تعالیٰ ہے۔ اور باعتبار کسب اور جمع وسائل و اسباب مختار ہے۔ اور کتب کلامیہ میں انہوں نے جبریہ اور قدریہ کا رد کیا ہے۔ اگر ڈھکوسا صاحب کو حقیقت حال سے واقفیت نہیں تھی تو جہالت ہے اور جہالت بھی مرکبہ۔

۵۔ آنکس کہ نداند و بداند کہ بداند در جہل مرکب ابدالہر بماند

اور ایسی صورت میں ڈھکوسا صاحب کی زبان میں یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ

نہ اسولت محکم آید و نہ فروع شرم باید از خدا و از رسول

اور اگر علم ہونے کے باوجود اس طرح کہا ہے تو بدترین دھوکہ اور فریب کاری ہے

اور علمی دنیا میں خیانت کی بدستہ مثال ہے۔ نیز جبری العقیدہ شخص کی روایت

نا قابل قبول تب ہوتی جب اس کا تعلق اس کے عقیدہ جبر کے اثبات یا اس کی

تائید و تقویت سے ہوتا اور جب اس روایت کا اس عقیدہ سے قطعاً کوئی تعلق

ہی نہیں تو اس غدر فاسد کی وجہ سے اس روایت پر اعتراض کرنے کا کیا مطلب؟

نیز مسعد بن صدقہ کو سنی کہنا بھی دیانت و امانت کا خون ناحق بہانے کے

مترادف ہے۔ کیونکہ وہ تبریہ فرقہ سے تعلق رکھتا ہے جو گو حضرات شیخین حضرت ابو بکر

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی خلافت کے قائل ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح

انہیں بھی امام تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت

زیر اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہم سے بغض و عناد رکھتے ہیں۔ اور ان سے برائت اور
بیزاری کا اظہار کرتے ہیں ملاحظہ ہو حاشیہ روضہ کافی ص ۲۰۱ ورجاں کشی ص ۲۰۱
کیا ایسے عقیدہ والا شخص سنی ہو سکتا ہے اور کوئی اہل سنت کے عقائد سے
باخبر شخص ایسے لوگوں کو سنی کہنے کی جسارت کر سکتا ہے جس سے صاف ظاہر
ہے کہ علامہ موصوف کا کام صرف پیرا پھیری ہے اور مغالطہ دہی اور فریب کاری الغرض
یہ راوی اگر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مخالف نہیں ہے تو حضرات ائمہ
کی محبت و عقیدت کا دم بھرنے والا بھی ہے اور ان کے مخالفین جو اس کے نظریہ
کے مطابق واقعی مخالف ہیں ان کا دشمن بھی ہے۔ ایسی صورت میں جو روایت ائمہ
کرام کی عظمت شان کے خلاف ہوتی وہ اس کو کیونکر بیان کرتا اور شیعہ محدث
کلمینی اس کو ذکر کیوں کرتا اور امام مہدی اس پر مہر تصدیق کیونکر ثبت فرماتے۔
لہذا اس کو ناقابل قبول ٹھہرانے کی یہ وجہ درست نہیں ہو سکتی۔

شریفانہ زبان

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ابن شہاب زہری کے متعلق شیعہ
کے اپنے اعتراف اور اس کی خاص طرز بیان جس سے خلفاء راشدین رضی اللہ
عنہم کے خلاف غلط تاثر قائم ہو سکے کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو شیعہ کہہ دیا
توڑھکو صاحب نے اس پر یہ زبان استعمال کی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تقیہ بانہ
حضرات اہل جماعت کے گھروں میں گھس جائیں، ان کی کتب کے بطلون سے
ان کے بچے بھی پیدا ہوتے رہیں مگر گھر والوں کو اس کی مطلق اطلاع نہ ہو
یا للجب ص ۱۴۲۔

لیکن ہارون بن مسلم اور سعد بن صدوق کو تقیہ کے بغیر ہی شیعہ پروردی
کے گھروں میں یونکر کسے کا موقع مل گیا کیا ان کے دروازے ہر ایک کے لیے
کھلے رہتے ہیں یا یہاں بھی وہی الفاظ دہرائے نہیں جاسکتے؟ لیکن ہماری شرافت

ہمارے لیے مانع ہے۔ اور ڈھکوسل صاحب کے لیے کوئی مانع موجود نہیں ہے۔
 اس لیے ہم ان کو اس زبان میں جواب دینے سے قاصر ہیں اور نہ ہی ان کو یہ کہتے ہیں
 کہ اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے۔ کیونکہ یہ مطالبہ ایسا ہی ہے جیسے کھویا
 سانب سے مطالبہ کیا جائے کہ ڈنگ مارنے اور ڈسنے سے گریز کرنا اور شرفاراد
 کی شرافت کو ملحوظ رکھنا حالانکہ وہ اپنی عادت اور تقاضائے طبع سے مجبور ہیں جن
 لوگوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ اور آپ کے سسر اور داماد
 نبی اور داماد علی پر تنقید و اعتراض کرتے وقت نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شرم
 محسوس ہو نہ علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے انہیں دوسرے لوگوں پر کیچڑا اچھالتے
 وقت اور بدزبانی سے کام لیتے وقت کیونکر شرم و حیا دامنگیر ہو سکتی ہے؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا داماد علی مرتضیٰ ہونا

خلیفہ ثانی سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ
 کا رشتہ دینا اور ان کو شرف و دامادی بخشنا کوئی کم مرتبہ دلیل نہیں۔ اعتبار کریں درنہ کتاب
 فروع کافی جلد ۲ ص ۲۱۱ کی یہ عبارت بروایت امام ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ
 پڑھیں: عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال سألتہ عن امرءة
 المتوفی عنہا زوجہا اتقد فی بیتہا و حیث شاءت قال ان
 علیاً علیہ السلام لما توفی حمواقی ام کلثوم فانطلق بها الی بیتہ
 یعنی حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مسئلہ دریافت کیا گیا جس عورت کا خاندان
 فوت ہو جائے، تو وہ اپنے گھر (خاندان کے گھر) عدت بیٹھے یا جہاں مناسب خیال کرے
 وہاں بیٹھے؟ امام عالی مقام نے جواب دیا کہ جہاں چاہے عدت بیٹھے، کیونکہ جب حضرت
 عمر فاروق رضی اللہ عنہ فوت ہوئے، تو حضرت علی علیہ السلام اپنی بیٹی ام کلثوم رضی اللہ عنہا
 کو اپنے گھر لے گئے۔

علیٰ ہذا القیاس کتاب طراز المذہب المتطہری مصنفہ میرزا عباس قلی ناں وزیر
 مجلس شوریٰ کبریٰ سلطنت ایران جلد اول ص ۶۷ میں اس نکاح کے متعلق تمام

علمائے شیعہ کا اتفاق اور ان کی اس نکاح کے متعلق تصریحات ملاحظہ فرمائیں۔ یہ کتاب شاہ ایران مظہر الدین قاجار کی زیر سرپرستی لکھی گئی ہے۔

اس نکاح کا ثبوت تقریباً شیعہ کی ہر کتاب میں موجود ہے، مگر جن الفاظ کے ساتھ اہل بیت کرام کی عقیدت کا دم بھرنے والوں نے اس نکاح کا اقرار کیا ہے، مجھے اللہ تعالیٰ کی قسم ہے کوئی ذلیل سے ذلیل انسان بھی اپنے متعلق ان الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتا جن الفاظ کو اہل بیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان مدعیانِ توالی نے استعمال کیا ہے۔ کوئی شخص ان الفاظ کو دیکھ کر یہ بات تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس قسم کے الفاظ بدترین دشمن ہی منہ سے نکال سکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے مقبولوں کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرنے والا اسی دنیا میں عرق کیوں نہیں ہو جاتا۔

لہذا میں یہ جرات نہیں کرتا اور وہ الفاظ لکھ کر اپنی عاقبت تباہ نہیں کرتا۔ اہل تشیع کی ام المکتب فروع کافی جلد ثانی ص ۱۴۱ سطر ۷ مطبوعہ لکھنؤ کسی بڑے مدعی توالی اور معتقد اہل بیت سے سنیے۔ نیز ناسخ التواتر جلد ۲ ص ۳۶۳ و ص ۳۶۴ سطر ۷ ملاحظہ فرمائیں اور میری تمام تر معروضات کی تصدیق کریں کہ شانِ حیدری میں کس قدر بکواس اور سب و شتم شیعانِ علی نے کیے ہیں کوئی بڑے سے بڑا بد بخت خارجی بھی ان کے حق میں اس قسم کے الفاظ لکھنے کی جرات نہیں کرے گا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں یہ بکواس صرف اس لئے کئے ہیں کہ آپ نے سیدنا امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ کو رشتہ کیوں دیا ہے۔ کاش میرے بھولے بھالے برادرانِ وطن! شیعہ مذہب کی حقیقت سے واقف ہوتے۔

اے ساداتِ عظام! خدا کا واسطہ، کچھ سوچو اور ضرور سوچو۔ جس مذہب کی اس قدر معتبر کتاب میں حضرت سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شانِ اقدس میں اس قسم کے بکواس ہوں جو آپ کسی ذلیل سے ذلیل نوکر کو بھی نہیں کہہ سکتے، تو اس مذہب کے آپ نے کیا پھل پانا ہے؟ خدا ما اپنی عاقبت تباہ نہ کرو۔ آئیے اہم اہل سنت آپ کے بڑے اور آپ کے گھرانے کے غلام ہیں۔ ہم سے اپنے خاندانِ ہدایت کی عزت و ناموس کے متعلق صحیح روایات سنیے اور خاندانِ نبوت کی شان کو ملاحظہ فرمائیے۔

یہی روایت جس کے لکھنے سے میرادل لرز گیا اور میرے ہاتھ سے قلم گر گیا اور اللہ کی قسم میں لکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اہل تشیع نے اپنی معتبر کتاب ناسخ التواتر جلد دوم حصہ ۲ ص ۲۶۳ سطر ۲۹ پر بڑے شد و مد کے ساتھ اور ثبوت نکاح میں یہ تمام صفحہ اور ص ۳۶۴ علیٰ ہذا القیاس ص ۴۳۳ بھی ملاحظہ فرمائیے اور اس کے بعد اور نہیں، تو شیعان حیدر کرار کو یہ ہی پڑھ کر سنا دیجئے کہ ع

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسمان کیوں ہو
مگر درحقیقت دوست نہاد دشمن کے بغیر اہل تشیع کے مذہب کی بنیاد اور کوئی نہیں رکھ
سکتا۔ مذکورہ بالا عبارات کو پڑھ کر یقیناً اہل انصاف سیری تصدیق کریں گے

سینہ کو بی کا موجب اصلی

ممکن ہے کہ بھولے بھالے برادرانِ وطن کہیں جو لوگ سال بہ سال حضرت امام
عالی مقام زندہ جاوید کا ماتم کرتے ہیں اور اپنے سینوں کو پیٹ پیٹ کر خون خون کھیتے
ہیں، یہ کیسے کسی دشمن کی تقلید میں مذہب تشیع اختیار کر سکتے ہیں یا جس نے یہ مذہب گھڑا
ہے، وہ کیونکر اور کیسے دشمن اہل بیت ہو سکتا ہے؟

اس کا فطرتی جواب صرف اتنا ہے کہ اس قسم کی روایات گھڑنے کی سزا یہی
ہو سکتی ہے اور جن ہستیوں کو امام عالی مقام سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، امام الہدیٰ
شیخ الاسلام، حبیب، مقتدا اور پیشوا فرمائیں، جن کے ہاتھ پر بیعت کریں جن کو
لطیفِ خاطر رشتے دیں، اُن کی شانِ اقدس میں علانیہ بکواس بکنے کی دُنیا میں یہی سزا
ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنے منہ اور اپنے سینوں کو پیٹ پیٹ کر اڑا دیں۔

ورنہ محبت کے تقاضے پر یہ کارروائی معنی ہوتی، تو اس کی ابتدا حبید کرار
رضی اللہ عنہ کرتے۔ ان کے بعد یازدہ ائمہ کرام اس پر عمل کرتے، مگر یاد رکھو یہ کسی بدست
مجرم خدا کی سزا سے ہی شروع ہوتی ہے۔

اے آلِ حیدر کرار، آپ اپنے جدِ امجد کی سنت تلاش فرمائیے اور اپنے تمام
اجدادِ طاہرین کی سنت کی پیروی اختیار کریں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اس قسم کی روایات

گھڑنے اور ان کو رائج کرنے کا یہ ایک سیاسی کرتب تھا تا کہ بیوقوف اور کم سمجھ لوگ اس قسم کی غلط روایات کے باوجود ہمیں محب سمجھتے رہیں گے اور ہم آسانی کے ساتھ اپنا مذہب رائج کرتے رہیں گے۔ آپ دعویٰ محبت کے کوٹ اور پردہ کے اندر دیکھئے اور اس زہر قندانہ دوسے بچئے۔ خیر یہ ایک مخلصانہ مشورہ تھا جو موضوع سے نکال کر لے گیا۔

اب ائمہ طاہرین معصومین کی روایات سے خود اہل تشیع کی کتابوں میں جب یہ بات مل گئی کہ ائمہ طاہرین نے خلفاء راشدین کو سدیق مانا، ان کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کو امام الہدیٰ، شیخ الاسلام، مقتدار اور پیشوا تسلیم کیا، ان کے حق میں سب شتم بکنے والوں کو قتل کیا، سزائیں دیں اور اپنی مجلس سے نکالا بلکہ خلفاء راشدین کی شان میں سب بکنے والوں کو مسلمانوں کی جماعت سے نکالا اور یہ بھی مسلم ہے کہ ائمہ طاہرین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے پاک احسن دلوں میں غیر خدا کا خوف نہیں آسکتا تھا اور ارشاد خداوندی: وَلَا تَخَافُوهُمْ خَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ یعنی اگر تم مومن ہو تو میرے بغیر کسی سے مت ڈرو، پر ان کا پورا پورا ایمان تھا اور میدانِ کربلا میں اپنے اس ایمان کا عمل پیش کیا، تو پھر وہ تمام تر ارشادات جو ائمہ نے فرمائے اور وہ تمام تر اخوت اور مودت کے عملی ثبوت جو انہوں نے ہم پہنچائے صرف صدق و صفا اور طاہری و باطنی صداقت ہی کی بنا پر فرمائے۔

خلافت خلفاء سابقین کے متعلق جن واضح اور غیر مبہم کلمات طبعیات کے ساتھ حضرت سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے قطعی فیصلہ دیا ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اس کے بعد فتنہ و فساد پیدا کرنا اور خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شانِ اقدس میں سب شتم بکنے اور محبت علی کہلوانا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ جھٹلانا اور پھر دعویٰ محبت و تولیٰ کرنا ایمان تو بجائے خود کسی معقولیت پر بھی مبنی نہیں ہو سکتا۔ تحفہ حسینیہ، اذالہ الحسنان، مہر اشرف السیالوی وغیرہ

نتمہ بمبحث نکاح حضرت ائمہ کلثوم رضی اللہ عنہا

یہ سندہ قدیم ایام سے محل نزاع اور معرکہ الارار بنا ہوا ہے اور طاہر ہے کہ

خوشی اور رضامندی سے اس نکاح کا انجام پذیر ہونا شیعہ مذہب کو زنج و بٹن سے اکھڑنے والا ہے، اس لیے شیعہ حضرات اس میں ہزار تاویل کریں گے اور اس کو چھپانے یا ایسا رنگ دینے کی مقدور بھرسعی کریں گے کہ اس سے فاروقی اور مرتضوی تعلقات کی خوش گواری ثابت نہ ہو سکے اور اگر یہ نکاح ثابت ہوتا ہے تو حضرت ہر رضی اللہ عنہا کی ناراضگی کے افسانے اور غضب فدک اور غضب خلافت کے افتراءات حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں، لہذا سبائی ذہنیت نے اس کو عجیب عجیب رنگ دینے کی کوشش کی ہے، لیکن حقیقت نہ چھپنی تھی اور نہ ہی چھپی اور ان کی عام کتابوں سے لے کر صحاح اربعہ تک میں اس کا اعتراف موجود ہے۔ فروع کافی جلد ثانی میں عنوان قائم کیا، باب فی تزویج ام کلثوم اور پہلی روایت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ نقل کی ہے۔

۱۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام ان ذالک فرج غصبتہ فروع کافی جلد ثانی ص ۱۴۱ بے شک یہ ایسا رشتہ ہے جو ہم سے غضب کر لیا گیا ہے العیاذ باللہ! وکذا فی الشانعی لعلم البدی۔

حضرات ذرا اپنے گریبان میں جھانکیں اور دل سے فیصلہ طلب کریں کہ اگر تمہارے ساتھ ایسا معاملہ پیش آئے، تو ایسے شخص غاصب کو نمازیں امام اور پیشوا بناؤ گے؟ اس کا وزیر اور مشیر بننا پسند کرو گے؟ اس کے ہاتھوں سے تحالف اور وظائف وصول کرو گے؟ اور اس کو اسلام میں بلند مرتبت شخص اور اس کی وفات کو اسلام کے لیے ناقابل تلافی نقصان اور نہ مندمل ہونے والا زخم قرار دو گے؟ اور اس کو راستہ وادراہ راست پر چلانے والا، بے عیب اور پاک دامن کی حالت میں دنیا سے جانے والا، خیر اور مصلحتی کو ذخیرہ کرنے والا اور شر و فساد سے امن بچا کر نکل جانے والا وغیر ذالک من الادصاف کا مالک قرار دے سکتے ہو؟ قطعاً نہیں، بلکہ جو نہی موقع ملے گا، اس کے وجود کو لوح جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو گے۔ تو اس روایت کے پس منظر میں مولا علی رضی اللہ عنہ بلکہ تمام بنو ہاشم اور تمام بنو عبدمناف کا کیا مقام رہ جاتا ہے؟ کیا اہل بیت کرام کی

اس سے بڑی دشمنی اور عداوت بھی کوئی ہو سکتی ہے جو دوستی اور محبت کی آڑ میں سر انجام دی گئی ہے۔

۲۔ عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال لما خطب الیہ قال انہا صبیۃ قال فلقی العباس فقال له مالی ابی باس فقال وما ذاک قال خطبت الی ابن اخیک فردنی اما واللہ لا اعودن زمزم ولا ادع لکم مکرمۃ الا ہدمتھا ولا قیمین علیہ شاہدین بانہ سرق ولا قطعن یمینہ فاتاہ العباس فاخبرہ وسأله ان یجعل الامر الیہ فجعلہ الیہ۔

حضرت ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی اور منقول ہے کہ جب سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے پاس نکاح کا پیغام بھیج دیا تو انہوں نے فرمایا: ام کلثوم ابھی بچی ہے۔ تو عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی اور فرمایا: مجھے کیا ہے؟ کیا مجھ میں کوئی عیب اور نقص ہے؟ آپ نے دریافت فرمایا: آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو فرمایا میں نے آپ کے بیٹے سے رشتہ طلب کیا ہے، لیکن انہوں نے میری التجار کو رد کر دیا ہے۔ بخدا! میں تم سے زمزم واپس لے لوں گا اور اس کے ملاوٹ نہاری ہرگز نہ بزرگی اور ساز و سامان فخر و ناز کو ختم کر دوں گا اور میں دو گواہ قائم کر کے حضرت علی بن ابی طالب نے چوری کی ہے، اس کے دائیں ہاتھ کو کاٹ دوں گا۔ چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی میت میں حاضر ہوئے اور صورت حال سے ان کو باخبر کیا اور اس نکاح کا معاملہ ان کے سپرد کرنے کا مطالبہ کیا؛ چنانچہ آپ نے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر کے ساتھ نکاح کا معاملہ حضرت عباس کے سپرد کر دیا اور انہوں نے زمزم کی سقایت اور یہ شرف برقرار رکھنے کے لیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ کٹنے کے ڈر سے حضرت ام کلثوم کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح کر دیا۔ وکذا فی الانوار النعمانیۃ للعلامة الجزائری جلد اول ص ۸۳ وکذا فی اشافی بعلم الہدی ص ۲۱۶

اب اس افسانہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق

کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شیریں اور دلیری اور اسدا للہی شان کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ اور تمام بنو ہاشم اور بنو عبد مناف کے متعلق کیا تاثر قائم ہوتا ہے؟ امام حسین رضی اللہ عنہ کو ہر حیلہ و بہانہ کے باوجود بیعت کے لیے نہ جھکایا جاسکا اور شیر خدا رضی اللہ عنہ کو رشتہ دینے کے لیے خالی دھمکی دے کر جھکالیا گیا اور آپ کے اس کے اس فرمان "المنیۃ ولا الدنیۃ" کی دھجیاں اڑادی گئیں کہ موت قبول کی جاسکتی ہے، مگر ذات قبول نہیں کی جاسکتی۔ کوئی معقول شیعہ عالم ہے جو مظلوم کربلا سید الشہداء کے عمل اور علی مرتضیٰ شیر خدا رضی اللہ عنہما کے اس عمل و کردار میں تطبیق دے سکے اور باپ

بیٹے بلکہ امام اہل اور امام ثالث میں وحدتِ فکری ثابت کر سکے۔
ترویج اُم کلثوم کی وجہ سے حضرت علی کی جہنم عباس پر راضی

قاضی نور اللہ شوستری صاحب فروع کافی کی اس دوسری روایت میں مزید ہنگ بھر کر اسے ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں،

۳۔ در کتاب استغاثہ وغیرہ منقول است کہ چون عمر بن الخطاب بحجت ترویج خلافت فاسدہ خود داعیہ ترویج اُم کلثوم دختر حضرت امیر نمود و آن حضرت جہت اقامت حجت امتناع نمود، آخر عمر عباس را نزد خود طلبید و سوگند خوردہ گفت اگر علی را بدامادی من راضی نہ سازی آنچه در دفع او ممکن باشد خواہم کرد و منصب ستفایت حج و زمزم را از تو خواہم گرفت عباس ملاحظہ نمود کہ اگر این نسبت واقع نشود آن خطا غلط ترکیب چنان امرنا صواب خواہد شد۔ از حضرت امیر علیہ السلام التماس و الحاح نمود کہ دلایت نکاح آن مطہرہ مظلومہ را با او تفویض نماید و چون مبالغہ عباس در آن باب از مدگزششتہ آن حضرت از رویے اکراہ ساکت شدند تا آن کہ عباس از خود ارتکاب ترویج او نمود و جہت اطفاء نائرہ فتنہ او را بآن منافق ظاہر الاسلام عقد فرمود و ظاہراً بواسطہ این کالت فضولی و امثال آن حضرت امیر علیہ السلام عباس را مانند دیگر یاران فدائی خود راضی و محبت و اخلاص نہی دانست و مجالس المؤمنین جلد اول ص ۱۸۲

کتاب استغاثہ وغیرہ میں منقول ہے کہ جب عمر بن الخطاب نے اپنی خلافت فاسدہ کی ترویج و ترقی کے لیے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اُم کلثوم

رضی اللہ عنہا کے ساتھ نکاح کا پختہ ارادہ کر لیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اتمام حجت اور اقامت برہان کے لیے اس سے امتناع اور گریز ظاہر کیا، تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اپنے پاس بلایا اور کہا: میں نے قسم کھالی ہے کہ اگر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ مجھے اپنی دامادی کا شرف نہیں بخشیں گے اور تم ان کو ہر قیمت پر راضی نہیں کرو گے تو میں اس رکاوٹ کو دور کرنے میں ہر ضروری اقدام کروں گا اور تم سے حاجیوں کو آب زمزم پلانے کا منصب چھین لوں گا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ اگر یہ عقد نکاح نہ ہوا، تو وہ سخت مزاج اور تند خواہیے تا صواب اور نامناسب امر کے ارتکاب سے گریز نہیں کرے گا، لہذا حضرت امیر علیہ السلام سے التماس اور زاری کی کہ اس مطہرہ و مظلومہ کا حق تزویج مجھے سوئپ دو اور جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا اس مطالبہ میں مبالغہ اور التماس و الحاح انتہا کو پہنچ گیا تو حضرت امیر علیہ السلام مجبوری و بے بسی کی وجہ سے خاموش ہو گئے تا آنکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے طور پر ان کا نکاح اور شادی کر دی اور فتنہ کی آگ بجھانے کے لیے اس ظاہری اسلام والے منافق کو عقد کر کے دے دیا اور اس وکالت فضولی اور اس قسم کے دیگر معاملات کی وجہ سے حضرت علی، حضرت عباس رضی اللہ عنہما، کو اپنے دوسرے فدا یوں اور جان نثار یاروں کی طرح محبت و اخلاص میں راسخ اور ثابت قدم نہیں سمجھتے تھے۔

تنبیہ: قاضی نور اللہ شوستری کی اس عبارت سراپا طلست و شقاوت میں کئی امور قابل غور ہیں:

۱۔ اس عقد تزویج کا بنیادی مقصد اپنی خلافت کی ترویج و ترقی تھا اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کی حقانیت کو راسخ کرنا تھا اور ہر شخص پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ مقصد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام کلثوم کے ساتھ نکاح سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا جو کہ بقول بعض شیعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بی بی تھیں، بلکہ صرف اور صرف آپ کی صلیبی بیٹی سے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔

نیز یہ اعلیٰ مقصد باہمی رضامندی اور صلح و صفائی سے طے ہونے والے رشتے

کے ذریعے ہی حاصل ہو سکتا تھا۔ جبر و اکراہ اور ظلم و تعدی سے تو وہ متصد بالکل فوت ہو جاتا، لہذا واضح ہو گیا کہ یہ لوگوں نے یہاں سیاقی ذہنیت کا کامل مظاہرہ کیا ہے، اور سنتِ اسلاف کو اپناتے ہوئے تحریف سے کام لیا ہے۔

۲۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے سقایت حج اور زمزم پر تصرف و تسلط قرار رکھنے کے لیے حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کو بھینٹ چڑھا دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے سامنے مجبور و بے بس ہو گئے۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کی اجازت نہیں دی تھی اور یہ نکاح ولایت فضولی سے طے پایا، حالانکہ نکاح فضولی میں فریقین کی رضامندی ضروری ہے اور حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا بقولِ شیعہ نابالغہ بھی تھیں جو کہ اذن دے ہی نہیں سکتی تھیں اور دلی اقرب کے ہوتے ہوئے بھی دلی بعد کا نکاح بلا اجازت اس کے منعقد ہو ہی نہیں سکتا تو اس عقد کے بعد رخصتی اور ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا شرعی حکم اور حیثیت کیا ہوگی اور کوئی غیرت مند باپ خواہ عامی قسم کا ہی کیوں نہ ہو، وہ بھی ایسی حرکت برداشت نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچے عباس اور آپ کے پیارے بھائی علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما ایسے غلط اور ناجائز امر کا ارتکاب کریں۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس خبیث نے منافق ظاہر الا سلام کہا اور اگر حضرت عباس اور حضرت امیر رضی اللہ عنہما کی نظر میں بھی وہ ایسے ہی تھے، تو منافق جو کہ باطن کافر ہوتا ہے، اس کے ساتھ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچے اور بھائی نے آپ کی نواسی کا نکاح کیونکر کیا؟ اور عام اہل اسلام نے اس سے کیا تاثر لیا؟ کہ یہ رشتہ منافق کو دیا ہے یا کامل مومن کو؟ گویا دوسری خرابی اور فساد لازم آگیا۔ ایک تو کافر کے ساتھ دید و انستہ رشتہ داری قائم کرنا دوسرا لوگوں کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرنا کہ وہ مومن کامل اور مخلص مسلمان ہیں اور دامادی علی بلکہ دامادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائق اور اہل ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔ کیا اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مشعلِ راہ ہدایت ہوا کرتا ہے یا ضلالت و غوایت کا سبب و ذریعہ؟

۵۔ علاوہ ازین حضرت علی رضی اللہ عنہ پر دباؤ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دھمکیاں (جیسا کہ شوستری کے قول میں آپ ملاحظہ فرما چکے اور فروع کافی کے حوالے سے بھی) اس امر کی بقیہ دلیل ہیں کہ جن کا رشتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مطلوب تھا، وہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کی لخت جگر اور نورِ نظر تھیں، ورنہ تو یہ دہاؤ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اولاد پر ہونا چاہیے تھا، کیونکہ شرعی طور پر وہی اولیاء اور ورثاء تھے، لہذا اس کے لئے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس تہدید و تشدید اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے لئے انذار و تحویف کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟

بیوہ کی عدت کا حکم اور حصرائِمِ کلثوم کا تذکرہ

بیوہ عورت کے مقامِ عدت کے ضمن میں فروع کافی، الاستبصار، اور تہذیب الاحکام میں متعدد روایات اس مضمون کی مذکور ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد اپنی لختِ جگر امِ کلثوم کو اپنے سسرال میں عدت بٹھانے کی بجائے اپنے گھر لا کر عدت بٹھایا، جس سے یہ مسئلہ ثابت کیا گیا کہ وہ عورت جس کا خاوند فوت ہو جائے، وہ جہاں چاہے عدت گزارے، اپنے فوت خاوند کے گھر اس کا عدت گزارنا ضروری نہیں ہے۔ اس باب میں فروع کافی کے اندر مذکور روایات میں سے پہلی روایت حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز نے نقل فرمائی، جس کا یہ جملہ قابلِ غور ہے۔

۱۰۳۔ ان علیاً لما توفي عمرانی امر کلثوم فأنطلق بها الى بیتی

یعنی جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وصال ہو گیا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لائے اور امِ کلثوم رضی اللہ عنہا کو اپنے گھر لے گئے۔ اگر وہ آپ کی صاحبزادی نہیں تھیں، تو خود جانے کی بجائے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی اولاد کو بھیجتے یا ان کو ہمراہ لے جاتے نہ بوقتِ عقدِ نکاح اور تزویج ان کا ذکر اور نہ بوقتِ بیوگی ان کا ذکر۔ آخر یہ مابرا کیا ہے کہ اصلی ورثاء کا کہیں نام و نشان ہی نہ ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہر جگہ ذکر ہو؟

جس سے صاف ظاہر ہوا اور دوپہر کے اُجالے سے بھی زیادہ روشن کہ اس اُمّ کلثوم کے اصل ولی اور وارث ہی آپ تھے نہ کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان اور دوسری روایت میں مضمون ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

۴۔ ثم قال ان علياً صلوات الله عليه طامات عمرات اُمّ کلثوم فاخذ بيد هافا فطلق بها الى بيتہ۔ (فروع کافی جلد ثانی ص ۳۱۱/۳۱۲)
اور ہر دور روایت میں یہ فرمان حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور اس طرح استنبصار جلد ثانی میں بھی اسی عنوان کے تحت چند روایات درج ہیں اور تہذیب الاحکام جلد ۵ ص ۱۶۱ پر بھی دو روایات اسی مضمون کی درج کی گئی ہیں۔ اگر سب کو علیحدہ علیحدہ شمار کریں تو چھ روایات بنتی ہیں۔

۵۔ عن جعفر بن محمد القمي عن القداح عن جعفر عن ابيه قال ماتت اُمّ کلثوم بنت علی وابنها زید بن عمر بن الخطاب في ساعة واحدة لا يدري ايهما هلك قبل فلم يورث احدهما من الاخر وصلى عليهما جميعاً۔

یعنی جعفر بن محمد قمی نے قداح سے اور اُس نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ حضرت امام محمد باقر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضرت اُمّ کلثوم بنت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور ان کے صاحبزادے حضرت زید بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کا ایک ہی وقت میں وصال ہو گیا اور یہ تحقیق نہ ہو سکی کہ کس کا وصال پہلے ہوا ہے، لہذا کسی کو دوسرے کا وارث نہ بنایا گیا اور ان دونوں پر اکٹھی نماز جنازہ ادا کی گئی۔

فائدہ ۱: اس روایت میں بھی حضرت اُمّ کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا ذکر ہے اور ہر جگہ راوی امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں یا امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے لہذا اس کو مؤرخین کی غلطی تو نہیں کہہ سکتے۔ اگر یہ مجاز تھا تو کہیں حقیقت کا بھی ذکر ہونا چاہیے تھا اور اُمّ کلثوم بنت ابی بکر یا اُمّ کلثوم بنت اسماء کا بھی ذکر آ جاتا جب اس طرح نہیں اور بالکل نہیں تو صاف ظاہر ہو گیا کہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے بطن اقدس سے متولد ہونے والی تھیں۔

نکاح ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کے متعلق شیعہ روایات

تاویل اول، اس تاویل کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نکاح جبر و اکراہ کے ساتھ ہوا۔ لہذا کسی فضیلت اور رفعت مرتبت کا موجب نہیں ہے۔ سید نعمتہ اللہ موسوی جزائری نے انوار النعمانیہ میں اس عقد تزویج پر بحث کرتے ہوئے لکھا،

قد تفصّلی الاصحاب عن هذا بوجهين عامي وخاصي اما الاول فقد استفاض في اخبارهم عن الصادق عليه السلام لما سئل عن هذه المناكحة فقال انه اول فرج غصبتا۔ یعنی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آنے پر جو اشکال وارد ہوتا ہے کہ دین اسلام سے العیاذ باللہ ان کے مرتد ہونے کے باوجود یہ نکاح کیسے ہو گیا، تو علماء امامیہ نے اس سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے دو وجہیں ذکر کی ہیں۔ ایک جو سب کو معلوم ہے اور دوسری جو خواص تک محدود ہے۔ وجہ عام یہ ہے کہ شیعہ کی حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ستفیض و مشہور اور متواتر روایات سے ثابت ہے کہ جب آپ سے اس نکاح کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا، یہ پہلا رشتہ ہے جو ہم سے غصب کیا گیا اور جبری طور پر لیا گیا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) اس پر دلیل دبرلمان پیش کرتے ہوئے اور اس استبعاد و بلکہ استحالة کو زائل کرتے ہوئے جزائری صاحب نے کہا،

وتفصيل هذا ان الخلافة قد كانت ائمة على امير المؤمنين من الاولاد والبنات والازواج والاموال والى، فاذا لم يقدر على الدفع عن مثل هذا الامر الجليل وقد كان معذورا كما سيأتي الكلام فيه عند ذكر اسباب التقاعد عن الحرب في زمان الثلاثة ائمة الله والتقية باب فتح الله سبحانه للعباد وامرهم بارتكابه والنزاهة كما اوجب عليهم الصلوة

والقیام حتی انه ورد عن الأئمة الطاهرين عليهم السلام
لادين لمن لا تقية له فقبل عذرة في مثل هذا الامر الجرحي
وذلك انه قد روى الكليني الخ۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ خلافت حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو اولاد
بنات، ازدواج اور اموال سے زیادہ عزیز تھی، کیونکہ دین کا انتظام، سنت کی تہمید و تحمیل
دفع جوہر اور احیاء حق اور امانت باطل، نیز تمام دنیوی اور اُخروی فوائد اس پر موقوف تھے،
تو جب ایسے حلیل القدر اور عظیم الشان امر سے دفاع نہ کر سکے، جس طرح کہ معاویہ بن ابوسفیان
کے دور میں کیا اور اس خلافت کی خاطر ساٹھ ہزار آدمی معاویہ کے لشکر سے قتل کیے اور
بیس ہزار اپنے لشکر سے قتل کروائے۔ تو جب خلفائے ثلاثہ کے دور میں ہم نے ترک خلافت
میں آپ کو معذور سمجھ لیا ہے اور واقعی آپ معذور بھی تھے جیسا کہ اس کے اسباب پر
بعد میں روشنی ڈالیں گے اور پھر تقیہ کا دروازہ بھی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے
کھول رکھا ہے، بلکہ اس پر عمل کا حکم دیا اور اس کو لازم و ضروری ٹھہرایا ہے جیسے کہ نماز
اور روزہ کو فرض کیا ہے اور ائمہ طاہرین سے مروی و منقول ہے کہ جس کے لیے تقیہ نہیں،
اس کے لیے دین نہیں ہے، لہذا ہم اس قسم کے جزوی اور انفرادی معاملہ میں بھی آپ کو
معذور سمجھیں گے اور اس پر بطور استشہاد وہ روایت نقل کی ہے جو ہم قبل ازین کلینی کے
حوالے سے نقل کر چکے ہیں۔ یعنی باب تزویج ام کلثوم کے تحت مندرج دوسری روایت۔

سوال و جواب، اس تقریر کے بعد جزائری صاحب کو ایک سوال پوچھا

اور اس کا جواب بھی لازمی اور ضروری سمجھا، لہذا اسی کی زبانی سوال و جواب ملاحظہ کریں۔

أما الشبهة الواردة على هذا وهي انه يلزم ان يكون عسرًا زانیا
في ذلك النكاح وهو مما لا يقبله العقل بالنظر الى أم كلثوم
فالجواب عنهما بوجهين۔ زہا اس عقد پر وارویہ شبہ کہ اس طرح تہدید و تشہید
اور وعید و تکرار کے بعد ہونے والے نکاح میں عمر بن الخطاب کا زانی ہونا لازم آتا ہے حالانکہ ام کلثوم
رضی اللہ عنہا کے لحاظ سے عقل اس کو باور نہیں کرتی، تو اس کا جواب دو وجہ سے ہے۔

احدھما ان امر کلثوم لا حرج علیہا فی مثلہ لاطاہراً ولا
واقعا وھو ظاہر واما ھو فلیس بزانی فی ظاہر الشریعة لانہ
دخول ترتب علی عقد باذن الولی الشرعی واما فی الواقع و فی
نفس الامر فعلیہ مثل عذاب الزانی بل عذاب کل المساوی
والقباح۔ پہلی وجہ جواب کی یہ ہے کہ ایسے نکاح میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا پر
تو ظاہر و باطن اور واقع و حقیقت کے لحاظ سے کوئی حرج نہیں ہے جیسے کہ ظاہر ہے۔
رہے عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، تو وہ بھی ظاہر شرع کے لحاظ سے نوزنا کا نہیں ہیں،
کیونکہ ان کے ازدواجی تعلقات تو دلی شرعی کے اذن کے بعد پایہ تکمیل کے واقع اور نفس الامر
میں ان پر زنا کا عذاب، بلکہ جملہ اہل کبار اور ارباب قباح کی مانند عذاب ہوگا۔
الثانی، ان الحال لما آل الی ما ذکرنا من التقیۃ فیجوز
ان یکون قد رضی علیہ السلام بتلك المناکحة رفعاً لدخوله
فی سلك غیر الوطی المباح۔

یعنی دوسری وجہ جواب کی یہ ہے کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عمر بن الخطاب
رضی اللہ عنہ کے ساتھ عقد تزویج کا حال تقیہ کی طرف راجع ہے جیسے کہ ہم نے ذکر کیا،
تو عین ممکن ہے کہ آپ اس عقد پر راضی ہو گئے ہوں تاکہ یہ ازدواجی تعلق حرام اور ناجائز
مباشرت کے ضمن میں نہ آنے پائے۔ (انوار نعمانیہ جلد اول، ص ۸۳)

الغرض اس عامی وجہ جواب میں مناکحت تسلیم ہو گئی اور اس کا شرعی جواز بھی ثابت
ہو گیا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے لیے ہر قسم کے حرج وغیرہ کی نفی بھی ثابت ہو گئی اور
حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی ظاہر شرع کی رُو سے عقد صحیح کے ساتھ ازدواجی تعلقات
استوار کرنا واضح ہو گیا اور یہی اس وقت ہمارا مدعا اور مقصود ہے کہ یہ نکاح وقوع پذیر
ہوا اور رخصتی بھی ہوئی۔ خواہ جبر و اکراہ اور تغلیظ و تشدید کے بعد بطور تقیہ جیسے کہ شیعہ
صحابان کا گمان ہے۔ خواہ باہمی رضا مندی اور خوشنودی سے جیسے کہ اہل سنت کا
عقیدہ ہے لیکن یہ حقیقت محتاج وضاحت نہیں کہ اس تکلف و تصنع اور تقیہ وغیرہ کے

سہارے کی ضرورت اسی صورت میں پیش آسکتی ہے، جبکہ یہ اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی تخت جگر ہوں، ورنہ نہیں۔

عقد اُمّ کلثوم اور سید مرتضیٰ علم الہدی

اہل تشیع کے مسلم متکلم اور فاضل سید مرتضیٰ علم الہدی ابوالقاسم علی بن حسین جو کہ امام موسیٰ کاظم رضی اللہ عنہ کے پانچ واسطوں سے فرزند ہیں اور گویا یہ مسئلہ اُن کے ہی گھر کا ہے، اس لیے ان کا قول اس معاملہ میں حرفِ آخر سمجھا جانا چاہیے اور اس کے بعد چوں و چرا کی گنجائش شیعہ کے لیے نہیں رہنی چاہیے۔ علی الخصوص جبکہ شیعہ اس کو علم الہدی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قاضی عبدالجبار نے متغنی میں یہ طرز استدلال اختیار کیا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اپنی تخت جگر اور حضرت زہرا کی نورِ نظر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے نکاح کرنا اس امر کی بین اور واضح دلیل ہے کہ ان میں باہمی محبت اور مودت تھی اور کسی قسم کی مخالفت اور عداوت نہیں تھی اور نہ ہی نگاہِ مرتضوی میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ مرتد تھے، ورنہ مرتد کے ساتھ اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کیونکر کرتے۔

زوج ابنتہ من فاطمة بعضهم ويقولون كل ذلك دال على الولاية وخلاف العداوة (الی)، وكيف يزوج مرتد ابنتہ۔ تو اس کا جواب دیتے ہوئے شیعہ فاضل سید مرتضیٰ نے اپنی معروف و مشہور کتاب شافی میں کہا، فاما تزويجه بنته فلم يكن ذلك عن اختيار والخلاف فيه مشهور فان الرواية دلت بان عمر خطبها الى امير المؤمنين عليه السلام فدافعه وما طله فاستدعى عمر العباس (الی)، فقال له امرها الى ففعل فزوجه العباس اياها ويبين ان الامر جري على اكرالا ما روى عن ابي عبد الله جعفر بن محمد من قوله ذلك غصبا عليه على انه لو لم يجز ما ذكرناه لم يمنع ان يزوجه

عليه السلام لانه كان على ظاهر الاسلام والتمسك بشرائعه
واظهار الاسلام - شافى ص ۲۱۶

ربا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا اپنی صاحبزادی کا نکاح ان سے کرنا تو وہ اختیار
اور رضامندی سے نہیں ہوا تھا اور اس میں اختلاف مشہور ہے، کیونکہ روایت میں وارد
ہے کہ عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے مطالبہ پر آپ نے جواب دے دیا تو انہوں نے
حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو بلا کر زمزم کی ستائیت اور اسبابِ مکرمات چھین لینے اور
حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چوری کی شہادت قائم کر کے ہاتھ کاٹ ڈالنے کی دھمکی دی، تو
انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس نکاح کا معاملہ اپنے ہاتھ میں دیتے جانے کا
مطالبہ کیا جس کو حضرت امیر علیہ السلام نے قبول کیا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے یہ
نکاح پڑھا دیا اور اس جبر و اکراہ کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو امام
جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ یہ رشتہ ہم سے غصب کیا گیا اور اگر یہ درست
نہ بھی ہو جو وجہ ہم نے ذکر کی ہے، تو پھر بھی حضرت امیر علیہ السلام کے نکاح کر دینے میں کوئی
وجہ امتناع و استحالة نہیں ہے، کیونکہ عمر (رضی اللہ عنہ) بظاہر اسلام پر تھے اور احکام اسلام
کے ساتھ متمسک تھے، بلکہ اسلام کو ظاہر اور غالب کرنے والے تھے۔

عقد اقم کلثوم اور ابو جعفر طوسی

سید مرتضیٰ کی کتاب شافعی کی تلخیص طوسی صاحب نے کی جس کا نام تلخیص الشافعی
رکھا اور طوسی صاحب شیعہ کے عظیم محدث بھی ہیں اور ان کی صحاح اربعہ میں سے دو کتابیں
یعنی الاستبصار اور تہذیب الاحکام اسی کی ہیں، لہذا اس مسئلہ میں اس کا قول بھی ملحوظ
کر تے چلیں، کیونکہ اس کا قول شیعہ عقائد اور احادیث کا مغز اور جوہر ہو گا اور سید مرتضیٰ کے
جواب کا ما حاصل، لہذا اسی کی زبان قلم سے اس عقد نکاح کا ثبوت بھی ملاحظہ کریں اور
اس کے جواز اور صحت و درستگی کے لیے توجیہات و تاویلات بھی مشاہدہ کریں اور اس
نکاح کے ناقابل انکار و تردید حقیقت ہونے کا اندازہ کریں اور علی الخصوص قاضی عہد الحجاب

کی اس تصریح کے بعد کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا جس کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا، وہ آپ کی صاحبزادی تھیں اور حضرت سید زہرا رضی اللہ عنہا کے بطن اقدس سے پیدا ہونے والی محنت جگر تھیں، مگر نہ سید مرتضیٰ اس کا انکار کر سکا اور نہ ہی ابو جعفر طوسی بلکہ جوازِ نکاح کے لیے مختلف تاویلات و توجیہات ذکر کیں، جن کا بطور اختصار کتاب الشافی سے ذکر کیا جا چکا ہے، اب اس کی تفصیل تلخیص الشافی سے پیش خدمت ہے۔ ابو جعفر طوسی صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق نہیں تھے اور غاصب و ظالم تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کو اپنی دامادی کا شرف کیوں بخشا؟

اما انکاحہ بنتہ عمر لم یکن الا بعد توعد و تہد و مناجاة و منارہة و کلام طویل معروف اشفق منه من شروق الحال و لظہور ما لا یزال یخفیہ و ان العباس لما رأى ان الامر یفنی او الوحشة و وقوع الفرقة سألہ علیہ السلام رداً لہ فیہ ففعل فزوجها منه و ما یجری هذا المجرى معلوماً علی غیر الاختیار علی انہ لا یمتنع ان یمسح الشیخ ان یناکح بالاکسارہ من لا یجوز مناکحتہ مع الاختیار لاسیما اذا کان المنکح مظهر لاسلام و المتمسک بظاہر الشریعہ ولا یمتنع ایضاً من مناکحتہ الکفار علی سائر انواع الکفر و انما المرجع فیما یجوز من ذالک الی الشریعة و فعل امیر المومنین اقوی حجة من احکام الشریعة۔ (تلخیص الشافی ص ۳۵۴)

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اپنی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کرنا تو یہ وعید و تہدید اور نزاع و اختلاف اور طویل گفتگو کے بعد پایا گیا، جس سے اُس حقیقت کے روشن ہونے اور اس امر کے ظاہر ہونے کا اندیشہ تھا جس کو آپ ہمیشہ چھپاتے تھے اور جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے دیکھا

کہ عقد نکاح و تزویج کا معاملہ وحشت و افتراق کا موجب بن رہا ہے، تو انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے حضرت ائمہ کثوم کا معاملہ اُن کے سپرد کرنے کو کہا، چنانچہ آپ نے یہ معاملہ اُن کے سپرد کر دیا، تو انہوں نے آپ کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ (۱) اور جس عقد نکاح اور تزویج کا حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہ اختیار اور رضا مندی کے ساتھ نہیں ہے۔

(۲) علاوہ ازیں شریعت مطہرہ میں یہ امر ممتنع اور محال نہیں ہے کہ اکراہ و اجابہ کی صورت میں ایسے شخص کو نکاح کر کے دینا جائز ہو، جس کے ساتھ اختیار و قدرت کے ہوتے ہوئے نکاح کر دینا درست نہ ہو۔

(۳) علی الخصوص جبکہ نکاح کیے جانے والا شخص اسلام کا ظاہر کرنے والا ہو اور ظاہر شرع پر عامل اور کاربند ہو۔

(۴) مزید یہ کہ تمام قسم کے کفار کے ساتھ نکاح کی ممنوعیت بھی ثابت نہیں اور نہ یہ نکاح ممنوع و محال ہے۔ اس ضمن میں حلت اور حرمت کا دار و مدار شرع پر ہے اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا فعل احکام شرع کے لیے ایک اہم دلیل و حجت ہے۔

و کذا فی تنزیہ الانبیاء للعلامة سید مرتضیٰ ص ۱۴ و طراز المذہب المنطقی ص ۵۹

فائدہ ۱۸، طوسی صاحب نے قاضی نور اللہ صاحب سے اس معاملہ میں اختلاف کیا ہے کہ نکاح حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اختیار ملنے کے بعد پڑھا، جبکہ قاضی شوستر نے اس کا قائل تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سکوت فرمایا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بلا اجازت آپ کے ساتھ نکاح کر دیا، جس سے بھانت بھانت کی بولیاں بالکل واضح ہو جاتی ہیں اور دل کا اضطراب اور بے چینی صاف نظر آتی ہے۔

دوسرا اضافہ طوسی صاحب نے یہ کیا کہ کفار کی تمام انواع و اقسام کے ساتھ بچیوں کا نکاح کرنا حرام نہیں ہے، بلکہ اس حلت و حرمت کا دار و مدار شریعت پر ہے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ خود شریعت کی سند اور معیار ہیں، لہذا آپ کا فعل ہی حجت شرع ہے۔

سبحان اللہ! حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عمل کتاب و سنت کے برعکس کیونکر ہو سکتا ہے، لہذا آپ کی طرف منسوب عمل کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھنا ضروری ہے، کیونکہ ائمہ اہل بیت پر بہت زیادہ افترا پردازی اور بہتان تراشی سے کام لیا گیا ہے جیسے کہ خود امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا فرمان رجال کشی میں متعدد جگہوں پر موجود ہے۔

قابل غور

ہر شیعہ محدث اور عالم اس بات پر منحصر نظر آتا ہے کہ براہ راست حضرت علی نے نکاح نہیں کر دیا بلکہ سیتہا حضرت عباس رضی اللہ عنہ درمیان میں آگئے، لیکن دریافت طلب امر یہ ہے کہ اس سے کوئی منفعت اور بچت تلاش کی جاتی ہے۔ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو نکاح ہی درست نہ ہوتا اور جب آپ کی اجازت سے ہوا، تو وہ آپ ہی کا پڑھایا ہوا نکاح سمجھا جائے گا، لہذا اس ہیرا پھیری کا کوئی فائدہ شیعہ حضرات کو نہیں پہنچ سکتا۔ الغرض ابو جعفر طوسی صاحب کے ان جوابات سے واضح ہو گیا کہ ان کے نزدیک اس ام کلثوم کو بنت علی رضی اللہ عنہا تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں ہے۔ علی المحض من جبکہ قاضی عبد الجبار نے ان کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا بھی لخت جگر قرار دیا، لیکن نہ علم الہدی سید مرتضیٰ صاحب شافی نے اس کا انکار کیا اور نہ ہی طوسی صاحب نے تلخیص میں اس کا انکار کیا، جس کے بعد شک و شبہ کا امکان ہی ختم ہو گیا۔

دوسری تاویل، راز علی بن اسماعیل ابو الحسن التمار الاسدی، دیگرے پُر سید کہ چہرہ آنحضرت دختر خود را بعمر بن الخطاب داد گفت بواسطہ آنکہ اظہار شہادت میں مینمود بزبان واقرا بغضل حضرت امیر میگرد و در آن باب اصلاح غلطت و فطالت اونیہ منظور بود و این معاملہ دشوار تر از آن نبود کہ حضرت لوط پیغمبر عرب و دختران خود بر قوم کفار سے نمود و بمضمون آیت کریمہ ھُوَ لَا یَنَاقِی ھُنَّ اَطْمَھُنَّ لکم الایۃ زبان مبارک کے کشود۔ (مجالس المؤمنین جلد اول ص ۱۵۴) یعنی ابو الحسن علی بن اسماعیل التمار الکوفی الاسدی سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی لخت جگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کیوں نکاح کر دی؟

تو انہوں نے کہا چونکہ وہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا بھی اعتراف کرتے تھے اور اس رشتہ داری کے ذریعے ان کی طبعی شدت اور سختی کو کم کرنا مقصود تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا اس مصلحت کے تحت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں چلے جانا اس سے زیادہ دشوار تو نہیں جو کہ حضرت لوط علیہ السلام سے مروی و منقول ہے کہ انہوں نے اپنی بیٹیوں کو قوم کفار پر پیش فرمایا اور زبان مبارک پر یہ مضمون اور کلام جاری فرمایا، یہ میری بیٹیاں حاضر ہیں، وہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ ہیں۔

تنبیہ، ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ اس مقتدا اہل تشیع نے کتنی دُور سے یہ کوئی لا کر اپنی برادری کو تسلی دینے کی ناکام کوشش کی ہے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کر کے دینے کو تیار تھے، حالانکہ قوم کافر تھی اور بیٹیاں مسلمان تھیں۔ اگر پیغمبر کے اس اقدام پر اعتراض نہیں اور اس واقعہ کو سن کر کوئی انہیں پیدا نہیں ہوتی، تو حضرت ام کلثوم کے عمر بن خطاب کے ساتھ نکاح میں کوئی الجھن ہے۔ جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ زبانی توحید و رسالت کا اعتراف کرتے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل کا بھی اقرار کرتے تھے، لہذا اس رشتہ داری میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی کوئی قابل اعتراض پہلو ہے۔

مقام حیرت و استعجاب ہے کہ وہ اسلام جو منافقین کے ساتھ جہاد اور تغلیظ و تشدید کا حکم دے۔ کما قال تعالیٰ: يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ وہ اسلام جو ظالموں کی طرف معمول میلان اور رغبت کو جہنم کی دہلیز آگ کا ایندھن بننے کا سبب قرار دے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَلَا تَوَكَّنْ إِلَى الْدِّينِ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ الْمَنَاقِبُ۔ وہ اسلام جو کفار کے ساتھ شادی بیاہ کو حرام قرار دے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔ صرف بغضِ فاروق رضی اللہ عنہ کی وجہ سے اب اس میں ترمیم و تفسیح فرما کر اسے حضرت لوط علیہ السلام کے دین کے مطابق ڈھالا جا رہا ہے۔

بہر حال شیعہ حضرات اس امر پر تلے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اسلام بدلا جاسکے، تو بدل دو، لیکن حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے درمیان باہمی محبت و اُلفت، بھائی چارہ اور برادرانہ روابط اور اخلاص و ہمدردی کسی قیمت پر ثابت نہیں ہونی چاہیے۔ العیاذ باللہ العظیم۔

الغرض یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ رشتہ اس غرض اور مصلحت کے تحت دیا گیا تھا کہ آپ کی طبیعت میں جو شدت و صلابت ہے، وہ کم ہو جائے، جبکہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فضائل و کمالات کے معترف بھی تھے اور یہ مطلوب و مقصود اور سبب و موجب بیان کرنا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے جبکہ یہ اہم مکتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ہوں۔ اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ہوتیں، تو یار لوگوں کے لیے جواب دینا بڑا سہل اور آسان تھا کہ جیسا خلیفہ اول، ویسا ہی خلیفہ ثانی اور لڑکی بھی خلیفہ اول کی، لہذا کیا ہوا جو یہ رشتہ طے ہو گیا۔ تیسری تاویل، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اپنے جملہ امور میں حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کرتے رہے اور منجملہ ان امور کے رشتہ دینا بھی تھا، جیسے کہ قاضی لواء شہرستری نے مجالس المؤمنین جلد اول ص ۲۰ پر بیان کیا ہے، امیر المؤمنین بعد از وفات سید المرسلین در سائر امور خود تاسی بہ آنحضرت می فرمود و اقتدار بوحایائے اُدیفرمود (تا) اگر او در ابتداء امر لکم و دینکم ولی دین می فرمود۔ این نیز ترک ریاست قوم بے دین نمود، اگر او بوقت عجز بغار فرار نمود، این بوقت عجز در خانہ بروئے خود فرار نہ کرد۔ اگر مصطفیٰ در اقل صلح نمود مرتضیٰ نیز در اول اصلاح نمود و اگر فی دختر عثمان داد ولی دختر بعمرفرستاد و اگر پیغمبر با خرقہ قتال کرد، علی نیز با خرقہ قتال کرد۔ (مجالس المؤمنین جلد اول ص ۲۰) یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات شریف کے بعد تمام امور میں آپ کی اقتدار کرتے رہے اور آپ کی وصیتوں پر عمل فرماتے رہے۔ اگر ابتداء حال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قوم کفار کو فرمایا، تمہارے لیے تمہارا

دین ہے اور میرے لیے میرا دین، یعنی تم مجھے نہ چھیڑو، میں تم سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بے دین قوم کے لیے اپنا حق ریاست حکومت ترک کر دیا۔ اور اگر حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بوقتِ عجز غار کی طرف فراغتاً فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی بوقتِ عجز و ناتوانی اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیا اور اندر بیٹھ گئے۔ اگر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء و آغاز میں قوم کفار کے ساتھ صلح فرمائی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی صلح و آشتی کا اظہار کیا اور اگر نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دامادی کا شرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو بخشا تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو اپنی دامادی کا شرف بخشا۔ اگر پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آخر میں حرب و قتال فرمایا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی آخر کار جنگ اور جدال فرمایا۔

تنبیہ، اقول، گویا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام پھر از سر نو شروع ہوا اور جس طرح اُس نے دور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں مکی اور مدنی زندگی میں زندگی میں مرحلہ وار ترقی پائی۔ اسی طرح دصال نبوی کے بعد پھر اس کا آغاز ہوا اور جو کیفیت و صورت کمال اور تکمیل دین کی آپ کے وقت وصال میں تھی وہ العیاذ باللہ ختم ہو گئی اور اس تدریج اور آہستہ روی کا ایک حصہ یہ بھی تھا کہ تدریج اسلام کی خاطر حضور نبی اکرم، رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی لختِ جگر کا نکاح حضرت امیر عثمان رضی اللہ عنہ سے کرنا پڑا اور بالکل اسی مقصد کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھی اپنی لختِ جگر کا عقد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کرنا پڑا۔ بہر حال اس تقریر پر دہن پر سے یہ واضح ہو گیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے کر دیا تھا نہ کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کا، کیونکہ اس صورت میں تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امیر علیہ السلام کے عمل میں بالکل مطابقت پیدا نہیں ہو سکتی نہ حضرت امیر کی آپ کے ساتھ متابعت متحقق ہو سکتی ہے۔

چوتھی تاویل، سیدت الشہزادہ نے ایک عامی وجہ اس نکاح اور عقد تزویج کی بیان کی جو پہلے ذکر ہو چکی، اب خاصی و جبر یعنی جو صرف خواص شیعہ کو معلوم تھی اور عوام شیعہ سے بھی اس کو مخفی رکھا گیا تھا، وہ وجہ ملاحظہ فرمائیں۔ اور اس میں وہ خود منفرد نہیں ہیں، بلکہ آپ نے اس کو بہار الدین علی بن عبد الحمید الحسینی النجفی کی کتاب ”انوار مضیہ“ کی جلد اول سے نقل کیا ہے اور انہوں نے اس کو شیخ مفید سے نقل کیا ہے، عبارت ملاحظہ ہو:

الوجه الخاص فقد رواه السيد عالم بهاء الدين علي بن عبد الحميد الحسيني النجفي في المجلد الاول من كتابه المسمى بالانوار المضیة قال مما جاز لي روايته عن الشيخ السعيد محمد بن محمد بن النعمان المفيد - گویا متفق گردید رائے ابو علی بارائے من بلکہ شیخ مفید نے اس کو عمر بن اذینہ کے واسطے سے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ تک پہنچا دیا ہے۔ اس توجیہ و تاویل کا ملخص یہ ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ اصلی ام کلثوم کا عقد تزویج نہیں ہوا، بلکہ ایک چن عورت ان کی شکل میں ڈھل کر عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی دہن بنی رہی۔

اب روایت ملاحظہ فرمائیں: قال عمر بن اذينة لابي عبد الله عليه السلام ان الناس يحتجون علينا ان امير المؤمنين زوج فلانا ابنته ام كلثوم وكان متكيا فجلس وقال اتقبلون ان عليا عليه السلام نكح فلانا ابنته؛ ان قوما يزعمون ذاك ما يهتدون الى سواء السبيل ولا الرشاد ثم صفق بيده وقال ما كان امير المؤمنين عليه السلام يقدر ان يحول بينه وبينها كذوا المريكين ما قالوا - ان فلانا خطب الى علي عليه السلام ابنته ام كلثوم فابى فقال للعباس والله لن لم يزوجني لانزاع منك المتقاية وثر مزمر فاق العباس عليا عليه السلام فكلمه

فابی فالخ علیه العباس فلما رأى امير المؤمنين عليه السلام
 مشقة كلام الرجل على العباس وأنه سيفعل معه ما قال
 ارسل الى جنيته من اهل نجران يهودية يقال سحيفه بنت
 حبيب فامرها فتمثلت في مثال ام كلثوم وحجبت الالبصار
 عن ام كلثوم بها وبعث بها الى الرجل فلم تزل عنده
 (الى) فقتل فاخذت الميراث وانصرفت الى نجران واطهر
 امير المؤمنين ام كلثوم۔ (انوار نعمانيہ جلد اول ص ۸۳)

عمر بن اذینہ کہتا ہے کہ میں نے امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ لوگ
 ہمارے خلاف یہ حجت اور دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام نے فلاں کو اپنی
 بیٹی ام کلثوم نکاح کر دی۔ آپ تکیہ لگاتے بیٹھے تھے، میری بات سن کر اٹھ بیٹھے اور
 کہا کیا تم اس کو قبول کرتے ہو کہ آپ نے اپنی لڑکی اس سے نکاح کر دی۔ جو لوگ یہ کہتے
 ہیں، وہ راہِ راست اور ہدایت پر نہیں ہیں۔ پھر آپ نے تعجب سے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ
 پر مارا اور فرمایا کیا امیر المؤمنین میں اتنی قوت نہیں تھی کہ آپ ام کلثوم اور عمر رضی اللہ عنہما
 کے درمیان حائل ہو سکتے؟ یہ نکاح نہیں ہوا انہوں نے جھوٹ بولا بلکہ حقیقت حال یہی
 کہ فلاں (عمر فاروق رضی اللہ عنہ) نے حضرت امیر علیہ السلام سے یہ رشتہ طلب کیا تو آپ
 نے انکار فرمایا، تو انہوں نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہا اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ
 مجھے یہ رشتہ نہیں دیں گے، تو میں تم سے نہ مزم اور ستایت کا منصب چھین لوں گا تو حضرت
 عباس رضی اللہ عنہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے انکار فرمایا تو انہوں نے
 الحاح و زاری سے کام لیا۔ جب آپ نے اس شخص کے کلام کا حضرت عباس رضی اللہ عنہ پر
 گراں بار ہونا مشاہدہ کیا اور سمجھ لیا کہ اس نے جو کہا ہے کر گزے گا، تو آپ نے اہل نجران
 سے ایک جن یہودی عورت کو بلایا، جس کا نام سحیفہ بنت حریہ تھا اور اسے ام کلثوم کی صورت
 میں ڈھلنے کا حکم دیا؛ چنانچہ وہ آپ کی صورت میں ڈھل گئی اور اس کی وجہ سے حضرت
 ام کلثوم رضی اللہ عنہا لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئیں۔ چنانچہ آپ نے اس کو حضرت عمر

بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے گھر بھیج دیا اور وہ آپ کے قتل ہونے تک ہاں رہی اور اس کے بعد اپنا وراثت کا حصہ لے کر نجران چلی گئی، تو آپ نے ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو ظاہر فرمایا۔

دل کا چور

چونکہ یہ امر واضح تھا کہ جن و انس میں باہم مماثلت نہیں اور میاں بیوی والے تعلق کے باوجود یہ راز فاش نہ ہونا اور شک و تردید بھی پیدا نہ ہونا بعید از فہم و قیاس تھا، تو اس کا جواب دیتے ہوئے اس روایت میں یہ اضافہ کر دیا،

فلم تنزل عندہ حتی استتراب بها يوم ما قال ما في الارض
هل بيت اسحق من بني هاشم ثم اراد ان يظهر للناس قتل دناور حمانہ علیہ السلام
وہی صحیفہ بنی ہاشم تحریر یہاں یہ آپ کے پاس بطور بیوی رہی، حتیٰ کہ ایک دن حضرت
فخر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اس کے متعلق شک و تردد ہوا اور کہا کہ تمام رُفقاء زمین
کوئی گھرانہ بنو ہاشم سے زیادہ جادوگر نہیں ہے۔ پھر لوگوں پر اس امر کے اظہار
کا ارادہ کیا، مگر قتل ہو گئے۔ (اور یہ راز طشت از بام نہ ہوا اور مخفی و مستور رہ گیا)

عذرِ ناتمام

۱۔ اس خدشہ کے ازالہ کا خیال تو آیا مگر ان روایات کے متعلق جواب
لی نہ سوجھی، جن میں ولایت فضولی کے تحت حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے نکاح کو
کا اقرار ہے یا جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس ام کلثوم سے اولاد پیدا ہونے کا
بھی ذکر ہے اور ماں بیٹے کا اکٹھا وفات پانا بھی منقول ہے۔

۲۔ نیز یہ بھی خیال نہ آیا کہ اتنی دُور سے چنیہ عورت کو بلانے کی ضرورت کیوں
پیش آئی۔ مدینہ منورہ میں جن نہیں رہتے تھے، یا وہ آپ کا حکم تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے۔
۳۔ نیز یہ بھی وجہ نہ سمجھ آئی کہ ایک طرف تو صحیفہ حضرت علی رضی اللہ عنہ
لی اتنی فرماں بردار اور تابع فرمان کہ ان کی خاطر عرصہ دراز تک فاروقی بوجہ برداشت

کرتی رہی، مگر دوسری جانب سے اس قدر سیاہ دل کہ رہی یہودیہ ہی، اسلام قبول نہ کیا اور نہ امامت علی پر ایمان لائی۔

۴۔ پھر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں اہل کتاب دیہود نصاریٰ کی عورتوں سے متعہ جائز ہے، مگر نکاح دوام جائز نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو متعہ کو جائز ہی نہیں سمجھتے تھے۔ آپ کا مقصد نکاح دوام تھا اور تعیین مدت عقد میں نہ ہو تو نکاح دوام بن جاتا ہے اور شیعہ شریعت یہودیہ عورت کے ساتھ نکاح دوام کو حرام ٹھہراتی ہے، تو اس حرام کے ارتکاب کا ذمہ وار کون ہوگا؟ کیا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اس سے بری الذمہ ہو سکتے ہیں؟

۵۔ علاوہ انہی انسانوں اور چٹوں کے درمیان باہمی مناکحت اور ازدواجی تعلقات کے جواز کی کونسی دلیل شرعی ہے۔ یہ بھی بذات خود جائز اور حلال نہیں ہے، تو کیا اس جرم سے حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کا دامن پرچ سکتا ہے؟ ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسمان کیوں ہو؟

الغرض صاف ظاہر ہو گیا کہ یار لوگوں نے یہ ساری کہانی اس لیے گھڑی کہ کہیں ان حضرات کے باہمی تعلقات کی خوشگواہی ثابت نہ ہو جائے اور شیعہ مذہب کی زیخ و بن ہی نہ اکھڑ کر رہ جائے اور جھوٹ کے پاؤں ہوتے نہیں، اس لیے دیگر مناسد کی طرف توجہ دینے اور ان کا سد باب کرنے کا موقع ہی نہ ملا کہ وہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کی سیاست اور دور بین نگاہ نے قیصر و کسریٰ بلکہ عالم کفر کو عاجز و بے بس اور مقہور و مغلوب کر کے رکھ دیا تھا۔ ان کے پہلو میں اور قریب ترین مکان میں اصل ام کلثوم رضی اللہ عنہا موجود رہے اور انہیں خبر ہی نہ ہو سکے، یہ کیسے ممکن ہے؟ اور کون صاحب عقل سلیم اس کو باور کر سکتا ہے؟

شیعہ کے لیے دوسری الجھن

اس روایت نے ایک اور الجھن پیدا کر دی کہ اگر صورت حال واقعی یہ تھی

تو پھر انہیں امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کا حضرت اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کے متعلق فرمانا، اول فرج غضبنا، ”کیونکہ درست ہو گا کہ العیاذ باللہ یہ پہلا رشتہ ہے جو ہم سے غضب کر لیا گیا۔ تو اس کے جواب میں اکابرین شیعہ کی منطق ملا خطہ فرماتیں اور ابن سبار کی چالاکیوں کی داد دیں۔

نعمت اللہ جزائری نے کہا، اقول وعلى هذا فحديث اول فرج غضبنا محمول على التقية والاختفاء من عوام الشيعة كما لا يخفى۔
 رانوار نعمانی، جلد اول، ص ۸۷

یعنی اس روایت کے پیش نظر غضب والی روایت تقیہ پر محمول ہے اور عوام شیعہ سے اخفاء پر گویا حقیقت میں تو رشتہ غضب نہیں کیا گیا تھا مگر زبانی اس کا اظہار ائمہ کے ہم بھی کرتے رہے اور عوام شیعہ کو یہی تاثر دیتے رہے تاکہ حقیقت حال ظاہر ہونے پر انتقامی کارروائی کا نشانہ نہ بننا پڑے۔

۳۔ ملا باقر مجلسی صاحب نے ”بحار الانوار“ میں اس تعارض کو دور کرتے ہوئے کہا: این اخبار با حکایت جنیہ منافات ندارد چه آں حکایت است مکتوم کہ جزیرہ خواص اصحاب خویش معلوم نداشته اند ومعنی این حدیث چنین است کہ غضبنا ظاہراً (طراز المذہب المنطقی ص ۵۹) یعنی وہ روایات جن میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح کا اثبات ہے، وہ جن عورت والی حکایت کے ساتھ منافات نہیں رکھتیں، کیونکہ وہ ایک پوشیدہ حکایت ہے، جس کا سوائے مخصوص اصحاب احباب کے کسی پر اظہار نہیں کیا گیا، لہذا غضب والی روایت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سے بظاہر یہ رشتہ غضب کیا گیا، بلکہ ہم نے صرف ظاہر یہ کیا ہے کہ یہ رشتہ غضب کیا گیا، کیونکہ درحقیقت وہ بنیہ تھی۔ نہ وہ اپنا رشتہ تھا اور نہ ہی غضب کیا گیا، صرف وادیل کرتے رہے۔

حضرت اُمّ کلثوم کے عقد تزویج کے قابل جھوٹے کیوں؟

آپ نے حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب جنیہ عورت والی

روایت میں ملاحظہ فرمایا کہ حضرت امّ کلثوم رضی اللہ عنہا کے نکاح سے تعلقات فاروقی اور مرتضوی میں خوشگواہی ثابت کرنے والوں کو جھوٹا، گمراہ اور راہِ راست سے بھٹکا ہوا قرار دیا گیا ہے اور علامہ جزائری اور علامہ مجلسی کے جوابات سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو چکی کہ بطورِ تقیہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ یہی کہتے رہتے تھے کہ یہ شیعہ ہم سے غصب کیا گیا ہے اور عوامِ شیعہ سے بھی یہ راز پوشیدہ رہا اور صرف انھیں انھیں اصحاب کو اس کا علم تھا اور جب تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ شہید نہ ہو گئے، اصلی امّ کلثوم روپوش رہی اور جینیہ عورت اس روپ میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر آباد رہی۔ جب اس کی رخصتی بھی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر سے ہوئی اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت امیر علیہ السلام اس کو اپنے گھر بھی لاتے اور عام اہل اسلام پر یہ راز منکشف بھی نہ ہونے دیا گیا اور بطورِ تقیہ اس کو اپنی بیٹی ہی کہا، تو ایسی صورت میں عام اہل اسلام جھوٹے کیسے ہو گئے اور اگر وہ سچ بولتے تو کیا کہتے اور اس کی صورت کیا ہوتی؟ ہے کوئی صاحب عقل شیعہ جو ان حالات میں یہ حجت و دلیل پیش کرنے والوں کو جھوٹا ثابت کر سکے اور ان کے مقابل ائمہ کرام کو سچا ثابت کر سکے؟ ناطقہ سر بگڑیاں ہے اسے کیا کیسے جو جینیہ عورت کو اپنی بیٹی کہیں اور اس کو اپنی بیٹی ظاہر کریں، وہ سچے اور جو ان کی زبان اور ان کے اعلان پر اعتبار کریں اور اس کی روایت و حکایت کریں، وہ جھوٹے۔ ہر چیز یہاں کی اٹلی ہے، یہاں اٹلی گنگا بہتی ہے

علاوہ ازیں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ جس دور میں بطورِ تقیہ اور عوامِ شیعہ سے اخفا کے لیے یہ کہتے رہتے تھے کہ یہ رشتہ ہم سے غصب کر لیا گیا تھا۔ اس دور میں نہ تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی حکومت تھی اور نہ امیر عثمان رضی اللہ عنہ کی اور نہ بنو امیہ کی، وہ تو بنو عباس کا دور حکومت تھا اور انہیں بہر حال حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی عزت و حرمت بہ نسبت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زیادہ ملحوظ و مرغوب تھی، تو اس وقت اس راز کو عام کرنے میں حرج کیا تھا اور اس تقیہ اور اخفا کی ضرورت ہی کیا

تھی، بلکہ سمجھنے کو اسی شکل و صورت میں متمثل کر کے اس کی گواہی بھی دلوائی جاسکتی تھی اور وراثت کا حصہ بھی بطور شہادت پیش کیا جاسکتا تھا اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے یہی خواہوں کا ہمیشہ کے لیے ناطقہ بند کیا جاسکتا تھا، مگر اسے کیا کیجئے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے وصال اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے وصال کے درمیان ایک سو پچیس سال کے قریب فاصلہ ہے، مگر اتنے عرصے کے بعد بھی علی الاعلان اس مناکحت اور عقد تزویج کا انکار نہیں ہو سکا اور اہل سنت سے ہی نہیں، بلکہ علوم شیعہ سے بھی تقیہ اور اخفاء جاری رہا، تو پھر اہل سنت کی اس حجت و دلیل کی صداقت میں شکوک و شبہات کی کیا گنجائش ہے اور اس توجیہ و تاویل کے فساد بطلان میں کیا ریب و تردد ہو سکتا ہے جو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔

اعتراف حقیقت اور اقرار تزویج

ان بھونڈی حرکات اور مضمک خیز تاویلات میں ظاہر و باہر جو سقم و بطلان دیکھ کر شیعہ علماء کو حقیقی اور اصلی ائمہ کلثوم رضی اللہ عنہا کا عقد تزویج تسلیم کرنا ہی پڑا، اسی لیے صاحب ناسخ التواریخ نے کہا،
یعنی ان مردم شیعہ گوئند کہ ام کلثوم بجانہ عمر زنت بلکہ یکتی جنیہ بصورت ام کلثوم برآمد و با عمر بہتر گشت، لیکن مردم شیعہ را واجب نیفتادہ کہ حمل چندین مصائب کنند چہ در نزد ایشان خطبہ کردند ام کلثوم بیرون از شریعت از غضب خلافت کہ فتنہ او تا قیامت باقی است بزاید نیست از حضرت صادق روایت کردہ اند کہ فرمود اول فرج غضب من ام کلثوم پس لازم پس لازم نیست جنیہ بصورت ام کلثوم درآید (ناسخ التواریخ، جلد دوم ص ۳۶۳)

بعض شیعہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے گھر بطور زوجہ نہیں گئی تھیں، بلکہ ایک جنیہ عورت ان کی صورت میں متمثل ہو کر آپ

کے گھر گئی تھی اور ان سے ہمبستر ہوتی تھی، لیکن شیعہ لوگوں کے لیے واجب لازم نہیں کہ اس قسم کے مصائب (تاویلات و تسویلات کے) برداشت کریں، کیونکہ ان کے نزدیک حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا خلاف شرع نکاح خلافت کے غصب ہو جانے سے زیادہ عظیم معاملہ تو نہیں جس کا فتنہ قیامت تک باقی ہے اور حضرت صادق رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا رشتہ ہم سے غصب کیا گیا ہے، لہذا ضروری نہیں کہ جن عورت حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کی صورت و شکل میں متشکل ہو کر آئے

شرمِ تم کو مگر نہیں آتی

صاحبِ ناسخ نے بالآخر وہی حل اور مشکل کشا صورت اختیار کی جس کو نعمت اللہ الجزائری نے وجہ عامی کے عنوان سے ذکر کیا تھا اور وہ خاص وجہ جس کو علامہ بہا الدین اور شیخ مفید نے ذکر کیا تھا، اس کو رد کر دیا، لیکن سب علماء اسلاف کے برعکس اس عقد کو خارج از شریعت قرار دے دیا، مگر سوال یہ ہے کہ اس غیر شرعی عقد کا ذمہ دار کون ہوگا اور اس کا گناہ کس کے سر پر ہوگا؟ کیا حضرت امیر رضی اللہ عنہ کان کو اڑوا بنا کر شیعوں کی حفاظت کر سکتے تھے اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو مرعوب بلکہ لرزہ بر اندام کر سکتے تھے، لیکن اس غیر شرعی عقد کو روکنے کے لیے اور حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کی عزت ناموس کے تحفظ کے لیے یا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ڈر اور خوف اور خوف کو دور کرنے کے لیے وہ معجزہ بروئے کار نہیں لایا جاسکتا تھا؟ کیا عوامِ شیعہ کی عزت و حرمت حضرات اہل بیت سے بھی زیادہ ہے۔

علاوہ انہیں علامہ جزائری صاحب اور صاحبِ ناسخ نے اس عقد کو خلافت پر قیاس کیا اور کہا وہ غصب ہو گئی، تو اس غصب میں کونسی چیز کا دینے والی بات ہے۔ تو دریافت طلب امر یہ ہے کہ رافضی علماء کے نزدیک ملک سلطنت اور عزت و ناموس کے معاملات یکساں ہیں کہ اگر ملک سلطنت لیے تو عزت و ناموس بھی بے شک برباد ہو جائے اور ملک سلطنت ہاتھ آجائے، تو پھر عزت و حرمت اور ناموس عصمت بھی برقرار رہنی چاہیے۔
لعنت بریں عقیدہ باز

تاویلات کی ضرورت کیوں؟

شیعی علماء کا اضطراب دیکھ کر اور بھانت بھانت کی بولیاں سن کر آپ نے یہ اندازہ کر لیا ہو گا کہ اگر یہ ام کلثوم (رضی اللہ عنہا) حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی محنت جگر اور نور نظر نہ ہوتیں تو شیعی علماء پر مصائب و متاعب اور شدائد اور مشکلات و نوائب کے پہاڑ نہ ٹوٹتے اور انہیں اس قسم کی بیہودہ اور لغو تاویلات کا سہارا نہ لینا پڑتا کبھی جبر و اکراہ کی آڑ، کبھی تقیہ اور اخفائے حال کا بہانہ، کبھی فاروقی شدت و صلابت کو کم کرنے کا عندہ، کسی وقت اسلام کی تردید و اشاعت کا پاس و لحاظ اور کبھی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت و مطابعت میں سعی و کوشش، کہیں حضرت لوط علیہ السلام کے ساتھ موافقت و مطابقت کا اختراع، کسی وقت غضبِ خلافت پر اس رشتہ کے غضب کا قیاس کر کے خلاصی کی جدوجہد اور کبھی نجران سے منگوائی جانے والی جنتی عورت کو ام کلثوم کی ہم شکل قرار دے کر اس کی شادی اور عقد تزویج کا مفروضہ قائم کرنا، اس امر کی یقین بُرمان اور ناقابل تردید دلیل ہیں کہ یہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محنت جگر ہی ہیں اور آپ کی ہی نورِ نظر و در نہ علماءِ شیعہ کے لئے اتنا ہی کہہ دینا کافی تھا کہ بیٹی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تھی اور خاندانِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ بن گیا، جیسا باپ ویسا خاندان، مگر یہ جواب نہیں دیا جاسکا، بلکہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے منقول تمام روایات باہمی مخالف تعارض کے باوجود صرف اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ ام کلثوم حضرت امیر (رضی اللہ عنہا) کی نور چشم تھیں نہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی۔

نیز یہ بھی واضح ہو گیا کہ صرف ڈھکوسل صاحب تو کیا، ان کے عمر بن اذنیہ جیسے اسلاف اور قدیم شیعہ بھی اس دلیل و بُرمان کا جواب نہ دے سکے اور حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی بارگاہ سے اس اشکال کو حل کرانے کی کوشش کی، لیکن وہ تریاق بھی کارآمد ثابت نہ ہو سکا اور عوامِ اہل اسلام بلکہ عوامِ شیعہ کے سامنے بھی جو حقیقت ظاہر کی گئی وہ بھی یہی تھی کہ یہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا ہماری تھی اور ہم سے جبر و اکراہ کے ساتھ اس کا رشتہ لے لیا گیا۔ العیاذ باللہ!

عقد نکاح کی روایات کو موضوع کہنے کی لغویت

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کی اور ہماری نقل کردہ روایات اور حوالہ جات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ محمد بن یعقوب کلینی المتوفی ۳۲۸ھ سے لے کر صاحب ناسخ التواریخ اور صاحب طراز المذہب المنطوقی تک شیعہ متکلمین، مؤرخین اور دیگر علماء اس عقد کا ذکر کرتے چلے آتے ہیں اور اس کی مختلف توجیہات اور تاویلات بھی بیان کرتے چلے آتے ہیں اور ان کی کتب صحاح میں بھی اس عقد کے ثبوت و تحقق اور وقوع پر دلالت کرنے والی متعدد روایات موجود ہیں، بلکہ باب تزویج ام کلثوم کا مخصوص عنوان قائم کر کے ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ان تمام روایات کو موضوع اور من گھڑت قرار دینا خود شیعہ مذہب کو ہی اختراعی اور افتراقی مذہب قرار دینے کے مترادف ہے، کیونکہ مذہب کا دار و مدار مذہبی کتابوں پر ہی ہوتا ہے اور وہ سب موضوع اور من گھڑت روایات پر مشتمل ہوں، تو پھر مذہب کا اثبات کس طرح ہو سکتا ہے؟

ہم تو بڑی فراخ دل سے ان کی تمام تر روایات کو موضوع اور اختراعی اور افتراقی ماننے کو تیار ہیں، مگر وہ خود سوچیں کہ کہیں مذہب کی بنیاد ہی تو ختم نہیں کر رہے؟ تحریف قرآن کی متواتر روایات جو دو ہزار سے زائد وہ بھی موضوع۔ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح پر دلالت کرنے والی مستفیض اور مشہور روایات بھی یہی موضوع صحاح کرم علیہم الرضوان کے فضائل پر دلالت کرنے والی روایات بھی موضوع اور ناقابل اعتبار ہوں اور علیٰ ہذا القیاس تو پھر ان روایات پر محیط اور مشتمل مذہبی کتابوں پر کیا اعتماد و اعتبار ہو سکتا ہے اور جب مذہب کی بنیاد ان پر قائم ہوئی تھی اور وہ بنیاد ہی منہدم اور معدوم ہو گئی، تو اس پر شیعہ مذہب کا تعمیر شدہ سارا محل ہی مسمار اور زمیں بوس ہو جائے گا، لہذا ان کو موضوع اور ناقابل اعتبار کہہ کر غلطی اور جان چھڑانے کی سعی اور کوشش بے سود اور بے ثمر و بے نتیجہ ہے۔

رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۳۳ تا ۳۸ علامہ محمد حسین ڈھکوصاحب

پیر صاحب آف سیال شریف نے اپنے رسالہ کے ص ۵۷ پر دامادی عمر رضی اللہ عنہ کے افسانہ کا تذکرہ کر کے حضرت علی اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کے باہمی خوشگوار تعلقات ثابت کرنے کی سعی لا حاصل کی ہے، لیکن بچند وجہ اس مفروضہ عقد سے عمر کی فضیلت یا علی و عمر رضی اللہ عنہما کے باہمی تعلقات کے خوش گوار ہونے پر استدلال درست نہیں ہے۔

۱۔ اس سلسلہ کی جتنی روایات موجود ہیں، بتصریح علماء محدثین و محققین ان میں سے کوئی ایک روایت بھی صحیح السند نہیں ہے، جس سے یہ بات واضح اور عیاں ہو جاتی ہے کہ اس قسم کا کوئی عقد نہیں ہوا۔ یہ محض یہی خوابانہ خلیفہ کا طبع زاد افسانہ ہے۔ ملاحظہ ہوا مرآة العقول۔

۲۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کا رشتہ طلب کیا، تو آپ نے فرمایا: (انہا صغیرۃ) یعنی وہ چھوٹی ہیں اور ان کی درخواست رد کر دی۔ کیا کوئی صاحب عقل سلیم ایک لمحہ کے لیے باور کر سکتا ہے کہ اسی صغیرۃ السن شاہزادی کو نبین کی شادی بڑے بوکر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی ہو اور ان کے بطن اقدس سے ایک بچی پیدا ہوئی ہو اور وہ بھی چوتھی جگہ جن کے بڑے بونے پر ان کا رشتہ صاٹھ سالہ بوڑھے شخص عمر کو دے دیا جائے جو سببی رشتے میں ان کا پڑنا ہونا ہو؟

۳۔ تمام شیعہ کتب معتبرہ اور کتب معتمدہ میں مذکور ہے کہ جناب ام کلثوم دختر جناب امیر کا پہلا نکاح اپنے چچا زاد بھائی عون بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

۴۔ پیغمبر اسلام کی وفات حسرت آیات کے بعد حضرت علی اور حضرت بتول رضی اللہ عنہما کو بالخصوص ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا گیا اور ان مصائب و آلام کے ڈھانے میں عمر بن خطاب پیش پیش تھے، حتیٰ کہ انہی مصائب و نوائب کی تاب

نہ لاکر خاتونِ جنت وفاتِ پیغمبر کے پچھتر یا پچانوے دن بعد انتقال فرمائیں، لہذا کیسے ممکن ہے کہ اسی زہرا (رضی اللہ عنہا) کی لختِ جگر کا رشتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ عمر بن الخطاب کو دیں؟

۵۔ اگر جناب عمر بن الخطاب کا رشتہ کسی ام کلثوم سے ہوا تھا تو وہ ام کلثوم یقیناً علی و بنو علی (رضی اللہ عنہما) کی لختِ جگر نہیں تھی، بلکہ دختر ابو بکر تھیں جو اسماء بنت عمیس کے بطن سے تھیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ربیبہ تھیں، لہذا مجازاً بیٹی کہلائی اور بعض مورخین حقیقتِ حجاز میں فرق نہ کرتے ہوئے مغالطہ کا شکار ہو گئے۔ حالانکہ وہ اصولِ روایت اور روایت کے خلاف ہے، اسی لیے کسی روایت میں ام کلثوم کے نام کے ساتھ ”مِنْ بَطْنِ فَاطِمَةَ“ مذکور نہیں۔

۶۔ پیر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اُخروی فوز و فلاح اور نجات کا دار و مدار ایمان داری پر ہے نہ کہ رشتہ داری پر۔

۷۔ پیر صاحب کو فروعِ کافی کی روایت میں مذکور لفظ ”فرج“ سے جو غصہ آیا ہے، تو پیر صاحب کی کوتاہ اندیشی ہے۔ اس کو اگر فتحِ راس سے پڑھ لیتے، تو ان کا سارا غصہ ٹھنڈا ہو جاتا اور اگر سکونِ راس سے پڑھنے پر اصرار ہے، تو یہ لفظ متعدد جگہ قرآن مجید میں وارد ہے، لہذا جو فتویٰ ہم پر لگا رہے ہیں، وہ پہلے خداوند کی ذات پر لگائیں۔

تحفۂ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی

جواب الاول، علامہ ڈھکو صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے داماد مرتضیٰ ہونے پر پیش کردہ روایات کا پہلا جواب یہ دیا کہ اس مضمون کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے، خواہ کتبِ سننیہ میں مذکور ہو یا کتبِ شیعہ میں اور یہ ایک افسانہ ہے، جس کو بھی خواہاں خلیفہ نے اختراع کیا ہے، لیکن اس جواب میں چند امور غور طلب ہیں،

۱۔ علامہ موصوف کو یہاں اہل سنت کی کتابوں کے نام لینے کا کوئی حق نہیں تھا، اُن کی صحت کے ذمہ دار وہ خود ہیں، ڈھکو صاحب کو صرف اپنا دامن صاف کرنا

چاہیے تھا، لیکن انہوں نے محض یہ دعویٰ کر کے ان روایات کا جواب دیا جو حضرت شیخ الاسلام نے ذکر فرمائی تھیں کہ اس مضمون کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے اور کوئی حوالہ اور عبارت اس ضمن میں ذکر نہیں کی، حالانکہ محل نزاع اور مقام اختلاف میں اس قسم کے دعویٰ کا قطعاً اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ اس قسم کے کھوکھلے دعوے کو عاجزی اور بے بسی کی دلیل تصور کیا جاتا ہے، جبکہ سابقہ صفحات میں ہم نے شیعہ کتب معتبرہ سے اور مستند علماء کے حوالہ جات سے اس عقد نکاح کو مدلل انداز میں بیان کر دیا ہے

۲۔ مآب اقر مجلسی کی کتاب مرآۃ العقول کے نام کا حوالہ دے کر اور اس کی عبارت ذکر کیے بغیر اس فریضہ سے سبکدوش ہونے کی سعی فرمائی ہے، لیکن اسی علامہ مجلسی نے جہاں بنات رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چار ہونے کی تصریح کی ہے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عقد میں یکے بعد دیگرے دو صاحبزادیاں آنے کی تصریح کی ہے، ڈھکڑ صاحب اور ان کی روحانی برادری اس کی بروایات معتبرہ بیان کردہ اس تحقیق کے قائل نہیں ہیں تو اس کی تحقیق اس مسئلہ میں کیوں حرف آخر ثابت ہوگئی؟ یہ صرف میٹھا میٹھا ہڑپ اور کڑوا تھوڑا لی بات ہے، ورنہ اس بے چارے کو علماء محققین میں کون شمار کرتا ہے؟

۳۔ اہل السنۃ تو یہی خوابانِ خلیفہ، بلکہ یہی خوابانِ خلفاء راشدین اور صحابہ کرام و اہل بیت عظام کے بھی یہی خواہ ہیں اور انہیں اس پر فخر ہے، لیکن آپ کے مذہب کی بنیاد ہی صحابہ کرام کے ساتھ بغض و عداوتِ شیعین اور کیمۃ ذی النویۃ پر ہے، لہذا تمہاری کتابوں میں یہ افسانے کیسے اور کیونکر مذکور ہو گئے اور جنہوں نے انہیں ذکر کیا وہ علماء محدثین ہیں یا نہیں؟ اور تحقیق و تدقیق سے انہیں بھی کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا کافی، استبصار اور تہذیب الاحکام شیعہ کی صحاح اربعہ میں داخل نہیں ہیں؟ کیا ان کے لکھنے والے اہل سنت ہیں یا شیعہ کے اکابر محدثین؟

۴۔ اگر یہ روایات جن کو ایک مسئلہ پر بطور دلیل پیش کیا گیا ہے، صحیح نہیں ہیں تو اس مسئلہ کا اثبات کیونکر ممکن ہوگا اور اس پر دوسری دلیل کونسی قائم کی گئی ہے؟ علامہ صاحب اگر صحاح اربعہ میں مرجع وہ روایات درست نہیں ہیں جن سے خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کی باہمی

محبت اور پیار ثابت ہوتا ہے، تو ان میں بلکہ ان سے بھی کمتر درجہ کی کتابوں میں مذکور عداوت اور دشمنی پر مشتمل روایات کیونکر صحیح ہو سکتی ہیں؟

کیا یہ امر عجیب و غریب روزگار سے نہیں کہ قول باری تعالیٰ، **سَحَاءُ بَيْنَهُمْ** کے مطابق جو روایات ہیں، وہ توجہ وٹی ہوں اور جو اس کے خلاف ہوں، وہ سچی نہیں! کیا تمہارے پاس روایت کی صحت کا ضابطہ اور معیار یہی ہے کہ جو قرآن مجید کے خلاف ہوگی، وہ سچی اور صحیح ہوگی اور جو اس کے مطابق اور موافق ہوگی، وہ موضوع اور من گھڑت ہوگی؟ تو آپ کی زبان میں ہی کیوں نہ کہہ دوں

نے اصولت بحکم آید نے شروع شرم باید از خدا و از رسول

آخر آپ کے اتنے بڑے محدث اصولی اور متکلم ان روایات کی صحت اور درستگی سے بے خبر کیسے رہے؟ کہ انہوں نے دوران کار تا دیلات و تسویلات کے ذریعے اس عقد و نکاح کی صحت تسلیم کرنے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تفصیلت تسلیم کرنے سے انکار تو کیا، مگر یہ آسان طریقہ یعنی روایات کی صحت کے انکار والا اختیار نہ کیا، لہذا صاف ظاہر ہے کہ ان کے لیے روایات کی صحت اور درستگی میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

جواب الثانی، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا

کا رشتہ اس لیے نہ ملا کہ ان کی عمر شریف چھوٹی تھی، تو ان کی نعت جگر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا رشتہ کیسے مل گیا؟ جبکہ خاوند ساٹھ سالہ بوڑھا بھی ہو اور رشتہ سببی میں حضرت ام کلثوم کا پڑنا بھی ہو؟

۱۔ ماثرا اللہ! یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کسی نہ کسی پہلو سے حضرت ام کلثوم کا

پڑنا تسلیم کر لیا گیا اور وہ پڑنا اس صورت میں ہے، جب انہیں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا نانا تسلیم کرایا جائے اور ان کے ماننے تب بن سکتے ہیں، جب انہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی تسلیم کیا جائے اور قول باری تعالیٰ، **وَاَنْزَلْنَاهُ اُمَّهَاتِهِمْ** میں دیگر مومنین کے ساتھ انہیں بھی شامل کیا جائے اور جب حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لئے ازواج مطہرات کا مانتا ہونا تسلیم ہو گیا، تو پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کرام کے لیے بھی انہیں امتات تسلیم کرنا لازم تھا اور حضرت عمر بلکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہما کو ان سب کا نانا تسلیم کرنا لازم

مٹھرا۔ الغرض جب حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح کا سوال سامنے آیا تو یہ سب رشتے اور نسبتیں سمجھ میں آگئیں اور واجب التسلیم بھی ٹھہری، لیکن خلافت اور فدک وغیرہ کا سوال سامنے آئے، تو یہ تعلقات اور رشتہ داریاں نظروں سے فوری طور پر اوجھل ہو جاتی ہیں۔ نا طفقہ سر بگریاں ہے اسے کیا کہیے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہ سببی رشتے اس عقد نکاح میں مانع ہو سکتے ہیں؟

۲۔ نیز کیا عمر کا تفاوت نکاح کے جائز ہونے میں مانع ہے۔ جب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی ہوئی تھی تو اُس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر کتنی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کتنی تھی؟ اگر وہاں پر چھ گنا عمر زیادہ ہونے کے باوجود ازدواجی تعلقات درست تھے تو یہاں کیونکر درست نہیں ہو سکتے؟ کیونکہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا تولد دس ہجری سے قبل تسلیم کرنا ضروری ہے، کیونکہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے وقت بقول شیعہ حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بطنِ اقدس میں حضرت محسن رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ اور بقول ڈھکو صاحب جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کا رشتہ طلب کیا تو اس وقت ان کی عمر ساٹھ سال تھی تو اس طرح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی عمر شریف اُس وقت کم از کم گیارہ سال ضرور ہوگی جس کا تناسب فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی عمر سے اس سے بھی کم ہے جو کہ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وازواجہ اہمما وبارک وسلم کی عمر شریف میں تھا، لہذا اس کو اندرونی عقل و درایت رد کرنا اپنی بے عقلی اور درایت سے محرومی کو ثابت کرنا ہے۔

۳۔ نیز حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ رشتہ طلب کیا۔ اس وقت آپ کی عمر چوراس سال تھی، کیونکہ آپ کا عقد نکاح سترہ ہجری کو حضرت ام کلثوم کے ساتھ ہوا تھا اور ام کلثوم کے لیے فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہا کی وفات کی صورت میں دوسری جگہ نکاح کرنا جائز بھی تھا، جبکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے لیے یہ جواز بھی موجود نہیں تھا کما قال اللہ تعالیٰ، ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابداً۔

ابدًا۔ لہذا عقلی یا شرعی لحاظ سے کوئی وجہ اس نکاح کے ناجائز ہونے کی موجود نہیں تھی۔
 ۴۔ بحوالہ مشکوٰۃ شریف حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے صغیرہ ہونے کا جو ذکر کیا گیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری نسبت بہت چھوٹی ہیں نہ کہ یہ ابھی آپ بالغ نہیں ہوئیں، جیسے کہ ڈھکو صاحب نے سمجھا اور کہا اسی صغیر السن شہزادی کی شادی بڑے ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوئی، کیونکہ یہ عرضداشت ان حضرات کی طرف سے مدینہ منورہ میں کی گئی تھی اور بوقت وصال آپ کی عمر مبارک اٹھائیس سال تھی، اور صرف چھ ماہ تک وصال نبوی کے بعد بقید حیات رہیں اور دُؤ بھری میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی بھی ہو چکی، تو اس طرح صغیرہ ہونے کا مطلب نابالغ ہونا کیونکر ہو سکتا ہے؟ بلکہ حقیقت حال یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم حضرت فاطمہ الزہرا رضی اللہ عنہا کا رشتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو دینا چاہتے تھے اور ان حضرات نے بھی آپ کی مرضی معلوم کر لی تھی۔ اس لیے انہوں نے آپ کو قسم کے مالی تعاون کی پیشکش کر کے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں بھیجا اور رشتہ کے لیے عرض کرنے پر مجبور کیا، تو آپ انہیں کے مشورہ پر حاضر بارگاہ ہوئے اور اس سعادت سے بہرہ ور ہو گئے اور اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں ان حضرات کے عرض کرنے پر آپ کا جواب اس طرح منقول ہے کہ ابھی اللہ تعالیٰ کی قضا اور حکم نازل نہیں ہوا۔ الغرض اس روایت کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ازدواجی یا شرعی یہ ازدواجی تعلق جائز نہیں تھا۔ ہاں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ مرضی معلوم کرنے کے بعد اصرار کی گنجائش نہیں تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ برادرانہ روابط کی وجہ سے بے تکلفی تھی، لہذا اس اعزاز کے حصول پر بہت زیادہ رغبت اور دلچسپی کا اظہار کیا اور آپ نے بھی حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اس شرف سے مشرف فرمایا۔ ذالک فضل اللہ یؤتیه من یشاء۔

جواب الثالث، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ تمام شیعہ کتب معتبرہ میں ہے کہ پہلا عقد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت عون بن جعفر رضی اللہ عنہا سے ہوا۔

۱۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کونسی معتبر کتابیں ہیں اور نہ ہی علامہ موصوف نے ان کا نام بتانے کی زحمت گوارا کی ہے، حسبِ عادت مقامِ نزاع میں صرف دعویٰ پر اکتفا کر دیا ہے جو قطعاً قابلِ التفات نہیں۔ جب ان کی صحاح اربعہ ان کے نزدیک معتبر نہیں، تو دوسری کیسے معتبر ہو سکتیں؟

۲۔ نیز اس پر کیا دلیل ہے کہ ان فرضی معتبر کتابوں میں عقدِ اول کے الفاظ سے مراد اولیتِ حقیقیہ ہے؟ اولیتِ اضافی کیونکر مراد نہیں ہو سکتی، جبکہ لفظِ اول کا اس معنی میں استعمال بھی معروف و مشہور ہے، لہذا اول حقیقی وہ نکاح ہو جو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا اور اول اضافی وہ ہو جو کہ حضرت عون بن جعفر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا، بشرطیکہ وہ ثابت بھی ہو۔

۳۔ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ آپ کا پہلا عقد حضرت عون بن جعفر سے ہوا تھا، جبکہ قاضی القضاۃ نور اللہ شومتری صاحب ”مجالس المومنین“ میں تصریح کرتے ہیں کہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوا تھا اور ان کے وصال کے بعد پہلا نکاح حضرت محمد بن جعفر کے ساتھ ہوا تھا، لکھتے ہیں:

محمد بن جعفر بعد از فوت عمر بن الخطاب بشرف مصاہرت امیر المومنین علیہ السلام مشرف گشتہ ام کلثوم را کہ با عدم کفارت از روئے اکراہ و رجاء عمر بود تزویج نمود یعنی عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے وصال کے بعد محمد بن جعفر رضی اللہ عنہا حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے ساتھ شادی کر کے امیر المومنین رضی اللہ عنہ کے شرفِ امامی سے مشرف ہوئے جو کہ قبل ازیں باوجود کفو نہ ہونے کے محض اکراہ و اجبار کی وجہ سے عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کے عقدِ نکاح میں تھیں۔ (مجالس المومنین جلد اول ص ۱۹۵)

الغرض واضح ہو گیا کہ اول حقیقی وہ عقدِ نکاح ہے جو حضرت فاروقِ عظیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوا اور اس کے بعد اول عقد محمد بن جعفر والی ہے جیسے کہ قاضی نے کہا یا حضرت عون وان، جیسے ڈھکو نے دعویٰ کیا، اس لیے اس جواب سے حضرت عمر اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد کی نفی نہیں ہو سکتی اور نہ اس کے انکار کی کوئی

صورت نکل سکتی ہے اور تمام کتب معتبرہ کا لفظ ذکر کر کے علامہ ڈھکوصاحب نے اپنی روایتی خیانت اور قریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شیعہ کتب معتبرہ میں اس کے سراسر خلاف اور برعکس مذکور ہے جیسے ہم نے قاضی نور اللہ کی کتاب سے ثابت کیا ہے۔

جواب الرابع: علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت بتول پر بے شمار ظلم و ستم ڈھائے گئے، جن میں عمر بن الخطاب پیش پیش تھے، لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اسی زہرا رضی اللہ عنہا کی لخت جگر کا رشتہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو دین تو جو ابا گزارش ہے کہ ہم اس عقد تزویج اور نکاح و شادی کو پیش ہی اس لیے کرتے ہیں کہ تمہارے ظلم و ستم اور تعدی و استبداد کے متعلق تراشے ہوئے سارے افسانے اور داستانیں بے بنیاد اور لغو و بیہودہ ثابت ہوں کہ اگر ان میں کوئی صداقت ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی لخت جگر کا رشتہ کیونکر دیتے، لہذا یہ عمل اور اس قدر قریبی تعلق، بلکہ تعلقات کی سب سے اعلیٰ صورت اور نوعیت اس امر کی بین دلیل اور ناقابل تردید برہان ہے کہ وہ افسانے جناب کے طبع زاد اور خود ساختہ ہیں اور صرف عبداللہ بن سبا یہودی کی فتنہ پر دازی کے ثمرات و نتائج ہیں۔

قبل ازین ابن ابی الحدید شیعہ معتزلی شارح نہج البلاغۃ کے حوالہ جات سے یہ تصریح نظر نواز ہو چکی ہے کہ اس قسم کی روایات کے ساتھ صرف شیعہ منفرد ہیں۔ دوسرے تمام اسلامی فرقے ایسی روایات کو نہ ذکر کرتے ہیں اور نہ ہی ان کے قائل اور معترف ہیں اور شیعہ کی ان مقدس ہستیوں کے ساتھ عداوت اور کینہ وری روشن اور واضح ہے، لہذا کلام العدی ضرب من الہذیان کے مطابق وہ سب ناقابل اعتبار اور نالائق اعتداد ہیں، اس لیے ان طبع زاد اور خود تراشیدہ افسانوں کو یہاں پیش کر کے شیعہ علماء کا ان روایات اور تصریحات کو غلط اور موضوع قرار دینے کی کوشش کرنا جو ان کی انتہائی معتبرہ علیہ اور صحاح میں موجود ہیں بالکل بے جواز ہے اور اس عقد تزویج کا اس جیلے بہانے سے انکار کرنا بالکل غلط اور بے سود ہے، بلکہ جب شیعہ کی معتبرہ کتابوں سے اس کا ثبوت مل گیا اور جمہور اہل اسلام کے نزدیک

صحابہ کرام کے بالعموم اور حضرت عمر اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے بالخصوص برادرانہ اور دوستانہ تعلقات ایک مسلم حقیقت قرار پاتے، تو اس عقد کا سراسر حقیقت ہونا اور ظلم و تعدی کا سراسر افسانہ بلکہ بہتان ہونا واضح طور پر ثابت ہو گیا۔

۲۔ نیز علامہ موصوف نے فرمایا کہ انہیں مصائب و نوائب کی تاب نہ لا کر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا وصال فرما گئیں، یہ کس قدر بے عقلی اور کچھ فہمی کا منطابہ ہے کہ سید العالین صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کا صدمہ تو آپ کے لیے جاں لیہ ثابت نہ ہوا، صرف فدک (جس کے نہ ملنے کے باوجود اموال غنیمت وغیرہ سے حصص اور معقول وظائف ملتے رہے) ان کے حاصل نہ ہونے کا غم اس قدر ناقابل برداشت ہو گیا کہ اسی وجہ سے آپ کا وصال ہو گیا، حالانکہ فدک بھی دنیوی معاملہ اور جو خلافت بقول شیعہ غضب ہوئی وہ بھی دنیوی معاملہ تھا۔ علاوہ ازیں اس کا تعلق بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات متقدسہ سے تھا نہ کہ آپ سے، لیکن اس فانی دنیا کے ہاتھ سے نکل جانے پر آپ اس جہاں سے بھی بیزار ہو کر دوسرے جہان کو سفر کر جاتیں۔ نا طفقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے جن کے غلاموں کے غلام تخت و تاج چھوڑ کر اور آبائی ورثہ کو ترک کر کے خلوتوں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے میں مصروفیت و مشغولیت کو سعادت دارین سمجھیں جیسے کہ حضرت ابراہیم بن ادھم رضی اللہ عنہ بلکہ آپ کے تحت جگر نورِ نظر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اتنی عظیم سلطنت کو چھوڑ کر امت میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی سعی فرماتیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبی خبر کو سچا کر دکھاتیں، "ان ابی ہذا سید لعل اللہ ان یصلح بہ بین فئتين من المسلمین عظیمتین" ان کی امتی جان۔ اس قدر محدود مال اور محدود حکومت ہاتھ سے نکل جانے پر اس قدر اندوہناک ہو جاتیں کہ آپ کی موت واقع ہو جائے۔ لعنت بریں عقیدہ باد!

ڈھکیو صاحب البغض صحابہ کرام تو تمہاری مجبوری ہے، مگر اہل بیت کرام کو اس قدر عبید دنیا بنا ڈالنے میں اہل بیت کرام کے ساتھ کونسی محبت اور مودت اور اخلاص و ہمدردی کا اظہار ہے؟ جن کے آبا جہان کو کونین کی حکومت و سلطنت پیش کی جائے مگر

وہ فقر و مسکنت کو ترجیح دیں اور اسے اختیار فرمائیں۔ ان کے مقدس خمیر سے پیدا ہونے والی بتول اور ان کے انوارِ علم اور تجلیاتِ عرفان کی امین فاطمہ میں دنیا کی محبت کا کوئی امکان ہو سکتا ہے؟ اور پھر فاطمہ اور بتول کے معنی پر ہی غور کر لیتے۔ وہ ان القاب اور اسما سے موسوم ہیں تو دنیوی بے رغبتی اور دنیا سے بے تعلقی کی وجہ سے ہی پھر دنیوی محبت اور محبت اور حرص اور یہ القاب و اسماء جمع کیونکر ہو سکتے ہیں؟

۳۔ نیز علامہ ڈھکو صاحب کا اس عقدِ نکاح کو اس دلیل دہرمان سے رد کرنا کی درایت ہے، جبکہ شیعہ علماء نے اپنی درایت کے مطابق اس عقدِ نکاح کو بھی ظلم و استبداد کی اسی لڑی میں پرو دیا اور اسے بھی غضبِ خلافت پر قیاس کر لیا تو فرمائیں ڈھکو صاحب کی درایت قابلِ قبول ہے جو اپنی تمام معتبر مذہبی کتابوں میں مندرج اور مسلم روایات کے انکار پر مبنی ہے یا دیگر علماء شیعہ کی درایت جو ان روایات کی صحت اور درستگی تسلیم کرنے پر مبنی ہے۔ الغرض ڈھکو صاحب کا یہ جواب سراسر تحکم اور سینہ زوری ہے اور اپنے علماء کو بلکہ ائمہ کرام کو جھٹلانے کی مذموم سعی اور جہد و جہد ہے۔

جواب الخامس: علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں جس ام کلثوم نامی عورت کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا، وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں جو کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئی تھیں اور وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں اور ان کے زیر تربیت رہیں، اس لیے مجاز ہی طور پر بیٹی کہلاتیں، کیونکہ انہی حضرت اسماء کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے نکاح کر لیا تھا۔ لیکن یہ جواب بھی بوجہ غلط اور بیہودہ ہے۔

۱۔ علامہ موصوف کو یہ خیال نہ رہا کہ حضرت ام کلثوم بنت علی (رضی اللہ عنہا) کا تولد دس ہجری سے قبل تسلیم کرنا ضروری ہے، کیونکہ علماء شیعہ اس پر متفق ہیں کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے بطن اقدس میں حضرت محسن اس وقت موجود تھے، جب سرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا تھا، جبکہ ام کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا کی ولادت ۵ ہجری میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی، تو اندر ہی صورت

جو اُمّ کلثوم چار پانچ سال کم از کم بڑی ہیں، جب اُن کا نکاح ساٹھ سالہ بوڑھے عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ از روئے درایت جائز نہیں تھا، تو اس سے کم از کم چار پانچ سال چھوٹی ام کلثوم کا نکاح اس بوڑھے شخص کے ساتھ کیونکر جائز ہو گیا؟
 ڈھکوصاحب یہ جواب دیتے وقت آپ کی درایت کہ ہر گنتی جو بنت علی رضی اللہ عنہا کے نکاح کو محال اور ناممکن بنا رہی تھی؟ اقلیس منکم س جل س شید۔

۲۔ اگر حضرت عمر کی منکوصہ ام کلثوم حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہم کی صاحبزادی ہیں تو شیعہ علماء کو یہ تاویلات و تسویلات گھڑنے کی کیا ضرورت تھی کہ ام کلثوم بنت علی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہم کے گھر نہیں گئی تھیں، بلکہ ان کی ہم شکل صحیفہ جنیہ عورت گئی تھی۔ حضرت امیر علیہ السلام نے محض ظاہری اسلام کی وجہ سے ان کو یہ رشتہ دے دیا تھا، اگرچہ حقیقت میں ان کو مومن نہیں سمجھتے تھے۔ اگر خلافت جیسا اہم منصب آپ سے غضب ہو گیا اور آپ مجبوراً خاموش رہے تو اس رشتہ کے غضب ہو جانے میں کونسی تعجب کی بات ہے وغیرہ وغیرہ۔ لہذا روز روشن کی طرح ظاہر ہوا کہ وہ ام کلثوم بنت علی ہی تھیں نہ کہ بنت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہم،

۳۔ اگر وہ ام کلثوم بنت صدیق رضی اللہ عنہا تھیں، تو پھر اہل سنت کے جواب میں سید مرتضیٰ اور ابو جعفر طوسی جیسے شیعہ متکلم اور محدث کیوں پیچ و تاب کھاتے دکھائی دیتے ہیں اور قرآن و سنت کے برعکس حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس فعل کو دلیل بناتے ہوئے کفار کے ساتھ نکاح کو کیوں جائز قرار دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سیدھی سی بات تھی کہ جیسا اُس کا باپ ویسا ہی اُس کا خاوند، لہذا حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟

۴۔ علامہ ڈھکوصاحب فرماتے ہیں بعض مورخین مغالطہ کا شکار ہو گئے اور ام کلثوم بنت ابو بکر کو حضرت علی رضی اللہ عنہم کے ہاں تربیت پانے کی وجہ سے بنت علی سمجھ لیا، مگر یہ سراسر دھوکہ بازی اور فریب کاری ہے۔ کیا محمد بن یعقوب کلینی صاحب بھی تو شیخ ہیں اور ابو جعفر طوسی صاحب بھی۔ کیا حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ بھی انہیں

مغالطہ کا شکار ہونے والے مورخین میں شامل ہیں جنہوں نے اس رشتہ کے غصب کئے جانے کا بقول شیعہ اقرار فرمایا ہے۔

از روئے روایتِ ام کلثوم بنت علی کے نکاح کا ثبوت

ڈھکوصاحب! آپ فراڈ بازی اور مکاری سے کام نہ لیں، اپنی کتبِ حدیث میں سے صحاح کو چھوڑ کر دوسری طرف کیوں بھاگتے ہو، جبکہ کافی تمہارے نزدیک مسلم ہے اور تمہارے محدثِ کلینی کا دعویٰ ہے کہ اس پر مہرِ تصدیق لگاتے ہوئے امام غائب حجۃ اللہ المنتظر نے فرمایا: **هَذَا كَافٌ لِّلشَّيْعَةِ**۔ الغرض از روئے روایت و روایتِ یسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت عمر کی منکوحہ ام کلثوم حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کی ہی تختِ بکر اور نورِ نظر تھیں، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اگر رغبت اور دلچسپی ہو سکتی تھی، تو دینی لحاظ سے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رشتہ داری میں ہی ہو سکتی تھی جیسے کہ طراز الذبب المظفری میں ص ۵۷، ۵۸ پر مذکور و منقول ہے کہ انہوں نے کہا میں نے رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا، **كُلُّ حَسَبٍ وَنَسَبٍ يَنْقَطِعُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا حَسَبِي وَنَسَبِي**۔ یعنی قیامت کے دن تمام حسبی اور نسبی رشتے منقطع ہو جائیں گے سوائے میرے حسبی اور نسبی تعلق کے۔ اور حسبی تعلق میں تو پہلے سے شامل ہوں، لہذا نسبی تعلق میں بھی مجھے شریک کر لو تاکہ قیامت کے دن مجھے اس سے فائدہ پہنچ سکے اور دنیوی لحاظ سے رغبت ہو سکتی تھی تو بھی آپ کے ہی رشتہ میں تاکہ بنو ہاشم اور بنو عبدمناف کا تعاون حاصل ہو جائے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اس رشتہ کے حاصل ہو جانے کے بعد خلافت پر مہرِ تصدیق بھی لگ جائے اور کسی کو تنقیدِ اعتراض کا موقعہ ہی نہ مل سکے۔ نیز حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی کبیرہ گی اور ناراضگی وغیرہ کے افسانے بھی اس صورت میں ختم ہو کر رہ جاتے تھے، لہذا از روئے روایات اور روایت و قیاس یہ رشتہ یقیناً ام کلثوم بنت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہا کا ہے نہ کہ ام کلثوم بنت ابوبکر رضی اللہ عنہما کا۔

۵۔ علامہ موصوف نے اپنے مفروضہ پر یہ قرینہ قائم فرمایا کہ بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کہیں بھی ام کلثوم کے نام کے ساتھ بنت فاطمہ یا من لطن فاطمہ موجود نہیں ہے، مگر یہ بھی جناب والا کی دھوکہ بازی اور قریب کاری ہے، کبرئکہ اگر بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا وغیرہ اس نام کے ساتھ مذکور نہیں تو بنت اسماء وغیرہ بھی کہیں مذکور نہیں ہے تاکہ اس کو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے لطن سے پیدا ہونے والی ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی تسلیم کیا جائے۔ جو جواب باصواب اس لفظ کے متذکر نے کے بعد جو دام کلثوم بنت اسماء رضی اللہ عنہا کی طرف سے ہوگا وہی جواب ام کلثوم بنت فاطمہ رضی اللہ عنہا مذکور نہ ہونے کا بھی ہوگا۔ لہذا علامہ صاحب کے ایسے بے ہودہ اور بے ذرا اور بے مقدار بے اعتبار قرائن کے ذریعے حقائق اور حقیقت کو چھوڑ کر مجاز کی طرف رجوع کیونکر کیا جاسکتا ہے نیز اگر اس قسم کے بے بنیاد توہمات کی بناء پر حقیقت کو کے اثبات کا امکان ہی نہیں رہے گا، ہر مخالف کوئی نہ کوئی عقلی یا نقلی قرینہ بزرگموش تیار کر ہی لے گا۔

الحاصل عبارات کے مترجم مفہوم اور نصوص کے متبادر الی الفہم معانی و مفہیم پر ہی دار و مدار ہوگا اور بلا دلیل قطعی اور بغیر احتمال ناشی عن الدلیل کے حقیقت سے عدول و انحراف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی اور طراز المذہب المتطہری میں بیس صفحات پر پھیلی ہوئی ام کلثوم کے نکاح کی بحث میں شیعہ اور سنی کتابوں کے حوالہ جات سے اس امر کی تصریح کی ہے اور اس تصریح و توضیح پر مشتمل متعدد روایات نقل کی ہیں کہ حضرت عمر کی منکوحہ ام کلثوم حضرت علی رضی اللہ عنہم کی بی لخت جگر تھیں، مگر ڈھکوسا صاحب نے نہ اس کو دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے اور نہ اس میں مندرج حوالہ جات کے جواب کی۔

۶۔ نیز حقیقت واقعہ یہ ہے کہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے لطن سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی کوئی بیٹی پیدا ہی نہیں ہوتی تھی، بلکہ صرف اویس ایک بیٹا محمد بن ابی بکر پیدا ہوا تھا، تو وہ ام کلثوم جو حضرت اسماء کے لطن سے پیدا ہی نہیں ہوتی تھی وہ حضرت اسماء کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح کے بعد

اُن کی رہنمائی کیسے بن گئیں اور بطور مجاز اس کو بیٹی کیسے کہہ دیا گیا اور مغالطہ کیسے لگ گیا۔ کیا عقل و فرد کی دنیا میں اس اندھیر گردی اور فریب کاری کی کوئی مثال مل سکتی ہے؟

اسلام میں رشتہ داری کا دار و مدار ایمان داری پر ہے

جواب السادہ، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ پیر صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ اخروی فوز و فلاح اور نجات کا دار و مدار ایمان داری پر ہے نہ کہ رشتہ داری پر۔ یہ بھی علامہ موصوف کی کوتاہ اندیشی یا بد باطنی پرمبنی جواب ہے، بلکہ مغالطہ دینے کی کوشش۔ پیر صاحب کو تو معلوم تھا اور اُن کے مریدین کو بھی، مگر تمہیں اور تمہاری قوم کو معلوم ہونا چاہیے کہ مجوسی اور یہودی مذہب کے احکام اب لاگو نہیں ہو سکتے۔ اسلام میں جنگ بدر کے بعد سے کفار کے ساتھ باہمی نکاح کو ناجائز قرار دے دیا گیا تھا۔ کما قال اللہ تعالیٰ، لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔ یعنی مشرکین اور کفار مردوں کے لیے مومن عورتیں حلال نہیں اور نہ مشرک اور کافر عورتوں کے لیے مومن مرد حلال ہیں۔ نیز فرمایا، وَلَا تَمْسُكُوا بُعْصَمَ الْكُوفَارِ۔ کافر عورتوں کو اپنے عقد زوجیت میں نہ رکھو اور اہل کتاب لوگوں کے ساتھ بھی رشتہ داری کی فقط یہ صورت جائز اور مباح رکھی گئی کہ ان کی عورتوں سے مسلمان مرد نکاح کر سکتے ہیں، لیکن اہل کتاب مردوں کے ساتھ مسلم عورتوں کا نکاح جائز نہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ مومنہ عورت کے لیے مومن مرد ہی خاوند بننے کا حق رکھتا ہے اور ایسے رشتہ کا دار و مدار صرف اور صرف ایمان داری پر ہے اور جہاں پر ایمان داری نہیں ہوگی، وہاں پر رشتہ داری بھی نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص جہاں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسا عظیم المرتبت انسان اور مقتدا ہو سکتا ہے خلق رشتہ داری قائم کر رہا ہو تو اس جگہ ایمان داری کو تسلیم نہ کرنا بے ایمان اور بدین شخص کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی ایماندار شخص ایسی بات زبان پر نہیں لا سکتا۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ شیعہ مذہب میں شراب خوردگی کے ساتھ مومنہ عورت کا

نکاح درست نہیں ہے جیسا کہ ان کی اصلاح میں اس کی تصریح موجود ہے تو کیا غضبِ خلافت اور غضبِ فدک بلکہ نفاق اور ارتداد کو شرابِ جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے تھے؟ کہ شرابی کے ساتھ نکاح تو حرام ہو، مگر غاصبِ خلافت و فدک اور منافق و مرتد کے ساتھ مناکحت اور رشتہ داری جائز ہو۔ باوجود اس منافقت اور ارتداد کا قطعی علم ہونے کے۔ حاشا ہم اللہ تعالیٰ عن ذالک۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ ان کو صرف مخلص مومن ہی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس امت سے افضل ترین اور اپنے مقابلہ میں شکِ اعمال نامے والی شخصیت تسلیم کرتے تھے۔ کیا سبب۔

جواب السابع، علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں، پیر صاحب کو فروع کافی میں منقول لفظ فرج پر بہت غصہ آیا ہے، لیکن یہ اُن کی کوتاہ اندیشی ہے، اس کا معنی کشائش اور فراخی ہے اور اس کو راء کی زبر کے ساتھ پڑھا جانا چاہیے۔ مگر اس میں بھی علامہ صاحب نے محض ہیرا پھیری سے کام لیا ہے۔

۱۔ سبحان اللہ العظیم! جب عنوان ہے: ”باب تزویج ام کلثوم“ تو اس جگہ کشائش فراخی کا معنی کیونکر مراد ہو سکتا ہے اور سکون راء کی بجائے فتح راء کے ساتھ پڑھنے کا امکان کیسا ہے، کیونکہ آپ اس رشتہ کے بخوشی اور برضا و رغبت ہونے یا جبر و اکراہ کے ساتھ اس کے وقوع پذیر ہونے کو بیان کرنا چاہتے تھے، دوسری کسی فراخی عیش اور کشائش رزق کے چھین جانے کا تذکرہ ہی بے محل اور نامناسب تھا۔

۲۔ نیز خلافت اور فدک وغیرہ بقولِ شیعہ پہلے غضب ہو چکے تھے اور اس غم اور رنج و الم کی وجہ سے بقولِ ڈھکو صاحب حضرت سیدہ زہرا طاہرہ رضی اللہ عنہا اس جہاں کو بھی الوداع فرما گئی تھیں اور یہ رشتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ مترہ بگیری میں یعنی سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال شریف کے بعد ساتویں سال طے ہوا، تو اتنے عرصہ بعد کہنا کہ یہ پہلی فراخی اور کشائش تھی جو ہم سے غضب کر لی گئی، سائے شیعہ مذہب پر پانی پھیر کے مترادف ہے، کیونکہ اس طرح غضبِ خلافت و فدک کا دعویٰ بھی غلط ہو گیا اور حضرت زہرا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما پر ظلم و ستم اور جبر و استبداد کے افسانے بھی بے بنیاد

ہو کر رہ گئے۔ علامہ صاحب کی درایت و دانش اور فہم و فراست کا بھانڈا بھی چور ہے میں
بھیٹ گیا کہ چند سطر قبل جو کچھ ظلم و ستم اور غضب و غیور کے دعوے کیے تھے، وہ یہاں پہنچنے
تک فراموش ہو گئے۔ بریں عقل و دانش بیاید گریست

الغرض یہ تاویل سراسر بے جوڑ اور بے محل ہے، بلکہ صرف اور صرف دہی معنی متین
ہے، جس پر حضرت شیخ الاسلام کو اعتراض ہے اور علامہ ڈھکوا صاحب جیسے علماء کی
تاویلات کو دیکھ کر اور سن کر علامہ اقبال علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے
وَلَمْ يَأْتِ شَأْنُ دَرْجَتِ اِنْدَاخْتِ خُذْ اَوْ جَبْرِ اِلِ و مُصْطَفٰى رَا!

۳۔ نیز علامہ صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ پیر صاحب قدس سرہ کو ناراضگی
غضب کے لفظ سے بھی ہے کہ یہ وہ رشتہ ہے جو ہم سے غضب کر لیا گیا ہے، کیونکہ رشتہ
غضب کر اگر خاموش ہو کر بیٹھ رہتا غیرت مند لوگوں کا کام نہیں ہوتا، لہذا ایسی مقدس
بستیوں اور بلند و بالا مراتب و درجات پر فائز حضرات کے متعلق اس قسم کے الفاظ
استعمال کرنے والا یقیناً محبت و مودت سے ہی نہیں، بلکہ ایمان و اسلام سے بھی
محروم ہے اور وہ شخص اہل بیت کرام کا بدترین دشمن ہے، مگر لباس محبت میں۔
اور ایسا دشمن سب دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

۴۔ نیز محض فرج کے لفظ استعمال کرنے پر غصہ ہو تو بھی بجا ہے۔ رہا قرآن مجید
میں اس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے استعمال تو اس کو وجہ جواز بنانا قطعاً درست نہیں
کیونکہ عمومی تعبیر میں اس کا استعمال علیحدہ امر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَالَّذِينَ
هُمْ لَفِىْ وُجُوْهِہُمْ رَہَاقُطُوْنٌ ۝ اور بالخصوص اہل بیت کرام میں اس کو استعمال کرنا
اور وہ بھی بروایت شیعہ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اور حضرت علی المرتضیٰ
رضی اللہ عنہ کی لُحْنَتِ جَبْرِ کے حق میں اور اپنے پروردگار سے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ
کی ہمیشہ کے حق میں قطعاً قابل قبول اور لائق تسلیم نہیں ہے اور اگر قرآن مجید میں
حضرت مریم علیہا السلام کے حق میں اس کو استعمال کیا گیا ہے تو وہ مقام ضرورت میں ہے
اور کچھ بھی ہو، بندے کو اپنی مسلح پرہیز کر سوچنا لازم ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کے مقام پر اپنے

آپ کو پہنچا کر۔

اللہ تعالیٰ انبیاء کرام علیہم السلام کے حق میں اپنی شانِ الوہیت و صمدیت کے تحت اگر ایسے کلمات استعمال فرمادے جو اُس کی شانِ بے نیازی کے لائق ہوں تو ہمارے لیے ان کو سندِ جواز بنا لینے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ ایک ہمارا خدا دوسرے ہمارے نبی و رسول، ہم پر دونوں کی تعظیم و تکریم فرض ہے، لہذا ہمیں اپنے حدود میں رہ کر الفاظ استعمال کرنا لازم ہے۔ الغرض اول خرج غصبا کا جملہ غصہ اور فرج دونوں کے لحاظ سے سخت بے ادبی ہے اور انتہائی قابلِ اعتراض اور ناقابلِ برداشت، لیکن اہل ایمان، اہل ادب اور اربابِ نیاز کے لیے اور جو لوگ محبت کے دعویٰ کی آڑ میں بے ادبی اور گستاخی کرنے پر تلے ہوئے ہوں، بلکہ ادھار کھائے پیچھے ہوں، اُن کے لیے ایسے جملوں میں کیا خرابی اور ستم اور اسارت و بے ادبی ہو سکتی ہے؟ بلکہ انہیں تو شادمانی اور فرحت بھی اسی وقت حاصل ہوتی ہوگی، جب اس طرح کے وہ الفاظ استعمال کرتے ہوں گے۔

علامہ مجلسی کا مذہب اور ڈھکوصاحب کا کذب

علامہ ڈھکوصاحب نے ان روایات کو موضوع اور من گھڑت کہہ دیا، جن سے حضرت ام کلثوم اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا عقدِ تزویج ثابت ہوتا تھا اور حوالہ علامہ مجلسی صاحب کا دے دیا۔ ہم اسی مجلسی صاحب کے حوالے سے ڈھکوصاحب کے اس دعویٰ کی لغویت اور بطلان ثابت کیے دیتے ہیں اور اس دروغ بے فروغ کا پردہ چاک کرتے ہیں۔ صاحب طراز الذہب المنظری میرزا عباس قلی خاں سپہر اس عنوان پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں،

”مجلسی در بحارالانوار بعد از نگارش برخے اخباری نویسد کہ از زرارہ از ابی عبد اللہ مرویست کہ در باب تزویج ام کلثوم فرمود ان ذالک فرج غصبا و بروایت فرمود اول فرج غصب من ام کلثوم (تا)، شیخ مفید در جواب مسائل منقولہ

می فرماید۔ خبریکہ بتزویج نمودن امیر المومنین دختر خود را یا عمر دارد است ثابت نیست
 (تا) بعد انکار نمودن عمر نفس را و ظهور عداوت او با اہل بیت علیہم السلام قول بجز مناکحت
 او بدون ضرورت یا حصول تقیہ مشکل مینماید و اینکه شیخ مفید اصل این واقعہ را انکار
 نماید برائے بیان آنست کہ از طرق اہل بیت بعید است، ورنہ بعد از ورود این جملہ
 اخبار در وجود این مناکحت انکارش عجیب مینماید و ہم از حضرت ابی عبد اللہ علیہ السلام
 مروی است انّ علیاً علیہ السلام لما قوی عجمانی امر کلثوم فانطلق
 بہا الی بیتہ و این حدیث بر وقوع این قضیہ تصریح مینماید۔

و اصل در جواب این است کہ این مناکحت از روئے تقیہ و اضطرار فرستے دادہ
 و استبعادی درین نیست چہ در مقام ضرورت بسیار سے از محرمات در جملہ واجبات
 می آید۔ علاوہ بر این بدستگیری اخبار صحیحہ ثابت شدہ است کہ امیر المومنین و سائر ائمہ
 معصومین سلام اللہ علیہم اجمعین را از رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم از آن ظلم و ستم ہا کہ بر
 آن ہاروئے دادہ و بر آنچہ واجب می شود برایشان کہ درین مقام بجائے بیاد و ذخیرہ
 رسیدہ بود، خدا کے تعالیٰ آن امر را برایشان مباح فرمود و رسول خدا تنصیف نمود
 با این صورت رفع و تسکین استبعاد حاصل شد۔ طراز الذہب المنظر فی ط ۵۹ تا ۶۱

علامہ مجلسی بحار الانوار میں چند روایات ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح
 کے ثبوت میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ زرارہ نے حضرت ابو عبد اللہ جعفر صادق
 رضی اللہ عنہ سے نقل ہے کہ آپ نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد تزویج کے متعلق
 فرمایا ہے شک یہ وہ رشتہ ہے جو ہم سے غضب کر لیا گیا ہے اور دوسری روایت میں
 ہے کہ پہلا رشتہ جو ہم سے غضب کیا گیا ہے، وہ ام کلثوم کا ہے اور شیخ مفید نے مسائل
 سر وہ کے جواب میں کہا کہ وہ تمام روایات جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ام کلثوم
 کا حضرت عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے ساتھ نکاح اور شادی کر دینے کا ذکر ہے وہ ثابت
 نہیں ہیں (تا) عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے نفس خلافت کا انکار کرنے کے بعد اور ان
 کی اہل بیت کے ساتھ بغض و عداوت ظاہر ہونے کے باوجود بغیر ضرورت اور مجبوری

کے یا تقیہ و کتمان کے یہ عقد مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اور یہ جو شیخ مفید نے اصل واقعہ کا ہی انکار کر دیا ہے تو وہ اس امر کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ اہل بیت کے طرز و طریق اور روش و کردار کے پیش نظر بعید ہے، ورنہ ان تمام روایات کے وارد ہونے کے بعد شیخ مفید کا اس مناکحت اور عقد تزویج کا انکار کرنا عجیب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ روایت بھی حضرت امام ابو عبد اللہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے ہی مروی و منقول ہے کہ جب حضرت عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) کا وصال ہو گیا تو حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور انہیں اپنے گھر لے گئے اور یہ روایت عقد تزویج کے وقوع و تحقق پر بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ دلالت کر رہی ہے (لہذا اصل واقعہ کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے کوئی نئی تاویل و توجیہ ضروری ہے)

تو اس عقد تزویج کے متعلق اصل جواب یہ ہے کہ عقد تزویج تقیہ و اضطراب کی وجہ سے رونما ہوا اور اس امر کو بعید سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کیونکہ ضرورت اور مجبوری کے تحت بہت سی حرام چیزیں صرف حلال ہی نہیں، بلکہ واجب ہو جاتی ہیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ صحیح اخبار و روایات کے ذریعے ثابت ہو چکا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور دوسرے ائمہ کرام کو ان تمام مظالم اور جوہر و ستم کی خبر دی جا چکی تھی جو ان کو پیش آنے والے تھے اور جو کچھ اس دوران ان پر واجب و لازم تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے وہ امور ان کے لئے مباح کر دیئے تھے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی وضاحت و صراحت کر دی تھی۔ لہذا اس جواب سے یہ استبعاد دور ہو گیا اور تسکین قلب حاصل ہو گئی۔

اس طویل اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ علامہ مجلسی اس عقد کو درست اور محقق تسلیم کرتا ہے، بلکہ اُس نے اس عقد کے منکرین کا صحیح روایات پیش کر کے رد کیا ہے، لہذا اس کا حوالہ دے کر ڈھکوسلے کا اس مضمون کی جملہ روایات کو موضوع اور بے بنیاد کہنا سفید جھوٹ ہے اور بدترین علمی خیانت اور اگر بالفرض بحارالانوار میں اس عقد کا

اثبات اور منکرین کا رہے مگر مرآۃ العقول میں اس کے برعکس ہے تو پھر تضاد و تناقض کے شکار شخص کو علماء محققین میں شمار کرنے کا کیا جواز ہے اور اس کے قول کو صحاح اربعہ کی روایات جو امام جعفر صادق سے منقول ہیں اور ان میں سے بعض کی تصدیق امام غائب حجتہ اللہ المنتظر کی طرف سے بھی ہو چکی ہے، ان کے مقابل کیا اہمیت و وقعت دی جاسکتی ہے؟

تلبیس ہی تلبیس

ڈھکوصاحب نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے عقد نکاح کے متعلق کوئی علمی بات کرنے کی بجائے فریب کاری اور دھوکہ دہی کے ریکارڈ توڑ دیئے ہیں اور سراسر تلبیس سے کام لیا ہے، چند نمونے ملاحظہ ہوں:

تلبیس اول: جس ام کلثوم کا نکاح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ہوا، وہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والی حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھی اور بطور مجاز اس کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی کہہ دیا گیا، کیونکہ حضرت اسماء کے ساتھ نکاح کر لینے کے بعد وہ آپ کے ہاں تربیت پاتی رہی تھیں حالانکہ حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت اسماء سے ام کلثوم نام کی کوئی لڑکی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پیداہی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاں تربیت پائی، لہذا اس مجاز کی کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔ آپ کی اس نام والی صاحبزادی حضرت ام حبیبہ بنت خاریجہ بن زید کے بطن سے پیدا ہوئیں اور وہ بھی آپ کے وصال کے بعد ۱۳ھ میں جبکہ عدت وفات گزار کر حضرت حبیبہ نے حضرت حبیب بن یسار رضی اللہ عنہما کے ساتھ نکاح کر لیا، لہذا اگر یہ ام کلثوم ربیبہ ہیں تو حبیب بن یسار کی نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی، لہذا اندر ہی صورت اس کے نکاح کا متوئی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تسلیم کرنا درست نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ان کو مجازی باپ تسلیم کرنا اور نہ ہی ام کلثوم کو دوران عدت حضرت علی رضی اللہ عنہ

کا اپنے گھرانے کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو: الاستیعاب لابن عبد البر جزو ثانی ص ۴۲۵۔ تجرید اسماء الصحابہ للذہبی۔

بلکہ استیعاب میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے صرف محمد بن ابی بکر کے متولد ہونے کی تصریح موجود ہے اور سوائے ان کے دوسری کوئی اولاد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ان سے متولد نہ ہونے کی وضاحت و صراحت موجود ہے اور اسی طرح "الاصابہ فی تمییز الصحابہ لابن حجر عسقلانی میں حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے متعلق مذکور ہے:

تزوجها جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فولدت له
هناك اولاداً فلما قتل جعفر تزوجها ابوبکر فولدت محمداً
ثم تزوجها علی فیقال ولدت له ابنه عوناً قال ابو عمر تفرد
بذلك ابن الکلبی۔ الاصابہ جلد ۱ ص ۲۳۱

ان کے ساتھ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے نکاح فرمایا تو انہوں نے ان کے
ہاں کئی بچوں کو جنم دیا، جب ان کی شہادت واقع ہوئی، تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ
نے ان کے ساتھ نکاح کیا تو آپ کے فرزند محمد ان سے متولد ہوئے۔ پھر آپ کی وفات
کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ کو اپنی زوجیت میں لیا اور کہا جاتا ہے کہ آپ
کے لیے ان سے عون کا تولد ہوا۔

الغرض حضرت اسماء رضی اللہ عنہ کے بطن مبارک سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ
صرف ایک بیٹے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے اور کوئی بیٹی متولد ہی نہیں ہوئی۔

شیعی مؤرخ کی طرف سے ڈھکوسل کی تکذیب

ناسخ التواتر میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق ازواج و اولاد
ابوبکر کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:

ابوبکر را چهار زن بود دو تن را در جاہلیت نکاح بست (تا)، و دو زن در

اسلام آورد یکے اسماء بنت عمیس و از محمد ربیب علی علیہ السلام متولد شد و آن دیگر حبیبہ دختر حارث بن زید انصاری و او در وقت وفات ابوبکر حاملہ بود پس از او دخترے آورد نام او اُمّ کلثوم۔ ناسخ التواریخ جلد دوم از کتاب دوم ص ۲۱۵ یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی چار بیویاں تھیں۔ دو کے ساتھ قبل از اسلام میں نکاح کیا۔ پہلی قتیلہ اور بروایت دیگر اسماء دختر عبد العزیٰ تھی جس سے عبد اللہ اور اسماء ذات لطافین رضی اللہ عنہما کا تولد ہوا اور دوسری حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا جن سے حضرت عبدالرحمن اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہما کا تولد ہوا۔ اور دو کے ساتھ دور اسلام میں نکاح کیا جن میں ایک حضرت اسماء بنت عمیس ہیں، جن سے محمد بن ابی بکر کا تولد ہوا جو کہ حضرت علی کے ربیب بھی تھے رضی اللہ عنہما، اور دوسری حبیبہ بنت حارث بن زید انصاری ہیں جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہم کی وفات کے وقت حاملہ تھیں اور بعد از وصال آپ کی ان سے ام کلثوم نام والی صاحبزادی پیدا ہوئی۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا کہ علامہ ڈھکو صاحب نے بالکل سفید جھوٹ بولا ہے اور ایسا جھوٹ جو اس سے پہلے استادانِ فن کو بھی نہیں سوجھا تھا۔ الغرض اس ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی ربیبہ کہنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے، لہذا شیعی روایات کی روشنی میں اہل سنت کا استدلال بالکل برحق ہے اور ڈھکو صاحب کی تاویلات و تسویلات لغو و بیہودہ اور صرف فریب کاری اور دھوکہ دہی کی ناکام کوشش ہے۔

اور اگر ڈھکو صاحب کی تحقیق ہی صحیح ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان سے پہلے تمام محدث اور متکلم اور اصولی و فقہاء اور مؤرخ و سیرت نگار جابلے بے خبر اور مूर्کہ تھے اور فنِ حدیث اور تاریخ سے کورے، جابلے اور ان پڑھ۔ بس صرف پندرہویں صدی میں ایک صاحبِ علم و بصیرت اور ماہرِ حدیث اور ناقدِ سیرت تاریخ پیدا ہوا۔ فی النسخان و لضعف الدرایۃ والادب۔

تلبیس دوم : علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کی زوجہ حضرت ام کلثوم اور ان کے بیٹے حضرت زید رضی اللہ عنہم کا انتقال تقریباً انچاس یا پچاس ہجری میں مدینہ منورہ کے اندر تسلیم کیا جاتا ہے اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کا ان پر نماز جنازہ پڑھنا بیان کیا جاتا ہے، جبکہ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کا میدان کربلا میں موجود ہونا ثابت ہے۔ حالانکہ طراز الذہب المنطفری ص ۵۲ پر ام کلثوم کبریٰ بنت زہرا اور اُم کلثوم بنت ام سعید بنت عروہ دو صاحبزادیاں حضرت علی رضی اللہ عنہم کی مذکور ہیں، لہذا حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کبریٰ رضی اللہ عنہما کا وصال نہ ۵۰ھ میں ہو گیا ہو اور دوسری صاحبزادی ام کلثوم صغریٰ رضی اللہ عنہما واقعہ کربلا کے بعد تک بقید حیات رہی ہوں تو اس میں کونسا استبعاد ہے اور اس قول سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی منکوحہ ام کلثوم کا ہی میدان کربلا میں موجود ہونا کیسے لازم آگیا، کیونکہ ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما جس طرح کبریٰ ہے اسی طرح صغریٰ بھی ہے اور اگر بالفرض کسی نے ام کلثوم بنت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہما کہہ دیا ہو تو یہ نام اشتراک کی وجہ سے لازم آنے والا معالطہ ہے۔

نیز اس قول سے حضرت ام کلثوم کے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ عقد تزویج میں منسلک ہونے کی نفی کیونکر ہو سکتی ہے؟ کیونکہ آپ کا وصال پہلے ہو چکا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کا وصال بعد میں ہوا اور اس کی تاریخ میں تو خبن کا اختلاف ہو گیا، لہذا بعد والے وصال کی تاریخ کا اختلاف اس سے کافی عرصہ پہلے وقوع پذیر عقد تزویج کو کیسے باطل کر سکتا ہے، بلکہ جو ممکن ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپ کا نکاح یقیناً ثابت ہوا اور آپ کے وصال کی تاریخ میں وارد روایات میں سے صرف ایک قسم کی صحیح ہوا اور دوسری غلط ہو اور دوسری غلط ہو، لہذا سحت عقد پر اس سے کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تلبیس سوم : علامہ ڈھکو صاحب نے حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہما کو صغیرہ ثابت کر کے عقد تزویج ناممکن قرار دینے کی کوشش

کی ہے، حالانکہ ان کا شمار صحابیات میں ہوتا ہے، جبکہ حضرت زینب بنت زہرا رضی اللہ عنہا کو صحابیات میں شمار نہیں کیا گیا اور ظاہر ہے کہ صرف زمانہ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا تشریح صحابی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے، بلکہ سن تمیز کا ہونا بھی ضروری ہے اور یہ قول شیعہ مورخ صاحب ناسخ التواریخ نے بھی ذکر کیا ہے اور عظیم سنی فاضل علامہ ابن عبد البر نے بھی استیعاب میں ذکر کیا ہے، جبکہ مرزا عباس قلی خاں اس کی صحت و صداقت پر یوں استدلال پیش کرتا ہے کہ اگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا بڑی ہوتیں تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے ساتھ نکاح کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے درخواست کرتے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ام کلثوم عمر میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے بڑی ہیں۔ ملاحظہ ہو طراز المذہب المنظری ص ۷۷

نیز حضرت ام کلثوم کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے بڑے ہونے کی دلیل اور برہان وہ روایت ہے جس کو شیخ صدوق نے اپنی سند کے ساتھ ابن ابی المقدم اور زیاد بن عبید اللہ سے نقل کیا ہے کہ ایک شقی اور بد بخت نے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اطلاع دی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ابو جہل کی بیٹی کے ساتھ شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آپ نے اس سے بتکار اس کی تصدیق کر لی تو آپ سخت کبیرہ خاطر ہوئیں۔ جب رات ہو گئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ماضی کے لئے روانہ ہوئیں جس کی کیفیت بقول شیخ صدوق یہ تھی:

فحصلت الحسن علی عاتقہما الایمن والحسین علی عاتقہما الایسر واخذت بید امر کلثوم الیسوی بیدھا الیمنی ثم حولت الی حجرۃ ایہما۔ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو دائیں کندھے پر اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو بائیں کندھے پر اٹھایا اور ام کلثوم رضی اللہ عنہا کے بائیں ہاتھ کو اپنے دائیں ہاتھ سے پکڑا اور والد گرامی کے حجرۃ مبارکہ کی طرف منتقل ہو گئیں۔

اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ کو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھر کی

طرف لے چلے، تو اس وقت بھی صورت حال بقول صدوق یہ تھی:

حمل النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحسن وحملت فاطمة علیہا السلام الحسین واخذت بید ام کلثوم فانتھلی الی علی وھونائم فی المسجد - (الزاد نعمانیہ جلد اول ص ۷۳)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن کو اٹھالیا، جبکہ حضرت زہرا نے حضرت حسین کو اٹھالیا اور حضرت ام کلثوم کا ہاتھ پکڑا۔ رضی اللہ عنہم۔

شیخ صدوق کی بیان کردہ اور سید نعمت اللہ الموسوی کی نقل کردہ اس روایت میں اگر کوئی صداقت ہے، تو پھر تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی ولادت سے قبل حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا تولد ہوا اور آپ اس وقت اتنی بڑی ہو چکی تھیں کہ چل پھر سکتی تھیں اور حضرت زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ کو ادھر ادھر لے جایا کرتی تھیں۔

اندریں صورت صدوق صاحب سچے ہیں تو ڈھکوسا صاحب جھوٹے ہیں اور اگر ڈھکوسا صاحب سچے ہیں تو صدوق صاحب کا معاملہ برعکس، نہہند نام زنگی کا فوروالا ہے، لیکن حقیقت یہی ہے کہ صدوق صاحب کے صدق میں کسی کو کلام نہیں ہے، اسی لیے جزائری صاحب نے تاویلات و تسویلات کے ذریعے ناراضگی اور عصمت میں تطبیق کی سعی اور جدوجہد کی، لیکن روایت سے انکار نہیں کیا اور صاحب ماسخ کو بھی اپنے غفل و فکر کو یہاں لگام دینے میں ہی عافیت نظر آئی، لہذا ڈھکوسا صاحب غریبی والا عذر اور اس عقد و تزویج کے عقلاً ناممکن ہونے کا دعویٰ لغو اور باطل ہو گیا۔ اس کے علاوہ بعض تبلیسیات کا ذکر پہلے آچکا ہے اور کنز مکتوم وغیرہ کے جو حوالے دیئے ہیں کہ ان میں اس مسئلہ کی تحقیق کا حق ادا کیا گیا ہے، تو اس کا رد بھی جن وجوہ حضرت علامہ نور بخش توکلی صاحب کے قلم حقیقت سے مخفیہ شیعہ جلد دوم ص ۲۸ تا ۴۸ پر ملاحظہ فرمائیں اور اندازہ کریں کہ ڈھکوسا صاحب نے یہ تبلیسیات کن ماہرین سے سیکھی ہیں اور کس قدر غلط اور خلاف تحقیق کتب مناظرہ پر اپنی اس جوابی کاروائی

کا دار و مدار رکھا ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی کہ ڈھکوصاحب نے بذاتِ خود کوئی تحقیق و تدقیق نہیں فرمائی، بلکہ ادھر ادھر سے مناظرانہ اباحت پر مشتمل کتب دیکھ کر حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے رسالہ کا جواب لکھنے کی کوشش کی ہے۔

رسالہ مذهب شیعہ از حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ

حدیث قرطاس اور شیعہ استدلال کی لغویت

بے خبر اور ناواقف لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کبھی قرطاس کی روایت پیش کی جاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ظاہری حیاتِ طیبہ کے آخری چھ مہینے میں اپنے حرم سرا میں اہل بیت کے مردوں سے کہا کہ لکھنے کے لیے کوئی چیز (دوات، قلم، کاغذ) لاؤ۔ میں تمہارے لیے کچھ وصیت لکھوں تاکہ میرے بعد تم صراطِ مستقیم پر ثابت رہو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مسجد میں جا کر قلم دوات طلب فرمائی، تو امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہمیں قرآن کریم کافی ہے۔ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں داغ مفارقت تو نہیں دے رہے ہیں؟ اس بات کو سمجھو۔

یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں بھی اہل تشیع کی کتابوں میں بہر صورت قرآن مجید کی آیت کریمہ وَلَا تَخْطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذْ آلَا تُثَابُ الْمُحْسِنُونَ کے خلاف ہے، یعنی آپ اپنے ہاتھ مبارک سے کبھی اس کو نہ لکھنا تاکہ گمراہ کرنے والے لوگ شک پیدا نہ کر سکیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود لکھ سکتے تھے اور قرآن کریم بھی خود لکھا ہے، خدا کی طرف سے نہیں۔ اب آیہ کریمہ میں نفی ہو یا نہیں۔ بہر صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا منسوخ اور محال ہے اور روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ دوسرا بغرض تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں۔ اس سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلا فصل کیسے ثابت ہو گئی۔ تیسرا اہل بیت کے مردوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود تھے، تو ان کو دوات، قلم پیش کرنے کا حکم ہوا جیسا کہ اِيتُونِي كَمَا صِغَرُ جَمْعُ مَذْكُورٍ اسی امر پر دلالت کرتا ہے۔ فرض

کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حَسْبُنَا کِتَابُ اللہ کہہ بھی دیا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے، تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے کہنے پر عمل کرنا تھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے دوات، قلم اور کاغذ پیش نہ کیا؟ چوتھا فرض کہ ہر حضور خلافت ہی لکھتے (جس کا ذکر تک روایت میں نہیں) مگر جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا، اس کے بعد عمر ہوگا۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے۔ دیکھو تفسیر صافی جلد دوم صفحہ ۳۲۔ اسی طرح تفسیر قمی زیر آیت نبأنی العلیہ الخبیر پ ۱۲۰ سودۃ تحریر، تفسیر حسن عسکری اور باقی تمام شیعہ کی معتبر ترین تفاسیر میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت ثابت ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف اور اپنے ارشاد کے خلاف کوئی دوسری خلافت لکھ سکتے تھے؟

بسم پہلے سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے واضح اور غیر مبہم خطبات آپ کو ثنا چکے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد خلافت کی بیعت لینے کے بارے میں عرض کیا گیا، تو آپ نے فرمایا میری خلافت کا زمانہ ابھی نہیں آیا۔ اس وقت میری خلافت کا سوال ایسا ہے جیسے کوئی قبل ازوت کچے میوے توڑے یا کسی دوسرے کی زمین میں کھیتی باڑی شروع کر دے اور فرمایا کہ میرے فتنے یہ ہے کہ میں دوسروں کی اطاعت کروں اور میرے بیعت لینے پر میرے لیے دوسروں کی طاعت مقدم ہے۔ میرے لیے ممکن ہی نہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیعت کی مخالفت کروں۔ بالآخر ان کا خود بیعت کرنا۔ یہ تمام تر روایات حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے تحریر کیے جانے کے سراسر خلاف ہیں اور منافی و مناقض۔

تحفہ حسینی
از ابوالحسن محمد اشرف سیالوی

نہم بحث قرطاس

پہلے قرطاس طلب کئے جانے کے متعلق اہل سنت کی انتہائی معتبر اور مستند کتب میں مروی و منقول روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ قلت یا بن عباس ما یوم الخمیس قال اشتد برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجعہ فقال ایتونی بکتف اکتب لکم کتاباً لن تضلوا بعدہ ابدًا فتنانزعوا واینبغی عند نبی تنارع فقالوا ما شانہ اھجر استفھموا فذہبوا یردون علیہ فقال دعونی ذرونی فالذی انا فیہ خیر مما تدعونی الیہ فامرهم بثلاث فقال اخرجوا المشرکین من عزیرة العرب واجیزوا الوفد بنحو ما کنت اجیزهم فسکت عن الثالثة او قالها فنسبتھا قال سفیان هذا من قول سلیمان و متفق علیہ مشکوٰۃ باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: خمیس کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درد سخت ہو گیا، تو آپ نے فرمایا کہ میرے پاس شانہ کی ہڈی لاؤ تاکہ میں تمہارے لیے ایسی تحریر لکھوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، تو صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہوئے یہ مناسب نہیں ہوتا، تو انہوں نے حجرہ مبارکہ میں موجود حضرات باہم نزاع و اختلاف کئے کرتے گئے، جبکہ حضور نبی اکرم کہا، آپ کا کیا حال ہے، کیا آپ بچہ قصد اور غیر ضروری گفتگو فرما رہے ہیں؟ آپ سے اس کو سمجھ لو۔ وہ جب آپ سے دوبارہ پوچھنے لگے، تو آپ نے فرمایا مجھے چھوڑ دو اور اپنے حال پر رہنے دو، کیونکہ میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، تو آپ نے انہیں تین امور کا حکم دیا: مشرکین کو

جزیرہ عرب سے نکال دینا، آنے والے وفد کو اسی طرح انعامات اور تحائف دینے کو رخصت کرنا جیسے کہ میں دیا کرتا تھا۔ تیسری بات سے سکوت فرمایا یا میں اس کو بھول گیا۔ سفیان فرماتے ہیں کہ یہ قول سلیمان ابن احول کا ہے جس نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت نقل کی ہے (متفق علیہ)۔

۲۔ عن ابن عباس قال لما حضر رسول الله صلى الله عليه وسلم وفي البيت رجال فيهم عمر بن الخطاب قال النبي صلى الله عليه وسلم هلموا اكتب لكم كتابا لن تضلوا بعد فقال عمر قد غلب عليه الوجد وعندكم القرآن حسبكم كتاب الله فاختلف اهل البيت واختصموا فمنهم من يقول قريبا يكتب لكم رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنهم من يقول ما قال عمر فلما اكثروا اللغو والاختلاف قال رسول الله صلى الله عليه وسلم قوموا عني قال عبيد الله وكان ابن عباس يقول ان الودية كل الودية ما حال بين رسول الله صلى الله عليه وسلم وبين ان يكتب لهم ذلك الكتاب لا اختلافهم ولغظهم متفق عليه حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت وصال قریب آگیا اور حجرہ مبارکہ میں چند آدمی موجود تھے جن میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی تھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس (لکھنے کا سامان) لے آؤ، میں تمہارے لیے ایک تحریر لکھوں جس کے بعد تم ہرگز گمراہ نہیں ہو گے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: تحقیق آپ پروردگار غلبہ ہے اور تمہارے پاس قرآن مجید ہے، لہذا تمہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے تو گھر میں موجود لوگوں نے باہم اختلاف کیا اور جھگڑنے لگے۔ بعض کہتے تھے لکھنے کے لیے ضروری اشیاء مہیا کرو۔ آپ تمہارے لیے لکھیں اور بعض اس طرح کہتے تھے جیسے حضرت عمر

رضی اللہ عنہ نے کہا تھا۔ جب ان کا اختلاف و نزاع زیادہ ہو گیا اور شور مچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے پاس سے اٹھ جاؤ اور دور جا کر بحث مباحثہ کرو، عبید اللہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے تھے، بہت بڑی مصیبت اور پریشان کن بات ہے، مہرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اس تحریر کے درمیان حائل ہو گئی بسبب ان کے اختلاف اور شور کے۔

اقول: بخاری شریف اور مسلم شریف کی متفق علیہ روایات سے چند امور واضح ہو جاتے ہیں، جن کا ذہن نشین رکھنا از بس ضروری ہے۔

۱۔ یہ واقعہ خمیس کا ہے اور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال شریف سوموار کو ہوا، گویا تین دن رات مکمل درمیان میں گزرے اور خمیس کا بقیہ حصہ اور سوموار کی رات اور دن کا کچھ حصہ، لیکن پھر آپ نے اس حکم کا اعادہ نہ فرمایا اور کسی قریبی رشتہ دار کو بھی سامانِ کتابت لانے کا حکم نہ دیا اور نہ ہی انصار کو جو فی الواقع کامل انصار تھے اور صاحبِ ایثار اور جہاں نثار غلام۔

۲۔ جب صحابہ کرام علیہم الرضوان نے تحقیق کے لیے اور حتمی ارادہ معلوم کرنے کے لیے دوبارہ عرض کیا، تو فرمایا، مجھے میرے حال پر چھوڑو، میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے، جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو۔ اگر اس امر کا تعلق فراتسن رسالت سے تھا، تو اس کا بیان نہ فرمانا اور لکھنا فراتسن رسالت میں العیاذ باللہ تقصیر اور کوتاہی کا موجب ہوگا جو قطعاً درست نہیں۔

۳۔ آپ نے زبانی تین چیزوں کا ذکر فرمایا، جن میں سے دو تو صراحت کے طور پر مذکور ہیں اور تیسری چیز سلیمان بن اھول کو یاد نہ رہی یا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ذکر نہ فرمائی، لیکن وہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کی روانگی کی تاکید ہے جیسے کہ محدثین نے تصریح فرمائی، ان میں بھی خلافت بالفصل یا بلا فصل کا کہیں نام و نشان نہیں، جس کے گمان پر صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مورِ طعن و تشنیع بنایا گیا ہے۔ اگر تحریر بھی ان کی فرمانی تھی تو زبانی ان امور

کی وضاحت ہو گئی جس طرح نبوت کے تئیس سال کا معمول تھا کہ جملہ عقائد و اعمالِ نبانی ہی بتلائے جاتے رہے۔ اور اگر وہ ان امور کے علاوہ کوئی چیز تھی تو امت کی ہدایت کی ضامن اور موجب تحریر کو نظر انداز کرنا صرف چند حاضرین میں سے بعض آدمیوں کے اختلاف کی وجہ سے اور قیامت تک آنے والی امت کی بہتری کو نظر انداز فرمانا رحمتہ للعالمین اور بالمؤمنین رَدِّف ورحیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی شان والے نبی سے بعید ہے۔

۴۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خالص ہمدردی اور نیازمندی پر مشتمل مشورہ دیا کہ آپ پر درد کا شدید دورہ ہے اور تمہارے پاس قرآن حکیم ہے جو ہدایت کے لیے کافی ہے۔ اس میں آپ کی طرف کس طرح بے ادبی اور جرأت و جسارت کی نسبت کی جاسکتی ہے؟ جبکہ آپ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے وزیر میں داخل اور مشورہ میں شامل تھے جن کے ساتھ مشورہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا وِشَاوْهُمْ فِی الْاَھْرَاور متعدد مقامات پر ان کا مشورہ قبول کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان کے مشورہ کے مطابق وحی نازل فرمائی، لہذا مشورہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ عمل کے معاملہ میں آپ مالک تھے، مشورہ قبول نہ فرماتے اور اپنے عزم اور حتمی ارادہ کے مطابق عمل فرماتے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰہِ**۔ یعنی جب آپ کا پختہ ارادہ بن جائے، تو اللہ تعالیٰ پر توکل کرو اور اس کام کو کر لو۔ جب آپ نے وہ تحریر لکھی، تو معلوم ہوا کہ آپ کا ارادہ ہی بدل گیا تھا، ورنہ اس حکم خداوندی کی خلاف ورزی لازم آئے گی اور ترکِ توکل جو کہ قطعاً درست نہیں ہے۔

۵۔ جب اتنا طویل وقت درمیان میں ہونے کے باوجود دوبارہ اس ارادہ کو ظاہر نہ کیا گیا، تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو قبول فرمایا اور اسی کے مطابق عمل ہوا، لہذا یہ چیز آپ کے عظیم مناقب میں داخل ہو گئی کہ آخری لمحے میں بھی آپ کے ہی مشورہ کے مطابق عمل ہوا نہ کہ باعثِ طعن و تشنیع اور موجبِ جرح و قدح۔

۶۔ جن لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف اس واقعہ کو بطور حربہ استعمال

کیا ہے ان سے دریافت طلب امر یہ ہے کہ قرآن مجید میں وہ امر تھا یا نہیں تھا جس کی تخریب کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ارادہ رکھتے تھے۔ اگر نہیں تھا تو دین کامل نہ ہوا اور قرآن مجید کا یہ اعلان الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا نَعُوذُ بِاللَّهِ غُلَطُ بُوہ رہ گیا، کیونکہ حجۃ الوداع کے موقع پر تو دین کے اکمال اور نعمت کے اتمام کی خوشخبری سنائی گئی تھی اور ربیع الاول شریف میں یعنی صرف دو ماہ درمیان میں گزرنے پر وہ دین پھر ناقص ہو جاتے اور ہدایت کا دار و مدار اور گمراہی سے تحفظ کا ضامن امر ابھی پایا ہی نہ گیا ہو تو اس قدر اہم اور ضروری امر کے اعلان و اظہار کے بغیر دین کامل کیسے ہو گیا اور تکمیل نعمت کیونکر ہو گئی اور اگر اس اہم امر کا بیان قرآن مجید میں تھا تو اب اس کا لکھوانا یا لکھنا تکرار اور تاکید کے زمرہ میں آتا تھا جو ہر حال اس شدید تکلیف کے دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے ہمدرد اور خیر خواہ کے لیے قابل برداشت نہیں تھا، لہذا یہ مشورہ عرض کرنا آپ کا فرض تھا اور آپ نے اپنی طرف سے ہمدردی اور اخلاص کا حق ادا کیا۔ جس پر آپ لائق صد تحسین تھے نہ کہ قابل تنقید و تنقیص کما قال اللہ تعالیٰ، فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ لَا يُؤْمِنُونَ یعنی قرآن مجید کے علاوہ وہ کس بات سے صاحب ایمان ہو سکتے ہیں؟

۷۔ اگر قرآن مجید میں خلافت اور امامت کا مسئلہ حل کیا جا چکا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت بلا فصل کی تصریح موجود تھی، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خلافت مرتضوی میں روٹے اٹکانے والا الزام غلط ہو گیا اور آپ کا ”حسبنا کتاب اللہ“ کہنا خلافت مرتضوی کا انکار نہ ہوا بلکہ اقرار۔ اور اگر اس خلافت و امامت کا قرآن مجید میں ذکر نہیں تھا، تو آج وہ آیات شیعہ حضرات کو کہاں سے مل گئیں جو صحابہ کرام کو نہ مل سکیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تفسیر اور تشریح کے باوجود مہاجرین و انصار سمجھی ان سے بے خبر رہے اور صرف شور مچی رہی وار و مدار سمجھ لیا اور اپنا دین و مذہب اور دنیا سب کچھ نعوذ باللہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خاطر ہر باد کر

بیٹھے اور قرآن مجید کو بھی چھوڑ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی چھوڑا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو بھی۔ آخر ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ میں وہ کونسی جاذبیت اور مقناطیسی قوت تھی جس نے سب کو غافل اور یہ خبر کر کے رکھ دیا؟ لغو ذبا اللہ من سوء الفہم وزیغ القلب۔

۸۔ اگر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسئلہ خلافت کے متعلق ہی اپنا فیصلہ لکھنا چاہتے تھے، تو وہ کس کی خلافت تھی؟ اس پر کیا دلیل ہے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت کی تحریر کا احتمال تھا، تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے متعلق بھی یہ احتمال موجود تھا۔ تحریر ہو جاتی، تو ایک صورت متعین ہو جاتی اور جب تحریر نہیں پائی گئی تو محض احتمال کی بنا پر ان مقدس ہستیوں کو مورد الزام و اتہام ٹھہرانا جن کے فضائل و کمالات اور اخروی نعمتوں اور بلند درجات اور ان سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی وغیرہ کا بیسیوں جگہ قرآن مجید میں اعلان ہے کونسی دینداری اور دیانتداری ہے۔ کیا یہ مسلم عقلائی قاعدہ نہیں ہے: اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال، بلکہ اہل السنۃ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت پر دلیل ترجیح پیش کر سکتے ہیں، کیونکہ جہاں یہ روایت بخاری شریف اور مسلم شریف میں ہے۔ دوسری روایت جو حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت سے متعلق ہے، وہ بھی انہیں میں موجود ہے اور تمام روایات کو سامنے رکھ کر معنی کا تعین ضروری ہے نہ کہ صرف اپنی پسندیدہ اور مرضی کی روایت لے کر مخالف فریق کے خلاف عدلی اور الزامی طریقہ اپنالیا جائے۔ روایت ملاحظہ ہو،

۱۔ عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا (الی)، ولقد ہممت ان اسدت ان اسل الی ابی بکر و ابنہ و اعہد ان یقول القائلون او یتمنی المتمنون ثم قلت یا بی اللہ و یدفع المؤمنون او یدفع اللہ و یا بی المؤمنون۔ رواہ البخاری باب وفات النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا، البتہ تحقیق میں نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ ابو بکر اور ان کے بیٹے کی طرف آدمی بھیجوں اور ان کی طرف عہد کروں تاکہ کہنے والے نہ کہیں یا تمناؤ آرزو کر نیوالے تمناؤ آرزو نہ کریں۔ پھر میں نے کہا، اللہ تعالیٰ انکار کرے گا اور مومن ان کو دور کر دیں گے یا اللہ تعالیٰ دوسروں کو دور کر دے گا اور مومن ان کے ماسوا کی خلافت سے انکار کر دیں گے۔

۲۔ عن عائشة رضی اللہ عنہا قالت قال لی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ ادعی لی ابا بکر اباک و اخاک حتی اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن ویقول قائل انا ولا و یا بی اللہ والمؤمنون الا ابا بکر و اولادہ مسلم۔

اس روایت کا بھی معنی و مفہوم وہی ہے جو پہلی روایت کا ہے اور جو ذکر کیا جا چکا ہے اور یہ روایت مشکوٰۃ باب مناقب ابی بکر رضی اللہ عنہ میں موجود ہے۔ لہذا بخاری شریف اور مسلم شریف کی روایات کی تائید سے اس روایت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تحریر کرنے کا احتمال متعین ہو گیا، لہذا صدیقِ خلافت کے لیے عہد نامہ لکھنے میں اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رکاوٹ ڈالی بھی ہے تو اس سے شیعہ حضرات کو کونسی شکایت ہو سکتی ہے اور اگر کہا جائے کہ یہ روایتیں موضوع اور من گھڑت ہیں تو دوسری روایات کی صحت کی کیا ضمانت ہے؟ کیا جس میں اعتراض کی گنجائش نکلے اور صحابہ کرام بالعموم اور شیخین بالخصوص تنقید و تنقیص کا نشانہ بن سکتے ہوں صرف وہی صحیح ہوا کرتی ہے؟ اور جو روایت ابہام و اجمال کو دور کر دے، وہ غلط ہوا کرتی ہے (مالکم کیف تحکمون)

۹۔ جس علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کے لیے سب صحابہ کرام علیہم الرضوان کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے، خود ان سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت وصال آچکا ہے، لہذا دریافت کر لو کہ آپ کے بعد مغلالت و امارت کس کے لیے ہے؟ ہمارے لیے ہے یا دوسروں کے لیے؟

تو انہوں نے فرمایا: میں تو دریافت نہیں کرتا، اگر آپ نے اس وقت انکار کر دیا تو لوگ کبھی بھی ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ یہ روایت بھی بخاری شریف باب وفات النبی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں موجود ہے اور اس پر متعدد حوالے شرح حدیدی سے ذکر بھی کئے جا چکے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ کبھی بھی خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ذکر اور اعلان نہ پہلے ہوا اور نہ اس وقت اس پر کوئی علامت گویا موجود تھی اور نہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ اس مسئلہ کو چھیڑنا چاہتے تھے جب آپ کا طرز عمل یہ ہے تو محض احتمالات کو مد نظر رکھتے ہوئے امت مسلمہ کے محسنین اور اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو موردِ طعن و تشنیع بنانا قطعاً غلط اور ناروا ہے۔

۱۰۔ بعینہ یہی مضمون شیعہ کتب میں بھی موجود ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بالخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فرمایا کاغذ اور قلم لاؤ، میں تمہیں وہ چیز لکھ دوں، جس کے بعد تم کبھی گمراہ نہ ہو سکو۔ جب انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میرے کاغذ اور قلم لانے تک اگر آپ کا وصال ہو جائے تو پھر کیا ہوگا؟ آپ زبانی فرمائیں، میں یاد رکھوں گا۔ تو آپ نے فرمایا: **الصَّلَاةُ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ**۔ نماز کا خاص خیال رکھنا اور مملوک غلاموں اور لونڈیوں کا ملاحظہ ہو۔ ناسخ التواتر، جلد ۱، ص ۵۵۵

لہذا اس قسم کے توہمات کو بنیاد بنا کر ان مقدس ہستیوں کو نشانہ بنانا مومنین کے لیے قطعاً درست نہیں ہے اور یہ اقدام عقل و خرد اور دین و ایمان کا دشمن ہی کر سکتا ہے۔ ابھی مزید بہت کچھ کہنا باقی ہے، مگر بخوفِ طوالت اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ **وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ** فائدہ: بخاری و مسلم شریف کی ان روایات سے جن میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے علاوہ کسی کی خلافت پر اللہ تعالیٰ اور مومنین کا راضی نہ ہونا بلکہ اس کو دور کرنا اور دوسری خلافت کا انکار کرنا ثابت ہے اور شیعہ تفاسیر میں مندرج روایات جن سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق

رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بننا ثابت ہے۔ ان دونوں قسم کی روایات سے واضح ہو گیا کہ یہ خلافت ظالمانہ اور غاصبانہ نہیں تھی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشاء کے عین مطابق تھی اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ نامزد نہ کر کے اپنی اُمت کو بغیر نگران کے نہ چھوڑا اور نہ انہیں اختلاف و انتشار کے حوالے کیا کیونکہ خود اللہ تعالیٰ اس کا کفیل ہو چکا تھا اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتلا چکا تھا کہ میرا فیصلہ اور میری قضاء و تقدیر کیا ہے اور میں نے کس شخص کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کے لیے منتخب کر رکھا ہے اور یہی قرآن مجید کا مقتضی و مدلول ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **يَسْتَخْلِفْنَهُم فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ** (الایۃ) یعنی اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور صالحین کے ساتھ خلیفہ بنانے کا حتمی وعدہ کر رکھا ہے اور جب اللہ تعالیٰ اس امر کا ضامن اور کفیل ہو چکا تھا، تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اندیشہ اور تفکر کی کیا ضرورت تھی؟

رسالہ تنزیہ الامامیہ

از علامہ ڈھکو صاحب

پیر صاحب سیالوی نے اس روایت کے وجود کا انکار نہیں کیا بلکہ اشارۃً یہ تسلیم کیا ہے کہ شیعہ و سنی ہر دو فریق کی کتابوں میں موجود ہے۔ ہاں بزعم خویش چاروں ابراد وارد کر کے اسے غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ پہلے اعتراض کا جواب، پہلا ایراد کہ بمطابق آیۃ کریمہ: **وَلَا تَخْطُئُ بِمِثْنِكَ**۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے ہاتھ سے لکھنا محال ہے اور اس روایت میں ہے کہ میں لکھوں۔ خلاصہ یہ کہ اُمت تو عالم و فاضل، ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی اور نبی اُمت اور وہ بھی خواجہ کائنات اور علت فانی مکانات ان پر مہم محض کہ جس کے لیے لکھنا محال ہے۔ ہزار لعنت بریں عقیدہ باد

۲۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ شیخ الاسلامی کے دعویدار کو لائے نا فسہ اور

لائے نہی اور کسی کام کے نہ کرنے اور نہ کر سکنے میں جو نمایاں فرق ہے وہ بھی معلوم نہیں
 قول باری تعالیٰ: ”وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ
 بِمِثْنِكَ إِذَا الْأَرْسُ تَابَ الْمُبِطُونَ“ سورة صکیوت کا مفہوم یہ ہے کہ
 اعلان نبوت سے قبل پیغمبر علیہ السلام لکھتے پڑھتے نہ تھے، ورنہ باطل پرستوں کو شک
 کرنے کا موقع مل جاتا۔ یہ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں، لہذا یہ ترجمہ کہ اپنے ہاتھ سے کبھی نہ
 لکھنا پیر صاحب کا وہ علمی شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔

۳۔ اعلان نبوت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں جو مصلحت ملحوظ تھی،
 وہ اعلان نبوت کے بعد ختم ہو گئی، کیونکہ معترضین کو یہ کہہ کر خاموش کیا جاسکتا تھا کہ
 جس خدا نے نبوت و رسالت عطا فرمائی، اُسی نے لکھنا پڑھنا سکھا دیا۔ خاندان نبوت
 سے مروی ہے کہ آپ تہتر زبانوں میں گفتگو کر سکتے تھے اور اتنی ہی زبانوں میں لکھ سکتے
 تھے اور اسی طرح اہل سنت کی کتابوں میں بھی آپ کا اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا
 ثابت ہے (تاہم کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کی پوزیشن
 بچانے کے لیے پیغمبر خدا تعالیٰ کی توہین کی پروا نہیں کی جاتی۔

دوسری اعتراض کا جواب، ۱۔ بفرض تسلیم اس روایت میں
 خلافت کا ذکر تک نہیں، تنگ نظری اور کوتاہ اندیشی ہے، ورنہ معمولی سی دینی اور
 سیاسی بصیرت رکھنے والا باسانی سمجھ سکتا ہے کہ رحمۃ للعالمین نبی اپنی امت کو ابدی
 ضلالت سے بچانے کے لیے اپنے آخری لمحات حیات میں وہی چیز تحریر فرمانا چاہتے
 تھے، جو بدریعہ تقریر اور بعثت سے لے کر دوات قلم طلب فرمانے تک مختلف اوقات
 میں مختلف اسالیب و عناوین سے برابر بیان کرتے رہے تھے تاکہ اتمام حجت کی
 آخری منزل ملے ہو جائے اور وہ سوائے خلافت و امامت مطلقہ حضرت علی کے اور
 کوئی چیز نہیں ہو سکتی تھی۔

۲۔ علمائے اہل سنت مثلاً علامہ شہاب خفاجی نے نسیم الدیاض میں علامہ
 عسقلانی نے فتح الباری میں، نووی نے شرح المسلم میں اور محدث دہلوی نے شرح

مشکوٰۃ میں یہی کہا ہے: اسرار ان یبین امرا الخلفۃ لئلا یختلفوا۔
ہو تعین الخلیفۃ بعدہ وغیرہ۔

۳۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اس اجمال کا پردہ ہی چاک کر دیا ہے
لکھتے ہیں: رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل فرمایا مجھے کاغذ اور
دوات لا کر دو تاکہ میں ہر قسم کے اجمال و اشکال کو دور کر دوں اور بتا دوں کہ میرے بعد
خلافت کا حق دار کون ہے؟ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑ دو کہ وہ بھی باتیں
کر رہے ہیں۔ ان حقائق کے بعد کوئی شک و شبہ رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے حقیقی جانشین
کے نام کو ضبط تحریر میں لانا چاہتے تھے، لیکن تاڑنے والے تاڑ گئے کہ نام انہیں کا
لکھیں گے جن کا نام بیسیوں بار زبانی بتلا چکے ہیں، لہذا دیرینہ امیدوں پر پانی پھرتا دیکھ کر دماغ رول
پر اعتراض کر دیا۔

تیسرے اعتراض کا جواب: پیر صاحب کے تیسرے اعتراض کا
خلاصہ یہ ہے کہ ائینہ جمع مذکر کا صیغہ ہے، لہذا بالفرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے
قلم دوات پیش نہیں کی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تعمیل حکم کر کے وہ تحریر
کیوں نہ لکھوالی۔ ہم اس کے جواب میں یہی کہیں گے ع
سخن شناس نہ دلبر اخطا این جا ست

۱۔ یہ مانا کہ روایت میں حکم عام ہے، مگر یہ خطاب انہیں لوگوں کے لیے ہے،
جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا، لیکن وہ بزرگوار جو ہادی و مہدی ہو اور کائنات کو
صراطِ مستقیم پر چلانے والا ہو، اسے تحریر لکھوانے کی کیا ضرورت تھی؟ گویا یہ تحریر حاصل
کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ دوسرے صحابہ کرام پر فرض تھا، آپ اس حکم سے
مستثنیٰ تھے (محمد اشرف سیالوی)

۲۔ علاوہ بریں جب برادرانِ اسلامی کے بقول شمع رسالت کے بڑے پردانے
نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ہدیان کی تہمت لگادی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں
ہاں ملا دی، تو بعد ازاں حضرت امیر یا کوئی دوسرا شخص وہ تحریر لکھوا بھی لیتا، تو

اُس کا وزن کیا ہوتا، وہی جو ایک دیوانے کی بڑ کا ہوتا ہے۔

چوتھے اعتراض کا جواب: پیر صاحب کا یہ کہنا کہ فرض کریں

کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، مگر جب حضور خود فرماتے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ ابوبکر ہوگا اور اس کے بعد عمر (رضی اللہ عنہما) تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارشاد کے خلاف دوسری خلافت لکھنا چاہتے تھے۔؟

۱۔ پیر صاحب کا یہ کہنا (کلمۃ حق) ارید بہا الباطل، کے ضمن میں آتا ہے اور

پیر صاحب اس سے جو نتیجہ اخذ کرنا چاہتے ہیں وہ قیامت تک درست ثابت نہیں ہو سکتا۔

۲۔ تفسیر صافی وغیرہ کے جو حوالے ہیں، اُن کا صرف اور صرف یہ مطلب ہے کہ وہ

خود بخود خلافت اور بادشاہی حاصل کر لیں گے اور یہ خبر اسی طرح کی ہے جس طرح دیگر قیامت تک پیش آنے والے اشراط و علامات۔ اگر یہ نصوص خلافت تھیں، تو اُمت کے سامنے اس کا اعلان ہونا چاہیے اور اس کو صیغہ رازہ میں رکھنے کی تاکید نہیں ہونی چاہیے تھی۔ بلکہ یہ ایک مشکوک تھی، مثل خراج و جال کے جو حرف بحرف پوری ہوئی۔

۳۔ پھر اہل السنۃ ان خلافتوں کو اجماعی اور شورائی کیوں قرار دیتے ہیں

نصی کیوں نہیں سمجھتے؟

۴۔ اعلان خلافت تو اس قدر ضروری تھا کہ بمطابق ارشاد خداوندی ذِانُ

لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ مِيسَاتَهُ تمام کارِ رسالت کے اکارت ہونے کا

اندیشہ تھا، مگر یہاں اس راز کے افشاء پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں۔ کیا ہے کسی

معقول آدمی کے پاس کوئی معقول جواب، ان سوالات کا؟

(رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۳۹ تا ۴۱)

نوٹ: پیر صاحب نے آیت مبارکہ وَلَا تَخْطُبُوا كُوفًا وَلَا تَخْطُبُوا

لکھا ہے، جس سے اُن کی قرآن دانی پر تیز روشنی پڑتی ہے۔

تحفہ حسینہ

از ابوالحسنات محمد اشرف سیالوی

علامہ ڈھکو صاحب کے اعتراضات آپ نے ملاحظہ فرمائے اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز کے جوابات پر تنقید اور صرح و قدح کا آپ نے مطالعہ فرمالیا، لیکن ایک دفعہ پھر رسالہ ”مذہب شیعہ“ کا متعلقہ مقام پڑھنے کی تکلیف فرمادیں اور آپ کی طرف سے پیش کئے گئے نہج البلاغہ کے اقتباسات پڑھیں، جن سے آپ نے یہ ثابت کیا تھا کہ خود امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ میرا اس وقت خلافت کی بیعت لینا قبل از وقت ہے اور کچا پھل توڑنے کے مترادف اور غیر کہیں میں کھیتی باڑی کرنے کے حکم میں ہے۔ نیز میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خلفاء کی اطاعت کا پابند ہوں، لہذا میرے لیے ناممکن ہے کہ میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مخالفت کر دوں اور پھر خود آپ کا ان کے ہاتھ پر بیعت کرنا، یہ تمام تر روایات حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تحریر کے منافی بلکہ مناقض ہیں۔

(مذہب شیعہ ص ۸۹ و ۹۰)

حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ نے قبل ازیں مفصل روایات، عبارات اور حوالہ جات ذکر فرمائے ہیں، وہاں بھی ڈھکو صاحب نے جواب دینے کی زحمت گوارا نہ کی اور یہاں پھر ان کا اجمالی طور پر اعادة فرما کر حدیث قرطاس کا جواب دیا تو پھر بھی علامہ موصوف نے ان کا جواب نہ دیا، جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہوا کہ وہ بے بس اور عاجز ہیں اور ان روایات و عبارات کے جواب سے بالکل قاصر، جب اس کے اپنے مذہب کی مستند کتابیں اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات ہی خلافت بلا فصل کے دعویٰ کو سراسر غلط اور بے بنیاد ٹھہراتے ہیں، تو ادھر ادھر بھاگنے اور دُور کی کوڑیاں لانے کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔

بہر حال ڈھکو صاحب کے ذمے نہج البلاغہ اور بہت سی دوسری کتابوں کے

حوالہ جات کے جوابات باقی ہیں اور اس چوری اور فراڈ کی ناکام کوشش نے ان کی اجتہادی صلاحیت اور حجتہ الاسلامی کو نیست و نابود کر دیا ہے اور یہ واضح کر دیا ہے کہ ان دلائل کا پوری قوم کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہے اور اب ہم ڈھکوسل صاحب کے ذکر کردہ جوابات کی حقیقت قارئین پر واضح کرتے ہیں۔

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا لکھنا محال ہے اور اس کا مطلب

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے حدیث قرطاس کے متعلق پہلا قابل غور امر یہ پیش کیا تھا کہ اس میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے لکھنے کا ذکر ہے اور آپ کے لئے بذاتِ خود لکھنا محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وَلَا تَخْطُ بِمِیْنِكَ فَرَاکِرَآپ کے نہ لکھنے کی خبر دی ہے اور یہ لائے نافیہ ہے، اور یا آپ کو لکھنے سے منع فرمایا ہے اور یہ لائے نہیں ہے، لہذا ہر دو صورت میں آپ کا لکھنا محال ہے۔ اس تقریر شیعہ فیاض نے تین طرح سے مواخذہ کی سعی لا حاصل فرمائی ہے، جو آپ ﷺ کا خط فرما چکے، مگر ان کی سباری کاوش میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ انہوں نے ذاتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لحاظ سے لکھنا محال سمجھ لیا، اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی ایم اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی ہونے کا عقیدہ لازم اور ضروری قرار دے دیا ہے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ وہ اگر غور کرتے اور تعصب و عناد نے ان کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج نہ کر دیا ہوتا، تو بات بالکل صاف اور واضح بنتی تھی کہ اللہ تعالیٰ کی خبر کے خلاف کرنا یا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنا بتی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ممکن نہیں تھا، یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھنے کو محال بالذات نہیں کہا گیا، بلکہ محال بالغیب کہا گیا ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نہ لکھنے کی خبر کے لحاظ سے اور آپ کی شانِ اطاعت اور سربازانہ روی کے لحاظ سے۔

مثلاً تمام انبیاء کرام علیہم السلام اور ملائکہ معصوم ہیں اور ان سے کفر و کبار کا سرزد ہونا محال ہے، لیکن علامہ ڈھکوسل صاحب عیسایہ محقق اس عبارت کو دیکھ کر کہہ دے:

دہا رہے سنی علماء! امتی تو ایسے کام کریں اور حق و شیاطین بھی کر سکیں، مگر اولوالعزم مفسدہ
 رسل کریم نہ کر سکیں اور عظیم قوتوں اور قدرتوں کے مالک ملائکہ نہ کر سکیں، یہ کیسے ممکن ہے؟
 لیکن آپ کا یہ دعویٰ سراسر تحکم اور سینہ زدوری ہوگا، بلکہ حماقت، کیونکہ انہوں نے اس
 قول میں انبیاء و رسل اور ملائکہ کرام کی شان عصمت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بالکل اور
 بعینہ اسی طرح لکھنے کے معاملہ میں بھی ڈھکوصاحب نے سینہ زدوری سے کام لیا ہے
 بطریق اعجاز اور فرق عادت لکھ سکنے کی نفی نہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے فرمائی
 نہ ہی وہ محل بحث ہے، بلکہ کلام عملی طور پر لکھنے میں ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف
 سے نہ لکھنے کی خبر یا لکھنے سے نہی کے پیش نظر اور محال بالسرض اور ممتنع بالغیر کے
 طریقہ پر اور اگر آپ کا یہ مقصد نہ ہوتا، تو لائے نفی یا لائے نہی کو ذکر ہی کیوں فرماتے
 آپ کا قول باری تعالیٰ: وَلَا تَخْطِئُ فِيهِ لَئِيْكَ تَتَذَكَّرُ اَلَا نَبِيًّا
 محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کو محال قرار دینا، اسی حقیقت کا واضح بیان ہے،
 مگر اہل البصار و بصائر کے لیے۔

شقی علیہ: دوسری شق میں ڈھکوصاحب نے فرمایا کہ شیخ الاسلامی کے
 دعوے دار کو نہ کرنے اور نہ کر سکنے کا فرق معلوم نہیں۔ نیز لائے نفی اور لائے نہی کا فرق
 بھی معلوم نہیں اور وَلَا تَخْطِئُ جملہ خبریہ ہے انشائیہ نہیں ہے الخ قبل ازیں حضرت
 شیخ الاسلام قدس سرہ کا مطلب انہیں کی عبارت کے سیاق و سباق کی رو سے عرض کیا
 جا چکا ہے اور نہ کر سکنے کی حقیقت واضح ہو چکی ہے، مگر بدقسمتی سے علامہ صاحب نے
 خود عبارت سمجھی ہی نہیں تھی۔ نیز لائے نفی اور لائے نہی میں فرق نہ سمجھتے تو دونوں کو بطور
 تقابل ذکر ہی کیوں فرماتے اور لائے نہی ہونے کی صورت میں ترجمہ بالکل وہی ہے جو
 حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر فرمایا۔ ہاں البتہ اس پر اعتراض کرنا جہالت کا
 ایسا شاہکار ہے جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا، بلکہ نفی کی صورت میں بھی معنی نہیں
 والا ہی ہوگا اور اس کو صورت خبر میں ذکر کرنا مزید تاکید حکم اور مبالغہ کے لیے ہوگا جیسے
 کہ کتب معانی و بیان میں اس کی تفصیل موجود ہے اور یہ دعویٰ کہ وَلَا تَخْطِئُ فقط جملہ

خبر یہ ہے اور اس میں انشائیت کا احتمال بھی نہیں ہے، محض دعویٰ ہی ہے جو محل نزاع میں غیر مسموع ہے۔

شوق ۳: تیسری شق میں ڈھکوصاحب نے فرمایا کہ جو مصلحت اعلان نبوت سے قبل نہ لکھنے اور لکھا ہوا نہ پڑھنے میں تھی، وہ اعلان نبوت کے بعد ختم ہو گئی، تو ہم ڈھکوصاحب سے دریافت کرتے ہیں کہ اعلان نبوت کے بعد سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل، زبور اور دیگر صحف سماویہ کا مطالعہ شروع فرمادیا تھا؛ یا قرآن مجید اپنے ہاتھ مبارک سے لکھنا شروع کر دیا تھا اور کسی کاتب کو کتابت وحی کی تکلیف نہیں دیا کرتے تھے؟ جب آپ نے کتب سابقہ کا مطالعہ بھی کبھی نہ فرمایا اور قرآن مجید کی کوئی آیت بھی اپنے ہاتھ مبارک سے نہ لکھی اور اعلان نبوت کے بعد کتابوں کے مطالعہ اور قرآن کریم کی کتابت والا معجزہ ظاہر کر کے اپنی حقانیت و صداقت نبوت پر اس کو دلیل نہ بنایا تو ثابت ہو گیا کہ یہ قول مبارک صرف قبل از اعلان نبوت کی حالت کو نہیں بتلا رہا اور نہ مصلحت سابقہ پر دلالت کر رہا ہے، بلکہ آئندہ کے لیے بھی وہی حکم تھا اور اسی پر آپ نے زندگی بھر عمل فرمایا اور اس مصلحت کو اعلان نبوت کے بعد بھی ملحوظ رکھا، لہذا علامہ موصوف کا یہ دعویٰ کہ اعلان نبوت کے فوراً بعد وہ مصلحت ختم ہو گئی، سراسر لغو اور مہربودہ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وصاف اُمت کی بقا اعلان نبوت کے بعد بھی بہت ضروری تھی جو شخص اہل کتاب وغیرہ سے مشرف باسلام ہونے کے لیے آتا، جن کو معلوم تھا کہ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اُمتی ہوں گے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: الذین یتبعون النبی الا قی الذی یجدون مکتوباً عندہم فی التوراة والانجیل۔ اور وہ آپ کو کتابت کرتے دیکھتا یا کتب سماویہ کا مطالعہ کرتے دیکھتا، تو وہ کس طرح اُمتی والی علامت آپ میں موجود ہونے کا یقین کرتا اور کتب سابقہ کی اقتدار و اتباع میں آپ پر کس طرح ایمان لاتا؟ لہذا آخر تک آپ کا وصف اُمت پر رہنا ہی سراسر مصلحت اور عین حکمت تھا، گو شیعہ علماء اس کو سمجھنے سے قاصر رہے ہوں۔

کیا سید عالم و عالمیان صرف بہتر زبانیں جانتے تھے؟

علامہ ڈھکو صاحب نے فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بہتر زبانیں جانتے تھے اور ان میں کلام فرما سکتے تھے، لیکن ہم کہتے ہیں صرف بہتر کیا بہتر بہتر زبانیں جانتا بھی بعید نہیں، کیونکہ آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت مجسم بنا کر بھیجے گئے، لہذا جتنی اجناس و اصناف اور انواع و اقسام اہم و اقوام کی ہیں، حیوانات ہوں یا جن و انس ان سب کی بولیاں آپ کو معلوم تھیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ، وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ۔ یعنی ہم نے ہر نبی و رسول کو اس کی قوم کی زبان کے ساتھ مبعوث فرمایا تاکہ وہ انہیں اپنا مدعا و مقصود سمجھا سکے اور ان کی بات بھی سمجھ سکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سب انسانوں، جنوں اور ملائکہ نیز جملہ حیوانات کے لیے بھی رسول رحمت ہیں کما قال اللہ تعالیٰ، وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ لہذا ان تمام کی زبانیں آپ کو معلوم ہونی چاہئیں، لیکن باوجود اس قدر علم کے محل بحث اہمیت اسی طرح برقرار اور باقی و دائم رہے گی، کیونکہ یہ زبانیں عام طریقہ تعلیم کے مطابق آپ نے حاصل نہیں کیں۔ اگر عربی الفہم و فصیح عربی بول لے لیکن بطور تعلیم تو علم نہ ہو اور ہم اس معیار کی عربی نہ بول سکیں، مگر درسی تعلیم حاصل کی ہو تو پھر بھی و دائمی رہے گا اور ہم اُمتی نہیں ہوں گے۔ نیز یہ وسعت علم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں کسی غلط فہم کی موجب نہیں ہو سکتی، بلکہ حقانیت کی دلیل ہوگی اور اگر لکھنا شروع فرمادیں اور مطالعہ شروع فرمائیں تو مغالطہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نیز بہتر زبانوں میں آپ کا لکھ سکتا بطور معجزہ محل بحث نہیں ہے، لیکن بطور عادت جاریہ ایک سطر لکھنا بھی ثابت نہیں کیا جاسکتا اور کلام اسی معمول میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ لکھنے کی پابندی میں اور علامہ موصوف کی توجہ کے لیے عرض کر دوں کہ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ اگر بطور اعجاز بھی لکھنا آپ کے حق میں محال سمجھتے تو ولا تخطئہ کے اندر لاتے نہیں کا احتمال ہی ذکر نہ فرماتے اور نہ ہی والا معنی ہی نہ کرتے،

کیونکہ جو شخص لکھنے سے بالکل عاجز و قاصر ہو، اس کو لکھنے سے منع کرنا ہی غیر معقول ہوگا
لہذا صاف ظاہر کہ آپ نے لکھنے کی قدرت تسلیم کی، لیکن اللہ تعالیٰ کی اطاعت و
فرمانبرداری کے تحت آپ سے فعل کتابت کا سرزد ہونا محال بالغیر قرار دے دیا اور
اس کلام صداقت نشان پر صریح و قہح کا کوئی جواز نہیں ہے۔

کتاب اہل السنّت اور بشیّد عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کا ثبوت

علامہ موصوف نے کتاب اہل السنّت سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لکھنے کا کوئی ثبوت
تحریر نہیں کیا۔ حسبِ عادت صرف دعویٰ کر کے آگے چل دیتے ہیں اور مقام نزاع و خلاف
میں محض دعویٰ کر دینا کافی نہیں ہوا کرتا، مگر ڈھکوسل صاحب نے مباحثہ و مناظر اور استدلال
استشہاد کا طریقہ ہی نیا ایجاد کیا ہوا ہے، لہذا جواب کی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی
تھی، لیکن پھر بھی بطور تبرع جواب عرض کیے دیتے ہیں۔

علامہ موصوف کے اس دعویٰ کا دار و مدار غالباً صلح حدیبیہ کے موقع پر تحریر کیے گئے
معاہدہ پر ہے، جس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے معاہدہ
لکھتے وقت آپ کے نام نامی کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھ دیا۔ فریق
مخالف نے اس پر اعتراض کیا کہ ہم آپ کو رسول اللہ مانتے تو جنگ کیوں کرتے اور کاٹ
کیوں ڈالتے، لہذا اس کو مٹا دیجئے۔ آپ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، اس لفظ
کو مٹا کر محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ انہوں نے عرض کیا میری مجال نہیں اور نہ ایمان ایتقان
اس کی اجازت دیتا ہے کہ رسول اللہ کا لفظ مٹا دوں، تو آپ نے اپنے دستِ اقدس کے
ساتھ اس لفظ پر لکیر کھینچ دی۔ اس کے بعد مجبور کا قول یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو
فرمایا اب ابن عبد اللہ لکھ دو اور بقول بعض آپ نے صرف ابن عبد اللہ کا لفظ خود
تحریر فرمایا اور آپ اچھی طرح لکھتے نہیں تھے فکتب ولم یکن یحسن یکتب
اس کے علاوہ لکھنے کا کوئی ثبوت نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ جزوی اور محتمل امر ہے اور حضرت
علی رضی اللہ عنہ کے انکار کے بعد ضرورت اور مجبوری کے تحت ہے اور وہ بھی بقول

جمہور صرف لکیر کھینچنے تک محدود ہے، لہذا اس سے علامہ صاحب محل نزاع میں کیا حاصل کر سکتے ہیں ماسوا غوغا آرائی کے، کیونکہ سبب امر کی طرف فعل کا نسبت کیا جانا متعارف اور عام ہے۔ الغرض ڈھکو صاحب کی ساری تحریر اور گرج اور چمک صرف اپنی غلط فہمی بلکہ کج فہمی پر مبنی ہے جس کی ذمہ داری حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نہیں ڈالی جاسکتی۔

شیعی علماء اسلام کے اقوال

آئیے اب اس مسئلہ پر شیعی علماء اسلام کے اقوال ملاحظہ کریں،
صاحب ناسخ التواتر شیخ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتیازی اور مختصہ احکام میں سے حرام امور کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے۔ در ذکر مخطورات و محرمات رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم (تا) پنجم خط نوشتن قال اللہ تعالیٰ، ولا تخطوا بيمينك اذا لاس كتاب المبطلون۔ (جلد اول از کتاب دوم ص ۵۹۹)

آپ کے لیے مختصہ امور اور احکام میں سے پانچواں حرام اور ممنوع امر ہے خط لکھنا اور تحریر کرنا جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اور نہ لکھنا تم اس کو اپنے داینے ہاتھ سے ورنہ باطل پرست لوگ شک و تردید میں پڑیں گے۔ کہیے علامہ صاحب جملہ خبریہ اور لائے نافیہ کی صورت میں خط لکھنا حرام کیسے ہو گیا؟ لفظ یا معنی جملہ انشائیہ ماننا لازم ہے یا نہیں؟ اور جو معنی حضرت شیخ الاسلام نے کیا وہی آپ کے علماء سے ثابت ہے یا نہیں؟ کیا یہ ترجمہ حضرت پیر صاحب کافی الواقع علمی شاہ کا ہے یا نہیں ہے۔؟

۲۔ علامہ طبرسی نے سید مرتضیٰ علم الہدی کے حوالے سے لکھا ہے،
هذه الآية تدل على ان النبي صلى الله عليه وسلم
ما كان يحسن ان يكتب قبل النبوة فاما بعد النبوة فالذي
نعقده في ذلك التجويز لكونه عالمًا بالقرأة والكتابة
والتجويز لكونه غير عالم بهما من غير قطع على احد الامرين

وظاھر الایۃ یقتضی ان النفی قد تعلق بما قبل النبوة
دون ما بعدھا ولان التعلیل یقتضی اختصاص النفی بما
قبل النبوة لان المبطلین انما یرتابون فی نبوتہ لو کان
یحسن الکتابۃ قبل النبوة فاما بعد النبوة فلا تعلق لہ
بالریبۃ والتمہۃ فیجوز ان یکون تعلیمھا من جبرئیل
علیہ السلام وتفسیر مجمع البیان ص ۲۸۷ و ۲۸۸ ومنہج الصادقین ص ۱۶۸ و ۱۶۹

یہ آیت کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ نبوت سے پہلے درست طریقہ پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ رہا اعلانِ نبوت کے بعد کا دور تو ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ ممکن ہے آپ اس میں کتابت اور قرأت کا علم اور ملکہ رکھتے ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس دوران بھی آپ کو یہ ملکہ حاصل نہ ہو کسی ایک امر کا حقیقی علم اور یقین نہیں ہے۔ ہاں آیت کریمہ سے بظاہر یہی پتہ چلتا ہے کہ نفی کا تعلق اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ تھا نہ کہ اعلانِ نبوت کے بعد والے دور سے۔ نیز جو علت اس نفی کی بیان کی گئی ہے، وہ بھی اعلانِ نبوت سے پہلی حالت کے ساتھ نفی کتابت کا اختصاص چاہتی ہے، کیونکہ باطل پرست اسی صورت میں آپ کی نبوت میں شک و شبہ کر سکتے تھے، جبکہ آپ قبل از نبوت اچھی طرح لکھ سکتے تھے، لیکن اعلانِ نبوت کے بعد والے دور کو اس تہمت اور ریبیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا ہو سکتا ہے کہ آپ نے جبرئیل علیہ السلام سے کتابت کا علم اور ملکہ حاصل کر لیا ہو۔

شیعہ کا مذہب مختار

مجمع البیان اور منہج الصادقین کی عبارات ہی ڈھکوسا حبلے تعالیٰ اور گرج چمک کی بنیاد بنتیں اور بلا حوالہ یہی تقریر انہوں نے اپنے رسالہ میں درج کر دی، لیکن ان عبارات سے صرف اتنا قدر ثابت ہوا کہ ممکن ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

جبریل علیہ السلام سے فن کتابت کا علم حاصل کر لیا ہو، لیکن اس کا یقین اور اعتقاد جازم نہیں ہے، لیکن آئیے دیکھیں کہ ان کا مذہب مختار اس باب میں کیا ہے؟ علامہ فتح اللہ کا شانی کے قول کے مطابق جو لوگ آپ کو آخر عمر تک اُمّی تسلیم کرتے ہیں، وہی صواب کے بہت قریب ہے اور شعرانی نے کہا صحیح ہی یہی ہے۔

۱۔ و مذہب آنانکه دے صلی اللہ علیہ وسلم را اُمّی دانند از اول عمر تا آخر عمر بصواب اقرب است۔ منہج الصادقین ج ۱، ص ۱۶۹

یعنی جن لوگوں کا مذہب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اول عمر سے آخر عمر تک اُمّی تھے، وہ صواب اور درستگی کے بہت زیادہ قریب ہے۔

۲۔ صاحب تفسیر نے کہا تھا کہ آغازِ کار میں رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھنے کا علم و ملکہ نہ ہونا فضیلت تھا، وچوں معجزہ ظاہر شد و در اُمّیت اوشک و شبہ نما نہ حق تعالیٰ در آخر عمر ایں فضیلت بے ارزانی داشت تا معجزہ دیگر باشد یعنی جب آپ کا معجزہ ظاہر ہو گیا اور آپ کے اُمّی ہونے میں شک و شبہ نہ رہا، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آخری عمر میں یہ فضیلت عطا فرمادی۔

لیکن ابوالحسن شعرانی صاحب نے اپنے حاشیہ میں اس پر رد کرتے ہوئے لکھا کہ ان لوگوں کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے آپ کے لیے علمِ قرأت اور علمِ الخط از روئے حدس اور گمان ثابت کیا ہے نہ کہ نقل اور روایت کے ساتھ ”و تاریخ را باید بنقل ثابت کرد نہ بحدس“ اور لکھنے وغیرہ کے قول کو نقل کے ساتھ ثابت کرنا چاہیے نہ کہ ظن و تخمین کے ساتھ اور جن لوگوں نے یہ قول کیا ہے ان کا منشا قول یہ ہے کہ لکھنا اور پڑھنا فضیلت ہے اور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس اس فضیلت سے خالی نہیں ہونی چاہیے۔

”لیکن حق آنست کہ خط و کتابت و قرأت برائے تعلیم و تعلم است و خود فی حد ذاتہ فضیلت نیست و آنکہ ہے واسطہ با عالم اعلیٰ رابطہ دارد و یہ نیازش بخط و قرأت باشد۔“ حاشیہ منہج الصادقین ج ۱، ص ۱۶۹

لیکن حق و حقیقت یہ ہے کہ علم الخط اور علم قرأت اور لکھا ہوا دیکھ کر پڑھ سکتا تعلیم و تعلم کے لیے وسیلہ اور ذریعہ ہے، بذات خود کوئی فضیلت نہیں ہے، لہذا وہ ہستی مقدس جو بلا واسطہ عالم بالا اور رب اعلیٰ کے ساتھ رابطہ رکھتے ہوں، اُن کو رسم الخط اور لکھا ہوا پڑھ سکنے کی طرف محتاجی نہیں ہو سکتی۔

ستر علوم پر دسترس اور اُن میں لکھنے کی حقیقت

علامہ ڈھکو صاحب نے اپنا عقیدہ و نظریہ بیان کیا تھا کہ آپ کو ستر علوم پر کامل دسترس تھی اور اُن میں آپ لکھ پڑھ سکتے تھے، لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ دراصل وہ روایت بصائر الدرجات کی ہے جو خود بھی ضعیف کتاب ہے اور اُس کی یہ روایت بھی ضعیف ہے جیسا کہ حاشیہ منہج الصادقین میں ہے،

”و در بصائر الدرجات کہ خود کتابے ضعیف است بسند ضعیف روایت کردہ است کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بہفتاد زبان میخواندومی نوشت و این با مخالف بظاہر قرآن است۔ خواندن باعجاز و وحی تعلیم جبریل در ہر جا کہ ثابت شود از محل کلام خارج است۔ منہج الصادقین جلد ۱، ص ۱۶۹۔“

یعنی ”بصائر الدرجات“ میں جو کہ بذات خود کتاب بھی ضعیف ہے، پھر اس میں ضعیف روایت کے ساتھ مروی و منقول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ستر زبانوں میں پڑھتے اور لکھتے تھے، لیکن یہ روایت قرآن مجید کے ظاہری معنی و مفہوم کے خلاف ہے۔ بطور اعجاز پڑھ لینا یا وحی اور تعلیم جبریل علیہ السلام کے ساتھ جہاں بھی ثابت ہو وہ محل بحث اور مقام نزاع سے خارج ہے۔

یہ تھی علامہ ڈھکو صاحب کی دلیل و برہان جس کو خود اس کے اہل مذہب نے رد کر دیا تھا اور بنار القاسمی الضعیف فی الضعیف قرار دیا تھا۔

اقول، علاوہ ازیں اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عمر شریف کے آخری حصہ میں فن کتابت اور قرأت میں مہارت حاصل کر چکے تھے، تو اب آپ کو اُمّی والے

فرماتے ہیں ۛ کفای بالعلم فی الامی معجزۃ

فی الجاہلیۃ والتادیب فی الیتیم

یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ جاہلیت میں موجود ہونے اور امتی ہونے کے باوجود صاحب علم ہونا اور یتیمی کے باوجود حسن ادب اور اخلاقِ عالیہ سے متصف ہونا صداقتِ نبوت پر معجزانہ دلیل ہے اور اسی حقیقت کو امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے یوں ادا فرمایا ہے ۛ

ایسا امتی کس لیے منت کش اُستاد ہو

کیا کفایت اُس کو اقرآنِ یک لاکرم نہیں

بلکہ یہ وہ امتی ہیں جن پر سلسلہ تعلیم کی انتہا ہو گئی اور پھر کسی معلم کائنات اور نبی و رسول کے مبعوث فرمانے کی ضرورت نہ رہی اور پہلی شریعتیں ان کی شریعت سے منسوخ ہو گئیں اور پہلی کتابیں ان کی کتاب سے ۛ ولنعلم ما قبل ! ۛ

یتیمے کہ ناکردہ قرآن درست کتب خانہ چند ملت بست

حدیثِ قرطاس کی دوسری توجیہ اور جواب

علامہ ڈھکو صاحب کی جواب میں فریکاری

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے الفاظ پہلے ملاحظہ فرمائیں۔ آپ فرماتے ہیں بغرض تسلیم اس روایت میں خلافت کا ذکر تک نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلا فصل اس سے کیسے ثابت ہو گئی۔ ص ۱۷۹ اس کے جوابات میں ڈھکو صاحب نے جو مبسوط تحریر سپردِ قرطاس فرمائی، بتلاؤ اسے کوئی مناسبت حضرت شیخ الاسلام کے فرمان سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں اس روایت میں قطعاً خلافت کا ذکر ہی نہیں ہے چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اور وہ بھی بلا فصل مذکور ہو۔ ڈھکو صاحب نے کس جملہ سے اس جواب کو توڑا ہے۔ کتب اہل سنت کا حوالہ دیا ہے، تو ان میں بھی بطور احتمال اس امر کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ بھی خلافت بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تو مراد

نہیں، مگر اس سے روایت میں تصریح خلافت کیسے ثابت ہو گئی اور عقلی طور پر جواب دیا ہے کہ زندگی بھر مختلف اسالیب و عادات میں سے جس کا ذکر کیا تھا، اب وہی لکھنی تھی اور کیا لکھنا تھا؟ یہ جواب بھی غلط ہے کیونکہ از روئے عقل کیا یہ نہیں کہا جاسکتا کہ جس کو زندگی بھر بیان فرماتے رہے اور اس کا اعلان کرتے رہے، اس کا ذکر اب تکرار محض کی وجہ سے اتنا اہم نہیں تھا، جتنا قدر کہ دوسرے اہم دینی امور لہذا جو ابھی بتکرار بیان نہیں ہو سکے تھے ان کے لیے لکھنے کا اہتمام مقصود تھا تو اس عقلی وجہ کو کیوں نظر انداز کیا جائے اور جو ڈھکوسل صاحب کے عقل نے اختراع کی ہے، اس کا کیوں التزام کیا جائے، لہذا نہ از روئے نقل یہ جواب صحیح ہوا اور نہ ہی از روئے عقل۔

امام غزالی علیہ الرحمہ پر بہتان

علامہ صاحب نے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف ایک عبارت کی نسبت کر دی، لیکن ان کی کسی کتاب کا حوالہ ہی نہیں دیا۔ کیا اس طرح کے دعوے اور دلائل کی مثال و نظیر کسی نے دیکھی ہے؟ غالباً آپ ستر العالمین کا حوالہ دینا چاہتے تھے، لیکن طبعی تقاضا کے عکس شرم آگئی کہ اپنی لکھی ہوئی کتاب کی نسبت اہل السنۃ کے عالم کی طرف کر کے جگہ ہنسائی اور رسوائی کیوں مول لیں، لیکن پوری طرح شرم نہیں آئی، ورنہ یہ موضوع اور من گھڑت عبارت ذکر ہی نہ کرتے نہیں نہیں، بلکہ بہت بڑی فریب کاری کا مظاہرہ کیا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ یہ ”احیاء العلوم“ جیسی معروف زمانہ کتابوں میں مذکور عبارت کا حوالہ ہے، حاشا وکلا، یہ ان کی کسی معروف کتاب میں نہیں، بلکہ ان سب میں اس کے منافی و مخالف عقیدہ کا اثبات ہے۔ قاضی نور اللہ شوستری نے اس کتاب کے اور امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ ملاحظہ ہو۔

محمل عقیدہ ادایں است کہ در مبادی حال بواسطہ مصاحبت رؤسا

اہل ضلال از نور ایمان خالی بودہ و آخر مومن موالی بلکہ شیعہ اعلیٰ گردیدہ —
(مجالس المؤمنین ص ۱۹۲)

یعنی اجمالی طور پر غزالی علیہ الرحمہ کے عقیدے کا بیان یہ ہے کہ ابتدا میں دوسرا
اہل ضلال کی صحبت کی وجہ سے نور ایمان سے خالی تھے اور آخر میں مومن موالی ہو گئے اور
اعلیٰ مرتبت شیعہ۔

در کتاب ستر العالمین کہ آں راستہ مکنون نیز گویند و آں از جملہ کتبے است کہ غزالی
آں را در آخر نوشته و افشاء ستر خود نموده و تصریح بارتداد خلفا ثلاثہ و تابعان ایشان
فرمودہ۔ یعنی کتاب ستر العالمین جس کو ستر مکنون بھی کہا جاتا ہے اور یہ منجملہ ان کتابوں کے
ہے جن کو امام غزالی علیہ الرحمہ نے عمر کے آخری حصہ میں لکھا اور اپنے راز کا افشاء کیا
اور خلفا ثلاثہ اور ان کے متبعین کے مرتد ہونے اور دین حق سے برگشتہ ہونے کا قول کیا۔
(مجالس المؤمنین جلد دوم، ص ۱۹۶)

جب قاضی شوستری یہ راز بیان کر چکا تو ایک سوال سوجھا، لہذا اس کا جواب
دینا بھی ضروری سمجھتے ہوئے سوال و جواب کو کتاب میں درج کیا، آپ بھی ذرا اس
سوال و جواب کا مطالعہ فرما کر مخطوط ہوں اور علامہ ڈھکو صاحب کی ڈھٹائی میں
اس کی مجبوری و معذوری کو محسوس کریں، کیونکہ اخلاف اپنے اسلاف کی راہ کیونکر چھوڑ
سکتے ہیں اور تبلیس و دیس کا یہ طریقہ انہیں اسلاف سے ہی ورثہ میں ملا ہے، لہذا وہ اس
معاملہ میں مجبور محض ہیں۔

سوال، کسے نگوید کہ چون حکم بتشیع غزالی و امثال او کہ بمذہب اہل سنت
اشتہار دارند نمود پس باید کہ سخن ایشان را کہ در کتب کلامیہ و غیر آن مسطور است
بر اہل سنت حجت نسازید۔ جواب، زیرا کہ مامیگوئی کہ حکم بابتشیع غزالی و امثال
او نظر بباطن حال ایشان و شک نیست کہ ظاہر حال ایشان موافق اہل سنت بود
و تصانیف ایشان بر طبق عقائد آن جماعت واقع شدہ۔ وہمگی مطالعہ آن تصانیف
کردہ اند و آنچه در آنجا مسطور است بقبول ملحق نمودہ اند و آں را مخالف روایات

درایات خود ندانستہ اند پس فی الحقیقت احتجاج مایا پچہ در تصانیف امثال غزالی
است احتجاج است بتصانیفیکہ اہل سنت آل را اعتبار کردہ اند بلکہ افتخار
بآن نمودہ اند ہر چند مصنف آل شیعہ باشد یا ظاہراً۔ (مجالس جلد دوم ص ۱۹۸)
سوال: یعنی کوئی شخص یہ نہ کہے کہ جب تم غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کے شیعہ ہونے
کے قائل ہو تو پھر اُن کی وہ عبارات جو کتب کلامیہ وغیرہ میں مسطور ہیں اور مسلک
اہل سنت کے خلاف ہیں، وہ اُن کے خلاف بطور حجت و سند پیش نہ کرو (کیونکہ یہ تو
شیعہ کی عبارت کو اہل سنت کے خلاف حجت قرار دینے کے مترادف ہوا)

جواب: کیونکہ ہم جواب میں کہتے ہیں کہ ہمارا غزالی اور اس قسم کے لوگوں کو اہل تشیع
میں شمار کرنا ان کے باطنی حال کے پیش نظر ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ ان کا ظاہری
حال اہل سنت کے موافق ہے اور اُن کی تصانیف بھی اہل سنت کے مطابق پائی گئی
ہیں اور تمام اہل سنت نے ان کا مطالعہ کیا اور اُن کو اپنے ہاں قابل قبول ٹھہرایا اور
اُن کو اپنی روایات و روایات کے مخالف نہیں سمجھا، لہذا درحقیقت ہمارے استدلال کا
دارومدار ان تصانیف پر ہے جن کو اہل سنت نے معتبر سمجھا ہے، بلکہ ان پر فخر کا
اظہار کیا ہے، خواہ اُن کا مصنف باطن میں شیعہ ہو یا ظاہر میں۔

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

اہل سنت امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی جن کتابوں پر اعتبار و اعتماد کرتے ہیں
اور اُن پر اظہارِ فخر کرتے ہیں، اُن میں ایسی عبارات نہیں ہیں جو شوستری صاحب نے نقل
کی ہیں اور جن میں ایسی عبارات ہیں، وہ سرسوتہ راز ہیں، جن سے صرف شیعہ حضرات آگاہ
ہوئے اور وہ اہل سنت کے نزدیک قابل قبول اور نہ امام غزالی علیہ الرحمہ وغیرہ کی
تصنیفات ہی ہیں، لہذا جو معتبر اور مقبول ہیں، ان میں عقیدہ اہل سنت کی صحیح اور
مکمل ترجمانی ہے، ان کو اہل سنت کے خلاف کون احمق پیش کر سکتا ہے، اور جن
کو پیش کیا جاتا ہے، وہ اہل سنت کے نزدیک صحیح النسبت ہی نہیں، لہذا ان کو اہل سنت

کے خلاف پیش کرنا بھی سراسر تحکم اور سینیہ زوری ہے۔ الغرض اس سوال کا دوبارہ
سہ بارہ مطالعہ کرو اور جواب کی مطابقت بھی مشاہدہ کرو تو یقیناً یہی کہنا پڑے گا

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

(غالب)

جب امام غزالی علیہ الرحمہ بقول قاضی شوستری شیعہ ہو گئے تھے اور تشیع کے بعد
انہوں نے کوئی کتاب لکھی جس میں خلفائے ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے متعلق نعوذ باللہ مرتد ہونے
کا قول کیا وغیرہ وغیرہ، تو ایسی کتاب بغیر الدین طوسی کی ہو یا امام غزالی کی، اس سے
اہل سنت کو الزام دینے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

کتاب ستر العالمین حضرت شاہ عبدالعزیز کی نظر میں

حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے تحفہ اثنا عشریہ صنف پر شیعہ کے اکیسویں
مکر و کید کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ کبھی اپنے طور پر کتاب لکھ کر اس میں صحابہ کرام علیہم السلام
پر طعن و تشنیع اور اہل سنت کے مذہب کو باطل کرنے والی عبارات درج کر کے اہل سنت
والجماعت کے اکابر علماء میں سے کسی کی طرف منسوب کر دیتے ہیں اور اس کتاب کے آغاز
میں خطبہ لکھ دیتے ہیں جس میں کتمان اسرار اور حفظ امانت کی وصیت درج کر دیتے ہیں
اور لکھتے ہیں کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے، وہ ہمارا خفیہ عقیدہ ہے اور جو کچھ دوسری کتابوں میں
لکھا ہے، وہ محض پردہ داری اور زمانہ سازی کے لیے طور پر لکھا ہے۔

مثلاً کتاب ستر العالمین کہ آں ما با امام غزالی نسبت کنند علیٰ ہذا القیاس کتب
بسیار تصنیف کردہ اندو بہر یک از معتبرین اہل السنۃ نسبت نمودہ اند کسی کہ بکلام
آں بزرگ آشنا باشد مذاق سخن خیر و امتیاز و تفرقہ نماید کیاب می باشد، ناچار عوام
طلبہ دریں مکر غوطہ خورند و خیلے سراپیمہ و حیراں شوند۔ (تحفہ اثنا عشریہ صنف)
مثلاً کتاب ستر العالمین کے جس کا امام غزالی کی طرف نسبت کرتے ہیں اور
علیٰ ہذا القیاس بہت سی کتابیں تصنیف کی ہیں اور اہل السنۃ کے معتبر علماء کرام میں

سے ہر ایک کی طرف ایسی اختراعی کتابوں کی نسبت کی ہے اور چونکہ ہر شخص اس بزرگ کے کلام سے آشنا نہیں ہوتا اور اس کے مذاق سخن کو دوسرے لوگوں کے مذاق سخن سے جدا اور ممتاز نہیں کر سکتا، لہذا ناچار، عام طلبہ اس مکر میں غوطے لگانے لگ جاتے ہیں اور بہت زیادہ حیران و سرگردان ہوتے ہیں۔

اقول، یہ طریقہ واردات صرف علماء اکابر کے ساتھ نہیں، بلکہ ائمہ کرام کے ساتھ بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ جو کچھ وہ مجمع عام میں اور خطبات میں فرماتے اس کو زمانہ ساز اور پردہ داری اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کا بہانہ قرار دیتے ہیں اور اپنی طرف سے روایات گھڑ کر ائمہ کی طرف منسوب کر کے اسے ان کا اصلی اور باطنی عقیدہ قرار دیتے ہیں اور اسی غرض سے مستقل چوردروازہ تقیہ والا ایجاد کیا ہے۔ اللہم انا نجعلک فی نحورهم ونحوذیک من شروسهم۔

امام غزالی سید نعمت اللہ الموسوی الجزائری کی نظر میں

اگر علامہ ڈھکو صاحب نے اپنے علماء مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو پھر بھی ایسی جرات نہ کرتے اور ”سر العالمین“ جیسی کتاب سے استدلال نہ کرتے۔ شیعہ فاضل سید نعمت اللہ الجزائری نے صوفیاء کرام پر جرح و قدح کرتے ہوئے حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق اپنے غیظ و غضب اور بغض و عناد کا خوب اظہار کیا اور ان کی تالیفات معروفہ کے حوالہ جات سے شیعہ کے خلاف اُن کے تاثرات کو مفصل طریقہ پر بیان کیا، چنانچہ جزائری صاحب نے کہا،

۱۔ احياء العلوم میں امام غزالی نے لکھا ہے، قد انكشف له فضل ابی بکر علی امیر المؤمنین علی علیہ السلام کہ ان کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا کشف ہوا یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حقیقت اُن پر آشکار ہو گئی۔

۲۔ اپنی کتاب ”المنقذ من الضلال“ بحکم انہوں نے درس فندیس کے ترک

کرتے اور مجاہدات و ریاضات میں بیس سال تک مشغول رہنے کے بعد تالیف کی اس میں انہوں نے شیعہ کار کیا اور ان کے عقیدہ عصمتِ ائمہ کو باطل قرار دیا اور اس میں مذہبِ امامیہ کے بطلان کا کشف ہونے کی تصریح کی ہے۔ عبارت ملاحظہ ہو،
 وانكشف له بطلان مذهب الامامية بعد ان ترك
 التدريس وانقطع في دمشق ومكة المكرمة نحوًا عن عشرين
 سنة ملان ما للخلوة في آخر عمرة وصنف كتابا سماه المنقذ
 من الضلال يتضمن الرد على من يدعي العصمة والابطال
 لمذاهبهم۔

۳۔ امام غزالی علیہ الرحمہ نے بار بار احیاء العلوم وغیرہ میں روافض کا ذکر آنے پر لکھا: قالت المر وافض خذ لهما الله تعالى۔ رافضیوں نے اس طرح کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و مسوا کرے۔

۴۔ احیاء العلوم میں ہی انہوں نے لکھا کہ اگر کوئی رافضی ہمارے پاس آئے، اور کسی شخص پر قتل کا الزام عائد کرے اور اپنے لیے بدلہ لینے کا استحقاق ثابت کرے تو ہم کہیں گے کہ تیرا اپنا قتل کیا جانا حلال ہے، تو دوسرے سے قصاص کا طلب گار کیونکر ہو سکتا ہے؟ قال فيه انه لو جاء اليه رافضی وادعی انه لطلب
 دمر عند احد قلنا ان دمك هدر۔ (انوار نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۸۵ و ۲۸۶)

کتاب سرائع العالمین علامہ جزائری کی نظر میں

حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کے متعلق شیعہ کے عظیم محدث کا نقطہ نظر معلوم کر لینے کے بعد اب اس کتاب کے متعلق اس کی رائے معلوم کریں،
 نعم ربما نسب اليه كتاب يسمى سرائع العالمين فيه مقالة
 يظهر منها ميله الى الحق ونطقه به ليكون حجة عليه وبعضهم
 انكروا كون الكتاب له او ان المقالة ملحقة بالكتاب۔
 (انوار نعمانیہ جلد ثانی ص ۲۸۶)

ہاں بعض دفعہ ان کی طرف ایک کتاب کی نسبت کی جاتی ہے جو کہ سر العالمین کے نام سے موسوم ہے، اس میں ایک مقالہ ہے، جس میں ان کا حق کی طرف یعنی مذہب شیعہ کی طرف میلان اور اس کے ساتھ لفظ ظاہر ہوتا ہے تاکہ اس پر حجت برہان بنے اور بعض علماء نے اس کتاب کا غزالی کی تصنیف ہونے کا انکار کیا ہے اور یہ کہ یہ مقالہ الحاقی ہے، یعنی اسے روافض نے اپنی طرف سے لکھ کر کتاب میں درج کر دیا ہے۔

جزائری صاحب کا انتقال ۱۱۲ھ میں ہوا ہے اور انہوں نے اس کتاب کی نسبت کا مشکوک ہونا اپنے قول سے بمانسب الیہ کتاب..... سے ظاہر کر دیا، کیونکہ فعل مجہول کے ساتھ نسبت کی تعبیر اس نسبت کے ضعیف اور ناقابل اعتماد و اعتبار ہونے کی دلیل ہے اور متداول کتب اور معروف و متواتر مؤلفات و مصنفات سے روافض کا رد اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل ہونے کا عقیدہ نقل کر کے بتلا دیا کہ ان کا حقیقی اور واقعی مذہب جو ان متداول و معروف کتابوں میں ہے، وہ رافض و تشیع کے رد و ابطال پر مبنی ہے اور جس کتاب میں روافض اور اہل تشیع کے موافق عبارت موجود ہے۔ وہ ساری کتاب یا اس کا وہ مقالہ من گھڑت ہے اور ناقابل انتساب اور وہ لائق اعتماد و اعتبار نہیں ہے۔ ایسی صورت میں آپ ڈھکو صاحب کو داد دیں، جو پندرہویں صدی میں پھر اسی رسولائے زمانہ غیر معتبر اور ناقابل قبول کتاب سے استدلال پیش کر رہے ہیں اور بالکل خوفِ خدا اور شرمِ خلق سے بے نیاز ہو کر۔

الغرض ڈھکو صاحب کا امام غزالی علیہ الرحمہ پر یہ بہتان عظیم ہے اور اس کو حقیقت اور واقعہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کی متواتر و معروف کتابیں اس کی تائید کرتی ہیں، بلکہ جس طرح سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول شاذ اور مشہور حدیث میں تعارض ہوتا تھا مشہور کلمہ گانہ کہ شاذ کا۔ اسی طرح امام غزالی علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ان شاذ بلکہ موضوع و من گھڑت عبارت کا ان مشہور و متداول کتب کے اندر بصراحت مذکور عقائد و نظریات کے مقابل کیا اعتبار ہو سکتا ہے؟

ڈھکوصاحب کی بے اصولی

تفسیر حسن عسکری کے حوالہ کا جواب دیتے ہوئے ڈھکوصاحب نے کہا تھا کہ اس کتاب کی نسبت حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کی طرف مشکوک ہے، لہذا جب تک اس کے مندرجات کی تائید و تصدیق دوسری صحیح اور مستند روایات سے نہ ہو جائے اس وقت تک اس کے مندرجات سے استدلال و استشہاد درست نہیں ہے، لیکن جو قاعدہ اور ضابطہ اپنے لیے وضع کرتے ہیں اور اسے اصولِ مناظرہ قرار دیتے ہیں اہل سنت کے خلاف جوابی کارروائی میں اس کو بھول جاتے ہیں، بلکہ دیدہ دانستہ نظر انداز کرتے ہیں، حالانکہ ع۔۔۔ ”ہرچہ برائے خود نہ پسندی برائے دیگران پسند“ مسلم قانون ہے۔ لیکن علامہ موصوف صرف چند ورق سیاہ کرنے کو ہی اپنا منتہائے مقصود قرار دیتے ہوئے ہیں، ہرچہ سراسر بے اصولی پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں۔

حدیث قرطاس کی تیسری توجیہ کے جواب میں علامہ ڈھکوصاحب کی کیا دی مکاری

تیسری توجیہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے شیعہ استدلال کا ابطال میں یہ ذکر فرمائی تھی کہ حدیث قرطاس میں ایٹھویں جمع کا صیغہ ہے جس میں گھر کے اندر موجود تمام افراد کو مخاطب ٹھہرایا گیا ہے۔ اس میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی شامل ہیں۔ چلو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا بھی دیا، حسبنا کتاب اللہ یعنی ہمیں اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پروردگار کا غلبہ ہے، لہذا اس دوران آپ کو آپ کو تکلیف نہ دو۔ تو سوال یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے کہنے پر عمل کرنا تھا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے کاغذ اور قلم اور دوات پیش کیے؟ اتنی

اب علامہ ڈھکو صاحب کے جوابات اور ان کا رد ملاحظہ فرمائیں،
 شوقِ اَوَّل : اس کا پہلا جواب علامہ صاحب یہ دیتے ہیں کہ صیغہ ”ایتوتی“
 ضرور جمع مذکر کا ہے، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ اس میں داخل نہیں بلکہ یہ خطاب ان
 کے لیے ہے جن کے گمراہ ہونے کا خدشہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ ہادی مہدی
 تھے اور کائنات کو صراطِ مستقیم پر چلانے والے تھے، لہذا ان کو یہ تحریر لکھوانے کی کیا
 ضرورت تھی؟ سبحان اللہ! کیا خوب جواب ہے۔ اس کو پڑھ کر اسطو، افلاطون
 اور بوعلی سینا بھی دم بخود رہ جائیں۔ اقول وبالله التوفیق!

۱۔ جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تحریر لکھوانا چاہتے تھے، مگر
 اپنے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے، اسی طرح حضرت علی رضی اللہ
 بھی لوگوں کی ہدایت اور بھلائی کے لیے اس کو لکھوا لیتے۔ آخر دوسری کتابیں بھی تو لکھی ہوئی
 تسلیم کی جاتی ہیں جن میں ستر ستر ماہ نامہ لکھا ہے، تو وہ کس لیے ہیں؟ ہدایت
 خلق کے لیے، یا گمراہی کے لیے؟

۲۔ اس ہادیِ ملاق نے قرآن مجید کیوں لکھا تھا؟ اپنی ہدایت کے لیے یا لوگوں
 کی ہدایت کے لئے؟ جو مصلحت قرآن مجید کے لکھنے میں تھی، کیا وہی مصلحت یہاں موجود نہیں
 تھی؟ آپ خود تو بقول شیعہ ازل مومن اور عارف تھے۔

۳۔ پھر سوال یہ نہ تھا کہ کس کی ہدایت مطلوب تھی؟ سوال یہ ہے کہ حکم کس کا تھا
 اور تعمیل کس نے نہیں کی؟ لیکن ثابت ہو گیا کہ کاغذ، قلم و ودات پیش نہ کرنے اور تعمیلِ ارشاد
 نہ کرنے میں سمجھی برابر ہے ع ای گناہیت کہ در شہر شمانیز کنند۔

۴۔ اگر اس عقیدہ و نظریہ کے تحت عملی طور پر تعمیلِ حکم نہ کرنا جائز تھا تو حضرت عمر
 رضی اللہ عنہ نے بھی وہی کچھ کیا جو اس عقیدہ اور نظریہ کے تحت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا
 آپ نے ذرا اس عقیدہ و نظریہ کو ظاہر کر دیا اور حسب کتاب اللہ کہہ دیا۔ یعنی ہمیں
 ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کی کتاب کافی ہے، لہذا ان کو بھی ضرورت نہیں تھی اور جن کو اللہ تعالیٰ
 نے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم

۱۔ اسلامِ دیناً۔ کامرودہ سنایا، یعنی میں نے آج کے دن (نہ ذوالحجہ کے دن) تم پر اپنی نعمت کامل و مکمل کر دی اور تمہارے لیے دینِ اسلام کو بطور دین پسند کیا، لہذا وہ تمام صحابہ کرام مستثنیٰ ہو جانے چاہئیں، تو پھر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اور حکم کا مخاطب کس کو ٹھہرایا جائے گا، کیونکہ جن کی مغفرت و بخشش اور ان کے اللہ تعالیٰ سے راضی ہونے اور اللہ تعالیٰ کے ان سے راضی ہونے کا قرآن کریم گواہ ہے۔ وہ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرح مستثنیٰ ہی ٹھہریں گے۔

۵۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت توحید و رسالت پر لبیک کہنے کی بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کیا ضرورت تھی؟ نعوذ باللہ اور کفار کے ساتھ حرب و قتال کی نیز ہجرت وغیرہ کی، کیونکہ آپ تو پہلے سے مومن تھے اور بقول شیعہ حضرات پنجتن پاک، عالم ارواح و نوانیت میں اور روزِ اول سے ایمان و اخلاص میں بھی برابر کے شریک تھے، لہذا یہ دعوت بھی دوسروں کے لیے تھی اور اس کی تعمیل بھی دوسروں کو کرنی چاہیے تھی۔ خدا را سوچھیے اننا لغوا و رہیودہ جواب دینے کی کوئی ہوشمند آدمی جرات کر سکتا ہے۔

خیرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسین کرشمہ ساز کرے

شوقِ دوم، علامہ ڈھکو صاحب نے کہا جب بڑے پروانہ رسالت نے آپ پر ہدایان کی نہمت لگا دی اور اکثریت نے ان کی ہاں میں ہاں ملا دی، تو اس تحریک کا فائدہ کیا ہو سکتا تھا؟ جواب کی یہ شق بھی کسی وجہ سے لغو و باطل ہے اور سرسرا کر یاد کی گئی۔ کیونکہ سوال یہ نہیں کہ اس کا فائدہ ہوتا یا نہ ہوتا۔ سوال صرف یہ ہے کہ ارشادِ نبوی کی تعمیل ضروری تھی اور وہ بمعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کسی کی طرف سے بھی نہ پائی گئی۔ رہا فائدہ ہونے کا معاملہ تو وہ قرآن مجید سے بھی ہر ایک نے نہیں اٹھایا خود اہل اسلام میں ایسے فرقے ہیں جو قول باری تعالیٰ یُضِلُّ بِہِ مَنْ یَّشَاءُ کے مطابق اس کی وجہ سے گمراہ بھی ہوتے ہیں، جس کو ڈھکو صاحب چاہیں، تو اپنی افتادِ طبع کے مطابق قرآن مجید کے نقصانات میں بھی شمار کر سکتے ہیں، مگر اس کا نازل کرنا سرسرا کر حکمت اور یاد کرنا اور کرنا

اور جمع کرانا سب ہی اہم عبادات ہیں۔ لہذا زیادہ کے لیے نہ سہی، تھوڑوں کے لیے بھی، کچھ تو اس سے فائدہ اٹھاتے و قلیل من عبادی الشکور کے مطابق اہل حق کی تعداد کفار و مشرکین کے مقابل ہمیشہ تھوڑی رہی ہے، لہذا یہ کوئی صحیح توجہ و تاویل عدم تعمیل کی نہیں ہو سکتی۔

حضرت فوج علیہ السلام کے تبلیغی زمانہ کو دیکھو اور ان کے ہاتھ پر مشرف یا سلام ہونے والوں کی تعداد کو بھی دیکھو تو پھر کہہ دینا چاہیے کہ اتنی قلیل تعداد کے لئے اس قدر اور اتنا عرصہ تکلیف برداشت کرنے اور کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ علاوہ انہیں جس طرح کفار کے اُنک لمجنون“ اے نبی کہلانے والو بے شک تم تو مجنون ہو، کہنے کے باوجود آپ کے قرآن مجید اور کتاب حکمت نے آپ کی حکمت و دانائی کے سیکے بٹھا دیے اسی طرح وہ تحریر مقدس اور اس کے فیوض و برکات، آپ کی حکمت اور دانائی کا نقش اہل عالم کے قلوب و اذہان پر مزید گہرا کر دیتی۔ کیا اس تحریر پر مترتب اس فائدہ اور انجام کار ہاتھ آنے والی برکات کو نظر انداز کرنے کی کوئی وجہ جواز ہو سکتی تھی؟ قطعاً نہیں کیونکہ نبی علیہ السلام کا کام تھا تعمیرِ ملت کی بنیاد رکھنا اور بعد ازاں وہ عمارت اُن کے غلاموں کے ہاتھوں رشکِ ثریا ہو جاتی، لہذا فوری مصلحت کو دیکھنا اور انجامِ دعا کو نہ دیکھنا منصبِ نبوت و امامت کے سراسر خلاف ہے۔

۲۔ وہ تحریر بھی لے کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے پاس رکھ لیتے اور دوسرے راز ہائے درون پردہ کی طرح اس کو بھی شیعہ حضرات پر منکشف کر دیا جاتا اور اُن کے ایمان کو لوہے کی کٹھ کی طرح مضبوط کر دیا جاتا اور اُن کو مومنین در مومنین بنا دیا جاتا۔ جب حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریری سندِ خلافت بلا فصل پر صریح اور غریب الفاظ میں ان کے پاس موجود تھی، تو اہل سنت کی روایات کا سہارا لینے کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی اور کچھ نیکو کران سے مطلب برآری کی تکلیف سے نجات حاصل ہو جاتی۔

۳۔ سارے مہاجرین و انصار نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دولت کلمہ پر موجود تھے اور نہ ہی مسجد شریف میں، لہذا جب وہ تحریر انصار کو دکھلا دی جاتی تو یقیناً

سقیفائی اور شورائی خلافت کا تیاپانچہ کیا جاسکتا تھا، کیونکہ جب وہ خود خلافت نہیں لے رہے تھے، تو حکم نبوی کی مخالفت کر کے اپنی دنیا و آخرت کیونکر خراب کر سکتے تھے اور یہی وہ حضرات تھے جنہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چوتھا خلیفہ مانا اور آپ کی حنا طر بدری صحابہ طلحہ و زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بھی جنگ کرنے سے گریز نہ کیا، جبکہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم پاس ہوتا، تو روزِ اول میں ہی جنگِ جمل والا منظر پیش آسکتا تھا، لیکن افسوس ہزار افسوس مدعی ہی شمسست لکڑا یہ گواہ بچارے سوائے مکاری اور ہیرا پھیری کے کیا کر سکتے ہیں۔

۴۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نعوذ باللہ من ہذا البہتان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہدیان کا الزام عائد کیا تھا، تو اب وہ حکیمانہ تخریر وصول کرنا اور سرِ مسرت سے منفعت پر مشتمل وہ وثیقہ حاصل کرنا مزید ضروری ہو گیا تھا تاکہ معترضین کا ناطقہ بند کیا جاسکتا اور اُس دور کے لوگوں پر اور بعد میں آنے والی نسلوں پر ایسے لوگوں کے قلبی احوال کی نشان دہی کا ایک بہت ثبوت ہوتا اور ان کے مقامِ نبوی سے بے خبر بلکہ اس کے مخالف ہونے کی قوی سند ہوتی، لیکن عملی طور پر ان کے ساتھ اتفاق کر کے خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہی ان کے اس زعم کی تصدیق کر دی نعوذ باللہ یا کم از کم یہ امکان اور احتمال لوگوں کے دلوں میں راسخ کر دیا کہ ذاتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہدیان طاری ہو سکتا ہے اور ان کا ہر حکم ماننا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ اس کی مخالفت ضروری ہو جاتی ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ!

دعویٰ ہدیان در حقیقت ہدیان ہی ہے

یاد رہے کہ اہل السنّت کی کسی کتاب میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آپ کی طرف ہدیان کی نسبت کی تھی۔ آپ نے صرف خالص ہمدردی کی بناء پر مشورہ دیا قد غلبہ الوجع وعندکم کتاب اللہ جسور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر زور کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب موجود ہے، لہذا اس وقت آپ کو

یہ تکلیف نہ دی جائے، مگر مطابق قول سعدی علیہ الرحمہ ۷

چشم بد بین کہ بر کند ہ باد عیب نماید ہنرش در نظر

ڈھکڑا صاحب اور جملہ شیعہ برادری کو سراسر خلوص و محبت پر مبنی یہ مشورہ اعتراض و انکار ہی معلوم اور جن لوگوں نے اُھجس کا لفظ استعمال کیا ہے، وہ استفہام انکاری کے طریق پر ہے "اُھجس استفہام" کیا آپ بلا مقصد یہ کلام فرماتے ہیں؟ اچھی طرح آپ سے سمجھ لو۔ اس عبارت سے اس توہم کاشت اور سختی سے انکار کرنا مقصود ہے کہ آپ کی زبان اقدس پر بے مقصد کلام جاری ہو گیا ہو اور اس طرح کے استفہام انکاری کلام مجید میں بھی وارد ہیں جیسے اَلِیْسَ مِنْکُمْ جَلَسٌ شَدِیدٌ تو اس میں صحیح الفکر اور صاحب الرائے شخص کے وجود کا انکار مقصود ہے اور قول باری تعالیٰ، هَلْ مِنْ شُرَکَآءِ کُمْ مَنْ یَفْعَلُ ذَٰلِکَ۔ تو اس میں بھی اس امر کا انکار

مقصود ہے، یعنی تمہارے مفروضہ معبودات میں کوئی بھی ایسے کام کرنے والا نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اگر کسی جگہ کسی روایت میں استفہامی کلمہ بطریق صراحت مذکور نہیں تو مقدمہ جیسے کہ قول ابراہیم علیہ السلام قرآن مجید میں منقول ہے کہ آپ نے ستارے کو دیکھا تو فرمایا "هٰذَا سَبَیْ" پھر چاند کو دیکھا تو فرمایا "هٰذَا سَبَیْ" بعد ازاں سورج کو دیکھا تو فرمایا "هٰذَا سَبَیْ"۔ حالانکہ ظاہری طور پر اس کلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ان احوال کے دوران مشرک ہونا لازم آتا ہے اور اس پر اجماع و اتفاق ہے کہ پیغمبر کی ذات ابتدائے ولادت سے دعوائے نبوت تک کفر و شرک سے منزہ و مبرا ہوتی ہے، لہذا یہاں کلمہ استفہام مقدمہ ماننا لازمی اور ضروری ہے۔ یعنی اُھجس سَبَیْ کیا یہ مراد ہے اور مقصد اس کی ربوبیت کا انکار ہے اور قرآن مجید محاورات عرب کے مطابق نازل ہوا ہے، لہذا ثابت ہوا کہ استفہام انکاری میں بھی حرف استفہام کا مقدمہ ثبوت معروف اور شائع و ذائع تھا، لہذا کسی صحابی پر بھی یہ اعتراض کرنا بالکل غلط ہے اور بہتان محض ہے۔ یہی تحقیق محققین علماء اسلام نے بیان فرماتی ہے جیسے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اشعة اللمعات جلد چہارم ص ۲۲ پر فرمایا، "ایں کلام محمول بر استفہام انکاری

است و اگر در بعضی روایات حرف استفہام مذکور نباشد مقتداً راست یعنی کلام استفہام انکاری کے معنی میں ہے اور اگر بعض روایات میں حرف استفہام مذکور نہیں ہے، تو صرف لفظ کے لحاظ سے محذوف ہے۔ نیت وارادہ میں ہے اور ہر صورت میں معنی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے مقصد کلام نہیں فرما رہے، بلکہ اس کی تعمیل ضروری ہے اور یہ کلام بھی ان حضرات کی طرف بطور دلیل پیش کیا گیا جو اس وقت کاغذ اور قلم و دوات پیش کر کے تحریر حاصل کرنا چاہتے تھے تو وہ کس طرح ہدیان کی نسبت حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر سکتے تھے اور دوسرا فرق محض ہمدی اور اخلاص کی بنا پر اس شدید درد کی حالت میں آپ کو تکلیف دینے سے گریز کر رہا تھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی موافقت کر رہا تھا۔ ان کا قول تو صرف یہ تھا: قد غلبہ الوجع وعندکم کتاب اللہ۔ اس کے یہ معنی کس لغت میں ہیں کہ آپ ہدیان کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ العیاذ باللہ! بلکہ اس کا تو صرف اور صرف یہ معنی ہے کہ آپ پر درد کا غلبہ ہے اور تمہارے پاس اللہ کی کتاب ہدایت موجود ہے جس کی تفسیر و تشریح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرصہ مدید اور زمانہ بعید سے پڑھتے آرہے ہو۔

نیز ان کے لیے اس اعتقاد و جازم اور یقین کامل کی کوئی صورت ہی نہ تھی کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مرض اور تکلیف کے دوران وصال فرما جائیں گے بلکہ ان کی امیدیں اور آرزوئیں یہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے گا اور حسب سابق آپ سے تعلیم حاصل کر لیں گے اور وہ ضروری اور اہم امور معلوم کر لیں گے اور اگر لکھوانے ضروری ہیں تو بعد میں لکھوا لیں گے۔

سوال: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے، وہ وحی الہی سے ہوتا تھا، کما قال اللہ تعالیٰ، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ۚ إِنَّ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ۚ لہذا حکم فوری اہمیت کا حامل نہ ہوتا، تو آپ اس دوران قد و الم میں اس کو زبان اقدس پر کیوں لاتے؟

جواب: اگر آپ کا بولنا وحی الہی کے تابع ہے، تو آپ کا سکوت و اعراض

بھی اس کے مطابق ہے، وہ اس کے خلاف کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔ نیز احکام صرف فرائض و واجبات میں ہی منحصر نہیں ہوتے۔ مستحب اور ادنیٰ و انساب بھی ہوتے ہیں اور ان کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے سوال کر لینا محل اعتراض نہیں ہو سکتا اور اگر حتمی اور لازمی امر نہ ہوتا تو آپ اس پر اصرار فرماتے، لیکن آپ نے ان کے استفسار پر فرمایا، مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ میں جس حال میں ہوں، وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو، حالانکہ تحریر لازمی ہونے کی صورت میں آپ کی طرف سے یہ جواب نہیں ہو سکتا تھا، بلکہ اس صورت میں یہ تحریر فرائض رسالت میں داخل ہوتی اور اس فریضہ کی ادائیگی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی جاتی۔

چوتھی توجیہ کے جواب میں ٹھکوسنا کی حقائق پر پردہ پوشی

• حدیث قرطاس سے شیعہ استدلال کے ابطال میں چوتھی وجہ حضرت شیخ الاسلام نے یہ بیان فرمائی تھی کہ فرض کر لیتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، گو اس کا ذکر روایت میں نہیں ہے، مگر جب آپ فرما رہے ہیں کہ میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہوگا اور ان کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ دیکھو تفسیر صافی، تفسیر قمی، تفسیر حسن عسکری اور دیگر تمام معتبر تفاسیر۔ تو کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم اور فرمان کے خلاف اپنے اَشَادَات کے خلاف کوئی دوسری خلافت بھی لکھ سکتے تھے۔

شوق دوم، اس کے جواب میں ٹھکوسنا صاحب فرماتے ہیں کہ ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے متعلق خلافت حقہ کا اظہار آپ نے نہیں فرمایا تھا بلکہ خود بخود ان کے خلافت و حکومت پر قابض ہوجانے کی خبر دینا مقصود تھا جیسے کہ خروج و حال کی خبر دی۔ نہ اس کو خلافت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی اس سے ان کی خلافت کا برحق ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔

الجواب، وعلى الله الاعتماد۔ علامہ ٹھکوسنا حضرت صدیق و فاروق

(رضی اللہ عنہما) کے اعلانِ خلافت کو دجال کے خروج کے اظہار و اعلام کے مماثل قرار دے رہے ہیں، جو سراسر جھوٹ اور کذب بیانی ہے اور حقائق کو پردہ پوشی۔ ہم پہلے وہ آیتِ کریمہ پیش کرتے ہیں۔ پھر شیعہ مفسرین کے اقوال پیش کر کے قارئین کے عدل و انصاف پر یہ فیصلہ چھوڑ دیں گے کہ آیا ان کی دیانت و امانت اور عدالت و انصاف یہی کہتے ہیں کہ یہ خلافت اسی قسم کی پیشگوئی تھی، جیسے خروجِ دجال کی تہریا برحق خلافت کا اظہار و اعلام تھا۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے ارشاد فرمایا، وَاِذَا سَأَلَ النَّبِيَّ اِلَىٰ بَعْضِ اَزْوَاجِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَأَتْ بِهِ وَاظْهَرَ اَللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَفَ بَعْضَهُ وَاَعْوَضَ عَنْ بَعْضٍ قَالَتْ مَنْ اَنْبَاكَ هَذَا قَالَ نَبَاْنِي الْعِلْمُ الْخَبِيْرُ اور اس وقت کو یاد کرو، جبکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ازواج میں سے بعض کو راز کی بات بتلائی، تو جب انہوں نے وہ آگے بتلا دی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس پر مطلع فرمادیا، تو آپ نے اس میں سے بعض کے افشاء کے متعلق انہیں بتلایا اور بعض کے جملانے سے گریز کیا۔ اُس نے دریافت کیا کہ آپ کو کس نے بتلایا؟ تو آپ نے فرمایا، مجھے ظاہر و باطن کا علم اور خبر رکھنے والے نے بتلایا ہے۔

اور قرآن مجید نے اس راز کے افشاء کرنے اور زوجہ محترمہ کو وہ راز بتلانے کی وجہ بھی بتلا دی کہ آپ اس بیوی کو خوش کرنا چاہتے تھے اور اسے رضا مند کرنا چاہتے تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ، يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَنْفٍ وَاجِدَىٰ۔ یعنی اے نبی! آپ اس چیز کو اپنے اور پر کیوں حرام ٹھہراتے ہو؟ اور اس سے باز رہنے کی کیوں قسم کھاتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہے۔ تم اس تحریم کے ذریعے اپنی بیویوں کو خوش کرنا چاہتے ہو اور اُن کی رضا مندی کے طلب گار ہو۔

اور اس روایت کے نقل کرنے میں تمام شیعہ تفاسیر اور مفسرین متفق ہیں کہ

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مار قیبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آپ پر حرام ٹھہرایا تھا تا کہ حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا راضی ہو جائیں، کیونکہ اُن کے گھر میں اور اُن کی باری میں حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مار قیبطیہ کے ساتھ مباشرت فرمائی تھی، جس سے وہ غمزہ ہو گئیں اور اس فعل کو اپنے حق اور احترام کے منافی سمجھا، لہذا آپ نے اُن کو خوش و خرم کرنے کے لیے حضرت مار قیبطیہ رضی اللہ عنہا کو حرام ٹھہرایا اور ساتھ ہی انہیں یہ بھی بتلادیا: ان ابابکر یلی الخلافۃ من بعدی ثم ابوبکر۔ تفسیر قمی ص ۳۵۲ تفسیر صافی ص ۲۳۲ تفسیر منہج الصادقین ص ۳۳۹ تفسیر مجمع البیاء ص ۳۱۲ ج ۵ وغیر ذلک۔ یعنی میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق اور پھر تمہارے باپ عمر فاروق رضی اللہ عنہما۔

اس پس منظر میں اس روایت کا صاف اور واضح مطلب مفہوم یہ ہے کہ یہ امارت و خلافت اور حکومت و سلطنت اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے عین مطابق ہے نہ کہ اس کے منافی و مخالف اور غاصبانہ و ظالمانہ ورنہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے لیے اس میں خوشخبری کوئی ہو سکتی تھی اور ان کی دل جوئی اور رضامندی کے لیے بطورِ مشورہ اس راز کا انکشاف ان پر کیوں کیا جاتا، جس طرح و مجال کا خروج و ظہور، ڈھکوسل صاحب اور اس کے ہم مشرب لوگوں کے لیے مشورہ و خوشخبری نہیں، حالانکہ غیبی خبر ضرور ہے۔ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ خلافت و امارت غیبی خبر تو ہو سکتی تھی، لیکن اس کو بطورِ مشورہ و خوشخبری سنانا اور اس کے ذریعے پریشان اور غمزہ ام المؤمنین کو خوش کرنے کی سعی اور کوشش فرمانا، کسی بھی معقول انسان کے نزدیک درست نہیں ہو سکتا۔

الغرض کلامِ مجید اور احادیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سیاق و سباق اور پیش منظر اور پس منظر میں بہر حال شیخین دیکھ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بھی بقول بعض شیعہ مفسرین کے، خلافتِ حقہ اور امارت و سلطنتِ مطلقہ کی خبر دے رہے ہیں۔

علی الخصوص جب یہ حقیقت ذہن نشین رکھی جائے کہ جس طرح آج کے قرآن خوان کو یہ تجسس اور جستجو ہوتی ہے کہ وہ راز کیا تھا اور اس کا انکشاف حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس پر کیا اور اُس نے کس کو بتلایا۔ پھر جس قدر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے افشائے راز سے متعلق جتلا یا وہ کیا ہے؟ اور جس حصہ سے اعراض اور رُگردانی فرمائی۔ وہ کیا ہے؟ تو لا محالہ اس دور میں ہر قرآن خوان کو یہ جستجو اور تجسس پیدا ہونا لازم تھا اور اس کے متعلقہ امور سے باخبر ہونے کی خواہش اور طلب ہر دل میں ضرور پیدا ہوتی ہوگی اور کونسا عقلمند انسان ہے جو یہ باور کر سکے کہ خواص اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مفسرین صحابہ اور علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسی ہستیاں بھی اس سے بے خبر ہوں، بلکہ جہتی اور قطعی طور پر ان کو یہ تمام تفصیل معلوم ہونا لازم اور ضروری ہیں، بلکہ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے بیعت خلافت کے لیے ہاتھ بڑھانے اور یہ منصب بذات خود سنبھالنے کے لیے عرض کیا گیا، تو آپ نے فرمایا میرا اس وقت بیعت لینا کچھ بھل کو توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مترادف ہے اور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس عہد کا پابند کیا گیا ہوں کہ میں ان خلفاء کی اطاعت کروں۔۔۔۔۔ لہذا ڈھکوصاحب کا یہ دعویٰ کہ خلافت شیخین کا اعلان و اظہار محض دہال کے خروج جیسی پیشین گوئی ہے۔ اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے، جب خروج دہال کی پیشین گوئی اور فیسی خبر سے اُن کو بھی فرحت و شادمانی حاصل ہو سکے اور یہ خبر سن کر اُن کے سارے غم و آلام دور ہو جائیں، لیکن ایسی خبر اگر کسی کے لیے سوداں روح ہو اور وہ اسے سن کر لہز اٹھے تو اس کی مسترت و شادمانی اور دل جوئی و رضامندی کے لیے اسے یہ خبر نہیں سنائی جاسکتی۔ بعینہ اسی طرح ظالمانہ اور غاصبانہ حکومت و خلافت جو ظالم و غاصب کے لیے عذاب الیم کی موجب ہوا کرتی ہے۔ اس کے ذریعے ظالم و غاصب کے عزیز و اقارب کو خوش نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان کو کوئی خوشی اور مسترت حاصل ہو سکتی ہے، لہذا اصاف ظاہر ہے کہ کم از کم حضور

سرورِ عالم و عالیشان علی اللہ علیہ وسلم نے اس خلافت و امارت کو غاصبانہ اور ظالمانہ نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو بتلایا کہ وہ ظالمانہ حکومت ہوگی اور نہ آپ نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو اس لیے بتلایا تھا کہ وہ اس حکومت و خلافت کو ظالمانہ سمجھیں۔ ہاں شیعہ حضرات کو بالعموم اور ڈھکوسٹ صاحب کو بالخصوص کہیں دوسری جگہ سے الہام ہو گیا ہو اور یہ مخفی راز ان پر منکشف ہو گیا ہو تو ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے، کیونکہ علم و آنکھی کا دوسرا ذریعہ بھی موجود ہے۔ کما قال تعالیٰ ان الشیاطین لیوحون الی اولیاءہم۔ بے شک شیاطین اپنے دوستوں اور احباب و اولیاء کی طرف وحی کرتے ہیں۔ لہذا اس امر کا یقین رکھنا ضروری ہے کہ ان حضرات کی طرف سے یہ دعویٰ سراسر الہامی ہے۔ اگرچہ ذریعہ اس کا سراسر شیطانی ہے، کیونکہ شیاطین کا اس خلافت کے خلاف سرگرم عمل ہونا ان کا فطرتی تقاضا تھا اور ان خلفاء راشدین نے اسلام کی ترویج و اشاعت اور تائید و تقویت کا اہتمام کر کے فارس کے آتش کے ٹھنڈے کر کے اور صلیب کی پرستش ختم کر کے انہیں بہت دکھ پہنچایا تھا اور رسول برحق صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل بنائے ہوئے جھوٹے نبیوں کا صفایا کر کے ان کی ساری تدبیریں خاک میں ملا دی تھیں، لہذا وہ کس طرح اس خلافت کو فطرۃً تحسین دیکھ سکتے تھے اور ان کے لیے یہ حکومت الہیہ کیونکر قابل قبول اور قابل برداشت ہو سکتی تھی لہذا انہوں نے انسانوں میں سے اپنے بھائی، دوست بلکہ محبوب و مطلوب تلاش کیے، اور اس خلافت کے متعلق اپنی بے چینی اور قلق و اضطراب انہیں آگاہ کر کے ان سے اپنے زخمی دلوں کی مرہم پٹی اپنے در و کا درماں طلب کیا اور ان حضرات نے دوستی اور قلبی تعلق کا حق ادا کرتے ہوئے وہ کارنامے سرانجام دیے کہ خود شیاطین بھی سرپیٹ کر رہ گئے ہوں گے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ نایاں جاتا رہا
تنبیہ، ہماری اس گزارش سے علامہ ڈھکوسٹ صاحب کے ایک اور دعوے
یعنی شق اول کا کھوکھلا پن اور اس کی لغویت بھی واضح ہو گئی تفصیل اس اجمال کی یہ

کہ حضرت شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اگر سید عرب و عجم صلی اللہ علیہ وسلم خلافت ہی لکھنا چاہتے تھے، تو وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت تھی، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے اعلام و اطلاع سے جان چکے تھے کہ میرے بعد خلیفہ بلا فصل ابوبکر صدیق ہوں گے پھر حضرت عمر اور آپ بطورِ مشرودہ و خوشخبری حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا پر اس کا انکشاف بھی کر چکے تھے، تو اپنے اعلان و اظہار اور اللہ تعالیٰ کے فرمان کے برعکس آپ کوئی دوسری خلافت کیسے لکھ سکتے تھے۔ علامہ ڈھکو صاحب نے کہا پیر صاحب کا یہ قول: کلمۃ حق اسرید بہا الباطل کے ضمن میں آتا ہے اور قیامت تک آپ کا یہ مقصد ثابت نہیں ہو سکتا کہ شیخین کی خلافت منشاء ایزدی کے مطابق ہے، حالانکہ آیت مبارکہ کے سیاق و سباق۔ قسم کھانے کے پس منظر سے اور اس کے بعد اپنی زوجہ محترمہ کی لجوائی اور تسلی و اطمینان کے لیے خلافت فاروقیہ کا مشرودہ سننے سے تو لازمی طور پر یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ خلافت منشاء ایزدی کے عین مطابق تھی اور حضورِ مقررِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی منشاء و مرضی کے بالکل مطابق، کیونکہ اسی پر دین اسلام کا راسخ اور مستحکم بنوامون تھا اور ترقی و ترقی پانا اور اطراف و اکناف عالم میں پھیلنا وغیرہ۔

اور یہی وجہ ہے کہ ابن ابی الحدید معتزلی شیعہ کو اعتراض کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اسلام اور اہل اسلام پر خصوصی کرم اور لطف تھا کہ صحابہ کرام کو خلافت کی اس ترتیب کا الہام کیا، ورنہ اسلام کبھی پھیل پھول نہ سکتا اور قبل ازیں اس خلافت کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ عندیہ اور نظریہ بیان کیا جا چکا ہے کہ یہ خلافت وہی خلافت ہے، جس کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ اللہ الذین آمنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض الایہ میں وعدہ فرمایا، لہذا اس پس منظر میں اس کا منشاء ایزدی اور مرضی رسول کے مطابق ہونا و زبردستی کی طرح واضح ادعیاں ہے اور حضرت قبلہ پر صاحب کا یہ فرمان حقیقت و واقعہ کا بیان صداقت نشان ہے اور کیوں نہ ہو آپ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی اولاد و امجاد سے ہیں۔ لہذا آپ ان کے نظریہ و عقیدہ سے کیونکر منحرف ہو سکتے ہیں، بلکہ الولد لیسر لابیہ

کے تحت آپ عقائد و نظریات کے لحاظ سے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے عقائد و نظریات کے امین تھے اور انہیں کو آپ نے بڑے مدلل انداز میں بیان فرمایا۔ واللہ علی ذالک۔

شوقِ سوم، علامہ ڈھکو صاحب کے جواب کی تیسری شق یہ تھی کہ پھر اہل سنت اس خلافت کو اجماعی اور شوریاتی کیوں قرار دیتے ہیں، نصی کیوں قرار نہیں دیتے؟ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو پہلے ابو بکر اور ان کے بعد حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) کے خلیفہ بننے کی خبر دی تھی، لیکن جواب کی یہ شق بھی بوجہ لغو اور باطل ہے اور بغض و عناد اگر کسی کو اندھا اور بہرہ کر دے، تو پھر اس کا کیا علاج ہے؟

۱۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ سرورِ انبیاء نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برسرِ منبر حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا تاکہ اس کو نصی خلافت قرار دیا جاتا، لیکن اس طرح کا اعلان عام نہ کرنے کے باوجود تسلیم کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ آپ نے بطورِ اذکار جو کچھ بیان فرمایا، وہ بھی صرف آپ کا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد وہی تھا کہ مَا يَقُولُ عَنْهُوَ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ كَيْفَ يَكُنْ لَكَ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ آپ اپنی مرضی اور خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، بلکہ آپ کی زبان پر وحیِ الہی اور کلامِ خداوند تعالیٰ جاری ہوتا ہے۔ علامہ صاحب ہی بتلائیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعلانِ عام کیے بغیر صرف دو تین خدام اور حاضرینِ مجلس کو جو کچھ بتلائیں اس کا اعتبار نہیں ہے اور اسے آپ کا ارشاد اور فرمان کہنا غلط ہے؛ اور وہ فرمانِ وحیِ الہی اور کلامِ خدا کہلانے کا حقدار نہیں ہے؛ ہاں اس کو نصی خلافت اس لیے نہیں کہتے کہ اس کی صورت یہ ہوتی کہ آپ عام اہل اسلام کے سامنے کسی صماہی کے خلیفہ ہونے کا اعلان کرتے اور انہیں اس خلیفہ کی اطاعت اور اتباع کا پابند اور مکلف ٹھہراتے لہذا بایں معنی نصی بھی نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی منشا اور مرضی کے مطابق بھی ہے۔

۲۔ نیز ہم اس خلافت و امامت کو اجماعی اور شورائی قرار دیتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور پسندیدگی کو دخل نہیں، بلکہ رضا خلق، رضائے خالق کا مظہر اور عنوان ہوا کرتی ہے، لہذا اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اجماع و اتفاق اور ان کی اس خلافت پر عنامندی بھی اللہ تعالیٰ کی منشاء اور مرضی کی مظہر ہے اور یہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے، جس کا جواب دینے کی علامہ صاحب کو ہمت نہ ہوئی۔ آپ فرماتے ہیں،

انما الشورى للمهاجرين والانصار فان اجتمعوا على رجل وسموه اماماً كان ذلك لله مرضى - نهج البلاغہ
یعنی شوری اور انتخاب خلیفہ کا حق مہاجرین اور انصار کے لیے ہے اور وہ جس شخص کو بھی باہمی رضا مندی اور اتفاق و اتحاد سے خلیفہ نامزد کر دیں، تو وہی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ و امام اور خلیفہ ہوگا، لہذا یہ خلافت شورائی اور اجماعی ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق ہے اور اعلان عام نہ فرمائے جانے کی وجہ سے نصی نہ کہلائے گی، مگر بطور مشردہ اور خوشخبری اس ترتیب خلافت کا حضرت حصہ رضی اللہ عنہا پر اظہار ان حضرات کی خلافت الہیہ موعودہ اور خلافت حقہ کی دلیل بھی ہے۔ اس کے نص خلافت نہ ہونے سے اس کا بطلان اور خلاف واقع ہونا کس طرح لازم آگیا یا ظالمانہ خلافت والا مفہوم کیسے اور کس طرح یہاں سے اخذ کیا جاسکتا ہے۔

مشق چہماں م، ڈھکوصا حب نے فرمایا کہ اعلان خلافت تو اتنا اہم تھا کہ اس کے بغیر تمام کار نبوت اکارت ہونے کا اندیشہ تھا، کما قال اللہ تعالیٰ: دَاٰنَ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ۔ اور یہاں افشائے راز پر دل ٹیڑھے ہو رہے ہیں، لیکن یہ شق بھی مہر اسر و دھوکہ بازی اور فریب کاری پر مبنی ہے اور بے بنیاد اور خلاف حقیقت دعویٰ ہے۔

۱۔ یہ دعویٰ کہ اعلانِ خلافت کے ضمن میں یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی ہے شیعہ وروافض کا خود تراشیدہ نظریہ ہے، جس کو حقائق اور واقعات سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ خلافتِ مطلقہ اور ریاستِ عامہ کے مالک اور متولی کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق اعلان تو دور کی بات ہے۔ مساجدِ مدینہ میں سے صرف ایک مسجدِ نبوی کے امام بلکہ نائبِ امام کے طور پر بھی ان کا اعلانِ شیعہ ثابت نہیں کر سکتے۔ اس لیے بقولِ شیعہ امامتِ نماز کا معاملہ محلِ شک و تردید رہا اور صحابہ کرام ایک دوسرے پر ٹالتے رہے۔ اور جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور ان کی آواز حضورِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سنی، تو باوجود شدید تکلیف کے خود تشریف لائے اور ان کو مصلے سے بٹا دیا اور خود مصلاتے امامت پر تشریف فرما ہو گئے، مگر اسی قولِ یہ امر ماننا لازم ہو گیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ اس وقت اپنے مصلے پر کھڑا کیا اور نہ دوسرے کسی وقت میں ان کو نماز کی امامت کے لیے مامور فرمایا۔ جب اس محدود امامت اور امامتِ صفری کے لیے نامزدگی ثابت نہیں ہو سکتی، تو امامتِ کبریٰ کے لیے کیسے آپ کی تنصیص اور نامزدگی ثابت کی جاسکتی ہے، بلکہ جب اس طرح کا اعلانِ خلافت آپ کے لیے ہو چکا ہو تو نماز میں امامت خود بخود ان کے لیے ثابت ہو چکی تھی۔ پھر انہوں نے اپنا حق کیوں استعمال نہ فرمایا اور مصلیٰ کو خالی کیوں چھوڑا کہ خود حضورِ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر تکلیف برداشت کرنا پڑی اور بمشکل تمام مصلیٰ خالی کرنا پڑا۔

الغرض اس آیتِ کریمہ کے متعلق مفصل بحث تو حدیثِ غدیر خم میں ذکر کی جائے گی، وہاں ملاحظہ فرمادیں۔ اجمالاً اتنا قدر یاد ہے کہ امامتِ عظمیٰ اور خلافتِ کبریٰ تو کجا آپ کی امامتِ صفری کا اعلان بھی نہیں پایا گیا تھا تا کہ اس سے ہی امامتِ کبریٰ کا اشارہ سمجھ لیا جاتا جیسے کہ اہل سنت نے حضرت

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت نماز سے یہ اشارہ سمجھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہی وجہ تقدیم بیان کر کے انصار کو خلافت صدیق رضی اللہ عنہ پر متفق کر لیا اور وہ منا امیر و منکم امیر کے دعوے سے دستبردار ہو گئے

۲۔ رباؤ صکو صاحب کا یہ دعویٰ کہ یہاں اس خلافت کے اظہار پر دل پڑھے ہو رہے ہیں، سراسر خلاف واقع اور منحنکہ خیز ہے، کیونکہ خود ان کے مسلک کی کتابوں میں یہ وضاحت و نہاحت موجود ہے کہ جس امر کے افشاء پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو سرزنش فرمائی۔ وہ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے آپ پر حرام ٹھہرانے والا امر ہے نہ کہ حضرات شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت و امامت کا انکشاف و افشاء راز چنانچہ قرآن مجید نے بھی خود اس راز کے بعض حصہ پر افشاء کے متعلق خبر دینے اور بعض حصہ سے اعراض اور روگردانی کرنے کی تصریح فرمائی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ: فلما نبأت بہ و اظہر لا اللہ عرف بعضہ و اعرض عن بعض۔ اور اس کی تفسیر میں علماء شیعہ نے کہا:

الف، عن الزجاج ولما حرم ماریة القبطیة اخبر حفصة انه یملک من بعد ابوبکر ثم عمر فعرضا بها بعض ما افشت من الخبر و اعرض عن بعض ان ابابکر و عمر یملکان بعدی۔ (مجمع البیان ج ۹ - ص ۳۷۱)

یعنی زجاج سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو اپنے اوپر حرام فرمایا، تو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو یہ خبر بھی دی کہ میرے بعد ابوبکر والی ملک و سلطنت ہوں گے اور ان کے بعد عمر۔ پھر ان کے افشاء کرنے پر اس امر میں سے بعض بتلایا، یعنی عائشہ صدیقہ طاہرہ رضی اللہ عنہا کو بتلانا اور یہ خبر دینا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ کو اپنے اوپر حرام ٹھہرا دیا ہے اور بعض سے اعراض فرمایا، یعنی اس سے کہ

ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما، میرے بعد امور سلطنت کے مالک ہوں گے۔
 (وکذا فی التفسیر الصافی نقلاً عن مجمع البیان - جلد ثانی ص ۲۳۴)

ب: قوله تعالى: واذا اسرا النبي الى بعض اذواجه
 حدیثا سنخے را کہ تحریم ماریہ است و حکومت ابو بکر و عمر بعد از وراثت،
 عرف بعضہ و اعرض عن بعض شناسا گردانید پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام
 برخیزے ازاں حدیث را بحفصہ و خبر داد اور از افشار بعض آنکہ آن تحریم
 ماریہ است یعنی باو گفت کہ قصۃ تحریم ماریہ کہ با سرار آن امر نموده بودم، تو
 افشار آن نمودی و اعراض کردی رسول از بعض دیگر یعنی حکومت ابو بکر و عمر
 خطاب و تعریف افشار آن نکرد۔
 (ذہبیج الصادقین جلد ۹ ص ۳۳)

اس عبارت کا بھی معنی و مفہوم وہی ہے، جو مجمع البیان والی عبارت کا
 ہے اور ذکر کیا جا چکا ہے۔

الغرض اگر ان حضرات کی حکومت و امارت اور خلافت و امامت کے انکشاف
 پر قول باری تعالیٰ، فقد صغت قلوبکما میں ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہوتا، تو
 اس کو ذکر کیا جاتا اور علی الخنوس میں شیعہ مفسرین تو لانا اس کو درمیان میں لانے کی سعی
 کرتے۔ جب قرآن مجید اور احادیث نبویہ کی شہادت سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس انکشاف
 اظہار کو کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا اور اس پر کسی قسم کی سرزنش تو کیا گلہ ہی نہیں دیا گیا، تو
 ڈھکڑ صاحب کو یہ انکشاف کہاں سے ہو گیا کہ اس خلافت کے انکشاف پر زل ٹیڑھے
 ہونے لگے ہیں؟ کیا وہی ذریعہ الہام ہے جو قول باری تعالیٰ: اِنَّ الشَّيَاطِیْنَ
 لَیُوحِیْنَ اِلٰی اَوْلِیَاءِہُمْ میں بیان کیا گیا ہے؟ یقیناً صرف اور صرف وہی
 ذریعہ انکشاف ہے۔

۳۔ بلکہ حقیقت حال یہ تھی کہ سوال یہ نہیں تھا کہ کیا بیان کیا اور کیا بیان نہیں کیا؟
 تصور کیا یا زیادہ بیان کیا۔ سوال صرف یہ تھا کہ تم بنی الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویا
 ہوا اور امہات المؤمنین تمہارا لقب امتیاز اور طرۃ امتیاز ہے، لہذا تمہارا عمل و کردار

بھی اسی طرح اعلیٰ وارفع ہونا چاہیے اور جن کے صدقے تمہیں عزت و کرامت نصیب ہوتی ہے۔ ان کے احکام کی مکمل تعمیل ہونی چاہیے۔ لہذا افشار راز کرنا اور راز کو راز نہ رکھنا تمہارے جیسے مقام و مرتبہ کی مالک عورتوں کو زیب نہیں دیتا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی تعلیم و تربیت تھی، اور ان کے اخلاق و اعمال کی تہذیب و تزئین، نہ کہ ان کی مذمت۔ لیکن یہ صرف شیعہ ذہن کا فتور تھا کہ اس تعلیم و تربیت اور تادیب و تہذیب کو خلافت میں تنقیص و تنقید کا سبب بنا لیا اور اس کو غاصبانہ اور ظالمانہ خلافت فرض کر لیا اور یہ صرف سیائی و مہنیت کی ہی کارستانی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ افشار راز خواہ وہ جیسا بھی ہو، مناسب نہیں ہوتا۔ نہ یہ کہ واقعہ کے مطابق اور برحق ہو تو اس کا افشار درست ہو گا اور خلافت واقعہ اور ناحق ہو تو اس کا افشار ممنوع ہوتا ہے۔ لہذا ان غیر معقول سوالات کے بحمد اللہ معقول جواب آچکے۔ فیہل من مذكر۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا تھا، ان ابا بکریلی الخلافة من بعدی ثم ابوبکر۔ اس کا ترجمہ یوں کرنا کہ وہ خود بخود قابض ہو جائیں گے، اور خلافت کو غصب کر لیں گے، یہ کس لغت اور کس محاورہ کے لحاظ سے ہے اور برحق خلیفہ بننے کی خبر دینا ہو تو اس کے لیے کونسی تعبیر متعین ہے؟ کسی جملہ سے قائل کی مراد متعین کرنے کی صورت یہی ہوتی ہے کہ اس کے ظاہری اور متبادر الی الفہم معنی کو دیکھا جائے اور ظاہر و متبادر بالکل وہی ہے، جو ہم نے بیان کیا اور حضرت شیخ الاسلام نے بیان فرمایا اور شیعہ معنی انہ اس جملہ سے متبادر الی الفہم اور نہ اس پر کوئی قرینہ قائم ہوا، لہذا وہ سراسر تحریف ہے۔

۵۔ اگر امام الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مرض وصال میں انتقالِ اقتدار فرما دیتے تو ان خلفاء کے لیے یہ موقع فراہم نہیں ہو سکتا تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے عملی طور پر اقتدار منتقل کر کے خلافت مرتضویہ کا تحفظ کیوں نہ کیا اور اس میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشاء کے مطابق

عمل فرمایا یا بو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کی مرضی اور منشاء کے مطابق؟ اور آپ نے اپنا فریضہ یعنی حقدار کو اس کا حق مہیا کرنے کا کیوں نہ ادا فرمایا اور اس موقعہ پر ان کی جانی کا اعلان کیوں نہ فرمایا؟

۶۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس کوئی فوج و سپاہ نہیں تھی اور نہ ہی وہ ایسے عظیم قبیلہ کے فرد تھے، جو امر خلافت میں ان کی امداد و اعانت کا حق ادا کرتے جس سے انہوں نے خود بخود خلافت و حکومت پر قابض ہونا تھا، بلکہ ان کی خلافت امامت کا دار و مدار اہل حل و عقد کی بیعت پر تھا اور وہ مہاجرین و انصار تھے اگر وہ حضرات ان کی بیعت نہ کرتے، تو یہ خلیفہ اور امام نہیں بن سکتے تھے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ ان کو تو والی اور حاکم بنایا گیا تھا نہ کہ خود بخود بنے تھے، لہذا اگر معنی کیا جائے، جو ڈھکوسل صاحب نے کیا ہے، تو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب لازم آتی ہے۔

علاوہ انہی خلافت و امامت کا بذریعہ شوری انعقاد پذیر ہونا درست ہے، تو ان حضرات کی خلافت برحق ثابت ہوگئی اور نہیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی باطل ہوگئی، کیونکہ وہ بھی نفس سے نہیں، بلکہ اسی شوری اور مہاجرین و انصار کے انتخاب سے منعقد ہوتی تھی۔ بیعت کرنے والے نہ پہلے کسی نفس کو جانتے تھے اور نہ بعد میں۔

کے ذریعے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت حقہ کو تسلیم کیا، بلکہ محض شوری و جماعی ہونے کی وجہ سے ہی اس کو برحق تسلیم کیا۔ لہذا یا تو چاروں خلافتیں برحق تسلیم کرنی پڑیں گی یا چاروں باطل، پھر اس تفریق کی وجہ جواز کوئی نہیں ہو سکتی۔

۷۔ جن لوگوں نے پہلے غصب کرانے میں خلفائے ثلاثہ کا مکمل تعاون کیا اور بعد ازاں بھی اسی نظریہ پر قائم رہے کہ ان کی خلافت برحق تھی اور اس کا از روئے شوری و انتخاب انعقاد پذیر ہونا بالکل درست تھا، وہ مومن رہے یا مکر ہوئے اگر مومن رہے، تو خلافت بلا فصل کا عقیدہ رکھنا اسلام نہ رہا۔ اندریں صورت اس

پر کارِ نبوت کا توقف اور دار و مدار کیونکر ہو سکتا ہے اور خلافتِ مرتضوی کا اعلان نہ کرنے سے سب کارِ نبوت اکارت کس طرح ہو سکتا ہے؟ اور اگر مرتد ہو گئے تھے العیاذ باللہ! تو ان سے تعاون اور استمداد کا کیا جواز؟ نیز ان کو خوش کرنے کے لیے شیخین کی تعریف و توصیف بھی کرتے رہنے کا کیا جواز ہوگا، حالانکہ قبل ازیں متعدد حوالہ جات سے یہ حقیقت ثابت کی جا چکی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ علی الاعلان برسرِ حضراتِ شیخین کو ساری امت سے افضل قرار دیتے تھے۔ وغیر ذالک۔

۸۔ علامہ ڈھکو صاحب کے بقول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ از رہِ ظلم و تعدی خلافت پر قابض ہو جائیں گے اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وہ خلافت، خلافتِ موعودہ ہے اور خلافتِ الہیہ، تو اس صورت میں رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کس پر فتویٰ لگایا جائے گا؟ اور شیعہ حضرات ان میں سے کس کو صادق اور کس کو کاذب کہیں گے؟ نعوذ باللہ من ذالک کیا منصبِ امامت پر فائز شخص تصدیقِ رسول کا پابند نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے نبی کی تکذیب کرنا جائز ہے؟ العیاذ باللہ!

کیا ہیں ان معقول سوالات کے معقول جوابات کسی معقول شیعہ کے پاس؟ قطعاً نہیں، بالکل نہیں۔ انفرادی طور پر کجا، اجتماعی طور پر بھی ممکن نہیں ہیں۔

علمائے شیعہ کی عداوتِ شیخین میں ہوش و خرد سے بیگانگی

شیعی مفسر قمی اور محسن کاشانی رقمطراز ہیں کہ جب خلافت کے متعلق یہ راز فاش ہو گیا اور ابوبکر صدیق اور عمر فاروق (رضی اللہ عنہما) کو معلوم ہو گیا کہ واقعی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، "ان ابا بکر یلی الخلافت من بعدی ثم ابوی۔" تو انہوں نے دو آدمی دوسرے ساتھ ملا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنایا۔

فاجتمعوا لریعة علی ان یسموا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنزل جبرئیل علیہ السلام بهذا السورة (الی، عرف بعضہ ای اخیرھا وقال اخبرت بما اخبرتك وأعرض عن بعض لم یخبرهم بما علم مما هموا به من قتله۔ (تفسیر قمتی مع تفسیر حسن عسکری۔ ص ۳۵۴) یعنی جب چار آدمیوں نے آپ کو زہر دے کر شہید کرنے کا پروگرام بنایا تو اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی (تا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض حصہ کے متعلق حضرت حفصہ (رضی اللہ عنہا) کو بتلایا اور باز پرس کی کہ تو نے آگے کیوں بتلایا، جو میں نے تجھے بتلایا تھا اور بعض سے چشم پوشی فرمائی۔ یعنی یہ جان کر بھی کہ انہوں نے میرے قتل کا ارادہ کیا تھا، انہیں اپنے جان لینے اور اللہ تعالیٰ کے جتلانے کا ذکر نہ کیا۔ (تفسیر صافی جلد دوم ص ۲۳۷) ۱۔ قول، اس اضافہ میں کئی وجوہ سے سقم ہے جو اس کے سراسر افتراء اور بہتان ہونے کی بیق دلیل ہے۔

۱۔ جب انہیں معلوم ہو چکا کہ خلافت مل جائے گی، تو پھر آپ کو زہر کھلانے اور شہید کرنے کا پروگرام بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ ہاں یہ معلوم نہ ہوتا، تو ہاتھ پاؤں مارنے اور حیلوں و تدبیروں سے کام لینے کی ضرورت پڑتی علی الخصوص جبکہ ڈھکوسہ صاحب کے نزدیک حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ راہب کی اس پشتگوٹی کی وجہ سے ہی اسلام لاتے تھے کہ تم اس رسول کے خلیفہ بنو گے، تو اس علم کے مطابق پروگرام بنالیتے۔ اب اس تاخیر سے اور آپ کے اطلاع دینے کے بعد یہ پروگرام بنانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔

۲۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل اور زہر خورانی کا منصوبہ اللہ تعالیٰ اور رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک کیا اتنا معمول تھا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی ان لوگوں کو توبہ کرنے کا حکم نہ دیا اور صرف حضرت حفصہ اور حضرت عائشہ کو

حضرت ماریقبلیہ (رضی اللہ عنہن) کی تحریم کی خبر دینے پر توبہ کا حکم دیا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہ ان کو نگلہ دیا اور نہ دوسرے مخلص صحابہ کو اس غلط اقدام کی اطلاع دی اور نہ ہی ایسے لوگوں سے تعلقات توڑے، نہ ان کی بچیوں کو طلاق دے کر فارغ کیا تاکہ لوگوں کو ان کے تعلقات اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تقرب کی وجہ سے مغالطہ نہ لگے، تو کیا کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہے، اس کے تحت اس امر کو نظر انداز کیے جانے کے قابل سمجھ سکتا ہے؟ اور خود سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے بھیانک جرم کو جس کا تعلق نبی و رسول کی شہادت و قتل سے تھا، قابلِ عفو و درگزر سمجھ سکتے تھے؟

۳۔ نیز جب خلافت کے خواہشمندوں کے عزائم آپ کو معلوم ہو چکے اور ان کے ایسے مکروہ ارادے آپ پر واضح ہو چکے تھے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو عملی طور پر خلافت سونپنا اور اپنی ظاہری زندگی میں اقتدار کو منتقل فرما دینا زیادہ ضروری اور لازم ہو چکا تھا، لیکن آپ نے اس سے اعراض اور روگردانی کر کے گویا عملی طور پر خلافت مرتضوی کا راستہ مسدود کر دیا، لہذا صاف ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات عداوتِ شیخین میں ہوش و خرد اور عقل و فہم سے بالکل بیگانے ہو چکے ہیں اور ان کی سوچ اور فکر کی صلاحیتیں ہی ختم ہو کر رہ گئی ہیں، ورنہ بقائمی ہوش و حواس اس قسم کی روایات کیونکر گھڑی جاسکتی ہیں۔

اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ کی عداوت میں بے حیائی کی انتہا

(ب) قمی صاحب اور محسن کاشانی صاحب لکھتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضرت ماریقبلیہ رضی اللہ عنہا کے حرام بھڑانے کے بعد فرمایا: اَنَا فَضِي الْيَلَدِ سِرًّا فَانْأَنْتِ أَخْبَرْتِ بِهِ فَعَلَيْكَ لَعْنَةُ اللَّهِ وَمَلَائِكَتُهُ وَالنَّاسُ أَجْمَعِينَ فَقَالَتْ نَعَمْ مَا هُوَ؟ قَالَ إِنَّ أَبَا بَكْرٍ بَدَّلَ الْخِلَافَةَ مِنْ بَعْدِي ثُمَّ مِنْ بَعْدِهِ أَبُو بَكْرٍ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَذَا قَالَ نَبَأَنِي الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (تفسیر قمی مع العسکری ص ۳۵۴/ تفسیر صافی جلد دوم ص ۲۳۴)

یعنی میں ایک راز تیرے تک پہنچانے لگا ہوں اور اس کا افشا کرنے والا ہوں پس اگر تو نے اس کی کسی کو خبر دی تو تجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی۔ اس کے تمام فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی۔ تو انہوں نے کہا ہاں ٹھیک ہے! فرمائیے وہ راز کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا: بے شک میرے بعد ابوبکر والی خلافت ہوں گے اور اس کے بعد عمر۔ تو انہوں نے دریافت فرمایا آپ کو اس کی اطلاع کس نے دی؟ تو فرمایا مجھے اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے، جو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔

اقول: اس روایت میں بھی کئی وجوہ سے افترا اور بہتان واضح ہوتا ہے۔

۱۔ حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرعی احکام سے ہٹ کر ان کو ایسے راز کے تحفظ کا مسکلف ٹھہرانا، جس کے افشاء و اظہار پر ان کو اس قدر شدید لعنت کا حقدار بننا پڑے، کونسی رحمت کا مظاہرہ ہے؟ اور ان کے لیے کونسی خوشخبری کا موجب ہو سکتا ہے، جبکہ عورتوں کے طبعی صنعت اور صبر و تحمل کی قلت کا سرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم جیسے حکیم اور معلمِ حکمت سے بڑھ کر کس کو اندازہ ہو سکتا ہے؟

۲۔ راز افشاء کرنے کے باوجود اور ایسی شدید و مغلط لعنت کے حقدار ہونے کے باوجود ان کو اہبات المومنین میں شامل رکھنا اور زوجہ بنا کر رکھنا خود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتنا شدید اور غلط تاثر پیدا کر سکتا ہے؟ اور لوگوں کی نظروں میں آپ کا مقام کیا چھوڑے گا؟ کیا فخرِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی بیویوں کا انتخاب کر رکھا تھا؟ العیاذ باللہ

۳۔ یہ خبر دینے پر کہ میرے بعد ابوبکر صدیق خلیفہ ہوگا اور پھر عمر فاروق،

یہ سوال کرنا کہ تمہیں کس نے اطلاع دی ہے، اس کا کیا موقعہ محل ہو سکتا ہے؟ کیا ایسی فیسی خبروں کی اطلاع دینے والا اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی کوئی ہو سکتا تھا؟ اور اہبات المومنین رضی اللہ عنہم اس سے بے خبر ہو سکتی تھیں، لہذا اس سورت میں اس سوال کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ الغرض ہر طرح تحریف ہی تحریفِ مطمح نظر۔ معلوم ہوتی ہے۔

۴۔ من انباءك هذا اور قبا فی العلیم الخبیر کو البیہ صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کی اطلاع کے ساتھ چسپاں کر دیا گیا ہے، حالانکہ قرآن مجید اس راز کو فاش کرنے کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار پر ان کا یہ سوال نقل کر رہا ہے، کیونکہ اس وقت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے بھی آپ کو اطلاع دیتے جانے کا امکان تھا، جنہیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے یہ راز بتلا دیا تھا، لہذا آپ کا اس موقع پر یہ سوال بر محل تھا اور معقول، بھی مگر آپ نے تسلی کرادی کہ مجھے عائشہ صدیقہ نے نہیں بتایا، بلکہ اللہ علیم وخبیر نے بتلایا ہے، لیکن شیعہ مفسر نے بالکل بے موقعہ و بے محل تفسیر کر کے تحریف معنوی کا ارتکاب کیا ہے اور اہل تورات کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ شیعہ حضرات نے روایات میں کس قدر تحریف اور تغیر و تبدیل سے کام لیا ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقرب ترین صحابہ کو اور اہل بیت المؤمنین کو کس قدر اپنی بد باطنی اور بغض و عناد کا نشانہ بنایا ہوا ہے اور اس بغض و عناد میں کس قدر اندھے ہوئے ہمارے ہیں اور لازم آنے والے مفاسد سے کس طرح آنکھیں بند کر لیتے ہیں، البتہ جو خاندانی ہیں یا قدرے شعور کے مالک، وہ ایسی روایات نقل کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں، جیسے طبرسی صاحب مجمع البیان

ڈھکوصا صاحب کی جاہلانہ اور بے محل تنقید

جو کتاب یا رسالہ شائع ہوتا ہے، اس کی کتابت مصنفین نہیں کرتے بلکہ انہیں کاتب حضرات لکھتے ہیں اور وہ بعض اوقات کچھ کا کچھ لکھ جاتے ہیں، بالخصوص عربی کو۔ کیونکہ عربی سے ان کو واقفیت بہت کم ہوا کرتی ہے اور خود ڈھکوصا صاحب کے رسالہ میں اس طرح کی شدید غلطیاں موجود ہیں، مثلاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو باغیان شریعت لکھ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ص ۳۱، لہذا ڈھکوصا صاحب کا رسالہ ”مذہب شیعہ“ میں کاتب کی غلطی سے وَلَا تَخْطُئُ کی جگہ وَلَا تَخْطُوه لکھے جانے کو حضرت

شیخ الاسلام قدس سرہ کی طرف نسبت کرنا اور کہنا کہ اس سے ان کی قرآن دانی، پر تیز روشنی پڑتی ہے، انتہائی جاہلانہ اور سوقیانہ انداز اور سراسر غلط اور بیجا اعتراض ہے۔ آپ بحمد اللہ حافظ قرآن بھی تھے اور عربی لکھنے اور بولنے میں کامل دسترس کے مالک، جس کو صرف موافق ہی نہیں، بلکہ مخالف بھی تسلیم کرتے ہیں، لہذا صاحب علم اور شریف لوگوں کو اس قسم کے اعتراض زریب نہیں دیتے، گو علامہ ڈھکی صاحب ایسے اعتراضات سے باز نہ ہی رہیں گے اور نہ ہی رہ سکتے ہیں، کیونکہ یہ ان کی افتاد طبع اور مجبوری ہے۔

دسالہ مذہب شیعہ از شیخ الاسلام قدس سرہ العزیز

حدیث غدیر اور شیعہ استدلال کا ابطال

اسی طرح یہ بھی ابلہ فریبی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کی دلیل کے طور پر غدیر خم کی روایت پیش کی جائے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق فرمایا، من کنت مولاً فعلی مولاً یعنی جس کا میں دوست ہوں، حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی اس کے دوست ہیں۔ ظاہر ہے قرآن حکیم میں مولیٰ بمعنی دوست وارد ہے۔ دیکھو آیت کریمہ، فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلَاہُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ؕ یعنی اللہ تعالیٰ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کا دوست خود اللہ تعالیٰ شانہ ہے اور حضرت جبریل اور زیک بندے۔ وَالْمَلَائِکَةُۤ اٰیۡہُ ذٰلِکَ طٰہِرِیْنَ۔ ان کے بعد فرشتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے امداد کنندہ ہیں۔

اب مولیٰ کا معنی حاکم یا امام یا امیر کرنا صراحت قرآن مجید کی مخالفت ہے اور تفسیر بالرائے اور کونسا مسلمان نہیں مانتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دوستوں کے دوست ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کے

رسول نے گھر میں، ہجرت میں، نماز میں، سفر میں حتیٰ کہ قبر میں اپنا ساتھی اور رفیق منتخب فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے دوست ہیں۔ حضرت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا صاف صاف اور واضح ترین ارشاد گرامی نہ بھولیے جو کہ آپ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حق میں فرماتے ہیں: یعنی ہما حبیبای۔ وہ دونوں میرے محبوب ہیں اور دوست یہ حوالہ گزر چکا ہے۔ (رسالہ مذہب شیعہ ص ۷)

از ابوالحسن محمد اشرف السیالوی

تحفہ حسینیہ

تمتہ بحث حدیث غدیر

سب سے پہلے منقول روایت ملاحظہ فرمائیں، پھر اس کے بعد متنازع خلافت کے پس منظر میں اس استدلال کے منفع اور سقم کو ملاحظہ فرمائیں،

عن البراء بن عازب وزید بن أرقم رضی اللہ عنہما
أن رسول الله صلى الله عليه وسلم نزل بغدير خم وأخذ بيد علي فقال أستم تعلمون اني اولى بكل مومن من نفسه
قالوا بلى فقال اللهم من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم
وال من والاه وعاد من عاداه وانصر من نصره واخذل
من خذله وادرس الحق معه حيث دار فلقية عمر بعد ذلك
فقال هنيئاً يا بن ابي طالب اصبحت وامسيت مولى كل مومن
ومومنة رواه احمد - مشکوٰۃ باب مناقب علي رضی اللہ عنہ
حضرت برابر اور حضرت زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ
غدیر خم پر اترے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا، تو فرمایا کیا تم جانتے نہیں ہو
کہ میں سب مومنین سے ان کے ارواح و نفوس سے بھی زیادہ قریب ہوں۔

انہوں نے کہا: جی ہاں۔ تو آپ نے فرمایا: اے اللہ! جس کامیں مولیٰ ہوں، علی اس کے مولیٰ ہیں۔ اے اللہ! اُس کو دوست بنا، جو علی کو دوست بنائے اور اس کو اپنا دشمن قرار دے، جو علی کو اپنا دشمن سمجھے۔ اس کی مدد کر جو علی کی مدد کرے اور اس کو محروم التفات فرما جو علی کو چھوڑ دے اور محروم اعانت رکھ اور حق کو ادھر ہی پھیر جدھر کہ علی پھیرے۔ تو اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ملے اور کہا اے علی بن ابی طالب! تمہارے لیے مبارک باد اور خوشخبری ہے۔ اس اعزاز پر کہ آپ مومن مردوں اور عورتوں کے ہمیشہ کے لیے محبوب بن گئے۔

محل نزاع: اس میں کلام نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق ہیں اور امام المسلمین، لیکن اہل تشیع اور ذرافض آپ کی خلافت بلا فصل کے عقیدہ کو جزو ایمان بلکہ عین ایمان سمجھتے ہیں اور اس وجہ سے ہی انہوں نے تمام صحابہ کرام مہاجرین و انصار اور ان کے کامل متبعین کو صرف اور صرف اس جرم میں کافر اور مرتد قرار دے دیا کہ انہوں نے آپ کو خلیفہ بلا فصل تسلیم نہ کیا اور ارثہ الناس الا ثلاثہ کا قول کیا، یعنی سوائے حضرت ابوذر، حضرت سلمان اور حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے۔ درود نہ کافی، رجال کشی اور انوار نعمانیہ وغیرہ، حالانکہ کلام مجید کی بیسیوں آیات ان کے اخلاص اور قلبی صفائی، صدق اور سچائی، نجات و فلاح اور اللہ تعالیٰ کی رضا و رضوان سے مشرف اور بہرہ ور ہونے کی بین برہان اور صادق تبیان ہیں جیسے کہ قدرے مفصل بیان ان کا گزر چکا۔ اس کے برعکس اہل السنۃ کا مذہب یہ ہے کہ آپ چوتھے خلیفے ہیں اور خلیفہ کا مقرر کرنا صحابہ کرام کا اپنا معاملہ تھا کہ اپنے امور سلطنت کی بہتری اور اس کے انتظامات کی درستی کے لیے جس کو چاہیں خلیفہ و امام نامزد کریں۔ وہ اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کسی خاص شخص کو امام

اور خلیفہ بنانے کے پابند اور مکلف نہیں ٹھہراتے گئے تھے، لہذا انہوں نے اپنی صواب دید سے امر خلافت میں جو فیصلہ کیا، وہ بالکل صحیح اور درست تھا اور انہیں کا عمل دکر دار ہمارے اس نظریہ و عندیہ کا دار و مدار ہے کہ خلیفہ کا تقرر اہل اسلام کے اپنے فرائض میں سے ہے۔ صحیح انتخاب کر لیا تو ماجور اور مستحق ثواب ورنہ مجرم اور مستحق عذاب و عتاب اور اسے اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری قرار دینا یا محتاجِ نفس کہنا غلط ہے

شیعی استدلال کی مدارِ صحت

ہماری سابقہ گزارش سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو گئی ہوگی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں خلافت بلا فصل کے عقیدہ کو جزو ایمان بلکہ عین ایمان قرار دینا اسی صورت میں درست ہو سکتا ہے، جب کوئی قطعی الثبوت اور قطعی الدلائل آیت یا حدیث اس پر دلالت کرے اور ظاہر ہے کہ حدیث متواتر ہی قطعی الثبوت ہوتی ہے نہ کہ مشہور یا خبر واحد لہذا اس حدیث کے استدلال کا دار و مدار اس پر ہے کہ اس کا تواتر اور گنجی الثبوت ہونا ثابت ہو۔ نیز لفظ مولیٰ کا معنی صرف اور صرف خلیفہ بلا فصل ہو۔ اس کے علاوہ دوسرے معنی میں انہ دئے لغت یا محاورات اس کا استعمال نہ پایا جائے۔ اور اگر دوسرے معانی میں بھی استعمال ہوتا ہو تو پھر اس استدلال کا دار و مدار ایسے قطعی قرائن اور حتمی شواہد پر ہو گا جو اس مقام پر صرف مولیٰ بمعنی خلافت بلا فصل کا معنی متعین کر دیں اور کسی دوسرے معنی کا امکان اور احتمال باقی نہ چھوڑیں، ورنہ اگر ایسے قرائن اور شواہد موجود بھی ہوں، جو صرف اس معنی کے ادلیٰ اور انساب ہونے پر دلالت کریں اور اس کے زیادہ موزوں ادوار قریب قیاس ہونے پر دلالت کریں، تو پھر استدلال صرف مفید ظن ہو گا اور اس کے معارضہ میں اگر اسی قوت کا قرینہ موجود ہو گا تو استدلال سا قوط ہو جائے گا اور اگر اس لفظ کا معنی بھی خلیفہ بلا فصل میں منحصر نہ ہو اور ترجیح کا فائدہ دینے والے بھی قرائن بھی موجود نہ ہوتے، تو یہ استدلال

سرے سے لغو اور باطل ٹھہرے گا۔ گویا دو امر کا اثبات شیعہ کے ذمے ہے۔
 اول، حدیث کا توازن، کیونکہ صرف وہی قطعی الثبوت ہوتی ہے اور خبر واحد قطعی ہوتی ہے جو عقائد کے اثبات میں کافی نہیں ہوتی، بلکہ اکابرین شیعہ اس کو وجوب اعمال میں بھی حجت و دلیل تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ ابو جعفر طوسی تلخیص الشافی ص ۳۲۶ میں تصریح کرتے ہیں:
 اخبار آحاد لا توجب علماً عندنا وعند خصوصنا وعندنا خاصة
 لا توجب عملاً۔ یعنی اخبار اعداد ہمارے نزدیک بھی اور ہمارے مخالفین کے
 نزدیک بھی علم اور یقین کا فائدہ نہیں دیتیں اور بالخصوص ہمارے نزدیک وجوب
 عمل بھی ثابت نہیں کر سکتیں۔ دوم، اس میں وارد لفظ مولیٰ کا خلیفہ بلا فصل
 میں منحصر ہونا اور اس معنی کے ساتھ تخصیص ہونا اور ہم بلا خوف تردید اور بغیر کسی
 توقف و تردد کے یہ کہتے ہیں اور بالکل بجا کہتے ہیں کہ صرف ڈھکوسل صاحب نہیں
 بلکہ کوئی شیعہ فاضل قیامت تک یہ دونوں امر ثابت نہیں کر سکتا۔

امراؤں کی تحقیق

حدیث غدیر قطعاً متواتر اور قطعی الثبوت نہیں ہے، کیونکہ امام بخاری اور
 امام مسلم اور واقفی جیسے محدث جہنوں نے دور و دراز کے سفر کر کے احادیث
 رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جمع فرمایا۔ انہوں نے اس کو سرے سے نقل ہی نہیں کیا
 بلکہ ابوداؤد سجستانی اور ابو حاتم رازی اور دیگر بعض عادل اور مرجع انام
 قسم کے لوگوں نے اس کو مطعون ٹھہرایا ہے۔ اندریں صورت اس کے توازن کا
 دعویٰ کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم اس کو خبر واحد اور صحیح
 تسلیم کرتے ہیں اور ہمارے نزدیک قول مختار یہی ہے، لیکن خبر واحد اور صحیح
 ہمارے نزدیک صرف اعمال میں حجت و سند ہے نہ کہ عقائد قطعہ میں اور
 اکابرین شیعہ کے نزدیک وجوب عمل کا فائدہ بھی نہیں دیتی، لہذا اس قطعی عقیدہ
 کے اثبات کے لیے اس کو پیش کرنا صحیح نہیں ہے، خواہ واقع میں یہ حدیث صحیح

ہی کیوں نہ ہو اور ہمارا کلام اس مقام میں اس روایت کے تواتر کے رد و انکار میں ہے نہ کہ اس کی صحت کے انکار میں۔ کذا حقیقۃ الدلوی فی اشعۃ اللمعات والہبتی فی الصواعق۔

تنبیہ: یہ حقیقت بھی ذہن نشین رہے کہ خبر کے متواتر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل السنۃ کی دو تین کتابوں میں منقول ہو یا شیعہ اور سنی دونوں فرق کی کتابوں میں اس کا ذکر ہو بلکہ تواتر کا دار و مدار اس پر ہے کہ سید المرسل صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر آخری ناقل محدث تک ہر دور میں اس کے راوی اس قدر کثیر التعداد ہوں کہ از روئے عقل و درایت ان کا جھوٹ اور کذب پر اتفاق محال اور ناممکن ہو۔

نیز ایک دور راوی کہہ دیں کہ جس مقام پر سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا شا فرمایا وہاں اتنے ہزار صحابہ کرام موجود تھے۔ اس سے بھی روایت کا تواتر ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ناقلین کی تعداد تو اس طرح ہزاروں تک نہیں پہنچ جاتی ناقل تو صرف دو تین ہی ثابت ہوتے، لہذا یہ کہنا کہ چونکہ غدیر خم میں موجود صحابہ کرام سینکڑوں یا ہزاروں کی تعداد میں تھے، لہذا یہ روایت متواتر ہو گئی۔ خود فریبی بھی ہے اور دوسروں کو بھی مغالطہ دینے کی ناکام کوشش، کیونکہ اس حدیث و روایت کے نقل کرنے والوں کی تعداد کا لحاظ ضروری ہے نہ کہ راوی اور ناقل خواہ ایک ہی ہو مگر موقع پر بہت سے لوگ موجود ہوں تو اس روایت کو متواتر کہہ دیا جائے گا۔

امیر ثانی کی تحقیق

دوسرا امیر شیعہ استدلال کا دار و مدار ہے، وہ یہ ہے کہ یہ روایت اس معنی میں قطعی الدلالت ہے کہ مولیٰ کا لفظ صرف خلیفہ بلا فصل ہی کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، جبکہ یہ بھی قطعاً غلط ہے۔ خود شیعہ اقرار و اعتراف کے مطابق مولیٰ کے معانی کی تعداد چوبیس تک پہنچتی ہے اور ظاہر ہے کہ لفظ مشترک کے اس قدر کثیر التعداد معانی میں سے کسی ایک کی تعیین محتاج قرآن ہے اور یہیں ہے

اس کی از روئے دلالت ظہنیت واضح ہو جاتی ہے۔ جب یہ روایت متواتر بھی نہ ہوئی، اور اس کا معنی خلیفہ بلا فصل والا قطعی اور حتمی طریقہ پر بھی ثابت نہ ہوا تو محل نزاع میں اس سے استدلال محل نظر ہو گیا، کیونکہ شیعہ کتاب لغت میں بھی مولیٰ کا معنی خلیفہ بلا فصل موجود نہیں ہے، چہ جائیکہ عام کتب لغت میں۔

قرآن کی حیثیت

اب رہ گیا معاملہ قرآن کے ذریعے مولیٰ کے کثیر التعداد معانی میں کس مطلوبہ معنی یعنی خلافت و امامت متعین کرنے کا تو یہاں دو صورتیں ہی ہو سکتی ہیں۔ اقل یہ ہے کہ ایسے قرآن کے ذریعے اس کا معنی متعین کیا جائے جو قطعیت کا قائل ہو اور ان قرآن کے ہوتے ہوئے دوسرے معانی کا مراد ہونا باطل اور ناجائز ہو۔ ایسے قرآن بھی بالکل موجود نہیں ہیں اور علامہ ڈسکو صاحب نے جو قرآن پیش کر کے ان کے قطعی ہونے کا دعویٰ کیا ہے، ان پر بحث عنقریب ہدیہ ناظرین ہوگی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ایسے قرآن موجود ہوں، جو اس مطلوبہ معنی کی صرف تزییح اور اولیت کا فائدہ دیں اور بطور ظن غالب مولیٰ بمعنی خلیفہ کا ارادہ وزنی اور راجح قرار دیں، ایسے قرآن پیش کیے جاسکتے ہیں، مگر ان کے معارض قرآن ایسے ہیں جو ان سے بھی اقویٰ ہیں، لہذا ان کے موجود ہونے کی وجہ سے شیعہ قرآن کی دلالت محل نزاع میں قابل اعتدال و لاتق التفات نہ رہے گی اور ہمارے نزدیک ایسے ہی قسم کے چند وہ قرآن ہیں جو شیعہ حضرات نے اس مقام پر پیش کیے ہیں، لہذا ان کے بیان کرنے پر ان کے معارض اور مناقض قرآن بلکہ دلائل و براہین کو بیان کر دیا جائے گا۔ جن سے ناظرین کرام خود ہی فیصلہ کر لیں گے کہ قطعی استدلال اور ان کی طرف سے پیش کردہ قرآن میں کوئی وزن نہیں ہے۔

نوٹ: اہل تشیع کو اس امر کا اعتراف ہے کہ حدیث غدیر اور حدیث منزلت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تصریح نہیں ہے، بلکہ ان میں صرف

اس پر تعریف ہے اور اس کی طرف صرف اشارہ ہے۔ علامہ طبرسی نے الاختصاص
 ص ۱۵ پر ذکر کیا ہے، واثبت حجة الله تعالى لا تصرفها بقوله
 في وصيه من كنت مولا فلهذا مولا وبقوله هذا مني
 بمنزلة هارون من موسى ولو قال لهم لا تقلدوا الامم
 الا لفلان بعينه والآنزل بكم العذاب لآتاهم العذاب
 وذل باب الانظار والامثال۔

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حجت بطور اشارہ و کنایہ
 بیان فرمائی اور اس کی تفسیر صحیح نہیں فرمائی۔ ان دونوں باتوں میں یعنی من
 كنت مولا فلهذا مولا ہر خواہ انت منی بمنزلة هارون من موسى
 ہو۔ وصی رسول حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وصایت اور خلافت کی تفسیر صحیح نہیں فرمائی
 اور اگر آپ تصریح فرماتے کہ تنصب امامت صرف فلان معین شخص کو ہی سونپنا
 ورنہ تم پر عذاب نازل ہو جاتے گا، تو یقیناً ان پر اس حکم کی خلاف ورزی کی صورت
 میں عذاب نازل ہو جاتا اور مہلت کا دروازہ بند ہو جاتا۔

لہذا کسی بھی شیعہ عالم کو ان دونوں روایات کو قطعی دلیل اور خلافت علی
 کی نص صریح قرار دینے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، بلکہ وہ آپ کی خلافت امامت
 کی طرف بقول طبرسی کے صرف تعریف اور اشارات ہیں، حالانکہ قطعی عقیدہ
 کے لیے قطعی الثبوت اور قطعی الدلائل دلیل درکار تھی اور یہاں نہ ثبوت قطعی اور نہ ہی
 دلائل قطعی، تو اس سے وہ قطعی عقیدہ کیسے ثابت ہو سکتا ہے، جس کی بنا پر
 ایک لاکھ چوبیس ہزار اصحاب رسول کو اللہ عزوجل مرتد قرار دے دیا گیا
 ہے اور ان خدام رسول اور محسنین اسلام پر ہر قسم کے سب و شتم اور طعن و تشنیع کو
 صرف جائز ہی نہ رکھا گیا، بلکہ اسے جزو ایمان بنالیا گیا اور جس طرح نماز و روزه
 ہے، اسی طرح تبرک کو بھی فرائض اسلام میں شمار کیا گیا۔
 وائے ناکامی متاع کاروان عاتارہ کاے اں کے دل سے احساں یاں عاتارہ

رسالہ تنزیہ الامامیہ از محمد حسین ڈھکو صاحب

- ۱۔ پیر صاحب کا حدیث غدیر کی دلالت میں خدشہ ظاہر کرنا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ اس حدیث کی صحت و صداقت مسلم ہے اور اس کے متواتر ہونے کی دلیل۔
- ۲۔ پیر صاحب نے مولیٰ کا معنی دوست کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک مولیٰ کا صرف ایک ہی معنی ہے جو مدعی کے علوم عربیہ سے نا بلد ہونے کی عین دلیل ہے۔ بلکہ عربی زبان میں یہ لفظ پورے چوبیس معانی میں مستعمل ہے۔
- ۳۔ ان کا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ قرآن مجید میں مولیٰ بمعنی دوست استعمال ہوا ہے، بلکہ معنی اولیٰ، سید و سردار اور ناصر و مددگار بھی استعمال ہوا ہے۔
- ۴۔ یہ بھی غلط ہے کہ توقف کی پیش کردہ آیت میں مولیٰ بمعنی دوست استعمال ہوا ہے، بلکہ یہاں بمعنی ناصر و مددگار ہے۔
- ۵۔ مولیٰ کے معانی اگرچہ چوبیس ہیں، مگر مشہوران میں سے تین ہیں؛ اولیٰ بالتصرف ناصر و مددگار اور دوست اور قاعدہ یہ ہے کہ لفظ مشترک کے متعدد معانی میں سے موقع و محل کی مناسبت سے داخلی اور خارجی قرآن کے ساتھ ایک معنی کو متعین کیا جاتا ہے اور ہم بلا خوف رد علی الاعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حدیث غدیر میں مولیٰ کا معنی سوائے اولیٰ بالتصرف اور حاکم و سردار کے دوسرا کوئی معنی مراد نہیں ہو سکتا اور اس پر وہ ذقرا آن اور شواہد قطعیہ پیش کیے جاتے ہیں تاکہ جناب امیر علیہ السلام کی خلافت بلا فصل بالکل بے غبار و واضح اور آشکار ہو جائے۔

مخلص رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۴۹/۱۵۰

تحفہ حسینیہ

از ابوالحسن محمد اشرف السیالوی

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے حدیث غدیر سے شیعہ استدلال کے ابطال میں جو کچھ فرمایا تھا اس پر ڈھکو صاحب کی طرف سے اعتراضات کی فہرست اور تفصیل

ملاحظہ فرما چکے، اب ان کے جوابات کا مطالعہ فرمائیں اور خود ہی حق و باطل اور صحیح و غلط کا فیصلہ کریں۔

جواب الاول: حدیث غدیر کی صحت قول مختار کے مطابق مسلم بنے لیکن تواتر محل اختلاف ہے، ہمارے نزدیک یہ حدیث اخبار آحاد کے قبیل سے ہے، لہذا تواتر کا درمیان میں اضافہ کر لینا اس تحریف اور تغیر و تبدیل کا مظہر ہے جو ڈھکوسل صاحب کو اپنے اسلاف سے ورثہ میں ملی ہے۔ ہر روایت کی صحت اس کے متواتر ہونے کو مستلزم نہیں ہوتی، لہذا یہاں عیاری سے کام لیا گیا ہے۔ اگر متواتر ہوئی تو قطعی الثبوت ہوتی، اور اس کو عقیدہ قطعی کے اثبات میں پیش کیا جانا ممکن ہوتا، بشرطیکہ اس کی دلالت مطلوبہ معنی پر بھی قطعی ہوتی۔ جب تواتر ہی ثابت نہ ہوا، تو اس کے ساتھ کسی عقیدہ قطعی بلکہ ظنی کا اثبات بھی ممکن نہ رہا، بلکہ وجوب عمل ثابت کرنا بھی ممکن نہ رہا جیسے کہ ڈھکوسل صاحب کے اکابر نے تصریح کی ہے، جیسے کہ حوالہ دیا جا چکا ہے۔

جواب الثانی: پیر صاحب نے مولیٰ کے معانی کا دوست کے معنی میں انحصار ثابت نہیں کیا، بلکہ بطور احتمال ایک معنی ذکر کر دیا ہے اور چونکہ وہ مقام مشع میں ہیں اور مستدل شیعہ ہیں اور مانع کے لیے محض بیان احتمال کافی ہوتا ہے، تو آپ نے بھی اپنا وہی حق استعمال کیا ہے اور مشہور عقلاتی قاعدہ اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال کے مطابق مقام منع میں اتنا قدر ہی کافی ہے۔

نیز لفظ مشترک کے جب متعدد معانی ہوں اور ان میں سے بعض پر فریقین کا اتفاق ہو تو وہ متعین ہو جائیں گے اور مولیٰ بمعنی دوست بھی مسلم بنی فریقین سے ہے، لہذا اسی کو متعین ہونا چاہیے، کیونکہ عموم مشترک تو ہو نہیں سکتا، ورنہ علامہ صاحب کو قرآن بیان کر کے مشترک کے ایک معنی کو معین کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی اور اور جب ایک ہی معنی ایک جگہ مراد ہو سکتا ہے تو جو متفق علیہ ہے، وہی متعین ہو جائے گا، لیکن ڈھکوسل صاحب نے دونوں مسلم قاعدوں کو نظر انداز کیا ہے اور ساتھ ہی بلا وجہ بھپو کا کر دار بھی ادا کیا ہے۔

جواب الثالث: حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے مولیٰ کے معانی کا صرف اس ایک معنی میں منحصر ہونے کا بھی دعویٰ نہیں فرمایا اور نہ ان کے کلام میں صر پر دلالت کرے والا لفظی لفظ موجود ہے، بلکہ حقیقی وجہ بیان احتمال ہے اور معنی مسلم بین الفریقین کا متعین ہونا، لہذا یہ اعتراض محض تعداد بڑھانے کی بے سود کوشش ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے، بلکہ دونوں اعتراض اپنے مفروضہ دعویٰ تھری ہیں

جواب الرابع: اللہ تعالیٰ کے دوست اور اس کے معاون و مددگار ہونے میں تلامزم ہے اور ان کا ایک دوسرے سے جدا ہونا ناممکن ہے جبکہ دوسری جگہ کبھی دوستی ہوتی ہے، لیکن نصرت و اعانت بوجہ ضعف و ناتوانی نہیں ہوتی جاتی اور کبھی امداد و اعانت ہوتی ہے، مگر دوستی والا معنی موجود و متحقق نہیں ہوتا جیسے کہ اجنبی آدمی موقعہ پر پہنچ جائے اور ظالم کے ظلم و استبداد سے بچالے، لہذا حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمہ کا مقصد یہاں پر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ دوست بنے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کی اعانت و نصرت اس کی دوستی کی فرع ہے، لہذا اصل اور مدار اعانت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا بعض دوسرے حضرات نے اگر فرع کو بیان کر دیا اور مرتب نتیجہ کو تو وہ بھی صحیح ہے، جبکہ آپ نے اصل اور مدار کو بیان کر دیا، لہذا اس اعتراض کا کوئی موقعہ و محل نہیں ہے یا ان حضرات نے مطلق مفہومی تفاہیم کو سامنے رکھا اور آپ نے مخصوص مقام اور مادہ خاص میں نظر مرکوز رکھی۔ علاوہ ازیں مولیٰ بمعنی دوست مسلم عند الخصم ہے، لہذا مثال میں بحث دآب المحصلین سے خارج ہے اور اہل علم کے شایان شان نہیں ہے کہما ہوا المقر عند العقلاء من اس باب الفنون۔

جواب الخامس: ڈھکوصاحب فرماتے ہیں مولیٰ کے مشہور معانی

تین ہیں، اولیٰ بالتصرف، ناصر و مددگار اور دوست، اور یہاں بقول ان کے پہلا معنی متعین ہے۔ ان قراتن کی نو سے جو وہ بیان کریں گے، لیکن اولیٰ بالتصرف بطور خلافت بلا فصل کے ہی ہو، کلام صرف اس میں ہے نہ کہ مطلق خلافت اور

تصرف میں کیونکہ اہل السنّت کے نزدیک آپ خلیفہ برحق ہیں، مگر جو جوتھے ہیں۔
 لہذا پہلے از روئے لغت یہ معنی ثابت کرنا چاہیے، اس کے بعد قرآن پیش کرنے
 کی نوبت آئے گی، کیونکہ قرآن کے ذریعے مشترک کے متعدد موضوع نہ معانی میں
 سے ایک کا تعین کیا جاتا ہے نہ کہ قرآن کے تحت مشترک لفظ کا معنی از سر نو وضع
 کیا جاتا ہے، اور علامہ ڈھکوصاحب اور تمام شیعہ علماء اپنے پیش کردہ قرآن
 کے تحت اس مشترک کا معنی وضع کرتے ہیں جو بالکل غلط طرزِ فکر اور سراسر
 باطل طریقہ ہے۔

۲۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت غدیر خم میں حضرت علی رضی
 رضی اللہ عنہ کے لیے یہ لفظ ”فعلی مولا“ استعمال فرمایا، اسی وقت آپ کے
 لیے خلافت و حکومت ثابت ہو گئی یا نہ اور بر تقدیر اول دریافت طلب امر یہ ہے
 کہ حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت اپنا اقتدار علیؑ بھی حضرت علی رضی
 رضی اللہ عنہ کو منتقل فرمادیا یا نہ؟ دوسری صورت میں بیک وقت دو حاکم اور متصرف
 عملی طور پر موجود ہو گئے اور خود مخالفین بھی اس کے قائل نہیں ہو سکتے اور پہلی
 صورت میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا غدیر خم کے بعد سے وصال تک
 حکومت و اقتدار سے علیحدہ ہونا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اقتدار سہرہ
 قابض ہونا اور ملک عرب میں متصرف ہونا لازم آئے گا، حالانکہ یہ بھی حقائق
 اور واقعات کے خلاف ہے اور مسلماتِ خصم کے بھی خلاف ہے، لہذا ماننا پڑے گا
 کہ فوری طور پر تو اس تصرف و تسلط اور اختیار و اقتدار کو حضرت علی رضی
 رضی اللہ عنہ کے لیے ثابت نہیں کیا جاسکتا اور مستقبل میں اس معنی کے مراد ہونے
 کی صورت میں اقتدار و اختیار اور تصرف و تسلط ثابت ہو سکتا ہے لیکن مستقبل
 میں تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں۔ نزاع و اختلاف صرف بلا فصل تصرف کا مالک
 ہونے میں ہے اور لفظ مولیٰ یا اعتبارِ وضع اس پر دلالت ہی نہیں کرتا۔ اگر
 دلالت کرتا ہے، تو مطلق حکومت اور تصرف پر کرتا ہے۔ اس میں نزاع نہیں ہے۔

لہذا علماء شیعہ کا مدعی اس سے قطعاً ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی اہل السنّت کے مذہب و مسلک پر اس سے اعتراض ہو سکتا ہے۔

۳۔ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد قطعی طور پر خلافتِ بلا فصل ہی تھی تو آخر شیعہ صاحبان کو تو یہ عربی آگئی ”وخلیفۃ بلا فصل“ کیا سرورِ عالم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر عربی (نعوذ باللہ) نہیں آتی تھی؟ یا دیدہ دانستہ امت کو ابھن میں ڈالنا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بلا فصل خلافت کو صیستان بنانا مقصود تھا؟ نعوذ باللہ! جو کہ مکارمِ اخلاق کی تعلیم اور شرائعِ اسلام کی تکمیل فرمانے والے رحمتِ عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم نبی کی شان سے بعید تر ہے۔

۴۔ ظاہر ہے جس بادشاہ نے اپنے بعد کسی بھی ولی عہد بنایا، اس کی ولی عہد میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوا۔ دوسری حکومتوں کے معاملات کو چھوڑ دیتا رنجِ اسلام کے دورِ اول میں حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنانا ہر ایک کو معلوم ہے۔ یہاں خلیفہ اور ولی عہد ہونے میں کسی کو اختلاف نہ ہوا۔ آخر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی العیاذ باللہ خلیفہ بنانے اور ولی عہد مقرر کرنے کا سلیقہ نہ آیا یا بالعموم صحابہ کرام مہاجرین و انصار کو حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اتنا تعلق بھی نہیں تھا جتنا کہ حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما سے تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت میں سمجھی نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بقولِ شیعہ مخالفت کی، مگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ولی عہد بنایا، تو کسی نے بھی اختلاف نہ کیا۔ زمانہ اپنے تمام ترادوار میں کتبہ تواریخ اپنے نامہز اور اقاب اس قسم کی کوئی مثال دکھلا سکتی ہیں؟ جب ہمیں اور یقیناً نہیں دکھلا سکتی تو معلوم ہوا کہ یا لوگوں نے اس حدیثِ غدیر کا معنی ایسی غلط سمجھا ہے اور مقصود نبوی بیان کرنے کی بجائے اپنی طرف سے گھڑنت کی ہے اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں معنوی تخریف کر کے اپنے اسلاف کی تقلید کا حق ادا کیا ہے۔

علامہ ڈھکو صاحب کے بیان کردہ قرآن اور ان کا تبلیغ

علامہ موصوف نے اپنی کسی دوسری کتاب سے یہ عبارت نقل کر دی ہے، اس لیے ایسے حوالہ جات کی طرف اشارات اور بعض جگہ تصریح آگئی ہے، جن کا پورا کتاب میں کہیں نام و نشان ہی نہیں۔ بہر حال ہم بالترتیب قرآن کا ذکر کر کے ہر ایک کے متعلق واضح کرتے جائیں گے کہ اس سے وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا، جو شیعی علماء حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

پہلا قرینہ: اس حدیث کی ابتداء میں یہ جملہ **الستُ اولى بكم من النفسكم واروہ** جو اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ آنے والے لفظ **مولیٰ** سے یہی اولیٰ والا معنی مراد ہے اور یہ جملہ آیت **قرآنی البنی اولى بالمؤمنین** من **النفسهم** سے متقرب ہے، جس کے متعلق مفسرین نے لکھا ہے، **الاف فی الاموم کلہا** تفسیر بیضاوی جلد دوم ص ۲۵۶ طبع مصر، لہذا جن معنوں میں نبی **مولیٰ** ہے، انہیں معنوں میں علی بھی **مولیٰ** ہیں۔ در سالہ تنزیہہ الامامیہ ص ۱۵۱ **الجواب بفضل اللہ الوہاب**، علامہ ڈھکو صاحب بھی غیب آدمی ہیں۔ دعویٰ یہ کیا تھا کہ حدیث **فیرر علی** مولا کا معنی ہے اولیٰ بالتصرف اور حاکم یعنی خلیفہ بلا فصل اور قرینہ بیان کرتے وقت یہ کہہ کر اپنے فرض یعنی مشترک لفظ **مولیٰ** کے تین مہجوز معانی میں سے اس کا ایک معنی کی تعیین سے سبکدوش ہو گئے کہ **مولیٰ** کا یہاں وہی معنی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں **مولیٰ** کا معنی ہے مگر اس میں تو اختلاف ہی نہیں ہے کہ دونوں جگہ متناسب معنی مراد ہونا چاہیے۔ ہر دو جگہ محبوب والا معنی ہو گا یا محبت والا یا ناصر و مددگار والا یا اولیٰ بالتصرف والا۔ لہذا یہاں ڈھکو صاحب کو یہ ثابت کرنا چاہیے تھا کہ **البنی اولى بالمؤمنین من النفسهم** میں اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل والا معنی ہی مراد ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی معنی مراد نہیں ہو سکتا۔ جب یہ

نا بت نہ کیا اور نہ کر سکتے ہیں تو اس قرینہ کا ذکر ہی ٹھیک نہ ہوا۔

آئیے اب آپ ہمارے پیش کردہ اولیٰ المؤمنین میں اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش فرمائیں کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے۔ النبیٰ اولیٰ بالمؤمنین کا صحیح معنی

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مؤمنین کے ساتھ ان کی مثالوں سے بھی زیادہ

قریب ہیں کا معنی یہ نہیں کہ اس جملہ میں آپ کی خلافت و امارت بیان کی جا رہی ہے بلکہ امت پر آپ کی شفقت اور محبت اور پیار بیان کیا جا رہا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ

نے النبیٰ اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم فرما کر ساتھ ہی فرمایا

وان و اولیٰ امہاتہم کہ میرے نبی کی مقدس بیویاں مؤمنین کی مائیں ہیں اور

بعض قرأت میں و هو اب لہم بھی وارد ہے، یعنی نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم

مؤمنین کے باپ ہیں اور یہ جملہ نہ بھی ہو تو ازواج رسول کا امہات المؤمنین ہونا ہی

آپ کے امت کے لیے باپ ہونے کو مستلزم ہے اور امت کے لیے مثل آبا بلکہ

اس سے بھی زیادہ مشفق اور مہربان ہونے کی دلیل ہے، اسی لیے آیت کریمہ

کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا میں تو ان کا

فلورثقہ ومن تری دینا اوضیاعا فعلی واری۔

تفسیر صافی جلد ثانی ص ۳۱۰ ومعانی الاخبار

یعنی جس نے اپنے ورثہ میں مال چھوڑا، تو اس کے وارثوں کے لیے ہے اور

جس نے قرض چھوڑا یا یتیم بچے اور بیوگان وغیرہ تو اس قرض کی ادائیگی مجھ پر

لازم ہے اور وہ یتیم بچے اور بیوگان وغیرہ بھی میرے ذمے۔

صاحب تفسیر صافی ملا حسن کا شافی نے اس کی تصریح کرتے ہوئے کہا،

فالمراد باللہ نبیہ للمؤمنین ما یلزم الوالد والزم المؤمنین من

الطاعة له ما یلزم الولد للوالد پس اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

پر وہ حقوق لازم کیے جو والد پر اولاد کے لیے لازم ہوتے ہیں اور مؤمنین پر وہ امور

لازم کیے جو اولاد پر والد کے حق میں لازم اور ضروری ہوتے ہیں۔

۲۔ تفسیر صافی میں ہی اس آیت کریمہ کا معنی بیان کرتے ہوئے کہا۔ یعنی،
 اولیٰ بہم فی الامور کلھا فانہ لایاہرہم ولا یوضیٰ منہم
 الا بما فیہ صلاحہم ونجاہم بخلاف النفس فلذلک اطلق
 فیجب ان یکون احب الیہم من انفسہم وامرہ انفسہم
 من امرہا وشفقتہم علیہ اتم من شفقتہم علیہا (ص ۱۰۲)
 یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام امور میں مومنین کے لیے اولیٰ ہیں، کیونکہ آپ ان کو اس امر
 کا حکم دیتے ہیں اور وہی ان سے پسند کرتے ہیں، جس میں ان کی بہتری ہو، کامیابی ہو بخلاف
 نفس کے کہ وہ ایسے امور کا حکم دیتا ہے اور ایسے امور کا ان سے سرزد ہونا پسند کرتا ہے
 جو ان کی تباہی و بربادی کے موجب ہوتے ہیں، اسی لیے مطلقاً الیقینی اولیٰ بالمومنین
 فرمایا اور کسی خاص امر کے ساتھ اس کو مخصوص اور مقید نہ ٹھہرایا، لہذا ضروری اور لازم
 ہے کہ آپ مومنین کو اپنے نفوس سے زیادہ محبوب ہوں اور آپ کا حکم ان پر ان کے
 نفوس کی نسبت زیادہ نافذ ہو اور ان کی شفقت نبی معظم رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر
 اس سے زیادہ اتم و اکمل ہو، جتنی کہ انہیں اپنے نفوس پر ہے۔

خامد لا ۱۰ اور یہی معنی اس آیت کریمہ کا تفسیر منہج الصادقین جلد ۲۸۳ اور
 تفسیر مجمع البیان جلد ۳۳۸ رابع ص ۳۳۸ پر مرقوم ہے۔

۳۔ تفسیر مجمع البیان میں ہے کہ سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک
 کے لیے روانہ ہونے لگے، تو بعض صحابہ نے جہنم کیا، نستأذن آباءنا و امہاتنا
 (صافی جلد ثانی ص ۳۳۸ و مجمع البیان، جلد رابع ص ۳۳۸)، یعنی ہم اپنے
 آباء اور امہات سے اجازت لے لیں۔“ (پھر آپ کے ساتھ اس غزوہ میں
 شریک ہوں گے، تو اس وقت یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
 مومنین کے لیے ان کے آباء و اجداد اور امہات و جدات کی نسبت اطاعت اور
 فرمانبرداری کے زپادہ حقدار ہیں۔

۴۔ تفسیر منہج الصادقین میں بھی معنی بیان کرنے کے بعد (جو ابتدا میں صافی منہج اور

مجمع کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، علامہ کاشانی نے ذکر کیا، در حدیث صحیح آمد است
 ما من مومن الا انا اولیٰ به فی الدنیا والاخرۃ و نیز روایت صحیحہ
 ثابت شدہ کہ مسلمان مگر دوسرے صحیح یک از شما مومن نباشد تا نباشم دوست تر با و از
 پدر و مادر و فرزند و ہمہ مردمان او۔ پس باید کہ فرمان او از فرمان ہا لازم تر باشد و
 لہذا صاحبین المعانی گفتہ کہ محبت ہا و سزاوارتر است از خود و غیر خود از اقارب
 اہل جانب و از مجاہد منقول است کہ ہر پیغمبر پیچہ پدر است خود است و لہذا ہمہ
 مومنان برادران یک دیکر اند چہ پیغمبر پدر ایشاں است و دین۔

ترجمہ: حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
 نہیں کوئی مومن مگر میں زیادہ محبوب ہوں اس کے لیے دنیا و آخرت میں۔ نیز
 صحیح روایت میں وارد ہے کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا، جب تک
 کہ میں اس کو باپ، ماں اور تمام خویش و اقربا سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔ پس
 چاہیے کہ آپ کا فرمان دوسرے تمام فرمانوں کی نسبت زیادہ لازم اور واجب القبول
 ہو۔ اسی لیے صاحبین المعانی نے کہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ
 محبت زیادہ لائق اور مناسب ہے اپنی ذات سے بھی اور اپنے غیر سے بھی اقربا ہوں
 یا اہل جانب اور بیگانے اور حضرت مجاہد سے منقول ہے کہ ہر پیغمبر اپنی امت کے لیے
 والد کی مانند ہوتا ہے اور اس لیے تمام مومنین آپس میں بھائی ہیں، کیونکہ پیغمبر اسلام
 از روئے دین و ایمان کے والد ہیں۔

الحاصل ان تفسیری اقوال سے واضح ہو گیا کہ قول باری تعالیٰ: اولیٰ الی
 بالمومنین من انفسہم میں سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے
 سے زیادہ محبوب ہونا اور اپنے خویش و اقربا اور آباء و امہات سے زیادہ محبوب اور
 شفقت کا زیادہ سزاوار اور حقدار ہونا مراد ہے، کیونکہ نفوس انسانی گمراہی اور گمراہی
 کی طرف لے جاتے ہیں، جبکہ آپ ہدایت فرماتے ہیں اور راہ اخلاص و نجات پر
 چلاتے ہیں اور خویش و اقربا صرف جسمانی تربیت اور دنیوی امداد و اعانت کر سکتے

ہیں، جبکہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم روحانی تربیت فرماتے ہیں اور حیاتِ ابدی عطا فرماتے ہیں اور دنیا میں شرِ شیطان و شرِ نفس سے بچانے میں معاون و مددگار رہتے ہیں اور آخرت میں عذابِ دوزخ اور قہرِ خداوندی سے بچاتے ہیں، لہذا آپ محبت و مودت کے سب سے زیادہ حقدار ہیں۔ الغرض خود شیعہ حضرات کی تفاسیر سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اس جگہ خلافت و حکومت والا معنی مراد نہیں ہے چہ جائیکہ خلافت بلا فصل والا معنی **مولا** انھوں، جبکہ حکومت و خلافت پہلے سے ثابت تھی اور یہ آیت غزوہ تبوک کے اس موقع پر نازل ہوئی، جبکہ بعض صحابہ نے آبا و اہل سے اجازت لینے کا اذن طلب کیا، لہذا اس کو سب سے اولیٰ بالتصرف والے معنی کا قرینہ بنانا ہی درست نہ ہوا، چہ جائیکہ اس کو قطعی قرینہ خلافت بلا فصل کا قرار دیا جائے، بلکہ یہ جملہ تو اس امر کی دلیل صریح اور بڑبان ہیں کہ یہاں مولا بمعنی محبوب ہے، جیسے کہ یہاں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے ذکر فرمایا۔

مولا بمعنی محبوب پر قرآن کا بیان

۱۔ پچھلی ساری عبارات سے یہ مدعا واضح ہو چکا ہے، دوبارہ ان پر غور فرمائیں تاکہ شیعہ اکابرین کی زبانی اس امر کی تصریح روزِ روشن کی طرح واضح ہو جائے کہ یہاں مولا بمعنی دوست ہے۔

۲۔ قول باری تعالیٰ: **واذواجہ امہاتھم** میں ہم بھی داخل ہیں یا نہیں؟ دوسری شق کا بطلان اظہر من الشمس ہے، لہذا پہلی شق ہی متعین ہوگئی کہ قیامت تک پیدا ہونے والی امت کے لیے ازواجِ نبوی امہات ہیں تو لامحالہ خیمہ کے مرجع سے بھی یعنی المؤمنین سے بھی قیامت تک پیدا ہونے والے مؤمنین مراد ہیں ورنہ سب کے لیے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم اولیٰ ہیں، تو اب کون عقلمند انسان ہے جو یہ کہے کہ اب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری طور پر حاکم ہیں اور ملک و سلطنت ظاہری پر آپ قابض و متصرف ہیں، لہذا روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تب بھی محبوب تھے اور اب بھی محبوب ہیں۔ اس وقت بھی سب پر آپ کو جان و مال اور خویش و اقربا سے عزیز سمجھنا فرض تھا اور اب بھی اسی طرح فرض ہے۔ ۳۔ وہ حدیث جس کو علامہ کاشانی نے ذکر بھی کیا اور اسے صحیح بھی کہا۔

ما من مومن الا وانا اولیٰ به فی الدنیا والآخرۃ میں یہی اولیٰ کا لفظ موجود ہے اور اس میں مومن نکرہ ہے جو کہ نفی کے تحت داخل ہے جو مفید عموم و استغراق ہے۔ نیز دنیا و آخرت کی تعمیم بھی مذکور ہے، جبکہ آخرت محل حکومت اور مقام امارت و سلطنت ہی نہیں ہے، لہذا آخرت میں آپ کے مومنین کے ساتھ اولیٰ ہونے کا معنی محبت و شفقت والا ہی متعین ہے تو دنیا کے لحاظ سے بھی یہی معنی متعین ہو گیا، لہذا آیت اور حدیث صحیح کی شہادت سے واضح ہو گیا کہ یہاں محبوبیت والا معنی مراد ہے نہ کہ اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل والا گویا جس جملہ کو ڈھکوسل صاحب نے خلافت بلا فصل کا قطعی قرینہ بنایا تھا، وہ درحقیقت محبوبیت اور اجیت کا قرینہ ہے اور اس کی مذہبی کتب کی رُو سے یہ حقیقت آشکارا ہو چکی۔

قنبیہ، اولیٰ کو اسم تفضیل کا صیغہ اگر وہی ہے معنی قرب و استحقاق سے بنائیں تو پھر بھی قول باری تعالیٰ، النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم اور قول نبوی، الست اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم ہماری دلیل ہے اور ہمارے مدعا کا واضح قرینہ اور اگر اس کو ولایت یعنی محبت سے مشتق قرار دیں تو بھی ہمارا مدعا ثابت ہے اور یہ دوسرا معنی پہلے کی نسبت اولیٰ ہے، کیونکہ اس صورت میں جہت اولویت کو خارج سے اعتبار نہیں کرنا پڑتا، جبکہ پہلی صورت میں جہت اولویت کو موزون ماننا پڑتا ہے یعنی احق بالتصرف جبکہ حذف خلاف اصل ہے، لہذا اب صریح مفہوم اس آیت و حدیث کا یہی ہو گیا کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے لیے اپنے نفوس سے زیادہ محبوب تر ہیں۔

۴۔ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں الست اولی بالمومنین من انفسہم کے بعد وارد ہے، فمن کنت مولاً یعنی جس کا میں مولیٰ تھا، خواہ اس کائنات کے لفظ کو استمرار کے معنی میں ہی لے لو، تب بھی ماضی کو شامل ہونا اس کا لازمی اور ضروری ہے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ نبی اکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت سے قبل مومنین کے لیے مولیٰ تھے یا نہیں؟ اگر تھے اور یقیناً مولائے مومنین تھے تو نہ اس وقت مولیٰ کا معنی حکمران اور صاحبِ سلطنت تھا، نہ اب یہ معنی مراد ہوا۔ اس وقت بھی آپ مولیٰ بمعنی محبوب تھے اور اب بھی اسی معنی سے مولیٰ ہوں گے، کیونکہ حکومت و سلطنت تو بہت بعد میں قائم ہوئی۔

۵۔ اس حدیث و روایت میں مولیٰ اور اولیٰ کی مومنین کے ساتھ تخصیص فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید میں بھی اور حدیث شریف میں بھی حالانکہ آپ کی حکومت و سلطنت تو مومنین کے ساتھ خاص نہیں تھی، بلکہ یہود و خیبر اور نصاریٰ کے بھران بھی آپ کے زیرِ فرمان تھے اور آپ کی رعایا تھے، لہذا اگر یہاں حکومت و سلطنت والا معنی مراد ہوتا تو مومنین کے ساتھ تخصیص کا کوئی مطلب نہیں ہو سکتا تھا، جس سے واضح ہو گیا کہ یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مطابق ہے، ذالک بان اللہ مولیٰ الذین امنوا واتوا لکافرین لا مولیٰ لہم۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا مولیٰ ہے اور کافرین کے لیے کوئی مولیٰ نہیں ہے۔ حالانکہ کفار و مشرکین اللہ تعالیٰ کی حکومت سے باہر تو نہیں پہنچتے، اگر انہیں نصیب نہیں تو اللہ تعالیٰ کی محبت اور مومنین کو جو چیز کفار سے متنازع کرتی ہے، وہ بھی صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور ان کی اللہ تعالیٰ سے محبت اور اللہ تعالیٰ کی ان سے محبت ہی ہے، کما قال اللہ تعالیٰ، اللہ ولی الذین امنوا۔ وقال اللہ تعالیٰ، الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا هم یخزنون۔ وقال اللہ تعالیٰ، یحبہم و یحبونہ۔ لہذا اس تخصیص سے بھی واضح

ہو گیا کہ یہاں مخصوص محبت اور خصوصی تعلق کا بیان ہے اور حکومت و سلطنت کا بیان مقصود نہیں ہے۔ تو جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اولیٰ بالمومنین اور مولیٰ المومنین ہونے کا مطلب واضح ہو گیا تو۔

چرا در معنی من کنت مولائے میری ہر سو علی مولا یاں معنی کہ پیغمبر بود مولیٰ کا مطلب واضح ہو گیا۔

شیعی علماء کا منشاء غلط

۱۔ شیعی علماء کو مغالطہ یہاں سے لگتا ہے کہ فی الواقع چونکہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حاکم اور صاحب سلطنت اور تنفیذ احکام پر مقتدر تھے، لہذا اس لفظ سے بھی یہی معنی مراد ہوگا، حالانکہ واقع میں ایک صفت اور معنی سے موصوف ہونا الگ چیز ہے اور اطلاق کیے گئے لفظ سے بھی اس معنی کا مراد ہونا الگ چیز ہے مثلاً اللہ تعالیٰ ہر ہر ذرۃ کائنات کا مالک بھی ہے اور حاکم و متصرف بھی اور ملک مساوات و الارض کا بلا شریک غیرے حاکم، اور عرش و تخت کائنات پر مقتدر اور غالب لیکن باوجود اس کے اس نے اپنے آپ کو صلی الذین امنوا کہا ہے اور کافروں سے مطلقاً اپنے مولیٰ ہونے کی نفی کر دی ہے اور فرمایا: **وَالْكَافِرِينَ لَا يُولِيهِمْ**۔ لہذا واضح ہو گیا کہ واقعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصف حکومت سے موصوف ہونا اس امر کو مستلزم نہیں ہے کہ جب بھی آپ پر لفظ مولیٰ اطلاق کیا جائے، تو اس سے بھی وہی حکومت و سلطنت والا معنی مراد ہو بلکہ موقع و محل کے مطابق دوسرے معانی بھی مراد لیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ ڈکٹو صاحب نے قاضی بیضاوی کی عبارت فی الامور کلھا

و یکجہ کر سمجھ لیا کہ جب تمام امور میں آپ سب مومنین سے اولیٰ ہیں اور ان امور میں حکومت و سلطنت بھی داخل ہے، لہذا آپ کا اولیٰ بالمحکومت والا مارت ہونا ثابت ہو گیا، حالانکہ یہ کوتاہ اندیشی اور تغافل شعاری کا بدترین نمونہ ہے، کیونکہ

تفسیر صافی اور منہج الصادقین میں بھی بالکل وہی کلمات ذکر کیے گئے ہیں یعنی اولاً
 ہم فی الامور کلہا (صافی ج ۲ ص ۱۲۱) اور منہج الصادقین میں ہے،
 یعنی دہمہ کارہائے دین و دنیا (ص ۱۲۱) لیکن باوجود اس کے معنی محبوبیت والا مراد
 ہے، کیونکہ آپ کا نفوس کی نسبت دین و دنیا کے امور میں اولی ہونا مراد ہے، کیونکہ
 نفس انسانی ہلاکت اور بغاوت کی طرف لے جاتا ہے جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم
 خیر اور بھلائی، نجات و فلاح کی طرف بلاتے ہیں، لہذا نفوس انسانی انکے دشمن اور
 مبغوض ٹھہرے کما فی الحدیث: اعدای اعداءک نفسک التي بین
 جنبدیک یعنی سب دشمنوں سے تیرا بڑا دشمن تیرا نفس ہے پھر تیسرے دونوں پہلوؤں کے
 درمیان ہے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجب فلاح و فلاح ہونے کی وجہ سے
 محبوب تر ہو گئے۔ لہذا اس تفسیری عبارت کو اپنی دلیل بنانے میں بہت بڑی جہالت
 کا مظاہرہ ہے یا تنجاہل کا۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

دوسرا اقرینہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف پر

(تلاذیمہ الامامیہ ص ۱۵۱)

اس حدیث اور اس اہتمام سے واضح ہے کہ جناب امیر کی وہ خصوصیت بیان
 ہو رہی ہے، جس میں اور کوئی صحابی رسول آپ کا شریک نہیں اور وہ نہیں مگر یہی
 اولیٰ بالتصرف۔ ارشادِ بانی ہے، المؤمنون بعضهم اولیاء بعض
 ”یعنی بعض مومن دوسرے بعض مومنین کے محب ہیں۔“ یہی معانی اگر یہاں بھی
 مراد ہوتے تو اس قدر اہتمام و انتظام کی کیا ضرورت تھی؟ جو کہ تحصیل حاصل کو
 مستلزم ہے اور وہ محال ہے۔ علی الخصوص جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو
 عین ایمان اور آپ کے ساتھ بعض کو نفاق اور کفر قرار دیا جا چکا تھا، لہذا یہ صرف
 اور صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عملی خلافت کا اعلان تھا، جس کے بغیر کاروبار
 رسالت کا رت ہو رہا تھا۔

الْجَوَابُ وَهُوَ الْمَلِكُ الْمُتَّصِلُ بِالْمُلْكِ

غیر ختم میں صحابہ کرام کو جمع فرمانا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمانا، من کنت مولاً فعلی مولاً۔ ڈھکو صاحب کے نزدیک قطعی قرینہ بن گیا کہ یہاں صرف اور صرف اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل والا معنی ہی مراد ہے۔ محبت والا معنی تو تمام مومنین میں باہم پایا ہی جاتا ہے۔ اگر وہی بیان کرنا مقصود ہوتا، تو اس میں تکرار محض ہوتا، لیکن اہل قرینہ اور اس کی ولایت میں چند وجوہ سے سقم اور ضعف ہے۔ اس لیے ڈھکو صاحب اور شیعی علماء کے لیے مفید دعا نہیں ہو سکتا۔

۱۔ از روئے ایمان کے باہم محبت اور الفت کا پایا جانا ضروری ہے، لیکن محبت کے درجات مختلف ہوتے ہیں۔ عمومی وجہ محبت کی پائی جائے، تو اس کے بعد خصوصی سے محبت کا وجوب و لزوم بیان کرنا تکرارِ بے فائدہ کا موجب نہیں ہے۔ عمومی محبت میں خود حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شامل ہیں، کیونکہ آپ مومن بھی ہیں اور مومن بھی، لیکن بحیثیتِ نبی و رسول ہونے کے اور سب کا بہرہ دار اور خیر خواہ ہونے کے اور دنیا و آخرت میں منبع النعم و احسان ہونے کے سب مومنین پر آپ کے ساتھ خصوصی محبت فرض ہے۔ اسی طرح حضرت، علی رضی اللہ عنہ کی خدماتِ اسلام اور جہاد کفارینہ روحانی فیوض و برکات کا منبع اور سرچشمہ ہونے کے لحاظ سے آپ کے ساتھ بھی مومنین پر خصوصی محبت ضروری اور لازم ہے اور انہیں وجوہات و اسباب محبت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حضرات کے متعلق خصوصی اہتمام کے ساتھ یہ حکم بیان فرمایا۔ چنانچہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے متعلق فرمایا، فمن احبهم فاجبی احبهم ومن ابغضهم فابغضی ابغضہم۔ جس نے ان کی محبت کی، پس میری محبت کی وجہ سے محبت کی اور جس نے بغض رکھا پس اُس نے میرے بغض کی وجہ سے ان کے ساتھ بغض رکھا۔ اہل بیت کرام کے متعلق ہاموم بھی اور حضراتِ حسنین کریمین رضی اللہ عنہم کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا۔

اللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَحِبُّهُمَا فَاجِبْهُمَا وَاحِبٌ مِنْ یَحِبُّهُمَا۔

اے اللہ! میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں، لہذا تو بھی ان کو اپنا محبوب بنا اور ان سے محبت رکھنے والوں کو بھی اپنا محبوب بنا۔

الغرض بالعموم محبت کا وجوب و لزوم بیان کرتے ہوئے بعض بالخصوص محبت کے وجوب و لزوم کا بیان کرنا بے قلعہ و تکرار اور تحصیل حاصل کے ضمن میں نہیں آتا، جبکہ اس اہتمام کے ساتھ قبل ازیں کسی کے حق میں محبت کے وجوب و لزوم کو بیان نہیں کیا گیا تھا، لہذا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت ظاہر ہو رہی ہے۔ واضح ہو گئی کہ آپ کی محبت کو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مماثل قرار دیا گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھیے سب بڑوں کی عزت کرو اور بالخصوص والدین کی عزت کرو تو کون عقل و دانش کا دشمن اس کو بے فائدہ تکرار تصور کرے گا کہ والدین بھی بڑے ہوتے ہیں اور سب بڑوں کی عزت و توقیر کے حکم میں ان کے متعلق بھی حکم پایا گیا لہذا یہ تکرار محض ہے۔

۲۔ نیز اس اہتمام و انتظام کی خصوصی وجوہات بھی تھیں، جن میں ایک ایک وجہ تو ہے آنے والے حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے آپ کی عظمت کا اظہار کیونکہ آپ کے علم میں تھا کہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دشمنی رکھیں گے اور آپ کو کافر و مشرک کہیں گے نعوذ باللہ! جیسے خوارج، لہذا آپ کی عظمت شان بیان فرمائی اور آپ کے ساتھ محبت و مروت کے وجوب و لزوم کو واضح فرمایا تاکہ ہمدردی اور خیر خواہی کا حق ادا ہو جائے اور کسی کو کوئی غلط فہمی اس بارے میں نہ رہے جس طرح کہ صحابہ کرام علیہم الرضوان کے متعلق اس گروہ کا علم ہونے کی وجہ سے جو کہ ان پر سب و شتم کریں گے۔ فرمایا، اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ یَسُبُّوْنَ اَصْحَابِیْ فَقُولُوا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰی شُرَکْکُمْ جَبَّ اَنْ لَوْ کُنَّ مِنْ طَرَفِیْ مِیْرَے صحابہ کو گالیاں دیتے ہیں، تو کہو لعنت ہو تمہارے شرو و فساد پر۔ اور فرمایا، اللّٰهُ اللّٰهُ فِیْ اَصْحَابِیْ لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَوًّیًّا مِنْ بَعْدِیْ

میرے صحابہ کے معاملے میں خدا سے ڈرنا، خدا سے ڈرنا۔ ان کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنانا، لیکن بالعموم صحابہ کرام کے ساتھ اس قدر بغض و عناد کرنے والے نہ تھے، جتنا قدر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ بغض و عناد رکھنے والے تھے جو کہ صاحب قوت و شوکت بھی تھے اور مقابلہ میں آکر لڑنے اور جنگ کرنے والے اور آپ کے روبرو آپ پر کفر و شرک کے فتوے لگانے والے اسی لیے آپ کی خاطر زیادہ اہتمام فرمایا۔ بخلاف خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم کے کہ ہر دور میں ان کے ملاح اور ان کی عظمت کے معترف ہی غالب و کامران اور ہر اقتدار کے خواہ بنو امیہ کا دودھ پلایا بنو عباس کا یا بعد والے ادوار یا سولائے چند جزوی علاقوں اور اقوام کے اور وہ بھی چھ سات صدیوں کے بعد۔ لہذا یہ امر اس اہتمام و انتظام کا داعی اور موجب تھا۔

دوسری وجہ اس اہتمام و انتظام کی یہ تھی کہ شرور و انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کین میں امیر لشکر بنا کر بھیجا تھا اور کین سے ہی آپ وافر مقدار میں قربانیاں لے کر مکہ مکرمہ میں حج کے لیے پہنچے اور آپ کے بعض رفقاء نے کار کو آپ کے خلاف شکایات پیدا ہوئیں اور انہوں نے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آپ کی شکایت کی، تو اس وقت آپ نے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے متعلق بڑے اہتمام کے ساتھ محبت و مودت کے لزوم کو بیان فرمایا اور ان کو **مذیٰ لہم** کا شیع بنانے سے منع کیا۔ **عن یزید بن ابی بکر قال قال غزوہ مع علی الیمن فرعیت منه جفوة فلما قدمت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذکر علیاً کرم اللہ وجہہ فرعیت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد قفیر فقال یا یزیدة الست اولی بالمومنین من انفسهم قلت بلی یا رسول اللہ قال فکنت مولاة فعلی مولاة۔ رواہ احمد و رواہ النسائی فاصناد قوی جید، رجالہ کلہم ثقات۔ روح المعانی جلد ۳ ص ۳۸۸**

حضرت بردہ اُلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی معیت میں یمن میں جہاد کیا، تو میں نے ان سے جفاکاری اور شدت و سختی کا مشاہدہ کیا۔ جب بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوا، تو آپ کی خدمت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا، تو میں نے دیکھا کہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ اقدس غصہ سے سُرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا: اے بریدہ! کیا میں مومنین سے ان کے نفوس سے بھی زیادہ محبوب نہیں ہوں؟ تو میں نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! تو آپ نے فرمایا: من کنت مولاً فعلی مولاً۔

فیز محمد بن اسحاق نے یحییٰ بن عبد اللہ کے واسطہ سے یزید بن طلحہ سے نقل کیا ہے: اقبل علی من الیمن لیلقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بمکہ ففعل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واستخلف علی جند الذین معہ من اصحابہ فعمد ذالک الرجل فکسا کل رجل حلة من البز الذی کان مع علی کر ما للہ وجهہ فلما دنا جیشہ خرج لیلقاہم فاذا علیہم اللحل قال ویلک ما ہذا قال کسوت القوم لیتجملوا بہ اذا قد موافی الناس قال ویلک انتزع قبل ان تنتمی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فانتزع اللحل من الناس فردھا فی البز واطھر الجیش شکواہ لما صنع بهم۔ (روح المعانی ج ۶ ص ۱۷۱)

حضرت علی رضی اللہ عنہ یمن سے مکہ شریف کی طرف آئے تاکہ حضور نبی اکرم کے ساتھ ملاقات کریں۔ آپ جلدی مکہ شریف کی طرف روانہ ہوئے اور لشکر میں اپنے ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کو خلیفہ اور نائب بنایا، تو اس خلیفہ نے اس ہزار سے جو آپ کے پاس تھے، ایک ایک بوڑھا ہر سپاہی اور لشکری کو دے دیا۔ جب آپ واپس لشکر کے پاس پہنچے، تو وہ لشکری آپ کی ملاقات کے لیے نکلتے کیا دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نیا جوڑا پہنے ہوئے ہے، تو آپ نے اپنے نائب کو بلایا اور فرمایا:

تجھ پر ہلاکت ہو، یہ کیا ہے؟ اُس نے کہا: میں نے انہیں یہ پوشاکیں پہنائی ہیں تاکہ جب لوگوں میں آئیں، تو جمال و زینت اور زیبائش و آرائش کے ساتھ آئیں، تو آپ نے فرمایا: ان سے واپس لے لو، قبل اس کے کہ ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پہنچیں، چنانچہ اُس نے وہ جوڑے واپس لے لیے اور اس بیزاری میں شامل کر دیے جو حضرت امیر علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ لشکر نے بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں آپ کے اس فعل کی وجہ سے آپ کی شکایت کی۔

یہی مفصل روایت شیعہ مفسر علامہ فتح اللہ کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین میں ذکر کی ہے، جس کا آغاز یوں ہے: چوں امیر المومنین بنزدیک مکہ رسید خلیفہ بنو قریظہ بنی نضیر فرمود زنا، ایشاں اظہار شکایت امیر کردند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمود کہ علی بن ابی طالب ایں امر را برویہ صواب کرد ایشاں منزع شدہ بر شکایت ادا صرار کردند۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بر منبر آمد و خطبہ فرمود و گفت:

ایہا الناس اسفعوا لسننکم عن علی بن ابی طالب فانہ خشن فی ذات اللہ و غیر مد اھن فی دینہ۔ چوں خشم و مبالغہ رسول را دیدند زبان کوتاہ کردند۔ تفسیر منہج الصادقین جلد سوم ص ۲۷۷

ترجمہ: یعنی جب حضرت علی رضی اللہ عنہ بمع لشکر مکہ شریف کے قریب پہنچے تو آپ نے قوم پر ایک شخص کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا اور خود مکہ شریف میں بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے، اور جب واپس ہوئے اور لشکر کو نئے جوڑے زیب تن کیے دیکھا اور اپنے نائب کو اتروانے کا حکم دیا اور اُس نے واپس لے لیے۔ تو ان لشکریوں نے آپ کی شکایت بارگاہ رسالت مآب علیہ التہیۃ والثناء میں کی۔ آپ نے فرمایا: علی بن ابی طالب نے صحیح اقدام کیا اور اُن کا یہ فعل بالکل درست اور صواب ہے، مگر وہ باز نہ آتے اور اسی شکایت پر اصرار کیا، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما ہوئے اور خطبہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

اے لوگو! اپنی زبانیں علی بن ابی طالب کی شکایت سے روک لو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں سخت ہیں اور اس کے دین میں مداخلت سے کام لیتے ہوئے مخلوق کی رو رعایت اور ان کے پاس و لحاظ کو احکام خداوندی پر مقدم ٹھہرانے والے نہیں ہیں۔ جب ان لشکریوں نے رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی اور غصہ کا مشاہدہ کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حمایت اور آپ کی طرف سے دفاع کی سعی اور مبالغہ کو دیکھا، تو اپنی زبانیں بند کر لیں اور اس شکوہ و شکایت سے باز آ گئے۔

وجہ اہتمام، شیعہ و سنی ہر دو کے نزدیک ثابت و متحقق اور ہر دو کی معتبر اور مستند کتب میں مروی اور منقول اس روایت سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں محبت و مودت کے وجوب و لزوم کے اس عظیم اہتمام کی وجہ اب واضح ہو گئی، کیونکہ آپ کے زیر کمان لشکریوں کو آپ کے خلاف شکایت پیدا ہو گئی تھی اور حجاج کرام میں پھیل چکی تھی اور مشہور و معروف ہو چکی تھی اس لیے اس کا ازالہ از حد ضروری تھا اور جب تک اس قسم کا اہتمام نہ ہوتا، نہ سب لوگ آپ کی محبت کے وجوب و لزوم اور اس کی اہمیت و ضرورت کو سمجھتے اور نہ ہی ان کے قلوب اذہان سے یہ وسوس اور خدشات دور ہو سکتے تھے، اس لیے اس قدر اہتمام و انتظام بھی فرمایا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنی جانوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ عزیز اور پیارا سمجھنے کی تلقین فرمائی اور انہیں آیات سے آغاز خطاب میں اپنے متعلق اس استفسار کی حکمت بھی واضح ہو گئی۔

الست اولیٰ بالمومنین من انفسہم۔ کیا میں مومنین کے لیکن کے ارواح و نفوس سے بھی زیادہ محبوب نہیں ہوں۔ یعنی جب میں تمہارے لیے مثل والد کے شفیع ہوں اور تمہارے ساتھ اولاد کی طرح محبت رکھنے والا ہوں اور تمہارے نفسانی تقاضوں کے عکس سرا سر تمہاری فلاح و نجات اور اچھائی اور بھلائی میں کوشاں ہوں، تو جو کچھ اب فرما رہا ہوں، یہ بھی تمہاری بہتری

اور خیر خواہی والی صورت ہے، لہذا میرے اس حکم کو عین فلاح و نجات اور سرخروئی اور
آبرو مندی کا موجب سمجھتے ہوئے اس کی بھی پابندی کرو اور یہی وجہ ہے کہ آخر میں فرمایا
اللہم وال من والاہ و عاد من عاداہ۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی
رکھے اس کو تو بھی اپنا دوست بنا اور جو علی سے دشمنی رکھے، تو بھی اس کو اپنا دشمن بنا
تاکہ محبت مرتضیٰ کا موجب فلاح ہو نا واضح ہو جائے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی عداوت
کا موجب خسران ہو نا اور اللہ تعالیٰ کی عداوت کا موجب ہونا معلوم ہو جائے تو اب اس حدیث کے
اول و آخر اور سیاق و سباق نے واضح کر دیا کہ من کنت مولاً فعلی مولاً
میں حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ محبت و مودت اور الفت و عقیدت کی تاکید
اکید ہے اور اس سے خلافت بلا فصل کا اثبات سراسر بے موقعہ اور بے محل ہے۔
اور اس جملے یعنی مولیٰ مولاً کو ماقبل اور مابعد سے بالکل بے تعلق اور بے جوڑ
ثابت کرنے کی، ناکام کوشش کی ہے۔

۳۔ نیز عقلی اور درایتی طور پر بھی اس اہتمام و انتظام کی وجہ واضح ہے
کیونکہ حروب قتال میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قریش کے بہت سے
آدمی قتل ہو گئے تھے بہ نسبت دوسرے صحابہ کرام علیہم الرضوان کے کہ ان کے ہاتھوں
اس قدر افراد قتل نہیں ہوئے تھے، تو اس امر کا امکان تھا کہ مقتولین کے رشتہ دار و
اقربا اور ان کی اولاد اپنے دلوں میں آپ کے متعلق کسی طرح کی کدورت اور نفرت
رکھیں، لہذا آپ نے اعلان فرمایا اور بڑے اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا کہ علی مرتضیٰ
میرے قریبی ہیں اور بھائی اور انہوں نے جو کچھ کیا، وہ میرے حکم سے کیا اور میں نے
جو کچھ کیا اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا۔ لہذا جس طرح تم پر میرے ساتھ محبت لازم ہے
اور بغض و کدورت حرام ہے۔ اسی طرح علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے بھی محبت و
الفت تم پر لازم ہے اور ان کے ساتھ بغض و عناد رکھنا ممنوع اور چونکہ زمانہ رسول
صلی اللہ علیہ وسلم میں جنگ و جدال اور حرب و قتال کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا

اس لیے یہ آخری وصیت اور تاکید اکیہ فرمائی۔

تکرار اور تحصیل حاصل کے لزوم سے مغالطہ دینے کی سعی مذموم!

علامہ ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث غدیر میں علی مولا سے محبوبیت والا معنی مراد ہوتا ہے تکرار محض ہونے کی وجہ سے بے فائدہ اعلان ہوگا اور تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال اور ناممکن، کیونکہ اس اعلان سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بارگاہ آپ کی محبت کے وجوب اور لزوم کو بیان کر دیا تھا۔

اقول: علامہ ڈھکو صاحب قطعی قرآن بیان کرنے لگے تھے، جن کی وجہ سے علی مولا کا اولیٰ بالتصرف، حاکم اور خلیفہ بلا فصل کے علاوہ دوسرا کوئی معنی ممکن ہی نہ ہو، لیکن ذکر ایسے قرآن کر رہے ہیں جو اس معنی کی تزیح اور غلبہ ظن کا فائدہ بھی نہیں دیتے۔ شاید انہوں نے صرف قطعی کالفاظ سن رکھا ہے، اور اس کے معنی و مفہوم پر غور کرنے کا موقع ہی نصیب نہیں ہوا حقیقت یہ ہے کہ ایک اہم حکم تکرار کے ساتھ ذکر کرنا نہ بے فائدہ ہوتا ہے اور نہ وہ تحصیل حاصل جو کہ محال ہے۔ توجہ کے لیے چند امور سپردِ قسط اس کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں سیوں جگہ اَقِمُْوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فرمایا ہے۔ اہم سابقہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کا متعدد مواقع پر ایک ہی قصہ اور واقعہ مختلف اسالیب اور متنوع انداز میں دہرایا ہے اور سورہ رحمن میں کتنی دفعہ قَبَآئِیْ الْاَعْرَاسِ بِکُمْ اَتَّکَذِّبُ ہِیَہ کا تکرار ہے تو بقول علامہ ڈھکو صاحب قرآن مجید ہی تکرار بے فائدہ اور تحصیل حاصل محال کا مجموعہ بن جاتے گا۔

۲۔ حدیث قرطاس پر بحث کرتے ہوئے ڈھکو صاحب نے کہا کہ حضور نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم بار بار اور مختلف اسالیب و عناوین سے جس خلافت مرفوضی کا ذکر کرتے رہے تھے۔ اب بھی وہی خلافت لکھنی تھی اور کیا لکھنا تھا، یعنی وہاں خلافت کا بار بار ذکر اور تکرار اس آخری موقع پر بھی اسی کے مراد و مقصود ہونے کی دلیل ہو گیا، لیکن محبت کا وجوب و لزوم بار بار بیان ہو چکا، تو اب اس کا ذکر بے فائدہ تکرار بھی ہو گیا اور تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے محال بھی ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حُسن کرشمہ ساز کرے علامہ صاحب سے کون پوچھے کہ وہ تکرار کیوں بے فائدہ نہ ہوا اور تحصیل حاصل کا موجب ہونے کی وجہ سے محال کیوں نہ ہوا اور یہ تکرار کیوں بے فائدہ اور مستلزم محال ہو گیا اور کہیں وہ اپنی حالت ہی تو اس شعر میں بیان نہیں کرتے رہے۔
کبھی گرتا ہوں سا غریب کبھی گرتا ہوں مینا پر
میری بے ہوشیوں سے ہوش ساتی کے بھرتے ہیں

۲۔ علامہ ڈھکوصاحب کے بیان کردہ اس قرینہ نے ان کی دلیل کو ذنی کرنے کی بجائے ان کے بہت سے دلائل کا صفا یا کر دیا، بلکہ خود اسی دلیل کو ہی ختم کر کے رکھ دیا۔ مثلاً غزوہ تبوک کے موقع پر ہزاروں افراد کی موجودگی میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا، انت متی بمنزلة هارون من موسى۔ کیا اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اصل کا اعلان ہوا تھا یا نہیں؟ دوسری صورت میں اس کو دلائل خلافت کے طور پر پیش کرنا لغو ہو گیا اور پہلی صورت میں جب ہزاروں افراد اور مہاجرین و انصار کے سامنے آپ کی خلافت و امامت کا اعلان ہو چکا تھا، تو اب مَنْ كُنْتُ مَوْلَا فَعَلٰی مَوْلَا کہہ کر اس کا اعلان کرنا بے فائدہ تکرار بن گیا اور تحصیل حاصل جو کہ محال ہے۔

نیز قول باری تعالیٰ: اِنَّمَا وَلِيكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
الَّذِيْنَ يَّقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُوْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ سٰكِحُوْنَ

اہل تشیع کے نزدیک حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی امامت و خلافت بلا فصل کی نص قطعی ہے، کیونکہ ماتِ رکوع میں صرف آپ نے ہی زکوٰۃ اور صدقہ دیا تھا اور اس آیت مبارکہ کی بار بار تلاوت بھی ہوتی رہی اور شیخ ماکرم علی اللہ علیہ وسلم نے اپنا فریضہ رسالت ادا کرتے ہوئے صحابہ کرام کو اس آیت کے معنی و مفہوم کی تعلیم بھی دی ہوگی۔ کما قال اللہ تعالیٰ: **ويعلمهم الكتاب والحكمة** اور وہ آیت مبارکہ غدیر خم کے اس واقعہ سے بہت پہلے نازل ہو چکی تھی، لہذا اب غدیر خم میں امامت مرتضیٰ اور ان کی خلافت بلا فصل کا اعلان تکرار محض اور تحصیل حاصل ہونے کی وجہ سے ممکن ہی نہ رہا۔

الغرض ڈھکڑ صاحب کے بیان کردہ اس قرینہ سے انہیں اپنے کئی دلائل سے ہاتھ دھونا پڑے گا اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے، لہذا اس کو قرینہ کہنا ہی غلط ہے، چہ جائیکہ قطعی قرینہ کہا جائے۔

کیا اعلانِ خلافت کے بغیر کائناتِ اکارت ہو سکتا تھا؟

قول بلی تعالیٰ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک کی تحقیق

ڈھکڑ صاحب فرماتے ہیں کہ غدیر خم کے موقع پر صرف اور صرف اعلانِ خلافت کرانا تھا، کیونکہ اس کے بغیر کار و بار رسالت اکارت ہو رہا تھا اور اس جملہ میں جناب کا اشارہ اس آیت کریمہ کی طرف ہے: **یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس ان اللہ لا یمدی القوم الکافرین** اور قبل ازیں اس کی تصریح بھی ان کی طرف سے گزر چکی ہے۔ یعنی اے رسولِ معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جو کچھ آپ کی طرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اس کو لوگوں تک پہنچاؤ۔ پس اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو آپ نے فریضہ رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ آپ کو ان لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ بے شک اللہ تعالیٰ قوم کفار کو ہدایت نہیں دیتا۔

اقول: ۱۔ اس طرز استدلال اور قرینہ میں بھی وہی سابقہ خرابی اور فساد لازم آئے گا اور یہ سودا بہنگا پڑے گا، کیونکہ جب آیات امامت کی تبلیغ ہو چکی تھی اور فرمان رسالت انت منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ بھی جاری ہو چکا تھا وغیرہ وغیرہ، تو اب یہ اعلان درست ہی نہیں تھا اور تکرار محض کی وجہ سے اس میں کھٹیل حاصل تھی اور وہ علماء شیعہ کے نزدیک محال ہے، لہذا اب اس اعلان پر کاروبار رسالت کیونکر موقوف ہو سکتا تھا اور اس کے بغیر وہ اکارت کیوں ہو رہا تھا؟

۲۔ اس آیت کریمہ میں خلافت کی تصریح موجود نہیں ہے اور جب اس اعلان کے بغیر کاروبار رسالت اکارت جاری رہا تھا، تو معلوم ہوا کبھی قرآن و سنت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق خلافت مولایت کا اعلان اس سے قبل نہیں کیا گیا تھا۔ لہذا وہ سارے دلائل جو اس واقعہ سے قبل نازل شدہ آیات سے پیش کیے جاتے ہیں یا سیدہ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس واقعہ غدیر سے قبل صادر ہونے والی احادیث سے پیش کیے جاتے ہیں، وہ لغو اور باطل ہو گئے کیونکہ اگر اعلان خلافت پہلے ہو چکا ہوتا اور وہ بھی تکرار کے ساتھ تو اب اس پر کاروبار رسالت کے موقوف ہونے کا کوئی معنی نہیں تھا اور بقول علماء شیعہ کار رسالت تو اسی اعلان پر موقوف تھا، تو یقیناً پہلے سے کوئی اعلان خلافت نہیں کیا گیا ہوگا، لہذا وہ سارے دلائل غلط ہو کر رہ گئے اور ان کا پیش کرنا لغو اور باطل ٹھہرا۔

۳۔ کیا خلافت امیر کا صرف اعلان کر دینا زیادہ اہم تھا؟ یا عملی طور پر ان کو خلافت دینا اور اقتدار ان کے حوالے کرنا اور ظاہر ہے کہ محض اعلان کی بجائے عملی طور پر اقتدار ان کے حوالے کرنا اور خلافت انہیں سونپنا زیادہ مؤثر اور مؤکد امر تھا اور اس سے اس راہ کی ساری مشکلات دور ہو سکتی تھیں، لیکن نہ نبی مکرم رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اقتدار سونپا اور نہ اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا اور خلافت و امامت کبریٰ کی مسند حوالے کرنا تو بہت اہم معاملہ تھا۔ یہاں تو

مسجد نبوی کا مصلیٰ بھی آپ کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ الغرض جو چیز اسم اور مفید تھی اور جس میں سب مشکلات کا حل تھا، وہ دیتا کوئی نہیں اور جو اعلان بقول علماء شیعہ کیا گیا، اس کا حضرت امیر المومنین کرم اللہ وجہہ الکریم کو کوئی فائدہ نہ پہنچا کیونکہ سب صحابہ کرام نے متفقہ طور پر وہ خلافت اور اقتدار حضرت صدیق اور فاروق و عثمان رضی اللہ عنہم کے یکے بعد دیگرے حوالے کر دیا، تو اس اعلان پر کارِ رسالت کو موقوف کرنے میں آخر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کیا آیا؟

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بقول شیعہ من کنت مولاه فعلی مولاه فرما کہ حضرت امیر کی خلافت کا اعلان فرما رہے تھے اور اللہ تعالیٰ یہ اعلان کر رہا تھا جبکہ مہاجرین و انصار نے بالاتفاق خلافت علی الترتیب حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کو دے دی۔ اب دو ہی صورتیں ہیں، یا تو صحابہ کرام کو حکم خداوندی کا مخالف اور حکم رسالت کا باغی سمجھا جائے اور دائرۃ اسلام سے خارج نعوذ باللہ اور یا شیعہ حضرات کا یہ مفروضہ غلط اور باطل محض یقین کیا جائے۔

پہلی صورت قرآن مجید کی بیسیوں آیات سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہزاروں ارشادات اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے بے شمار ارشادات کے خلاف ہے، جس کا بطورِ نمونہ پہلے ذکر ہو چکا ہے اور علی الخصوص حضرت امیر کے اس ارشاد کے خلاف ہے: مَا كَانَ اللَّهُ لِيَجْمَعَ بَيْنَكُمْ عَلَى ضَلَالٍ وَلَا يَضُرُّهُمْ عَمِّي۔ (شرح ابن میثم بحرانی مع نہج البلاغہ جلد رابع) ۳۵۵

یعنی اللہ تعالیٰ کو یہ زریعہ نہیں کہ انہیں (مہاجرین کو) گمراہی پر متفق کرے اور نہ یہ کہ انہیں حق سے اندھا اور ناشناس کر دے اور اسی طرح اس ارشاد کے بھی مخالف ہے: فَاِنْ اِنِىْ فَقَاتِلُوْهُ عَلٰى اَتْبَاعِهِ غَيْرِ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (نہج البلاغہ مصری ج ۲، ص ۱) پس اگر کوئی شخص مہاجرین و انصار کے منتخب امام کی بیعت سے ازراہ طعن و تشنیع اور بدعت خروج

کرتا ہے، تو اسے واپس لوٹانے کی کوشش کرو اور اگر انکار کرے، تو اس کے ساتھ جنگ کرو، بوجہ مومنین کی راہ سے ہٹ کر دوسری راہ پر چلنے کے، جس سے صاف ظاہر اور مہر نیمروز کی طرح روشن ہے کہ مہاجرین و انصار کا گمراہی اور ضلالت پر اجماع و اتفاق محال اور ناممکن ہے، جیسے کہ قرآن مجید کا اعلان ہے،

و یقیع غیر سبیل المومنین ذلہ ماتولیٰ و نصلہ جہنم و ساءت مصیباہ جو شخص مومنین کی راہ سے ہٹ کر نئی راہ اختیار کرے گا، وہ جہنم میں آئے گا، ہم اس کو اُدھر ہی پھیر دیں گے، یعنی شتر بے مہار کی مانند کر دیں گے اور جہنم میں اسے داخل کریں گے اور بُرا ٹھکانا ہے۔

لہذا قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ مہاجرین و انصار اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر قطعاً اجماع و اتفاق نہیں کر سکتے تھے، تو لا محالہ ماننا پڑے گا کہ شیعہ حضرات کا مفروضہ اعلان خلافت ہی غلط ہے اور ارشاد مصطفوی من کنت مولاً فعلی مولاً کا قطعاً یہ معنی نہیں ہے، بلکہ محبوبِ قلوب اور راحتِ ارواح و نفوس والا معنی مراد ہے۔

۵۔ اگر اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کا اعلان ہو چکا ہوتا، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وصال میں امر خلافت کے متعلق دریافت کرنے کا حضرت امیر کو مشورہ نہ دیتے اور یہ نہ فرماتے کہ ہمارا حق ہے، تو ہمیں اس کی وضاحت فرمادیں، بلکہ ہمیں عنایت فرمائیں اور اگر ہمارا حق نہیں، تو پھر جس کا حق ہے اور جس کو ملنی ہے، اس کو ہمارے متعلق، وصیت فرمائیں، کیا یہ ممکن ہے کہ اٹھارہ ذوالحجہ کے اعلان کو وہ دو ماہ بعد بمقبول چکے ہوں؟ نیز حضرت علی رضی اللہ عنہ کیوں فرماتے کہ اگر آپ ہماری خلافت سے انکار فرمائیں، تو کبھی بھی لوگ ہمیں خلافت نہیں دیں گے۔ لہذا واضح ہو گیا کہ جملہ مہاجرین و انصار، بلکہ خود اہل بیت علی الخصوص حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما نے

بھی یہ معنی نہیں سمجھا تھا، جو شیعہ لوگوں نے اختراع کر لیا ہے۔

۶۔ قبل ازیں اس مضمون کے حوالہ جات بکثرت ذکر ہو چکے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے عہد لے رکھا تھا کہ خلافت کے لیے نزاع اور اختلاف نہ کرنا نظرت فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی واذا الميثاق فی عتقی لخییری، وغیرہ بلکہ دوسرے خلفاء کی اطاعت کرنا اور ان کی موافقت کرنا، تو اب شیعہ علماء بتلائیں کہ اعلان خلافت تو اتنا اہم کہ اس کے بغیر کارہ رسالت ہی اکارت ہو رہا تھا اور عملی خلافت اتنی غیر اہم کہ آپ کو حکم دے دیا تھا کہ مل جائے تو بہتر اور نہ ملے تو اختلاف و نزاع سے گریز لازم اور دوسرے خلفاء کی اطاعت فرض۔ تو کیا یہ اعلان خلافت تھا یا ایک مزاج اور مذاق تھا، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے متفقہ طور پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ قرار رکھا۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

۷۔ بقول شیعہ علماء حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حکومت و سلطنت اس قدر اہم تھی کہ اس کے عملی اعلان کے بغیر کارہ رسالت اکارت ہو رہا تھا، لیکن یہی سلطنت حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی نظر میں سراب اور چھٹ جانے والے سحاب بکری کے ناک کی ریش سے حقیر، کھجور کی جالی کے بنے ہوئے شکستہ جوتے سے بھی کم قیمت بلکہ خنزیر کی اس ہڈی سے بھی حقیر جو جذامی کے ہاتھ میں ہو، تو کیا اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک جو امر خلافت اس قدر اہم تھا اس کو ان تشبیہات کے ذریعے انتہائی ذلیل و حقیر قرار دینا آپ کی طرف سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین و تحقیر کا موجب نہیں ہوگا، یقیناً موجب توہین و تحقیر ہوگا، لہذا اس لفظ مولیٰ سے یہ ظاہری حکومت و سلطنت مراد لینا قطعاً غلط ہے تاکہ حضرت امیر کرم اللہ وجہہ الکریم کی طرف اس توہین و تحقیر کی نسبت لازم نہ آئے۔

کیا قول باری تعالیٰ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل
الیک من ربک کا نزول غدیر خم پر ہوا؟

علامہ ڈھکو صاحب کے اس قرینہ اور طرز استدلال کا دار و مدار اس مفروضہ
پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا نزول غدیر خم پر ہوا اور اس کی تعمیل میں سید
صلی اللہ علیہ وسلم نے باہتمام تمام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ اعلان فرمایا
من کنت مولاً فعلي مولاً لیکن داخلی اور خارجی قرائن سے یہ دعویٰ
پایہ ثبوت تک نہیں پہنچ سکتا اور جب بنیاد و اساس ہی ختم ہو جائے، تو اس پر
قائم عمارت کیونکر برقرار رہ سکتی ہے؟ بلکہ وہ دھڑام سے گر جائے گی، تو آئیے
وہ قرائن و شواہد ملاحظہ فرمائیں۔

داخلی قرائن کا بیان

۱۔ پہلا قرینہ یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ ما انزل الیک من ربک
عام ہے اور عام کو اپنے عموم پر رکھنا لازم اور ضروری ہوتا ہے، جب تک کہ کوئی
مخصص موجود نہ ہو اور یہاں قطعاً کوئی قطعی مخصص موجود نہیں ہے، بلکہ ہو سکتا
بھی نہیں، کیونکہ احکام الہیہ میں سے کوئی بھی شئی اگر آپ اُمت تک پہنچائیں
تو یقیناً فریضہ رسالت کی ادائیگی بحاقہ نہیں پائی جائے گی، لہذا اس آیت کو
حضرت امیر کی خلافت بلا فصل کے اعلان کے ساتھ مخصوص کرنا اس عموم
کو باطل ٹھہرانے کے مترادف ہے جو بالکل قواعد و اصول کے خلاف ہے۔

۲۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ واللہ یعصمک من
الناس میں تبلیغ رسالت پر عصمت و حفاظت کی ضمانت اس وقت نہ یا وہ ضروری
تھی، جب آپ تنہا تھے یا صرف چند معدود آدمی حلقہ بگوش اسلام ہوتے تھے،
وہ کہ جب آپ کی حکومت و سلطنت پورے عرب پر قائم تھی اور ہزاروں جاں نثار

آپ کے ادنیٰ اشارہ پر کٹ مرنے کو تیار تھے، لہذا اس آیت کا تعلق غدیر خم کے ساتھ قائم کرنا اور ابتدائی دور رسالت سے نہ کرنا، کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

۳۔ تیسرا قرینہ یہ ہے کہ قول باری تعالیٰ: **إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ** مقام تعلیل میں واقع ہے اور جہاں بھی **إِنَّ** کے ساتھ جملہ کا آغاز کیا جاتا ہے اور آیت کا اتمام اس پر کیا جاتا ہے، وہ حکم سابق کی علت پر مشتمل ہوتا ہے۔ اگر علم کی بات ہوگی، تو اس کی علت یوں بیان کی جائے گی: **إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ** اور قدرت خداوندی سے متعلق امر کا تذکرہ ہوگا، تو اس کے آخر میں **إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** ذکر کر دیا جائے گا، **وَاللَّهُ يَدْعُو الْقِيَامَ** لہذا یہاں بھی یہ جملہ مقام تعلیل میں ہے، تو مقصد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کفار کو تمہارے لئے ضرر اور نقصان پہنچانے کی راہ پر نہیں چلنے نہیں دے گا اور یا یہ مقصد ہوگا کہ جو شخص کفر پر اصرار کرے، تو آپ اسے تبلیغ رسالت میں تقصیر اور کوتاہی نہ سمجھیں، بلکہ اللہ تعالیٰ ان کو منزل مقصود تک نہیں پہنچانا پڑا ہوتا، اس لیے وہ ہدایت حاصل نہیں کر رہے نہ کہ تمہاری تبلیغ میں کوئی کسر رہ گئی ہے، لیکن اگر شیعہ حضرات کا دعویٰ درست تسلیم کیا جائے، تو لازم آئے گا کہ حضور نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت علی کے اعلان میں صحابہ کرام مہاجرین انصاریوں سے ڈر اور خوف لاحق تھا، لہذا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حوصلہ دلایا اور دلیر کیا حالانکہ اس کا بطلان اظہر من الشمس ہے، کیونکہ جب آپ اکیلے تھے اور کفار مشرکین سے خوفزدہ نہ ہوتے، تو اب خدام و خلعین کے بکثرت موجود ہونے کے باوجود کیونکہ خوفزدہ ہو سکتے تھے؛ لیکن شیعہ حضرات نے حضور نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان سے خوفزدہ اور لرزدہ براندام ماننے میں فرا بھر جھجک اور تامل سے کام نہیں لیا۔ پہلے سوالہ جات ملا خطہ فرماتیں، پھر اس توہم کا بطلان مشاہدہ کریں۔

بِتَوَلَّ شَيْعَى عَلِيٍّ خِلَافَتِ امِيرِ كَيْ اَعْلَانِ مِيں رَسُولِ مَعْظَمِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم کَا پَسِں وِپیشِ

فَلَمَّا وَقَفَ بِالْمَوْقِفِ أَتَاهُ جِبْرِئِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ عَنْ
اللَّهِ تَعَالَى فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَنْتَ اللَّهُ يَقْرَأُكَ السَّلَامُ وَيَقُولُ لَكَ قَدْ
دُنِيَ أَجَلَكَ وَمَدَّ قَتْلِي (إِلَى) فَأَقَمَهُ عَلِيُّ بْنُ أَبِي طَالِبٍ (لِلنَّاسِ)
عِلْمًا وَجَدَّ رِعْمَدَةً وَمُنِثَاقَهُ وَبِيعْتَهُ (إِلَى) فَخَشَى رَسُولُ
اللَّهِ صَلَّی اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَوْمَهُ وَأَهْلَ النِّفَاقِ وَالشَّقَاقِ
أَنْ يَتَفَرَّقُوا وَيَرْجِعُوا جَاهِلِيَّةَ لَمَّا عَرَفَ مِنْ عَدَاوَتِهِمْ وَلَمَّا
يَنْطَوِي عَلَيْهِ أَنْفُسُهُمْ لِعَلِّيٍّ مِنَ الْبَغْضَةِ وَسَأَلَ جِبْرِئِيلُ
عَلِيَّ السَّلَامَ أَنْ يَسْأَلَ رَبَّ الْعَصْمَةِ مِنَ النَّاسِ وَأَنْتَظِرُ أَنْ
يَأْتِيَهُ جِبْرِائِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالْعَصْمَةِ مِنَ النَّاسِ مِنَ اللَّهِ
فَإِذَا ذَاكَ إِلَى أَنْ يَلْغُ مَسْجِدَ الْخَيْفِ فَأَمْرًا أَنْ يَعْبُدَ عَهْدُ
وَيَقِيمَ عَلَيَّ النَّاسَ وَلَمْ يَأْتِهِ بِالْعَصْمَةِ مِنَ اللَّهِ الَّذِي
أَرَادَ حَتَّى أَتَى كِرَاعَ الْغَمِيمِ بَيْنَ الْمَكَّةِ وَالْمَدِينَةِ فَأَنَا
جِبْرِئِيلُ وَأَمْرًا بِالَّذِي أَتَاهُ مِنْ قِبَلِ اللَّهِ تَعَالَى وَلَمَّا تَأْتَتْ
بِالْعَصْمَةِ فَقَالَ يَا جِبْرِئِيلُ إِنِّي أَخَشَى قَوْمِي أَنْ يَكْذِبُونِي وَلَا
يَقْبَلُوا قَوْلِي فِي عَلِيٍّ فَرَحَلْ فَلَمَّا بَلَغَ غَدِيرِ خُمٍّ قَبْلَ الْجَحْفَةِ
بِثَلَاثَةِ أَمْيَالٍ أَتَاهُ جِبْرِئِيلُ (إِلَى) فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ أَنْتَ اللَّهُ
يَقْرَأُكَ السَّلَامُ وَيَقُولُ لَكَ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلَغَ مَا أَنْزَلَ
إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ فِي عَلِيٍّ وَأَنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ
وَاللَّهُ يَعصِمُكَ مِنَ النَّاسِ - (تفسيرضا في جلد اول ص ۱۶۴ تا ۱۶۵)

ترجمہ: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موقف یعنی عرفہ میں ٹھہرے، تو جبریل امین آپ کی خدمت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سلام فرماتا ہے اور یہ حکم دیتا ہے کہ آپ کا وقت وصال قریب آچکا ہے اور مدت تبلیغ پوری ہونے والی ہے (تا)، لہذا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو لوگوں کے لیے علم ہدایت قائم کیجئے اور ان کے عہد و میثاق اور بیعت کی تجدید کیجئے۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنی قوم سے اور اہل نفاق و شقاق سے خطرہ لاحق ہوا کہ وہ جدا نہ ہو جائیں اور جاہلیت کی طرف نہ لوٹ جائیں بسبب اس کے کہ آپ ان کی عداوت کو جان چکے تھے اور بسبب اس کے کہ ان کے نفوس بغض علی کو چھپاتے ہوئے تھے اور آپ نے جبرائیل علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے لوگوں سے عصمت اور تحفظ کی ضمانت فرایم کرنے کا مطالبہ کریں اور آپ اس انتظار میں رہے کہ جبرائیل امین اللہ تعالیٰ کی طرف سے عصمت کا عہد لے کر نازل ہو تو ولایت کا میں اعلان کر دوں، لہذا آپ نے اس اعلان کو مؤخر کر دیا۔ یہاں تک کہ آپ مسی خیف میں پہنچ گئے، تو پھر جبرائیل علیہ السلام نے اس عہد کا حکم دیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لوگوں کا امام اور خلیفہ متعین کرنے کا حکم پہنچایا، لیکن اس دفعہ بھی اس عہد و پیمان کے بغیر ہی نازل ہوئے، جس کا آپ نے مطالبہ کیا، حتیٰ کہ آپ کراخ الغمیم تک پہنچ گئے جو مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہے، تو اس وقت جبرائیل السلام نازل ہوئے اور جو حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے تھے، اس کی تبلیغ کا حکم دیا، لیکن عصمت اور تحفظ کی ضمانت جس کا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطالبہ کیا تھا، وہ اب بھی نہ لاتے، تو آپ نے فرمایا اے جبرائیل! مجھے اپنی قوم سے تکذیب کا اندیشہ ہے اور علی مرتضیٰ (کرم اللہ وجہہ الکریم) کے بارے میں میرے قول کے قبول نہ کرنے کا خوف ہے (لہذا میں بغیر عصمت کی ضمانت کے اعلان نہیں کرتا، تو آپ نے دیاں سے) بغیر ولایت علی کا اعلان کئے اور حکم خداوندی پر عمل کیے) کو چ فرمایا، تو آپ جب غدیر خم پر پہنچے جو تحفہ سے تین میل پیچھے

ہے، تو جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور سخت تاکید کی کہ جمع تہدید و توحیح کے اور ضمانت عصمت کے لائے، اور کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک فی علی وان لم تفعل فما بلغت رسالته واللہ یعصمک من الناس۔ اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف علی (رضی اللہ عنہ) کے متعلق نازل کیا گیا ہے، وہ لوگوں تک پہنچا دو اور اگر اس طرح نہیں کر دے گے، تو تم نے فریضہ رسالت ادا نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ تمہیں لوگوں کی ایذا اور تکلیف سے محفوظ رکھے گا۔

۲۔ فانزل اللہ ہذا الایۃ تشجیعاً لہ علی القيام بہا
 امرہ اللہ تعالیٰ بادائہ الخ تفسیر مجمع البیان للطبرسی جلد ۲ ص ۲۲۳
 شیعی مفسر علامہ طبرسی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ولایت علی کے اعلان والے فریضہ کی ادائیگی پر دلیہ کرنے اور حوصلہ دلانے کے لیے یہ آیت نازل فرمائی۔

نبی الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اندیشہ ناک اور خوف زدہ ہونے والے توہم کا بطلان

اس عبارت میں آپ نے غور فرمایا کہ کس طرح حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اعلان میں تاخیر و التوار اور ٹال مٹول سے کام لیا اور نو ذوالحجہ میں نازل ہونے والے حکم کو غزوہ میں پائیہ تکمیل تک پہنچانے کی بجائے بار بار اصرار کے باوجود اٹھارہ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ سے بہت دور غدیر خم کے مقام پر پورا کیا اور وہ بھی اس وقت جب عصمت و حفاظت کی ضمانت بھی حاصل ہوئی اور تعمیل حکم نہ ہونے کی صورت میں رسالت بھی ہاتھ سے جاتی دیکھی، حالانکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت خداوندی اور خدا داد جرات و شجاعت کے ہمیشہ نظر یہ توہم سرسراہٹ اور لغو ہے کیونکہ۔

۱۔ جب ساری دنیا پر کفر تھا اور بیت اللہ شریف میں تین سو اٹھ بتوں کی پوجا جاری تھی، اُس وقت اعلانِ توحید اور بتوں کی الوہیت کی نفی اور انکا اور ان کی مذمت کرتے وقت تو عصمت اور تحفظ کی ضمانت حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی اور پہلی دفعہ حکم ملتے ہی تعمیل کر دی، مگر اب تمام انصار، بنو ہاشم اور بنو عبد مناف اور عرب کے اطراف و اکناف سے اہل اسلام کی امداد و اعانت حاصل ہونے کے باوجود اتنا خطرہ لاحق ہو گیا اور وہ بھی صرف آپ کی ذات کو، نہ کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات کو، جنہوں نے امام اور خلیفہ بننا تھا اور اقتدار کے خواہشمند حضرات کے اقتدار سے محروم ہونے کا سبب بننا تھا۔

۲۔ علاوہ ازیں اس اعلان سے اگر خطرہ لاحق ہوتا، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خطرہ لاحق ہونا تھا، کیونکہ ان کی طرف سے حضور نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دینے سے تو اُلٹا اقتدار جلدی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مل جاتا تھا اُس میں اُن کو کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اگر فائدہ کی کوئی ممکنہ صورت تھی تو یہی کہ حضرت علی کو شہید کر دیتے اور یہ امر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا، کیونکہ ابن ملجم اگر یہ اقدام کر سکتا تھا، جو جرات و شجاعت میں قطعاً کوئی مقام نہیں رکھتا تھا، تو قریش کے لیے یہ کیونکر ناممکن اور محال تھا؟ الغرض جس ہستی کو ایسی ضمانت کی اشد ضرورت لاحق تھی، نہ انہوں نے ضمانت طلب کی اور نہ ہی اُن کے لئے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے مطالبہ کیا اور نہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے اس ضمانت کا اعلان فرمایا اور جن کو اہل اسلام سے ضمانتِ عصمت حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی، وہ اس کے طلب میں بھی اس قدر اصرار سے کام لیتے رہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی صرف انہیں کے لیے عصمت کا وعدہ فرمایا، جس کی نگاہ عقل و خرد میں اور تجربات و مشاہدات کی روشنی میں قطعاً کوئی ضرورت اور نہ موزونیت، لہذا روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ اندیشہائے دور دراز شیعہ حضرات کی افسانہ نگاری ہے اور سہائی و ہنیت

کا مظاہر ہے، جس میں خود دامن مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی آلودہ کرنے کی ناپاک سعی سے گریز نہیں کیا گیا اور عقلمندی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا گیا۔

۳۔ نیز اس قدر تہدید و تشدید اور وعید و تغلیظ کے بعد بھی بقول علامہ طبرسی صاحب "الاحتجاج" سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطریقِ صراحت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان نہ فرمایا، بلکہ صرف بطورِ تعریض اور اشارہ اس کا ذکر فرمایا۔ ملاحظہ ہوا احتجاج طبرسی ص ۲۵۵۔ قبل ازیں عبارت ذکر کی جا چکی ہے، تو آخر تعریض اور کنایہ میں کونسا ایسا خطرہ لاحق تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کو اس قدر سخت حکم، نازل کرنا پڑا، تب آپ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی اور وہ بھی ناقص اور ناتمام طریقہ پر، جس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ اگر دھمکیاں دے کر اور تغلیظ و تشدید فرما کر اعلان کرانا تھا، تو صریح اعلان تو کرایا جاتا اور آپ کو اس منصب پر عملی طور پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو فائز کرنے کا حکم دیا جاتا۔

۴۔ نیز لازم آئے گا کہ سب مہاجرین و انصار اور ان کے تابعین بالاحسان قوم کفار میں سے ہوں، العیاذ باللہ! جیسے کہ اَنَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ کا تقاضا ہے، حالانکہ وہ تو غیظ کفار و مشرکین ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ اَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رَحِمَاءُ بَيْنَهُمْ (الی)، لیغیظ بہم الکفار۔ یعنی اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں اور صحابہ کرام کے ذریعے کفار کو غیظ و غضب کی آگ میں جلانا چاہتا ہے اور وہ خود بھی اور اس کے محبوب کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی ان کو دیکھ کر باغ باغ ہوتے ہیں۔ کما قال اللہ تعالیٰ یُعِجِبُ الزُّرَّاعُ جِیسَے کہ کھیتی بان اپنی کھیتی کو پھیلنے پھولنے دیکھ کر خوش و فخرم ہوتا ہے۔

الفرض یہ تو تھے داخلی فترات، اب مفسرین کے نقل کردہ شانِ نزول کی روایات اور خارجی فترات کے ذریعے، اس آیت کریمہ کے معنی و مفہوم کا تعین کیا جاتا ہے۔

قول باری تعالیٰ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک کا شان نزول اور خارجی متران

شیعی فاضل نے باریار دعویٰ کیا اور بلند بانگ اعلان کیا کہ حضرت علی رضی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل کا اعلان کیے بغیر کارِ رسالت و نبوت اکارت اور ہر باد ہو رہا تھا اور اس دعویٰ کی صداقت کا دار و مدار اس پر تھا کہ یہ آیت کریمہ اس موقع پر نازل ہوتی ہوتی، جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دلالت کا اعلان ہو رہا تھا، یعنی غدیر خم میں جیسے کہ تفسیر صافی میں یہ تاثر دیا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس آیہ مبارکہ کے غدیر خم میں نازل ہونے پر نہ ہی علماء اسلام کا اجماع ہے اور نہ ہی جمہور اس کے قائل ہیں اور اگر اس کے قائل ہیں، تو صرف شیعہ حضرات تو ایسی سورت میں علامہ ٹھکڑ صاحب کا بیان کردہ قرینہ ہی یقینی طور پر موجود نہ ہوا، تو اس کے ذریعے مولیٰ کا معنی خلیفہ بلا فصل کیسے قطعی طور پر ثابت ہو گیا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا

۱۔ علامہ طبری نے مجمع البیان میں کہا: قد اکثر المفسرون فیہ الا قایل قلیل ان الله بعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم برسالة ضاق بها ذرعاً وكان یهاب قریشاً فانزل الله بهذا الایة تلك المہیبة عن المحسن۔ وقیل یرید انزال التوہم من ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتم شیئاً من الوحی للتقیة عن عائشة وقیل غیر ذلک۔ یعنی مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں بہت سے اقوال نقل کیے ہیں۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا، تو آپ تنگ دل ہوئے اور آپ قریش کی طرف سے خوفزدہ تھے، تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ کے ذریعے وہ خوف اور ہیبت زائل فرمادی اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ

اس آیت کریمہ سے اس توہم کا زائل کرنا مقصود ہے کہ رسول معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور تقیہ اور خوف و اندیشہ کچھ وحی چھپالی تھی اور اس کا اظہار نہیں کیا تھا اور اس کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ مجمع البیان، جلد ثانی، ص ۲۲۶

۲۔ تفسیر منہج الصادقین میں علامہ فتح اللہ کاشانی صاحب نے بھی اس آیت کا یوم غدیر میں نزول صرف بعض علماء اہل سنت کے حوالہ سے نقل کیا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ مفسرین اور علماء کی اکثریت اس آیت کو غدیر خم اور قول مصطفوی من کنت مولاً فعلی مولاً سے متعلق نہیں سمجھتی۔ ملاحظہ ہو، منہج الصادقین جلد سوم ص ۲۴۳۔ نزد بعضے از اعظم اہل سنت و اجماع اہل بیت این آیت در غدیر خم نازل شد و ازاں جملہ علی بن احمد الواحد کہ یکے از افاضل و مشاہیر اہل سنت است الخ یعنی بعض اعظم اہل سنت اور اجماع اہل بیت سے منقول ہے کہ یہ آیت غدیر خم میں نازل ہوئی تھی۔ ان اہل سنت میں سے واحدی اور ثعلبی کا ذکر ہے، جن کا حال بعد میں ذکر کیا جائے گا اور اہل بیت کے اکابرین کو ہمیشہ شیعہ راویوں کے افتراء اور بہتان تراشی سے شکایات رہی جیسے رجال کشی اور تنقیح المقال وغیرہ میں تصریح ہے، لہذا ان کے اجماع کا دعویٰ ان راویوں کی زبانی جن کو امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کذاب، مفتری، یہودی اور مجوسی کہیں کس طرح قابل اعتبار ہو سکتا ہے۔

۳۔ امام جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے درمنثور میں نقل کیا ہے: أخرج ابن مردويه والضياء في المختار عن ابن عباس رضي الله عنهما قال سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم أي آية أنزلت علي من السماء أشد عليك، فقال كنت بمثلي أيام الموسم واجتمع مشركو العرب وافتاء الناس في الموسم فنزل علي جبرئيل فقال يا أيها الرسول بلغ ما أنزل إليك من ربك وإن لم تفعل فما بلغت رسالته

والله يحصمك من الناس قال فقلت عند العقبة فقلت
 ايتها الناس من ينصر في علي ان ابلغ رسالة ربي ولكم الجنة
 ايتها الناس قولوا لا اله الا الله وانا رسول الله اليكم
 تنجحوا ولكم الجنة قال فما بقي رجل ولا امرأة ولا
 صبي الا يرمون علي بالتراب والحجارة ويبصقون
 في وجهي ويقولون كذاب صابغ الخ درمنثور جلد ثانی، ص ۲۵۸
 وكذا في روح المعاني جلد سادس ص ۱۷۱

”یعنی ابن مردویہ نے نقل کیا ہے اور ضیاء نے مختارۃ الصحاح میں
 ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ
 صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ آپ پر آسمان سے نازل ہونے والی
 آیات میں سے کون سی آیت زیادہ گراں بار اور سخت تھی، تو آپ نے فرمایا
 کہ میں آیام موسم میں منیٰ کے مقام پر موجود تھا اور سارے عرب کے مشرکین
 اور انواع و اقسام کے لوگ جمع تھے، تو جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر
 نازل ہوئے، یا ایتھا الرسول بلغ ما انزل الیک الایۃ
 تو میں پہاڑی کے سائخہ کھڑا ہو گیا اور باواز بلند کہا، اے لوگو! تم میں سے
 کون ہے جو رسالت کے احکام کی تبلیغ میں میری امداد اور اعانت کر کے
 جنت کا حقدار بنے۔ اے لوگو! کہولا لا اله الا الله اور میں تمہاری طرف
 اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، تم نجات پاؤ گے اور تمہارے لیے جنت
 ہوگی۔ آپ نے فرمایا: میرا یہ کہنا تھا کہ منیٰ میں موجود ہر مرد و عورت
 اور بچے نے مجھ پر مٹی پھینکنی شروع کر لی اور بعض پیٹھ مارنے لگے اور
 میرے منہ پر تھوکنے لگے اور کہتے تھے کہ یہ جھوٹے ہیں اور باپ دادے
 کے دین کو بدل ڈالنے والے۔

فائدہ ۱: اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ آیہ کریمہ حجۃ الوداع

کے موقع پر نازل نہیں ہوئی تھی، کیونکہ اس موقع پر مبنیٰ میں مشرکین و کفار کب تھے، بلکہ اس سے پہلے سالی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو امیر حج ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھیج کر اعلان کر دیا گیا تھا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک خواہ کسی علاقہ کا بسنے والا ہو، وہ حج نہیں کر سکتا۔ نیز مکہ مکرمہ آپ کی مملکت کا حصہ تھا اور آپ پورے عرب کے حاکم اور بادشاہ بھی بن چکے تھے اور قریش و دیگر قبائل فتح مکہ کے بعد بڑی و بھوق حلقہ اسلام میں داخل ہو چکے تھے یا دور دایز علاقوں کی طرف فرار ہو گئے تھے اور وہاں پناہ گزین ہو چکے تھے، تو ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی طرف سے اس قسم کے تشدد اور بے حرمتی کا آپ کو کیسے سامنا کرنا پڑ گیا، لہذا مہر نیمروز کی طرح روشن اور واضح ہو گیا کہ یہ واقعہ ہی ہجرت سے پہلے کا ہے اور عرب دور جاہلیت میں حج کیا کرتے تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان قبائل کے پاس تشریف لے جا کر توحید و رسالت کا اعلان فرماتے اور انہیں دین اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دیتے تھے اور یہیں پر آپ نے اوس و خزرج کے قبائل کو بھی دو مرتبہ دعوت اسلام دی اور انہوں نے آپ کی دعوت قبول کرتے ہوئے آپ کا طوق غلامی اپنے گلے میں ڈالا اور بیعت کی، جس کو کتب سیر اور تواتر میں عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے اور یہیں پر ان کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ منورہ جانے کی صورت میں ہر ممکن تعاون اور تحفظ فراہم کرنے کا معاہدہ ہوا تھا۔ الحاصل قبائل عرب اور قریش ہر سال جمع ہوتے تھے اور آپ ان کی قیام گاہوں پر جا کر رسالہ کو علیحدگی میں دعوت اسلام دیتے تھے، مگر اس موقع پر کھل کر اسلام کی دعوت دینے کا حکم کیا گیا اور آپ نے ہر ممکن رد عمل اور تشدد کی پرواہ کیے بغیر وہ حکم پورا کیا اور تعمیل حکم میں کسی مصالحت اندیشی اور فبرہ و داکو دخل انداز نہ ہونے دیا۔

الغرض آیت مبارکہ کے الفاظ و کلمات اور یہ روایت بالکل باہم منطبق ہیں اور روایتی اور وراثتی اور داخلی و خارجی قرائن بھی اسی کے متقید ہیں، لہذا

یہی روایت اور اُس کے موافق و مطابق دیگر روایات جو اس آیت کے شانِ نزول کے ضمن میں درِ منشور اور رُوح المعانی وغیرہ میں نقل کی گئی ہیں، وہی راجح اور مختار ہیں اور لائقِ اعتداد و اعتبار اور جن روایات میں اس کا حجۃ الوداع کے موقعہ پر نزول تسلیم کیا گیا، وہ قطعاً قابلِ اعتبار اور لائقِ اعتداد نہیں ہیں، بلکہ راوی کی غلط فہمی پر مبنی ہیں۔

فائدہ ۱: نیز اس روایت سے مغالطہ کی وجہ بھی واضح ہو گئی کہ یہ آیت کریمہ منیٰ میں نازل ہوئی تھی اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دس سحری میں حج ادا فرمایا تھا جو حجۃ الوداع کے نام سے معروف ہے۔ لہذا اس آیت کا نزول حجۃ الوداع کے موقعہ پر تسلیم کیا گیا اور یہ تمیز اور تفریق نہ کی گئی کہ ہجرت سے قبل بھی آپ نے حج فرماتے تھے، گو اس وقت حج فرض نہیں کیا گیا تھا اور اہل جاہلیت بھی اپنے نظریہ کے مطابق ان مقاماتِ مخصوصہ کی زیارت کے لیے جمع ہوتے تھے اور اس کو موسم یا ایامِ المومنین سے تعبیر کیا جاتا تھا، لہذا اس غلط فہمی کی وجہ سے ہجرت سے پہلے کے واقعہ کو حجۃ الوداع پر چسپاں کر دیا گیا اور اس موقعہ پر نازل ہونے والی آیت کو غدیر خم کے واقعہ پر کفار و مشرکین سے تحفظ اور رحمت کے وعدہ کو مہاجرین و انصار اور اہل اسلام سے حفاظت اور تحفظ پر منطبق کر دیا گیا اور توحید و رسالت اور دیگر احکامِ شرع اور فرائضِ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کو علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی مفروضہ خلافت بلا فصل پر چسپاں کر دیا گیا، حالانکہ اس خلافت بلا فصل اور عقیدہ امامت کی فرضیت کا پہلا انکشاف عبد اللہ بن سبا پر ۳۵ھ میں خلافت عثمان رضی اللہ عنہ کے دوران ہوا تھا اور لفظِ مولیٰ کے واضح اور معروف معنی کو بھی چھوڑ کر نئے معنی پر منطبق کر دیا گیا، حالانکہ وہ آیت کو اس موقع محل سے کوئی تعلق تھا اور نہ لفظِ مولیٰ کو اس مفروضہ معنی کے ساتھ۔ روایات تفصیلاً ملاحظہ کرنی ہوں تو درِ منشور کا مطالعہ فرمائیں اور شیعی استدلال کا ابطال ملاحظہ کرنا ہو تو رُوح المعانی کا متعلقہ مقام مطالعہ فرمائیں۔

۳۔ نیز یہ حقیقت بھی محتاج بیان نہیں کہ شان نزول کی روایات کا وہ درجہ نہیں ہوتا، جو کہ کتب صحاح میں مروی احادیث کا ہے، بلکہ ان میں بکثرت ضعیف، بلکہ موضوعات بھی موجود ہیں اور شیعی علماء بالعموم اور محمد حسین ڈھکو صاحب بالخصوص تصریح کرتے ہیں کہ ہم اپنی صحاح اربعہ میں بھی منقول ہر روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۰۳ تو پھر اہل سنت کو ایسی کتابوں کی روایت سے الزام کیونکر دے سکتے ہیں، جو ہر قسم کی ضعیف اور موضوعات پر مشتمل ہوں، جبکہ اہل السنۃ کی صحیح ترین کتاب حدیث بخاری شریف میں قول باری تعالیٰ 'الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام' دینا کا نزول عرفہ کے دن یعنی نو ذوالحجہ بروز جمعہ عرفات کے میدان میں مروی و منقول ہے، لہذا اس کے خلاف جو روایت بھی ہوگی، وہ اس اصح الکتب کے معارض نہیں ہو سکے گی، بلکہ متروک اور ناقابل اعتقاد و عمل ہوگی اور جب اس آیت کا نزول عرفات میں نو ذوالحجہ کو تسلیم کیا جائے، تو حضرات شیعہ کی ساری نظریاتی عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے، کیونکہ دین کی تکمیل اس دن ہو جائے، تو غدیر خم میں من کنت مولاً فعلی مولاً کے اعلان پر رسالت کا دار و مدار کیونکر ہو سکتا ہے اور اس کے بغیر کار رسالت اکارت کیونکر ہوگی، کیونکہ اس امر پر فریقین کا اتفاق ہے کہ یوم عرفہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ولایت کا اعلان نہیں کیا گیا تھا، بلکہ اس کے نو دن بعد وقوع پذیر امر کو مورد اجمال اور محل اتمام کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اور یہ اعلان نہ کرنے پر رسالت کے اکارت ہونے کی دھمکی کیونکر دی جاسکتی تھی؟ الغرض صحیح وجہ غدیر خم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق من کنت مولاً فعلی مولاً کے اعلان کی وہی ہے جو قبل ازیں ذکر کی جا چکی ہے کہ لشکرِ کربلا کو حضرت امیر علیہ السلام سے شکایت پیدا ہوئی تھی اور ان کے دلوں میں غم و غصہ پیدا ہو گیا کہ انہوں نے سرفروشان اسلام کے بدن پر سے کپڑے اتار

لیے ہیں اور ان کی سرفروشی اور جہاں نشاری کی کوئی قدر نہیں کی، بلکہ بخل اور کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے العیاذ باللہ! تو اس شکایت کو دور کرنے اور اس غم و غصہ کو زائل کرنے کے لیے حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اہتمام فرما کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بارگاہ رسالت میں قدر و منزلت طاہر فرمائی اور اہل اسلام پر ان کی محبت و مودت کے وجوب و لزوم کو تاکید انداز میں بیان فرمایا: ھذا ھو الحق فماذا بعد الحق الا الضلال۔ نہ اس موقع پر یہ آیت: یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک (الایہ) نازل ہوتی اور نہ ہی وہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل ہونے کا قطعی قرینہ بن سکتی ہے۔ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل کے دعویٰ میں بھی شیعہ حضرات منفر ہیں اور اس آیت کریمہ کا نزول غدیر خم کے مقام پر تسلیم کرنے میں بھی گویا ڈھکوسلہ حاصل استدلال یہ ہوا کہ چونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل ہے اور ہمارا دعویٰ ہے کہ اس اعلان ولایت کے بغیر کار رسالت اکارت ہو رہا تھا کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ آیت غدیر خم کے مقام پر نازل ہوئی، لہذا اہل سنت کے نزدیک بھی خلافت بلا فصل حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ثابت ہو گئی۔

نماطہ سر بگمہ بیاں ہے اسے کیا کیئے

تنبیہ: کسی بھی مدعا کے اثبات کے لیے بُری بانی مقدمات میسر ہوں، تو وہ قطعی نظریہ اور عقیدہ کہلائے گا اور منظون مقدمات ہوں گے، تو وہ عقیدہ اور نظریہ بھی ظنی ہوگا۔ جب نظریہ امامت کو اہل تشیع قطعی عقائد میں سے شمار کرتے ہیں، تو اس پر استدلال بھی قطعی اور یقینی مقدمات سے ہونا چاہیے، جو یہاں بالکل موجود نہیں اور جو کچھ پیش کیا جاتا ہے، وہ اُن کے اپنے مزعومات اور مفروضات ہیں جن کی تائید نہ واقعات و حقائق سے ہوتی ہے اور نہ ہی اہل سنت کے مسلمات سے لہذا یہ انداز استدلال نہ بُری بانی ہوا اور نہ ہی جدلی۔ اور یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اہل سنت کی کسی کتاب میں کوئی روایت موجود ہونے سے یہ سمجھ لینا کہ یہ ان کے مسلمات سے ہے، سراسر غلط ہے اور خود فریبی کیونکہ فریقین کی کتب میں ہر قسم کی روایات موجود ہیں،

صحیح و حسن ہیں، تو ضعیف اور موضوعات بھی ہیں، لہذا واضح ہو گیا کہ اس قرینہ کو قرینہ کہنا ہی صحیح نہ تھا، چہ جائیکہ اسے قطعی کہا جاتا اور اس کے ذریعے مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور حاکم والا معنی قطعی طور پر متعین ہو جاتا۔

تذہیبہ الامامیہ

چوتھا قرینہ کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف

اور خلیفہ بلا فصل ہے !!

حارث ابن نعمان فہری کا واقعہ اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ حدیث غدیر میں مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف یعنی حاکم و سردار ہے اور وہ اہل زبان سے تھا۔ اس نے اس لفظ سے وہی معنی سمجھا اور اپنی شقاوت اور بد بختی کی وجہ سے اپنی ہلاکت منظور کر لی، مگر ولایت علوی اور خلافت مرفوضی کا اقرار نہ کیا (رسالہ الجواب وهو الموفق للصدق والصواب)

اس قرینہ کو ذکر کرتے وقت بھی شیعہ علماء نے حقائق سے آنکھیں بند کر لیں، ورنہ وہ کبھی بھی یہ استدلال پیش کرنے کی جرأت نہ کرتے۔ پہلے ان کی بیان کردہ مفصل روایت ملاحظہ ہو، جس کی طرف علامہ موصوف نے صرف اشارہ کر دیا ہے پھر اس کے وجوہ بطلان ملاحظہ فرمائیں۔ علامہ فتح اللہ کاشانی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔ (منہج الصادقین، جلد سوم ص ۲۷۵/۲۷۶)

ثعلبی آورده است کہ چون حکایت نصب شاہ اولیاء منتشر و این قصہ مشہور گشت حارث بن نعمان فہری بر ناقہ نشست و متوجہ مدینہ شد از ہر لائے آنکہ محاذ لہ نماید بحضرت رسالت پناہ و مناقشہ کند در نصب علی بن ابی طالب (تا، یعنی چون آن ملعون این دعا کند و عذاب الیم از قہار عظیم درخواست سنگے از آسمان بیفتادہ و سرا و خورد و از دہرش بیرون رفت و در ساعت این آیت نزل

یافت کہ سائل سائل بعد اب واقع للکافرین لیس له دافع
من اللہ ذی المعارج۔

یعنی جب شاہِ اولیاء کے منصبِ خلافت پر نصب کئے جانے کی حکایت
مشہور ہو گئی اور یہ قصہ عوام میں معروف ہو گیا، تو حارث بن نعمان فہری اپنی اونٹنی
پر سوار ہو کر عازمِ مدینہ ہوا تاکہ بارگاہِ رسالت مآب میں حاضر ہو کر مجادلہ و
مناقشہ کرے کہ اس منصب پر اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالب کو
کیوں مقرر کیا ہے؟ اور کہا کہ آپ نے ہمیں تو حید و رسالت کی گواہی کا حکم دیا۔
ہم نے وہ گواہی دے دی۔ آپ نے ہمیں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ادا کرنے
کا حکم دیا۔ ہم نے اس کو بھی قبول کر لیا۔ پھر تم اس پر بھی راضی نہ ہوئے، حتیٰ کہ
اس بچے کو اس منصب پر فائز کر دیا، اور من کنت مولاً فعلی مولاً
کا اعلان کر دیا۔

تو کیا یہ اعلان آپ نے اپنی طرف سے کیا ہے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیا
ہے؟ تو آپ نے فرمایا: بخدا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو وہ واپس لوٹا۔
ور آنحالیکہ کہہ رہا تھا: اللہ ما ان کان هذا هو الحق من عندک
فامطر علینا حجارة من السماء واما متنا بعد اب الیم
اسے اللہ! اگر حکم اور اعلان برحق ہے، جو تیری طرف سے نازل ہونے والا ہے
تو ہم پر آسمان سے پتھر برسایا ہمیں عذابِ الیم میں مبتلا کر تو اس دوران اس
پر ایک پتھر آسمان سے گرا جو اس کے سر سے داخل ہو کر اس کی سرین سے
باہر نکل گیا اور اسی وقت یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی، سائل سائل بعد اب
واقع الایہ یعنی سوال کرنے والے نے سوال کیا اس عذاب کے متعلق جو کفار
پر نازل ہونے والا ہے، جس کو اللہ بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی دور کرنے والا نہیں ہے
نیز یہی روایت علامہ طبرسی نے سورۃ المعارج کی اس آیت کے شانِ
نزل میں مجمع البیان جلد خامس ص ۳۵۲ پر ذکر کی ہے۔ چونکہ بقول علامہ

ڈھکوصاحب، یہ روایت حدیث غدیر میں مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل ہونے پر قطعی قرینہ ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو وہ بھی ثابت ہو جائے گی اور اگر ثابت نہ ہوئی تو اس معنی کا تعین بھی دعویٰ بلا دلیل ہو کر رہ جائے گا، لہذا اس کے جملہ روایتی اور روایتی پہلوؤں پر غور فرمادیں، تو آپ یہ فیصلہ دیتے بغیر نہیں رہ سکیں گے کہ یہ روایت شخص شاعرانہ تخیل اور افسانہ نگاری پر مبنی ہے اور اس کو واقعہ حقیقت سے دور کا بھی واسطہ و تعلق نہیں ہے اور لوجود اس کا بطلان ثابت ہوتا ہے۔

۱۔ باتفاق مفسرین و ائمہ قرأت سورۃ معارج اور اس کی یہ آیت مکی ہے اور مکی آیات ہونے کا معروف اور مختار معنی یہ ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہوں یا اس میں کفار مکہ کو معنی طب کھڑا یا گیا ہو۔ کوئی معنی بھی لو، یہ روایت درست نہیں ہو سکتی، کیونکہ از روئے روایت یہ آیت مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے اعلان ولایت کے بعد، لہذا اس کو مکی سورت اور مکی آیت کے نزول سے کیا ربط و تعلق ہو سکتا ہے؟ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں یہ قول نقل کر کے اس کو رد کرتے ہوئے فرمایا: وانت تعلم ان ذالک القول منه علیہ الصلوٰۃ والسلام فی امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کان فی عند یرخم و ذالک فی اواخر سنی الهجرة فلا یکون ما نزل مکیا علی المشہور فی تفسیرہ وقد سمعت ما قبل فی مکیۃ لہذا السورۃ (ہی مکیۃ بالاتفاق) جلد ۲۹، ص ۵۵

”یعنی یہ قول کہ یہ آیت حارث بن نعمان فہری کے حق میں ولایت علی کا انکاء کرنے کی وجہ سے نازل ہوئی، بالکل غلط ہے کیونکہ تبیں معلوم ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں ولایت کا اعلان غدیر خم میں پایا گیا جو کہ ہجرت نبوی کا آخری سال ہے اور اس موقع پہ یا اس کے بعد نازل ہونے والی آیت مشہور و معروف معنی کے لحاظ سے مکی نہیں ہو سکتی، حالانکہ یہ امر بھی گوش گزار ہو چکا ہے کہ اس کے مکی ہونے پر سب متفق ہیں۔“

۲۔ اس قرینہ کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ آیت حارث بن نعمان فہری کے حق میں نازل ہوئی، جبکہ اُس نے ولایت علی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ یہ بھی غلط ہے، کیونکہ اس پر بھی مفسرین متفق نہیں بلکہ اس میں مختلف اقوال ہیں۔ علامہ طبرسی نے مجمع البیان میں اس پر بحث کرتے ہوئے متعدد روایات نقل کی ہیں، تو جب حتمی اور قطعی طور پر حارث کے حق میں نزول ہی ثابت نہ ہوا تو اس کا غیر قطعی قول مولیٰ کے معنی کا قطعی تعین کیسے کرے گا؟

پہلی روایت: مجاہد سے منقول ہے کہ اس سائل سے مراد وہی شخص ہے جس نے کہا تھا: اللہم ان کان هذا هو الحق الایہ اور وہ نصر بن حارث ہے۔ دوسری روایت: حسن سے منقول ہے کہ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب مشرکین نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: جس عذاب کا تم تذکرہ کرتے ہو وہ کس کے لیے ہوگا؟ تو اس کے جواب میں فرمایا: وہ کفار کے لیے ہے، اور اسے اللہ بزرگ و برتر کے علاوہ کوئی دور کرنے والا نہیں ہے۔

تیسری روایت: جبائی سے منقول ہے کہ دعا اور سوال کرنے والے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ کے ساتھ کفار پر عذاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

چوتھی روایت: ابن زید سے منقول ہے کہ سال جہنم کی وادی ہے اور وہ کفار کے عذاب کے ساتھ دہک رہی ہے۔

علماء اہل سنت اور سال سائل کا مصداق

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے درمنثور میں اس کے متعلق مختلف روایات نقل کی ہیں (۱) فریابی۔ عید بن حمید۔ نسائی۔ ابن ابی حاتم، ابن مردویہ اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ یہ سائل نصر بن الحارث ہے اور اُس نے کہا تھا: اللہم ان کان هذا هو الحق من عندك الایہ۔ اور

حاکم نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔

(ب) ابن المنذر نے زید بن اسلم کے واسطہ سے بھی اس کا مصداق نصر بن الحارث بن کلدہ قرار دیا ہے۔

(ج) ابن ابی حاتم نے سدی کے واسطہ سے نقل کیا ہے کہ قول باری تعالیٰ سال سائل الایہ مکہ مکرمہ میں نصر بن حارث کے متعلق نازل ہوا، جبکہ اس نے کہا تھا: ان کان هذا هو الحق الایہ اور اس کو یہ عذاب جنگ بدر میں دیا گیا۔ (تفسیر و ترمذ جلد ۶، ص ۲۶۲)

(د) تفسیر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں بھی سال سائل کا مصداق نصر بن الحارث کو قرار دیتے ہوئے فرمایا: یعنی دعا داع و هو النصر بن الحارث (الی)، فقتل يوم بدر صبراً۔ یعنی یہاں پر سوال بمعنی دُعا ہے اور وہ دعا کرنے والا نصر بن الحارث تھا اور وہ بدر کے دن قیدی بن جانے کے بعد قتل کر کے کیفر کردار کو پہنچایا گیا۔

(هـ) علامہ آلوسی نے ”ممنثور“ میں منقول ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اس قول کے متعلق فرمایا، جس میں اس سائل سے نصر بن الحارث مراد لیا گیا ہے کہ یہی قول سدی، ابن جریر اور جمہور سے منقول ہے اور اسی نصر بن الحارث نے انکار رسالت کرتے ہوئے اور منصب نبوت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا: اے اللہ اگر یہ رسول تیری طرف سے ہے، تو ہم پر پھیر بربایا عذاب الیم نازل فرما۔ (روی فی الکتاب عن ابن جریر والسدی والجمہور الخ۔)

(و) قیل ہوا بوجہل حیث قال ”اسقط علینا کسفا من السماء“ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سائل سے مراد بوجہل ہے، جبکہ اُس نے کہا تھا اس رسول کے برحق ہونے اور ہمارے منکر ہونے کی وجہ سے ہم پر آسمان کا ٹکڑا گرا دے۔

الفرض نہ آیت کا مدنی ہونا ثابت، اور نہ سائل کا حارث بن نعمان فہری ہونا

قطعی طور پر ثابت ہوا بلکہ آیت مکی اور ہجرت سے پہلے نازل ہوئی اور مصداق اس کا بقول جمہور اور بقول مفسر صحابہ و جبر امت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نضر بن الحارث جو کہ بدر میں قتل بھی ہو گیا۔ تو اندریں صورت یہ قطعی قرینہ کیسا بن گیا مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل کا بلکہ اس کو قرینہ کہنا ہی مرے سے غلط ہے۔ علماء شیعہ پر تعجب ہے کہ جس روایت کی بنیاد اساس ہی نہیں ہوتی، اسی کو قطعی دلیل کہہ دیتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے صرف قطعی کا لفظ سنا ہوا ہے، مگر اس کا معنی معلوم نہیں یا صرف توام شیعہ کو بیوقوف بنانے کے لیے ایسے ذہنی لفظ استعمال کرتے ہیں اور یا خود ہی اپنے عقل و غرور سے بھی تقیہ کئے ہوئے ہیں اور خلافت بلا فصل کی محبت میں بصارت اور بصیرت سے محروم ہوتے ہیں۔

تفسیر ثعلبی اور واحدی کی حیثیت

علامہ فتح اللہ کاشانی نے یہ روایت ثعلبی کے حوالے سے نقل کی اور قول باری تعالیٰ یا ایہا الرسول بلغ الایہ کو واحدی کے حوالے سے اہل سنت کی طرف منسوب کیا اور علامہ ڈھکو صاحب نے ان کو قطعی قرآن بنا کر پیش کر دیا لہذا ان کی حیثیت اور مرتبہ و مقام کا بیان کرنا از حد ضروری ہے تاکہ ان کے مندرجات سے استدلال و استشہاد کی حیثیت واضح ہو جائے۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر التقان میں طبقات المفسرین بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفاسیر کے اسنادوں میں سے ضعیف ترین اسناد یہ ہے، اوہی طریقہ طریق الکلبی عن ابی صالح عن بن عباس فان انضم الی ذالک سوابہ محمد بن مروان السدی الصخیری سلسلۃ الکذب و کثیرا ما یخرج منہ الثعلبی والواحدی۔ تفسیر التقان جلد ثانی ص ۸۹

یعنی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول تفاسیر کی سندوں میں سے کمزور ترین سند اور طریق روایت وہ ہے جس میں کلبی ابو صالح کے واسطے سے آپ کی تفاسیر نقل کرتا ہے اور اس کے ساتھ محمد بن مروان سدی صغیر شامل ہو جاتے، تو یہ پورا سلسلہ ہی کذابوں اور جھوٹے راویوں کا ہے اور ثعلبی اور واحدی بسا اوقات اور عمومی طور پر اسی سند اور طریق روایت سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال نقل کرتے ہیں۔

امام سیوطی نے ہی ابن جریر طبری کے دور کے بعد والے مفسرین پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ انہوں نے روایات کے اسنادوں کو حذف کر دیا اور مسلسل اقوال نقل کرتے چلے گئے، تو اس طرح غلط اور بے بنیاد اقوال بھی تفاسیر میں داخل ہو گئے اور صحیح و علیل کا امتیاز ختم ہو گیا اور یکے بعد دیگرے آنے والے مفسرین نے ان سابقین کے اقوال کو بلا تفریق و تمیز نقل کرنا شروع کر دیا اور معتمد علیہ اور غیر معتمد کا فرق ہوا سلاف کے پیش نظر رہتا تھا، وہ نظر انداز ہو گیا۔ بعد میں وہ حضرات آئے، جن کو کسی نہ کسی فن اور شعبہ میں دسترس حاصل تھی، تو اُس نے اپنی تفسیر کو اسی رنگ سے رنگ دیا۔ نحو کے ماہر بیان اعراب اور تفصیل تراکیب میں منہمک ہوئے، تو فلسفہ کے ماہرین نے تفسیر میں فلسفہ کو بھر دیا۔ والاخبار ی لیس له شغل الا القصص والستیفاء والاخبار عن السلف سواء كانت صحیحۃ اور باطلۃ کا ثعلبی ج ۲ اور جواخبار اور روایات پر عبور رکھتے تھے، ان کا مشغلہ صرف قصص کا بیان اور ان کی بھر مار رہ گیا اور انہوں نے اسلاف سے ہر قسم کی خبروں کا نقل کر دینا اپنا منتہائے مقصود قرار دے دیا، خواہ سچی ہوں یا جھوٹی اور باطل جیسے کہ ثعلبی نے یہی شغل اپنایا۔ انتہی ملخصاً۔

ناظرین کرام پر حقیقت اب پوری طرح واضح ہو گئی ہوگی کہ تفسیر ثعلبی میں مذکور عام اقوال کس سلسلہ کذب سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کا مطمح نظر

اور بنیادی مقصد کیا ہے؟ لہذا اس قسم کی تفسیر سے ایک بے بنیاد قصہ اور حکایت نقل کر کے اس کو قطعی قرینہ اور دلیل بنادینا، ریاست اور امانت اور علم و تحقیق کی دنیا میں درغور اعتبار اور لائق اعتبار نہیں اور محقق و مدقق، مجتہد العصر اور حجتہ الاسلام ہونے کے دعویدار کو قطعاً زیب نہیں دیتا بلکہ کوئی معمولی سوجھ بوجھ والا طالب علم بھی اس قسم کے دعوؤں کی جسارت نہیں کر سکتا کہ جس امر کا اپنا وجود ہی نہ ہو، اس کو قطعی کہہ دے اور اس کے ذریعے مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل کو قطعی قرار دے دے۔

حیرت ہے کہ وہ نظریہ و عقیدہ جس کے تحت حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک لاکھ چودہ ہزار یا چوبیس ہزار صحابہ کرام مرتد قرار دیئے گئے اور ان کے سب کارنامے اور خدمات و قربانیاں برباد اور بے اعتبار قرار دی گئیں اس کا دار و مدار ان جھوٹی اور بے سرو پا حکایات پر ہے۔ اگر انکار پر آئے تو بیسیوں آیات سے قطعی اندازہ میں ثابت ان کے فضائل و کمالات اور صدق و اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور جنت کے مشرے بھی ناقابل اعتبار بنا ڈالے اور جو ماننے پہ آئے تو ایسی جھوٹی اور بے بنیادوں حکایات کو قطعی عقائد بنا ڈالے۔

ع ناطقہ سر بگڑیاں ہے اسے کیا کہیے

پانچواں قریب

مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل پر

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غدیر خم میں ولایت علی کا اعلان کیا تو تمام صحابہ کرام نے بالعموم اور عموم الخطاب نے بالخصوص حضرت امیر کو مبارک باد دی اور کہا، بخ بخ لك يا ابن ابی طالب لقد اصبحت مولی و مولی کل مومن مومنہ۔ "مبارک ہو، مبارک ہو اے ابن ابی طالب! تم میرے اور تمام مومن مردوں اور عورتوں کے مولی بن گئے ہو۔" یہ بھی اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انہوں نے یہاں پر مولی بمعنی اولی سمجھا تھا، ورنہ صرف اخوت اور محبت مراد ہونے کی صورت میں مبارکباد کوئی معنی نہیں رکھتی۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۱۵۱

الجواب بتوفیق الوہاب

علامہ صاحب نے حدیث غدیر میں وارد مولیٰ کے خلیفہ بلا فصل اور اولیٰ بالتصرف کے معنی میں ہونے پر پانچواں قطعی قرینہ یہ پیش کیا کہ چونکہ آپ کو مولیٰ بننے پر مبارکباد دی گئی، لہذا قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ اس چوبیس معانی میں مشترک لفظ کا یہاں صرف اور صرف خلیفہ بلا فصل والا معنی ہی مراد ہے، مگر اس وقت کو قطعی قرینہ قرار دینا بھی یوجہ باطل ہے۔

۱۔ پہلے تو یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس روایت کی حیثیت کیا ہے؟ اور خود ہی وہ منکر، ضعیف اور ناقابل اعتبار ہو، تو پھر اس کے بل بوتے پر مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل کی قطعیت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ علامہ سید محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس پر بحث کرتے ہوئے فرمایا: وهذا ضعیف فقد نصوا ان علی بن زید وایا ہارون وموسیٰ ضعیفاء لا یعتمد علیہم وایتہم فی السند ایضاً ابواسحاق دھوشیعی مردود المر وایۃ - روح المعانی ج ۶ ص ۷۱۔ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ علماء جرح و تعدیل نے تصریح فرمائی ہے کہ اس کے راوی علی بن زید، ابو ہارون اور موسیٰ بن عثمان ہیں اور وہ سبھی ضعیف ہیں اور ان کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ نیز اس روایت کی سند میں ابواسحاق بھی ہے اور اس کی روایت مردود اور ناقابل قبول ہے، کیونکہ وہ شیعہ ہے۔ لیجئے حضرات جو روایت ہی مردود اور ناقابل قبول ہے، تو اس کو قطعی کہنا کیونکر درست ہوا اور اس کا سہارا لے کر مولیٰ کے کثیر التعداد معانی میں سے ایک کے متعین ہونے کی قطعیت کس طرح ثابت ہو گئی؟

۲۔ روایت کی ذاتی حیثیت یعنی ضعف و نکارت سے قطع نظر کر لیں اور اس کو سبجیح تسلیم کر لیں، پھر بھی اس سے شیعہ علماء کا دعویٰ ثابت نہیں

ہو سکتا، کیونکہ مولیٰ ہونا حاکم ہونے کو مستلزم ہی نہیں ہے۔ چہ جائیکہ بلا فصل خلافت و حکومت کو مستلزم ہو۔ اس ضمن میں احتجاج طبرسی کا ایک حوالہ پیش خدمت ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم انی لم اسئل اللہ اللیلۃ شیئاً الا اعطانیہ ولم اسئلہ لنفسی شیئاً الا سالت لک مثله وانی دعوت اللہ عز وجل ان یواخی ببینی یتذکر ففعل سالتہ ان یجعلک ولی کل مؤمن ومومنۃ ففعل وسالتہ ان یجمع علیک امتی بعدی فابی علی۔ احتجاج ص ۱۵۹ طبع جدید۔

یعنی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، میں نے آج رات اللہ تبارک و تعالیٰ سے جو کچھ طلب کیا، اُس نے مجھے عطا فرمایا اور میں نے اس سے اپنی ذات کے لیے جو کچھ طلب کیا، تمہارے لیے بھی اسی طرح کا مطالبہ کیا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ میرے اور تیرے درمیان اخوت اور بھائی چارہ قائم فرمائے، تو اللہ تعالیٰ نے اسے شرف قبولیت بخشا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ تمہیں تمام مومنین مردوں اور عورتوں کا مولیٰ بنائے تو اس نے اس دعا کو بھی شرف قبولیت و اجابت بخشا اور تجھے سب کا مولیٰ بنا دیا اور میں نے یہ التجاہ کی کہ میری ساری امت کو میرے بعد تجھ پر متفق اور متحد کر دے، تو اس نے اسے شرف قبولیت بخشنے سے انکار فرما دیا اور ساری امت کو میرے بعد تیری خلافت و امارت پر متفق و متحد نہ فرمایا۔

شیعی فاضل کی زبانی اور مستند ترین کتاب کے حوالے سے فرمان نبوی کے ذریعے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو گئی کہ ولی اور مولیٰ ہونا علیحدہ امر ہے۔ اور خلیفہ و عا کہ ہونا علیحدہ امر ہے، ورنہ دعائے ولایت قبول ہونے کے بعد اور تمام مومنین و مومنات کا مولیٰ بن جانے کے بعد پھر خلافت پر اتفاق کی دعا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی اور نہ اللہ تعالیٰ کے انکار کی کوئی وجہ، بلکہ وہ فرماتا، میں تو قبول کر چکا اور

خلیفہ بنا چکا ہوں، ان سب کو متفق و متحد کرنے کا نام نہ ہو چکا ہوں، تمہیں پھر دعا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور ان پراقت کو متحد اور متفق کرنے سے انکار فرمایا، تنہا یہ ہو گیا کہ یہ دونوں امر الگ الگ ہیں، لہذا قطعی طور پر معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مولیٰ ہونا حاکم اور خلیفہ ہونے کے معنی میں نہیں تھا، بلکہ دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں اور حیثیتیں تھیں، علامہ ڈھکو صاحب کو اس سے کیا غرض؟ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول

صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر نہیں مانتے کہ مولیٰ ہونا خلیفہ ہونے کو مستلزم ہے تو نہ مانیں، وہ تو بزرگ اور ڈنکے کی چوٹ اور اس کے قطعی اور حتمی ہونے پر اعتقاد رکھیں گے اور حکمین کو کافر و مرتد اور منافق کہیں گے، خواہ کسے باشد، کیونکہ ان کے پاس اس دعویٰ پر قطعی قرائن موجود ہیں اور وہ پورے دس قرائن ہیں۔ لغرۃ حیدری یا علیٰ نیز اس روایت سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ خلافت و حکومت نہ بھی حاصل ہو، مگر مولیٰ المؤمنین ہونا بہت بڑا اعزاز ہے، اسی لیے سید عالم رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں اس اعزاز و امتیاز کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائی اور جو مصلحت و حکمت دعائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی، وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام کے مبارک باد دینے میں تھی۔ اگر انوث و محبت مراد ہونے کی صورت میں مبارکبادی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی، تو پھر التجائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی اور اگر دعا و التجا اس لیے درست تھی کہ اس میں عام انوث و محبت مراد نہیں تھی، بلکہ مخصوص اور اتم و اکمل اور سب مؤمنین و مومنات کی طرف سے الفت و محبت مراد تھی، تو مبارکبادی کا باعث و موجب بھی یہی مخصوص اور اتم و اکمل محبوبیت تھی، لہذا یہ مبارکبادی خلافت بلا فصل کا قطعی قرینہ کیسے بن سکتی؟

علامہ موصوف کو کون سمجھائے کہ دنیوی اقتدار تو بقول مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سراب ہے اور پپرٹ جانے والا سحاب اور چند روزہ فانی متاع اور اصل اعزاز

اور حقیقی انعام تو وہ محبوبیت ہے جو صرف ظاہری زندگی میں نہیں، بلکہ وفات وصال کے بعد بھی قلوبِ خلق پر حاوی اور غالب اور حکمران و متصرف رہتی ہے، جیسے کہ ہر ایک کے مشاہدہ میں ہے کہ ارباب سلاسل کس طرح آج بھی محبوبِ قلوب اور قبلہ ارواح بنے ہوئے ہیں۔

۳۔ ابن بابویہ قمی نے "معانی الاخبار" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ سرورِ انبیاء حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ، جی ولا امامارۃ لی معہ وانا رسول ربی ولا امامارۃ معی وعلی ولی من کنت ولیہ ولا امامارۃ معہ۔ معانی الاخبار ۲۴۷۔
اللہ تعالیٰ میرا رب ہے اور میرے لیے امارت و حکومت اس کے ساتھ نہیں تھی اور میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، جبکہ بوقتِ بعثت میں امیر اور حاکم نہیں تھا اور حضرت علی ہر اس شخص کے ولی ہیں، جس کا میں ولی تھا، جبکہ وہ ہر اس شخص کے امیر نہیں ہیں۔ سرکارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی واضح ہو گیا کہ ولایتِ مرتضیٰ علیہ السلام ہے اور ان کا امیر ہونا علیہ السلام ہے اور ولایتِ امارت و حکومت کو مستلزم نہیں اور ساتھ ہی دلیل بھی آپ نے دے دی کہ میں جب سے رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، اس وقت سے مولیٰ ہوں، لیکن امیر و حاکم اس وقت سے نہیں ہوں اور جس کا میں ولی تھا، علی بھی اس کے ولی ہیں مگر نہ میں وقتِ بعثت سے امیر تھا اور نہ ہی یہ ابھی سے امیر ہوں گے۔ مجھے بھی امارت و حکومت بعد میں حاصل ہوئی اور انہیں بھی بعد میں حاصل ہو گئی۔

الغرض نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ولایت کی امارت سے جدا مانتے ہیں اور مولیٰ کو خلیفہ بلا فصل سے مختلف مانتے ہیں اور ان میں نہ از روئے معنی و مفہوم تھا و توافق تسلیم فرماتے ہیں اور نہ وجود خارجی اور مصداق کے لحاظ سے اور یہی مذہب اہل سنت و جماعت کا ہے۔ اب ڈھکھو صاحب کی مرضی کہ وہ راہِ نبوت و رسالت پر چلیں اور ہماری موافقت کریں یا ہمارے ضد میں بلکہ خلفائے ثلاثہ کی عداوت میں باغی نبوت بن جائیں اور راہِ نبی سے انحراف کریں۔

مولیٰ بمعنی اولیٰ سے کیا ثابت ہوا؟

(۴) ڈھکو صاحب فرماتے ہیں کہ مبارکبادی اس امر کی دلیل ہے کہ ان مبارکباد دینے والے صحابہ نے مولیٰ بمعنی اولیٰ سمجھا، مگر علامہ صاحب فرماتے ہیں کہ اولیٰ سمجھنے سے کیا خلافت بلا فصل تسلیم کر لینا اور عملی طور پر اقتدار و اختیار کا مالک تسلیم کرنا ثابت ہو جاتا ہے؟ اولیٰ سمجھا تھا، تو اخوت و محبت کے لحاظ سے بھی آپ اولیٰ ہو سکتے تھے، تو محض تصرف و حکومت کے لحاظ سے اولیٰ سمجھنا کیسے لازم آگیا؟ اللہ تعالیٰ نے کلام مجید میں فرمایا: مَا وَكُرْنَا لَكَ هِيَ مَوْلَاكُمْ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے، اور وہ تمہارا مولیٰ ہے۔ یہاں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہے، تو کیا آگ کو خلیفہ بلا فصل اور حاکم و سلطان تسلیم کیا جائے گا اور امر و نہی کے ساتھ تصرف کرنے والی — نیز کلام خداوندی میں ہے: وَادُلُّوا لَاسِ حَادٍ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ — یعنی ذوی الارحام میں سے بعض دوسرے بعض کے ساتھ اولیٰ ہیں تو کیا یہاں خلافت ثابت ہو گئی۔ قطعاً نہیں، بلکہ صرف یہ مطلب ہے کہ وہ جلانے کی زیادہ حقدار ہے اور ذوی الارحام وراثت مالی کے حقدار ہیں اور اگر مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو ہی سہی، تو اس سے شیعہ علماء کو کیا حاصل ہو سکتا ہے، جب تک اولیٰ بال حکومت و بالتصرف ثابت نہ ہو اور ان متعلقات کا نہ حدیث غدیر میں ذکر اور نہ مبارکباد دینے والوں کے کلام میں تو پھر خواہ مخواہ اس معنی کی تعیین کیسے ہو گئی؟

رہا یہ تو ہم کہ بالعموم محبت و ولایت اور اخوت و بھائی چارہ تو اسلام و ایمان کی وجہ سے ثابت تھا، والمؤمنون بعضهم اولیاء بعض۔ تو پھر اس پر مبارکبادی کا کیا معنی؟ تو جواباً گزارش ہے ع سخن شناس نہ خطا میں جا ست

یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کو محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم میں داخل

کیا گیا تھا اور یہ ابدی و غیر قافی اور ناقابل تغیر و تبدیل حکم تھا، یعنی جس طرح محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت بھی ترک نہیں کی جاسکتی اور نہ کبھی اس کا وجوب و لزوم ختم ہو سکتا ہے۔ اس طرح حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی محبت بھی کسی وقت ترک کرنے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ بخلاف عام مومنین کی محبت کے، لہذا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو اس مخصوص محبت میں اپنے ساتھ شریک فرمانا ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا اور آپ یقیناً اس پر مبارک باد کے مستحق تھے۔

اگر وہ صحابہ کرام جو غدیر خم میں موجود تھے، اس کو خلافت بلا فصل کا اعلان سمجھ رہے تھے، تو پھر انہوں نے عملی طور پر آپ کو وصال نبوی کے بعد کیوں خلیفہ تسلیم نہ کیا؟ انصار نے خود اپنے علاقہ پر تصرف حاصل کرنے کا پروگرام کیوں بنایا اور پھر اس پروگرام سے دستبردار ہو گئے، تو بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بلا فصل تسلیم کیا۔ آئندہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی دنیا کی خاطر اپنا دین و ایمان اور اپنی دنیوی شوکت و سلطنت دونوں ہی کیونکر قربان کر سکتے تھے، بلکہ وہ اپنے عزم و ارادہ سے باز صرف اس لیے آگئے کہ انہوں نے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث رسول سُن لی تھی: **الائمة من قریش** کہ امام و حاکم قریش ہی ہوں گے، تو ان حضرات سے یہ توقع کیسے ہو سکتی تھی کہ براہ راست نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنیں تو تسلیم نہ کریں اور بواسطہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سنیں تو اسے فوراً تسلیم کر لیں۔ نیز بنو عبد المطلب، بنو ہاشم اور بنو عبد مناف ان سب کو کیا ہو گیا تھا کہ انہوں نے بھی اس حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل نہ کیا اور نہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان اقدس پر عمل کیا اور نہ ہی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے حق قرابت کو ملحوظ رکھا۔ کچھ تو کیسے کہ ماجرا کیا ہے؟

چھٹا قرینہ
مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل پر

سابقہ سطور میں متعدد کتب کے حوالے سے لکھا جا چکا ہے کہ اس اعلان کے

بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا تھا کہ حضرت امیر کو امیر المومنین کہہ کر سلام کرو۔ یہ اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ مولیٰ سے مراد اولیٰ بمعنی سردار ہے۔ تنزیہ الامامیہ ص ۱۵۲

الجواب ومت التوفیق والسداد

ڈھکوصاحب نے پانچویں اور چھٹے قرینہ کو بیان کرتے ہوئے سطور بالا اور سطور سابقہ کا لفظ استعمال کیا اور متعدد کتب کے حوالہ جات ذکر کرنے کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ آپ کے پورے رسالہ میں ان دونوں قرینوں کے متعلق کہیں بھی کسی کتاب کا حوالہ موجود نہیں ہے، مگر آپ ہیں کہ نشہ و مستی کے عالم میں بس یہی رٹ لگاتے جا رہے ہیں کہ متعدد کتب کے حوالہ جات سے لکھا جا چکا ہے۔

ناطقہ سر بگریاں ہے اسے کیا کہیے

حالانکہ معمولی سوچ بوجھ رکھنے والا طالب علم بھی سمجھتا ہے کہ مولیٰ بمعنی خلیفہ بلا فصل شیعہ کا دعویٰ ہے اور اس کے اثبات کے لئے انہیں قطعی دلائل و شواہد پیش کرنے لازم ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک یہ نظریہ قطعی عقائد اور اصول اسلام میں شامل ہے لیکن یہاں دلائل بھی محض دعویٰ کے طور پر ہیں نہ کتاب کا نام، نہ عبارت مکمل طور پر درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر طور پر عبارتیں ہی غائب ہوتی ہیں، آخر یہ استدلال کا کونسا قسم ہے اور جوابی کارروائی کا کونسا انداز ہے؟ اگر محض دعویٰ کر دینا ہی مدعی کے لئے کافی ہو اور اس کی سچائی کی دلیل ہو، تو پھر اسلامی فرقوں میں سے کوئی بھی غلطی پر نہیں، بلکہ سبھی سچے ہیں۔ الغرض ہمارا نظریہ و عقیدہ صرف اور صرف یہ ہے کہ خدیجہ کے واقعات پر مشتمل روایات میں سے جو صحیح طور پر ثابت ہے، وہ ہے حضرت امیر رضی اللہ عنہ کے متعلق من کنت مولاه فعلی مولاه اللهم وال من والاه و عاد من عاداه کا اعلان۔ اس کے علاوہ امیر المومنین ہونے کا اعلان یا امیر المومنین کے لقب سے سلام دینے کا حکم یا خلافت و امارت کی صراحت وغیرہ قطعاً پایہ تکمیل و صحت اور ثبوت کو نہیں پہنچتی اور نہ مستند اور معتبر کتابوں میں کوئی ایسی

روایت موجود ہی ہے۔ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے علامہ آلوسی نے روح المعانی ج ۶ ص ۳۱ پر فرمایا: وانت تعلم ان اخبار الغدير التي فيها الامر بالاستخلا غير صحيحة عند اهل السنة ولا مسلمة لديهم (اصلاً یعنی تمہیں معلوم ہے کہ غدیر خم کی وہ روایات و اخبار کہ جن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا حکم ہے، وہ اہل السنۃ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے نزدیک معتبر اور مقبول ہیں اور یہ پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ اس اعلان کا پس منظر کیا تھا اور باعث و موجب کو نسا تھا؛ یعنی لشکریوں کی آپ کے خیانت شکایت اور آپ پر طعن تشنیع اور آپ کی شان میں تنقیص و تفریط جس کو علم اہل السنۃ اور علماء شیعہ دونوں فریق نے ذکر بھی کیا ہے اور تسلیم بھی کرتے ہیں۔

یہاں اس خاص روایت اور مخصوص مقصد پر مشتمل اخبار کے علاوہ دوسرے قسم کی روایات کا معاملہ جن کو بالعموم شیعہ علماء بطور استدلال پیش کرتے ہیں، تو وہ ایسی کتابوں سے لی جاتی ہیں جن میں مؤلفین نے صحاح کو جمع کرنے کا التزام ہی نہیں کیا اور نہ وہ خود ان کے تمام مندرجات کی صحت کے قائل ہیں، بلکہ ان کے پیش نظر واقعہ غدیر کے متعلق ہر قسم کی روایات اور ان کے اسناد اور طرق روایت کو جمع کرنا تھا اور ان کی درجہ بندی اور ترجیح راجح وغیرہ کا معاملہ انہوں نے دوسرے حضرات پر چھوڑ دیا لہذا ان کتب کے مؤلف اگرچہ سنی ہوں، بلکہ اکابر اہل سنت سے ہوں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے جو کچھ ذکر کیا ہے، وہ سب ان کے نزدیک صحیح ہے اور تمام اہل سنت پر بھی ان کو صحیح ماننا اور ان پر اعتقاد رکھنا لازم ہے۔ سید محمود آلوسی نے فرمایا: وقد اعتنى بحديث غدیر خم ابو جعفر بن الجری الطبری فجمع فيه مجلدین اور فیہما سائر طرقہ والفاظہ و ساق الفہم والسمین والصحيح والسقيم علی ما جرت به عادة كثير من المحدثين فانهم يوردون ما وقع لهم في الباب من غير تمييز بين صحيح وضعيف وكذا لك الحافظ الكبير ابو القاسم ابن العساكر و ابنه احاديث

کثيرة في هذه الخطبة والمحول عليه فيها ما اشرنا اليه ونحوه
 مما ليس فيه خبر الاستخلاف كما يزعمه الشيعة - روح المعاني ج ۴
 ابو جعفر بن جرير طبري نے حدیث غدیر کے بیان میں خاص و محسبی کا اظہار کیا اور
 اس میں دو جلدیں مرتب کیں اور اس واقعہ میں وارد خطبہ کے تمام اسنادات اور طرق وایا
 جمع کیے اور ہر قسم کے منقولہ الفاظ و کلمات اور ہر قوی و ضعیف اور صحیح و مقیم کو ان میں جمع
 کر دیا ہے جیسے کہ بہت سے محدثین کی عادت معروفہ ہے کہ وہ کسی باب اور عنوان کے
 مناسب موصول اور دستیاب ہر روایت کو وہاں پر درج کر دیتے ہیں اور ان میں سے
 صحیح اور ضعیف میں تمیز و تفریق نہیں کرتے اور یہی حال حافظ کبیر ابو القاسم ابن عساکر
 کا ہے۔ انہوں نے بھی اس خطبہ کے ضمن میں بہت سی احادیث ذکر کی ہیں اور مقابل
 وثوق اور لائق اعتماد صرف وہی ہیں جن کی طرف ہم نے اشارہ کر دیا ہے یا اسی قسم کی
 دو روایات جن میں خلافت مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ نہیں ہے جیسے کہ شیعہ کا زعم ہے
 تنبیہ: قبل انہیں بار بار اس طرف قارئین کی توجہ دلا چکا ہوں کہ شیعہ حضرات
 بھی اپنی کتابوں میں مذکور ہر روایت کو صحیح تسلیم نہیں کرتے، حتیٰ کہ صحاح اربعہ میں
 مذکور تمام روایات کو بھی صحیح اور حجت ماننے سے انکاری ہیں، حالانکہ ان کا بدعویٰ
 بھی ہے کہ امام غائب حضرت مہدی نے کافی مولفہ محمد بن یعقوب کلینی کا مطالعہ فرمایا
 اور اس پر مہر تصدیق لگاتے ہوئے فرمایا: هذا كاف شيعتنا۔ اور اسی طرح
 اہل السنۃ نے بھی کتب حدیث و روایت کی درجہ بندی کرتے ہوئے صحاح ستہ کو
 دوسری کتابوں پر ترجیح دی اور ان میں سے بخاری و مسلم کی متفق علیہ روایات کو۔ پھر
 ”بخاری کی انفرادی اور بعد از ان مسلم کی انفرادی روایات کو راجح قرار دیا اور ان چھ
 کتابوں کو بھی صحیح اس معنی کے ساتھ نہیں مانتے کہ ان کی ہر روایت صحیح ہے بلکہ اکثریت
 ان روایات کی درجہ صحت کو پہنچی ہوئی ہے، لہذا ملاک تحریر حکم الکل کے تحت انہیں
 صحاح ستہ کہا گیا۔ کما حقیقۃ المحدث الدہلی فی اشعة اللمعات (مقدمہ جلد اول)
 نیز حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ شیعہ مقام استدلال میں ہیں اور وہ غلات

بلا فصل کے دعویٰ کو عقائد قطعیہ میں شمار کرتے ہیں، تو اس کے اثبات میں ایسا طریقہ استدلال اپنانا جو جہل بھی نہ کہلا سکے، قطعاً قابل اللفات اور لائق اعتبار نہیں ہو سکتا، جبکہ جہلی قیاس مدعا کے ثبوت کا فائدہ بھی نہیں دیتا۔ صرف مخالف کے دفاع پر مشتمل ہوتا ہے۔ مدعائے قطعی کے اثبات کے لیے بہر حال بڑی قیاس کا ہی پیش کرنا لازمی ہوتا ہے اور جہلی قیاس کا بھی یہ مطلب نہیں ہوتا کہ فریق ثانی کی کسی کتاب کی کوئی روایت نقل کر دی، خواہ وہ اس کو ضعیف بلکہ موضوع اور من گھڑت ہی کیوں نہ تسلیم کرتے ہوں، بلکہ اپنی طرف سے دعویٰ کر دیا کہ یہ سنتی ہے اور پھر بطور الزام اور جہل، اس کی روایات پیش کر دیں جیسے کہ خطیب خوارزم اور ابن ابی الحدید وغیرہ کے حق میں علماء شیعہ نے اسی کارستانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ الحاصل ان معروضات کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب ڈھکوصائب کے بیان کردہ ان قریوہ کی حقیقت معلوم کریں۔

۱۔ ایسی کوئی روایت صحیح السند اور معتبر و مقبول کتب اہل سنت میں موجود نہیں، لہذا یہ دعویٰ، جب خود پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا، تو اس کو قطعی قرینہ قرار دینا ایک مجنونانہ حرکت کے سوا کیا ہے؟ علامہ موصوف کے استدلال کا حاصل یہ ہوا کہ چونکہ اہل تشیع تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کو صحابہ کرام نے بحکم حضور سید انام علیہ الصلوٰۃ والسلام، امیر المؤمنین کے لقب سے سلام کیا، لہذا اہل السنۃ کے نزدیک بھی قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ مولیٰ کا معنی خلیفہ بلا فصل ہے۔

بریں عقل و دانش بیاید گر لیست

۲۔ ابو نعیم نے حلیہ میں ذکر کیا ہے کہ لوگوں نے حضرت حسن مثنیٰ بن امام حسن بن حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہم سے دریافت کیا کہ حدیث غدیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت بلا فصل تنصیص اور اس کی تصریح ہے یا نہیں؟ تو آپ نے فرمایا: لو کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اراد خلافتہ لقال ایہا الناس ہذا ولی امری والقائم علیکم بعدی

فاسمعولہ واطیعوہ ثم قال الحسن اقسم بالله سبحانه
ان الله ورسوله صلى الله عليه وسلم لو آثرا عليا لاجل هذا
الامور لم يقدم علي كرم الله وجهه عليه لكان اعظم
الناس خطا - روح المعاني، ج ۶ ص ۷۵

”یعنی اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلیفہ بنانے کا ارادہ
کیا ہوتا، تو آپ اس طرح فرماتے یہ میرا ولی الامر اور ولی عہد ہے اور میرے بعد تمہارے
انتظام کا مالک اور قیم امر ہذا اس کے حکم کو قبول کرو اور اس کی اطاعت کرو۔
بعد ازاں حضرت حسن مثنیٰ نے قسم اٹھا کر فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم نے امر خلافت کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو چن لیا تھا اور ان
کی خلافت کا اعلان کر دیا تھا اور وہ وقت آنے پر خلافت کے لیے آمادہ نہ ہوتے اور
امور سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے سعی اور جدوجہد نہ کی، تو یقیناً ان سے بڑا
خطا کارا درگنہ گار کوئی نہیں ہو سکتا۔“

مقام غور ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی تہدید و تحویف اور رسالت
کے سلب کرنے کی دھمکی دے کر اعلان خلافت کرانے کی کوشش کی گئی اور حضور نبی معظم
صلی اللہ علیہ وسلم نے کار رسالت اکارت ہونے کے اندیشہ پر اعلان کیا تو کیا
من كنت مولاه فعلي مولاه کہنے سے وہ مدعا پورا ہو گیا اور السلام علیک
یا امیر المؤمنین کہلوانے سے وہ غرض پوری ہو گئی، جبکہ آل نبی اور آل علی رضی اللہ عنہم
کے عظیم فرد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے داماد اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے
پوتے ذمار ہے ہیں کہ خلافت کا اعلان کرنا ہوتا، تو اس کی صحیح صورت یہ تھی۔

۳۔ احتجاج طبرسی کے حوالے سے ذکر کر چکا ہوں کہ حدیث غدیر میں صرف
خلافت مرتضویٰ کی طرف اشارہ اور کنا یہ ہے، تصریح نہیں ہے اور تصریح
نہ ماننے کی وجہ یہ بیان کی کہ اگر تصریح فرماتے اور کہتے، لا تقلدوا الاما
الابنہ والابنہ والابنہ بکم العذاب لانا هم العذاب و

حال باب الاقطار والامہال مکتم نے امامت و خلافت کی فہم داری
صرف فلاں معین شخص کے ہی سپرد کرتی ہے، ورنہ تم پر عذاب نازل ہوگا، تو ضرور
ان پر عذاب نازل ہو جاتا اور مہلت کا دورہ بند ہو جاتا۔

مگر سوال یہ ہے کہ جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بطور اشارہ اور
کنا یہ بھی کچھ کہنے کو تیار نہ تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے رسالت ختم کرنے کی دھمکی دے کر
علی مولانا کا اعلان کر لیا اور آپ بھی اعلان کر کے رسالت کے چھن جانے کے
خطرے سے محفوظ ہو گئے، تو امت کو بھی اسی قسم کی دھمکی دے کر اقرار خلافت کرایا
جاتا اور عذاب الہی سے بھی بچا لیا جاتا۔ کیا رسول معظم صلی اللہ علیہ وسلم کو دھمکی دینا
جائز تھا؟۔ مگر امت کے لیے ایسی مشروط اور معنوی دھمکی دینا روا نہیں تھا۔
نبی الانبیاء علیہ التہنیت والثناء کی کسر شان لازم نہ آئی اور امت کی کسر شان لازم
آئی تھی؟ مالکم کیف تحکمون۔

نیز عذاب کی وعید نہ سنائی جاتی، خلافت کی تو تصریح کر دی جاتی اور
کہا جاتا امر خلافت صرف فلاں معین شخص کے لیے ہے، اس میں تو تعرض اور اشارہ
و کنا یہ سے کام لے کر انجمن پیدا نہ کی جاتی۔ امت کو عذاب سے بچانا حضرت علی رضی اللہ
کو خلافت دلانے سے اگر زیادہ اہم ہی تھا، تو عذاب کی وعید سناتے بغیر بھی اعلان
خلافت ہو سکتا تھا، کم از کم اس کی تصریح تو ہو جاتی اور غلط فہمیاں تو دور ہو جاتیں۔
الغرض خود اکابرین شیعہ جب تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں صرف تعرض ہے اور
انہیں مہلت دینے اور عذاب سے بچانے کے لیے اعلان صریح نہیں کیا گیا تھا،
تو پھر السلام علیک یا امیر المومنین کہلانے کا مطلب کیا ہوا؟ کیا اس میں تعرض تھی
اور تصریح نہیں تھی؟ گویا ڈھکوحباب کا بیان کردہ یہ قرینہ نہ اہل سنت کے
مسلمات سے ہے اور نہ ہی تمام شیعہ ہی اس کے قائل اور معترف ہیں، مگر نظر بدوور
ہے قطعی اور ناقابلِ ریب و شک۔

۴۔ اگر اعلان خلافت بھی ہو چکا تھا اور امارت پر مبارکبادیں بھی اور

امیر المومنین کے لقب سے سلام کرنے کا حکم اور اس کی تعمیل بھی ہو چکی تھی، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کا کیا معنی ہے؟ سلمنا للہ امرہ ورضینا عن اللہ قضاء و نظرات فی امری فاذا طاعتی قد سبقت بیعتی و اذا الميثاق فی عنقی لغیری۔ نہج البلاغہ۔ ہم نے اللہ تعالیٰ کے امر کو تسلیم کیا اور اس کی قننا پر راضی ہوئے۔ میں نے اپنے معاملہ میں غور و فکر کیا، تو ناگاہ میری دوسرے خلفاء کے لیے اطاعت میرے اپنے بیعت لینے سے سبقت لے جا چکی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مجھے ان خلفاء کی تابعداری کا پابند کر دیا گیا تھا کیا اس سے بڑا استہزار اور ٹھٹھا بھی کوئی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف اعلان خلافت اور امیر المومنین کا لقب دے کر سلام کروائے جائیں اور دوسری طرف عبد و پیمان طاعت نے کران کو دوسرے خلفاء کی پیروی اور فرمانبرداری کا پابند کر دیا جائے۔

۵۔ انصار نے جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث رسول الاثم من قدیش سنی، تو اس پر عمل کیا اور اپنے دعویٰ خلافت اور اپنے قول: منا امیر و منکم امیر سے دست بردار ہو گئے جو شیعہ اور اہل السنۃ دونوں کے نزدیک مسلم ہے اور ان کی کتب معتبرہ میں مروی و منقول ہے، تو آخر یہ اعلان خلافت اور سلام امارت اور اہتمام رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کیوں بھول گیا؟ مقام حیرت ہے کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی زبانی حدیث سنیں تو فوراً عمل کریں مگر زبان رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنیں اور اس اہتمام کے ساتھ سنیں، پھر بھی اس کو نظر انداز کر دیں اور اس مبارک بادی وغیرہ کی بھی مطلق پرواہ نہ کریں۔ کیا بے کوئی اہل تشیع میں جاگتے ضمیر والو اس اہل حقیقت اور ناقابل انکار و تردید واقعہ کو سامنے رکھ کر اس سبائی مفروضہ سے توجہ کرے اور حقیقت کا اعتراف و انشراح کرے۔ نیز اہل السنۃ کی معتبر ترین کتابوں یعنی بخاری وغیرہ میں منقول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مرض الوصال میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے امر خلافت متعلق دریافت کرنے کا مشورہ دیا لیکن آپ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اگر آپ ہمیں خلافت نہ دیں

تو پھر کبھی بھی خلافت لوگوں کی طرف سے نہیں نہیں ملے گی، لہذا میں نہیں پوچھتا۔ اگر اعلان خلافت بھی ہو چکا اور مبارکبادیاں بھی دی جا چکی تھیں اور امیر المومنین کے لقب کے ساتھ علیک سلیک بھی ہو چکی تھی، تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اس مشورہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اس جواب کا کوئی معنی نہیں رہ جاتا۔ لہذا یہ قرینہ شیعہ دُستی روایات بلکہ مسلمات کی رو سے انمل بے جوڑ، بے حقیقت، ناقابل اعتدال و اعتبار اور سراسر لغو اور بیودہ ہے اسے قرینہ کہنا بھی غلط ہے تاہم قطعیت چہرستہ

تذویہ الامامیہ از علامہ ڈاکٹر صاحب

ساتواں قرینہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل پر

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جو کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے درباری شاعر تھے۔ انہوں نے پورے واقعہ کو نظم کیا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس حدیث سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان ہی سمجھا تھا۔ آپ فرماتے ہیں:

فقال له قسم يا علي فانهي رضىتک من بعدى اما ما و هيا
اسے علی! اٹھو! میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کا ہادی و رہنما منتخب کیا ہے۔

تحفہ حسینیہ از ابوالحسنات محمد اشرف السیالوی

الجواب ومنه المام الصواب

علامہ موصوف نے اپنے استدلال کا دار و مدار اب حضرت حسان رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب اشعار پر رکھا ہے، لیکن جب تک یہ ثابت نہ ہو کہ واقعی آپ کا کوئی دیوان ہے اور وہ تحریف و تبدیل اور زیادت و نقصان سے محفوظ ہے،

اور اس میں الحاقی اور مصنوعی اشعار نہیں ہیں، اس وقت تک اس استدلال کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی اور تعجب کی جگہ ہے کہ جن لوگوں کے نزدیک کلام اللہ کی صحت مشکوک ہے اور وہ اس کو تغیر و تبدل سے محفوظ و مستون تسلیم نہیں کرتے اور ہزاروں روایات ان کی معتبر ترین کتب مذہب میں ایسی موجود ہیں جو اس قرآن کو ناقابل وثوق قرار دیتی ہیں اور محرف و متغیر ٹھہراتی ہیں تو اسی اہل مذہب کے نزدیک دیوان حسان اور اس کی نظمیں کیوں قابل وثوق ہو گئیں؟ لہذا جب تک اس نسبت کا درست ہونا اور اس کے مندرجات کا تغیر و تبدل سے محفوظ ہونا ثابت نہ کر دیا جائے، استدلال درست نہیں ہو سکتا۔

۲۔ اگر حضرت حسان رضی اللہ عنہ آپ کو بلا فصل خلیفہ اور امام و ہادی مان چکے تھے اور قصیدے بھی پڑھ چکے تھے، تو پھر ان کو مرتدین کے کھاتے میں کیوں ڈال دیا؟ اور اترت الناس الا ثلاثۃ کی تیغ جفا سے اس قصیدہ خوان رضی کی رگ و فاکیروں کو کاٹ دی؟ اگر واقعی انہوں نے اسی معنی میں آپ کو ہادی و ہما سمجھا تھا جو شیعہ کا مدعا ہے، تو پھر ان پر فتوے ارتداد کیوں؟ اور اگر یہ معنی نہیں سمجھا تھا، تو ان کے قول سے استدلال کیوں؟ اور اگر اپنے نظریہ سے منحرف ہو گئے تھے، تو دنیاوی منفعت اور مصلحت کو کسی حاصل کی جس کے تحت دین کو قربان کر دیا یا ان کو خطرات کو لسنے درپیش تھے، جن کے تحت ڈر کر مارے جان کے خوف کے اپنے قصائد اور اظہار عقیدت کے برعکس ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو خلیفہ تسلیم کر لیا۔ ۳۔ نیز اس قصیدہ میں اگر ثبات ہیں، تو امام اور ہادی کے الفاظ اور حضرت

علی رضی اللہ عنہ کے امام اور ہادی ہونے میں کسی کافر کو نزاع و اختلاف ہے۔ اگر اختلاف ہے تو بلا فصل خلافت میں ہے اور امام و ہادی کے الفاظ اس پر دلالت ہی نہیں کرتے، یہ جاتی کہ قطعی قرینہ بن سکیں، کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے علماء کا فریضہ ہے اور عوام اہل اسلام پر اس کی تعمیل لازم ہے انبیاء کرام علیہم السلام بھی ہادی اور امام بن کر تشریف لائے، مگر ان میں عظیم المرتبت

ہستیاں طاہری حکومت پر فائز نہیں تھیں اور بنی اسرائیل میں امام و یادی رونی ہوئے
مگر وہ حکمران اور خلفاء نہیں تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ وجعلنا ائمتہ یمہدون یاہرنا
ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ الغرض انبیاء
و رسل جو حکمران اور بادشاہ نہیں تھے اور دوسرے مذہبی رہنما جن کا تعلق بنی اسرائیل
سے تھا، وہ سبھی امام اور ہادی تھے، لیکن ان کو خلیفہ اور وہ بھی بلا فصل کہنا غلط ہے،
تو پھر اس جگہ امام و ہادی کہنے سے قطعی قرینہ خلافت بلا فصل کا کیسے ہا تھ لگ گیا؟
۴۔ نیز اسی موقعہ پر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث ثقلین بھی نبی بن
اقدس سے بیان فرمائی کہ میں تمہارے اندر دو قیمتی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔
ایک قرآن اور دوسری اہل بیت اور جب تک ان کے ساتھ تمسک اور اقتدا
کرتے رہو گے، ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ تو اس حدیث میں آپ نے اس امر کی طرف
اشارہ فرمایا ہے کہ جس طرح قرآن ہادی ہے، اسی طرح اہل بیت بھی ہادی ہیں،
اور ہر حکمران جس طرح قرآن حکیم کے مطابق احکام نافذ کرنے کا پابند ہے، اسی طرح
اہل بیت کرام اور بالخصوص حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مشوروں کے مطابق
عمل کرنے کا پابند ہے۔ نیز کتب مساویہ ہادی بھی ہیں اور ان کو امام بھی کہا گیا ہے
کما قال اللہ تعالیٰ، ومن قبلہ کتاب موسیٰ اما ما ورحمۃ۔ وقال
اللہ تعالیٰ اذ الیٰک الکتاب لاسیب فیہ ہدٰی للاحتقین۔ حالانکہ
ان کو خلیفہ کہنا بھی درست نہیں، چہ جائیکہ خلیفہ بلا فصل۔

لہذا اس حدیث کی روشنی میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو کچھ
فرمایا، وہ اہل سنت کے مسلک کے عین مطابق ہے اور شیعی علماء، اس کو اپنے مذہب
پر قطعی دلیل بنانا تو دور کی بات ہے، اشارہ قرار دینا بھی درست نہیں ہو سکتا،
اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشیر خاس بنانا، متعدد حوالہ جات
سے واضح کیا جا چکا ہے، لہذا جو مقصد اس ارشاد نبوی میں مضمر تھا، اس پر مکمل
عمل درآمد کیا گیا۔

تذریۃ الامامیہ

۱۔ کھواں قرینہ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور غلبہ بران

اس اعلان کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جناب امیر کے دوستوں کے لیے دعائے خیر فرمانا اور مخالفین کے لیے بددعا کرنا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مولا مولیٰ سے مراد اولیٰ بالتصرف ہی ہے جیسے کہ رسم ہے کہ اعلان ولی عہدی کے بعد اس قسم کی دعائیں کی جاتی ہیں، جن سے مقصد ولی عہد کی اطاعت کی ترغیب و تادیب سے ترہیب ہوتی ہے۔

ص ۱۵۳

تحفہ حسینیہ، الجواب وهو الملهم للصدق والصواب
علامہ ڈھکوصاحب قطعی قرائن اور شواہد بیان کرنے لگے تھے، لیکن اب ڈوٹے کوٹیکے کا سہارا کے مصداق تارہائے عنکبوت کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ چونکہ بعد میں یہ دعائے کہ اے اللہ! اس شخص کو دوست بنا جو صلی کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو صلی سے دشمنی رکھے، لہذا اس سے ولی عہدی ثابت ہو گئی۔

۱۔ یہی دعا تو اس ولی عہدی کے مخالف اور منافی قرینہ ہے، کیونکہ اگر ولی عہد مقصود ہوتی، تو دعائیوں دی جاتی، اللہ مال من اطاعہ و عا د من عصا اے اللہ! جو ان کی اطاعت کرے، اُس کو محبوب بنا اور جو ان کے حکم کی خلاف ورزی کرے، اس کو اپنا دشمن بنا۔ جب محبت و صداقت کا ذکر کیا، تو معلوم ہوا کہ یہ ولی عہدی کا اعلان نہیں تھا، بلکہ مخصوص محبت کے وجوب لزوم کا اعلان تھا جو اصل قرینہ تھا بقول حضرت حسن مثنیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ تھا فاسمعوا لہ و اطیعوا کہ یہ تمہارا مولا اور ولی امر ہے اور قیم امور، لہذا اس کی اطاعت کرنا اور اس کے احکام کو قبول کرنا، مگر اس کو تو یہاں ذکر نہ کیا گیا اور جو ذکر کیا گیا، وہ قرینہ ہی نہیں بن سکتا، تاہم قطعیت چہ رسد۔

۲۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے لیے من کنت مولا فعلی مولا

کے اعلان کے وقت ولایت ثابت ہو چکی، اسی لیے اس روایت میں من بعدی کا لفظ موجود نہیں ہے اور ولایت بمعنی تصرف تو اس وقت ہو ہی نہیں سکتی تھی ورنہ ایک وقت دو حکومتیں لازم آتیں، البتہ ولایت بمعنی محبت مخصوصہ ہو سکتی تھی اور یہ نزول محبتیں جمع بھی ہو سکتی تھیں اور فعلی مولا کا جملہ اسمیہ ہوتا جو دوام و استمرار کے لیے ہوتا ہے اور وہ بھی من کنت مولا کے استمرار و دوام کی طرح ولایت علی کے استمرار و دوام پر دلالت کرتا ہے، جو کہ اس امر کا اقویٰ قرینہ ہے کہ یہاں ولایت بمعنی محبت ہے نہ کہ ولایت بمعنی خلافت جو کہ بعد از وصال نبوی حاصل ہونی تھی۔ کیا ہوش و حواس کے قائم ہوتے ہوئے اس دعا سے ولایت بمعنی خلافت بلا فصل پر ادنیٰ اشارہ بھی سمجھا جاسکتا ہے، چہ جائیکہ اس کو قطعی قرینہ تسلیم کر لیا جائے۔

نانواں قرینہ۔ مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف اور خلیفہ بلا فصل پر

اس آیت کے بعد تکمیل دین کا نزول جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے، اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ آج آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت بڑے عظیم الشان فرض کی دائی سے سبکدوش ہو رہے تھے، جس پر دین اسلام کی تکمیل کا دار و مدار تھا اور وہ امامت و خلافت علی ہی ہو سکتی ہے نہ اعلان محبت وغیرہ۔

صفحہ ۱۵۴

الجواب بفضل مفيض الخیر والسداد

ڈھکڑ صاحب کا یہ دعویٰ قطعاً غلط ہے کہ قول باری تعالیٰ، الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً کا نزول غدیر خم میں اعلان ولایت کے بعد ہوا، بلکہ عرفہ کے میدان میں نوز و الحجہ بڑے جمعہ اس کا نزول ہوا، لہذا اس پر خلافت مرتضوی کا اعلان مترتب کرنا قطعاً درست نہیں ہے اور اہل سنت کے کتب صحاح میں اس کی تصریح موجود ہے اور تمام مفسرین اور علماء اہل سنت کا اسی پر اتفاق ہے اور اگر شیعہ حضرات اس آیت کے غدیر خم پر

نازل ہونے کے قائل ہیں تو ہمارے خلاف بطور الزام اور جدل ان کا یہ قول کیونکر پیش کیا جاسکتا ہے۔

۲۔ نیز علماء شیعہ کا بھی اس پر اجماع و اتفاق ثابت نہیں۔ جیسے کہ تفسیر منہج اور مجمع میں منقول متعدد اقوال اس پر شاہد ہیں۔

۳۔ علامہ موصوف نے اعلان خلافت کو بہت ہی عظیم الشان فرض قرار دیا ہے۔

جب اعلان کی عظمت اتنی ہے، تو ظاہر ہے خلافت کی عظمت کیا ہوگی؟ حالانکہ شیعہ نظریات اور مسلمات کے آئینہ میں دیکھیں اور شیعہ مفروضات

کو تسلیم کر لیں تو امت کو اس خلافت سے ذرا بھر فائدہ نہیں پہنچا۔ پچیس سال کا عرصہ تو خلفاء ثلاثہ کی موافقت و متابعت اور ان کی خلافت کو خلافت الہیہ اور خلافت عودہ قرار دیتے ہوئے گزر گیا اور اسی دوران بقول شیعہ قرآن بھی بدل دیا گیا اور شریعت کے دیگر احکام میں بھی رد و بدل ہوتا رہا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ ٹس سے مس نہ ہوئے اور جب خلافت مل گئی، تو نہ اصلی قرآن دے سکے اور نہ خلفاء سابقین کی روش اور کردار کے خلاف کوئی اقدام کر سکے اور نہ ان کے جاری کردہ طور طریقوں کو بدل سکے، کیونکہ ہمیشہ یہی خطرہ و اندیشہ لاحق رہا کہ میرا لشکر مجھے چھوڑ نہ جائے اور میں تنہا نہ رہ جاؤں۔ دیگر احکام کو تبدیل کرنا تو دور کی بات ہے، تراویح چھڑوانا، جس میں ہر سر بدن کی راحت کا سامان موجود ہے، وہ بھی ممکن نہ ہوا، جیسے کہ علامہ ڈھکو صاحب اور اس کے طبیب روحانی نے خود تسلیم کیا ہے۔ رسالہ تنزیہ الامامیہ ص ۶۵ تا ۶۷ کا تفصیلی مطالعہ فرمائیں۔

لہذا اندریں حالات تمام اہل تشیع کے اعتراف کی رو سے جب خود خلافت مرتضوی اسلام اور امت مسلمہ کے لیے کسی فائدہ کا موجب نہ ہو سکی اور اسلامیان عالم کو اس سے ہدایت حاصل نہ ہو سکی، تو اس کے اعلان کو عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی قرار دینا شیعہ مسلمات کی رو سے کیونکر درست ہو سکتا ہے؟

پہلے انبیاء کرام علیہم السلام نبی معظم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اعلان کے پابند تھے اور اس عظیم الشان فریضہ کو ہر ایک نے ادا کیا۔ پھر آپ

کے ظہور پر واضح بھی ہو گیا کہ واقعی وہ رسولِ گرامی اسی اہتمام کے لائق تھے، لیکن شیعہ روایات کو تسلیم کیا جائے، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اسلام کی آبیاری کی بجائے اس کی جڑیں کھوکھلی ہوتی نظر آتی ہیں۔ جو لوگ اسلام کے خلاف تھے نعوذ باللہ وہ آپ کے امام تھے اور انہیں کے آپ وزیر و مشیر تھے، ان کو وہی رشتے دے رہے تھے انہیں کی بیعت کو اپنی بیعت کی حقانیت اور درستگی کی دلیل بناتے رہے اور ان کو مقتدایانِ اسلام اور عظیم المرتبت مومن قرار دیتے رہے اور ان کو بے عیب، پاکدامن، راست رو اور سنت کا قائم کرنے والا وغیرہ قرار دیتے رہے، جس سے ان کی مکمل تائید اور موافقت پاتی گئی اور علانیہ ایک جملہ بھی آپ ان کے خلاف نہ بول سکتے تھے اور نہ بولے۔ تو کیا شیعہ مفروضات کے مطابق آپ کے ہاتھوں جب دینِ حق کی بنیادیں ہی کھوکھلی ہو گئی تھیں، تو اس خلافت کے اہتمام کا کیا مطلب؟ اور اس کے اعلان کے عظیم الشان فریضے کا کیا مطلب ہو سکتا تھا۔

ہاں اہل سنت اس خلافت مرتضویہ کو اپنے دور میں فی الجملہ عظیم الشان مانتے ہیں کیونکہ آپ نے ان کے نزدیک ذرہ بھر دین کی مخالفت برداشت نہیں کی اور اس کو منہاج النبوت کے مطابق چلایا اور اس میں کسی تعلق اور رشتہ داری کو حائل نہ ہونے دیا اور نہ ہی دین میں مداخلت اور بے جا رواداری کو برداشت کیا خواہ اس کی کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑی اور یہ خلافت امت کے حق میں نعمت بھی تھی امد قابلِ فخر بھی، لیکن وہ شورانی تھی اور چوتھے درجہ میں تھی اور اس میں خلفاء ثلاثہ اور بالخصوص شیعین کی روش و کردار کو برضا و رغبت اور بصدِ خلوص و محبت اپنایا گیا تھا، نہ اس میں تقیہ تھا اور نہ کتمانِ حق نہ مافی الضمیر کے مخالف و برعکس کا اظہار، لیکن شیعہ حضرات کے زعم و گمان کے مطابق، آپ بطور خلفاءِ سابقین کی مدح و ستائش کرتے اور ان کی سیرت و کردار کو اپناتے اور خواص میں ان کو مرتد اور دین کو تباہ کرنے والے قرار دیتے اور اس طرح آپ نے گویا دو اسلام جاری کیے ایک ظاہری اور علانیہ۔ دوسرا مخفی اور پوشیدہ جو خواص تک محدود رہا اور نعوذ باللہ

فرقہ بندی اور اختلاف و انتشار کے وہ بیج بوئے کہ قیامت تک ان سے بچھا چھڑانے کی عالمیان اسلام میں ہمت نہیں ہو سکتی، لہذا اگر شیعہ مفروضات درست ہیں تو وہ خلافت نہ امت و اسلام کے لیے رحمت اور نہ اس کا اعلان کوئی اہم فریضہ تھا اور اگر وہ رحمت تھی اور سراسر رشد و ہدایت کا موجب تھی، تو پھر شیعہ مفروضات غلط ہیں اور ان کا یہ پرچار حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی تنقیص و توہین کا موجب ہے۔

نیز جس طرح اعلان ولایت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اہم فریضہ تھا۔ اسی طرح خلافت بلا فسل کا دعویٰ اور اس کی خاطر ہر قسم کی تکالیف برداشت کرنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فریضہ تھا۔ بقول ڈھکوصاحب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو اس اعلان کے بعد عظیم الشان فرض کی ادائیگی سے سبکدوش ہو گئے، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر جو بار گراں خلافت والا ڈالا گیا تھا، تو اس فرض سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کب سبکدوش ہوئے؟ خود ان کے پوتے نے فرمایا کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی سے آپ کی خلافت کا اعلان کیا تھا، تو اس کا دعویٰ نہ کر کے اور اس کے حصول کی خاطر کوئی اقدام نہ کر کے آپ بہت بڑے مجرم اور گناہ گار ٹھہرے۔ مگر علامہ صاحب کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی گناہ گاری کی پروا نہیں، صرف خلفائے ثلاثہ خاص ثابت ہو جائیں، تو مدعا پورا ہو جائے گا، یعنی شیطان اور ابن سبا کی خوشنودی حاصل ہو جائے اور بس۔

قرآن مجید ایسے عظیم فریضہ اور مدار اسلام کے بیان کا موش کیوں

۴۔ علامہ ڈھکوصاحب نے اعلان ولایت کو عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی اور اس سے سبکدوشی قرار دیا، حالانکہ خلافت و امامت واقعی اگر قرآن اسلام میں سے اہم عقیدہ اور ایمان کے ارکان خمسہ توحید۔ عدل۔ نبوت۔ امامت اور قیامت میں سے چوتھا اہم رکن تھا، تو کہیں اس کی تصریح قرآن مجید میں بھی ہونی چاہیے تھی، کیونکہ اصل سرچشمہ ہدایت وہی ہے اور اگر فریقین میں قدیم مشترک کوئی ہو سکتا ہے تو وہ بھی قرآن مجید ہے اور شیعہ حضرات مہدی علیہ السلام کے ظہور تک تو لازماً اسی پر اعتماد کرنا

پڑے گا اور اس میں متعدد جنگ اصولی عقائد اور فرائض اسلام کو بڑی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، لیکن بارہ ائمہ کی خلافت کا اور بالخصوص حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اس میں کہیں تذکرہ نہیں ہے اور نہ اس عظیم الشان فریضہ کو صاف اور واضح انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف اہمیت اس قدر بڑا اور دوسری طرف اس کے بیان اور تصریح سے اجتناب کی کیفیت ہو تو یہ قابل فہم اور لائق تسلیم نہیں ہے۔
 و۔ متقین اور مخلصین کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن مجید نے ایمان بالغیب، اقامت صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ، قرآن مجید اور کتب سابقہ کی تصدیق اور آخرت پر یقین کامل کی صفات گنوائی ہیں، مگر خلافت و ولایت کا ذکر نہیں فرمایا۔

ب۔ ایمان رسول اور مومنین کے ایمان کے منسلقات بیان کرتے ہوئے فرمایا، کل آمن باللہ وملتئکتہ وکتبہ ورسولہ۔ یہاں بھی توحید و رسالت اور کتب و ملائکہ کا ذکر نہیں ہے۔

ج۔ مومنین کی فلاح و نجات پر مشتمل خصائل حمیدہ اور اخلاق عالیہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا، قد افلح المومنون الایہ اس میں بھی نماز میں خشوع۔ لغویات سے اعراض، ادائیگی زکوٰۃ، زنا اور بدکاری سے اجتناب، حفظ امانت رعایت جہد اور محافظت صلوٰۃ کو ذکر فرمایا، لیکن خلافت علی اور ائمہ اثنا عشریہ کو یہاں بھی شرط فلاح و نجات نہ بھڑھرایا۔ وغیر ذالک من الآیات۔

د۔ اگر خلافت کا تذکرہ ہے، تو اس میں نہ بارہ ائمہ کا بالعموم تذکرہ اور نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بالخصوص ذکر ہے، بلکہ عام مومنین کے ساتھ وعدہ استخلاف ہے۔
 ہ۔ اگر اطاعت و فرمانبرداری میں اللہ تعالیٰ اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اولی الامر کا ذکر ہے۔ کما قال اللہ تعالیٰ، اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔ تو اس میں بھی نہ بارہ کا ذکر نہ علی رضی اللہ عنہ کا، بلکہ منکم فرما کر اس تخصیص کو تقریباً ختم ہی کر دیا۔ کیونکہ حکم اطاعت جن کو ہے، انہی میں سے اولی الامر کی اطاعت لازم کی گئی ہے نہ کہ اولی الامر من آل

الرسول یا من اہل البیت کی اطاعت لازم کی گئی ہے۔ نیز اگر امام خمینی صابہ اولی الامر میں داخل ہو سکتے ہیں تو خلفائے ثلاثہ کیوں داخل نہیں ہو سکتے ؟

و۔ اگر ولایت کا ذکر کیا گیا ہے، تو وہ بھی عمومی انداز میں مثلاً انشاء ولتکم اللہ وسسولہ والذین آمنوا الایہ اس میں نہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تصریح اور نہ بارہ میں حصر کا نام و نشان، جبکہ والذین آمنوا کے عموم میں لاتعداد حضرات داخل ہو سکتے ہیں اور عام لفظ کو اپنے عموم پر رکھنا بھی لازم ہے۔

ز۔ یا ایہا الرسول بلغ ما انزل الیک الایہ میں بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر ائمہ کی امامت و خلافت کی تصریح نہیں، بلکہ داخلی اور خارجی قرآن کی رو سے اس خلافت کے ساتھ اس کا قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے اور جب تک ضعیف بلکہ موضوع روایات کو اور شان نزول پر مشتمل اخبار و حکایات کو ساتھ شامل نہ کیا جائے۔ کسی آیت سے اس عظیم فریضہ کی طرف اشارہ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ یا الہی یہ ماجرا کیا ہے ؟ اگر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جان کا ڈر اور خوف تھا، نعوذ باللہ، تو اللہ تعالیٰ کو کس سے ڈر تھا اور کس کا خوف تھا ؟ تو اس نے اپنے کلام میں اس کی صراحت کیوں نہ کر دی ؟

۵۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے اعلان کو لازم فرمایا، تو آپ نے دنیا سے کفر کی مخالفت و محاصرت اور مدافعت کو خاطر میں لائے بغیر اس کا اعلان کیا جس میں کوئی التباس و اشتباہ نہ ہو۔ فریضہ چہ اس اعلان سے والے فریضہ کی روح اور جان تھا اور اس کا دار و مدار تھا۔ اس کا اعلان ایسے انداز میں کیا گیا کہ ادھر ادھر سے قرآن ملا کر اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر پھر بھی بات نہیں بنتی اور وہ خلافت اس اعلان سے ثابت نہیں ہوتی اور شبیر شمشیر زن، خیر شکن اور منظر قوت پروردگار جن کی جرات و شجاعت اور بسالت کے ساتھ مسند کائنات بھی رشک کریں (مناقب ابن شہر آشوب، وہ بھی خاموش ہیں۔ شیعہ کہتے ہیں آپ قتل اور موت سے ڈر گئے تھے اور وہ آپ

کہتے ہیں، میں اللہ تعالیٰ کے امر و قضا کے سامنے تسلیم خم کئے ہوتے ہوں۔
یا الہی یہ ماجرا کیا ہے؟

کیا ایسے فرائض جو جانِ فرائض اور مدارِ رسالت ہوں، ان کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے جو اللہ تعالیٰ، رسول خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کیا ہے؟ لہذا روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ نہ خلافتِ بلا فصل ہی فرائضِ اسلام میں داخل تھی اور نہ اس کا اعلان کیا۔

دسواں قرینہ، مولیٰ بمعنی بلا فصل پر

خود امیر المومنین کا مختلف مقامات پر اپنی خلافت و امامت کے اثبات میں اس حدیث شریف یعنی من کنت مولاً فعلی مولاً کو پیش کرنا اور اس کے ساتھ تمسک کرنا بھی اس بات کا قطعی قرینہ ہے کہ یہ حدیث آنحضرت کی خلافتِ بلا فصل کی دلیل جلیل ہے۔
- تنزیہ الامامیہ ص ۱۵۳ -

الجواب بتوفیق الملک الوہاب

علامہ صاحب نے شرح حدیدی وغیرہ کے حوالے سے حضرت امیر المومنین کا اس حدیث کے ساتھ استدلال کرنا ثابت کیا ہے، مگر دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ نے اس حدیث کو کس انداز میں پیش کیا تھا۔ اگر اس انداز میں کہ اس حدیث کی رو سے حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری خلافتِ بلا فصل کا اعلان فرما دیا تھا اور تم نے میری خلافت و امامت کا اقرار کر لیا تھا اور تم نے مجھے امیر المومنین بن جانے کی مبارکباد دی تھی، تو ڈھکوصاحب اس کو قطعی قرینہ بنانے میں حق بجانب ہوتے۔ بشرطیکہ یہاں اہل سنت کی بھی ہوتیں اور ان کے ہاں قابل قبول بھی، مگر یہ سراسر جھوٹ اور کذبِ بیانی ہے، نہ اس انداز میں حضرت امیر نے اس کا تذکرہ کیا اور نہ ہی شرح حدیدی وغیرہ اہل سنت کی کتابیں ہیں اور اگر آپ نے اس انداز میں ذکر فرمایا تھا کہ تم میں کوئی شخص ایسا ہے جس کے متعلق سنو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو، من کنت مولاً فعلی مولاً

تو واقعی شرح حدیدی وغیرہ میں اس کا تذکرہ ہے، لیکن اس صورت میں اس سے استدلال اور اس کو قطعی قرینہ بنانا بوجہ باطل سمجھانے کا۔

اول: آپ نے اس کو تعدادِ فضائل کے طور پر ذکر کیا مگر اس میں ہی آپ کی خلافت کا اعلان تھا اور اس کے ذریعے آپ کے امیر ہونے کا عہد و پیمان تو آپ بھی اس کو اثباتِ خلافت اور اعلانِ حکومت کے طور پر پیش کرتے۔ حالانکہ آپ نے محض بیانِ فضیلت کے لیے اس کا ذکر کیا ہے اور اس حدیث کا فضائلِ مرتضیٰ رضی اللہ عنہ میں داخل ہونا محلِ بحث اور نزاع نہیں ہے۔

۲۔ علامہ موصوف اگر دیانت سے کام لیتے، تو انہیں یہ صراحت بھی کرنی چاہیے تھی کہ ان فضائل اور استحقاقِ خلافت کے وجہ و اسباب کا آپ نے کس وقت ذکر کیا؟ حضرت صدیق اور حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کے دور میں قطعاً ان فضائل سے تمسک اور استدلال نہیں فرمایا۔ حالانکہ اگر اس حدیث میں خلافت بلا فصل کا اعلان تھا، تو اس سے استحقاقِ خلافت پر استدلال بھی بلا فصل ہونا چاہیے تھا نہ کہ اربابِ شوری کے سامنے جنہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیعِ حضر امیر رضی اللہ عنہما کے نامزد کر دیا تھا۔ آخر اس تنازعہ اور التوا کی وجہ کیا ہے؟

۳۔ اگر یہ استدلال شیخین کی خلافت کے مقابلہ میں ہوتا، تو آپ ان کو خلافت کا اہل اور مستحق تسلیم نہ فرماتے اور اپنے استحقاق اور اہلیت کی نفی نہ کرتے حالانکہ متعدد روایات اور اخبار آپ سے اس مضمون کی مروی اور منقول ہیں جو کہ اسی شرح حدیدی وغیرہ میں مذکور ہیں۔

۱۔ جب جناب ابوسفیان نے حضرت امیر رضی اللہ عنہ سے بیعت کے لیے ہاتھ بڑھانے کو عرض کیا، تو آپ نے فرمایا:

أَنْتَ تَوَيْدًا مَرَّ السَّيْفَانِ وَ قَدْ عَمِدَ الْحَتَمُ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَمِدًا فَأَنَا عَلَيْهِ فَتْرَةٌ
أَبُوسَفْيَانَ وَعَدَلُ إِلَى الْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمَطْلِبِ فِي مَنْزِلِهِ
فَقَالَ يَا أَبَا الْفَضْلِ أَنْتَ أَحَقُّ بِمِيرَاثِ ابْنِ أَخِيكَ أَمَّا دَيْدُكَ

لا بايعك فلا يختلف عليك الناس بعد بيعتي اياك فضحك
العباس وقال يا اباسفیان يدفعها علی ویطلبها العباس
فرجع ابوسفیان خائباً۔ شرح ابن ابی الحدید جلد ۶ ص ۱۸
”اے ابوسفیان! تو ایک ایسے امر کا ارادہ رکھتا ہے، جس کے ہم لائق اور
مالک نہیں ہیں اور تحقیق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عبدلیا تنہا میں
اسی پر قائم ہوں۔ ابوسفیان آپ سے الگ ہوا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ
کی طرف مائل ہوا اور ان کے گھر جا کر ان کو عرض کیا، اے ابوالفضل! تم اپنے بھتیجے
کی وراثت کے زیادہ حقدار ہو، ہاتھ بڑھاؤ تاکہ میں تمہارے ہاتھ پر بیعت کر دوں
میری بیعت کے بعد لوگ آپ کے ساتھ بیعت کرنے میں اختلاف نہیں کریں گے۔
یہ سن کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ ہنس پڑے اور کہا اے ابوسفیان! اس بیعت
خلافت کو علی بن ابی طالب بٹھکے! آپ اور عباس اس کو طلب کریں، یہ کیسے ہو سکتا
ہے؟ تو ابوسفیان ناکام اور بے نیل مرام واپس ہوتے۔“

ب۔ جناب ابوسفیان کے ایسے ہی ایک مطالبہ کے جواب میں حضرت
علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ملاحظہ ہو کتاب السقیفہ للجوبہری شرح حدیدی۔
طالما غششت الاسلام و اهلہ فما ضررتم شیئاً لا حاجة لنا الی خیلک
و درجلیک لولا اناس عینا ایا بکر لہا اهل لہما توکناہ۔ اے ابوسفیان
تو نے بہت دفعہ اسلام اور اہل اسلام کو دھوکہ دیا، لیکن انہیں ذرہ بھر نقصان
نہ پہنچا سکا، ہمیں تیرے سواروں اور پیادوں کی امداد و اعانت کی ضرورت
نہیں ہے۔ اگر ہم ابوبکر کو امارت و خلافت کے اہل اور لائق نہ سمجھتے، تو اسے
کبھی اس منصب پر قائم نہ رہنے دیتے۔ جلد ثانی ص ۲۵

ج۔ قبل ازیں پنج البلاغہ کے حوالہ سے اسی مطالبے کے جواب میں آپ کا
یہ فرمان گزر چکا کہ میرا بھی خلافت کا وقت ہی نہیں ہے اور یہ دعویٰ کرنا چلتا
پھل توڑنے اور غیر کی زمین میں کھیتی باڑی کرنے کے مترادف ہے وغیرہ ذالک
من الخطبات۔

الغرض آپ کا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے خلافت کی اہلیت اور حقداری تسلیم کرنا اس امر کی واضح دلیل ہے کہ آپ نے اس دور میں اس قسم کا استدلال پیش نہیں کیا اور یہ دعویٰ خلافتِ درایت بھی اور خلافتِ روایت بھی اور کسی لحاظ سے بھی پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کو بھی آپ نے خلافتِ موعودہ اور اللہ تعالیٰ کی موعودہ خلافت قرار دیا، لہذا اس دور میں ایسا استدلال نہ ازروئے روایت درست، نہ ازروئے درایت صحیح۔ رہی کبیدگی خاطر جو ابتدائی ایام میں حضرت امیر اور حضرت صدیق رضی اللہ عنہما کے درمیان تھی، تو وہ امر خلافت میں نہ تھی بلکہ براورہ شکر رنجی تھی، جس کا باعث اور موجب یہ تھا کہ مجھے مشورہ میں کیوں شامل نہیں کیا گیا اور اس قدر غیر مسلم کیوں سمجھ لیا گیا، جس کا عذر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے بیان کر دیا اور حضرت امیر نے قبول کر لیا اور حضرت امیر رضی اللہ عنہ نے علی الاعلان بیعت کر کے سب غلط فہمیوں کی بنیاد ہی ختم کر دی۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں اس کی تفصیل مروی و منقول ہے اور بیان کی جا چکی ہے۔

لیکن اس جگہ شرح حدیدی کے حوالے سے عرض کرتا ہوں:

قال علی والناس بیروا غضبنا الا في المشورة وانا لنرى ابا بكر

احق الناس بها انه لصاحب الغار وانا لنعرف له سنة ولقد امره رسول الله صلى الله عليه وسلم بالصلوة بالناس وهو حي۔ جلد ثانی صفحہ ۱۷۷ شرح حدیدی بحوالہ کتاب السقیفہ لاجمہ بن عبد العزیز الجوهری۔

حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما نے کہا ہمیں صرف مشورہ میں شامل نہ کیے جانے پر ناراضگی تھی اور یقیناً ہم ابوبکر کو سب لوگوں سے زیادہ خلافت و امارت کا اہل اور حق دار سمجھتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار ہیں۔ اور ہم ان کی عمر رسیدگی اور بزرگی کے معترف اور قائل ہیں اور بخدا ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ طیبہ میں لوگوں کو نماز پڑھانے پر مامور فرمایا۔ الغرض واضح ہو گیا کہ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو کبھی بھی حضرت صدیق رضی اللہ عنہ

پر خلافت کی اہلیت اور حق داری میں سبقت اور تقدم کا دعویٰ نہیں رہا اور آپ نے ان کے خلافت کے لائق اور اہل نہ ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا، لہذا ان کے مقابل ایسے استدلال پیش کرنے کا کوئی معنی نہیں ہو سکتا۔

۴۔ اگر از روئے روایات اس قسم کے استدلال کا ذکر ملتا ہے، تو مجلس شوریٰ میں جبکہ ان چھ ارکان میں سے کسی ایک کو خلافت کے منصب پر فائز کیا جانا تھا تو اس وقت آپ نے اپنے فضائل بیان کیے اور دوسرے حضرات پر اپنی سبقت اور موزونیت بیان فرمائی، لیکن وہ بھی اس حدیث کے نص خلافت ہونے کے لحاظ سے نہیں، ورنہ آپ کا پہلے خلفاء کی خلافت پر اعتراض لازم آتا اور آپ کا شوریٰ میں شمولیت فرمانا ہی غلط ہو کر رہ جاتا اور آپ سراسر تضاد کا شکار ہو جاتے، کیونکہ اس حدیث میں آپ کی خلافت بلا فصل ثابت تھی، تو پہلے خلفاء پر نہیں تھے اور نہ ان کی اطاعت ہی درست تھی شوریٰ کا انعقاد بھی غلط تھا اور اس کا ارکن بننا بھی اور اگر وہ سب صحیح تھا، تو اس حدیث کا معنی خلیفہ بلا فصل نہ ہونا مسلم ہو گیا پھر تیسرے نمبر پر اس کو دلیل بنانے کا کیا مطلب تھا؟ الغرض اس کا تذکرہ بطور تعداد فضائل کیا اور جب دوسرے حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لیے منتخب کر لیا، تو آپ نے بھی ان کی خلافت کو تسلیم کر لیا، جیسے کہ بیچ البلاغہ میں ہے، واللہ لا سلیم ما سلمت امور المسلمین۔ بخدا میں اس خلافت کو تسلیم کروں گا اور کرتا رہوں گا، جب تک اہل اسلام کے معاملات صحیح طریقہ پر انجام پذیر ہوتے رہیں۔ جلد عمل، ص ۱۴۶

لہذا اس وقت بھی آپ کا اکثر بی بی فیصلہ تسلیم کر لینا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لینا اس حقیقت کا واضح اعتراف ہے کہ اس حدیث غدیر کی رو سے آپ کی خلافت ہی ثابت نہیں ہوتی، یہ جانتیکہ بلا فصل اور نہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مقصد تھا، جو سبائی ذہنیت نے اختراع کیا، ورنہ بقول حضرت حسن مثنیٰ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے زیادہ خطا کار کوئی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ اور اس کے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو خلیفہ بنائیں اور آپ دوسروں کو امامت و خلافت کا اہل اور حقدار تسلیم کریں اور ان کی بیعت کرتے پھریں اور ان کی شوری میں شامل ہو جائیں۔ پھر اس کے فیصلہ کو تسلیم کر لیں، حالانکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا بھی تھا کہ شوری میں شامل نہ ہونا، مگر آپ کا جواب یہ تھا کہ میں اختلاف کو پسند نہیں کرتا تو جو ہستی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بھی ان کے حکم کی تعمیل فرماتے اور اس کی مخالفت گوارا نہ کرے۔ کیا وہ ان کو غاصبِ ظالم سمجھ سکتے تھے اور اس پس منظر میں کیا کوئی عقلمند یہ باور کر سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک حدیثِ غدیر کا یہی معنی تھا جو ابنِ سبا اینٹ بچینی نے تیار کیا ہے؟ ورنہ لازم آئے گا کہ آپ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت تو برداشت کر سکتے تھے، مگر صحابہ کی مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے، تو اس سے بڑھ کر بھی کوئی گناہگاری ہو سکتی ہے؟

ابن ابی الحدید کا اثنا عشریہ پر رد و انکار

علامہ ڈھکو صاحب نے امیر المومنین کے لقب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سلام کرائے جانے کا اہد حدیثِ غدیر سے خلافت پر استدلال کی نسبت حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی طرف کرتے وقت شرحِ حدیدی جلد ۲ ص ۶۱ کا حوالہ دیا ہے، حالانکہ وہاں بالکل ایسی بحث موجود ہی نہیں ہے۔ البتہ اس سے چند صفحات پہلے اس بحث کو اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ اثنا عشری شیعہ کا حدیثِ منزلت اور حدیثِ غدیر سے خلافتِ امیر رضی اللہ عنہ پر استدلال غلط ہو جاتا ہے اور لوگوں سے آپ کے لیے بیعت لینے اور آپ کی ولایتِ عہد کا اقرار کرانے اور امیر المومنین کے لقب سے سلام کرانے کا حقیقت اور واقعہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جو شخص بھی نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلافت میں صحابہ کرام کے نزاع و اختلاف کو دیکھے اور انصار کے مدعی خلافت بننے اور قبیلش و مہاجرین کے قرابتِ نبوی کے تحت استحقاقِ خلافت کا اپنے اندر منحصر کرنا، ملحوظ رکھے۔ پھر حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے فضائل یعنی سبقتِ اسلام۔ یا غازی بننے

اور امام تہماز ہونے سے استدلال کو مد نظر رکھے، تو اثنا عشری شیعہ کے دعویٰ کی کوئی حقیقت معلوم نہیں ہوتی، لاسیب ان المنصف لما سمع ما جرى لهم بعد وفات رسول الله يعظم قطعاً انه لم يكن هذا الفرض ج ۲۔ ص ۵۹۔ یعنی اس میں شک و شبہ نہیں کہ کوئی بھی انصاف پسند شخص جب بھی وصال نبوی کے بعد صحابہ کرام کو پیش آنے والا باہمی معاملہ اور ان کا مباحثہ سنے تو وہ بالیقین اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ خلافت مرتضوی یا خلافت صدیقی کے بارے میں کوئی صریح اور واضح اور ناقابل شک و احتمال روایت موجود نہیں تھی۔

الفرض اس سے آپ ڈھکوصاحب کی دیانت داری کا بچشم خود مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ شرح حدیدی میں لکھا گیا ہے اور جناب والا اس کو پیش کس طرح کر رہے ہیں۔ الحاصل آپ نے یہاں تک ڈھکوصاحب کے پیش کردہ دس قرائن اور شواہد کا حال معلوم کر لیا، جن میں سوائے تحکم اور سبب زوری یا صرف لفاظی اور شاعرانہ تخیل کے کچھ نہ تھا اور واقعات و حقائق سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں تھا اور منصف و دیانت دار شخص ایسے امور کو قرائن اور اشارات کہنا بھی پسند نہیں کرتا، جن کو بزرگم خویش مجتہد اور حجت الاسلام نے قطعی قرائن اور شواہد بنا کر پیش کیا ہے۔

معیارِ صحت برائے روایات

تنبیہ: علامہ ڈھکوصاحب نے ان دس حد قرائن کو بیان کرتے وقت متقدم کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں، جن میں اکثر تو ان کے اپنے مذہب کی تھیں، مثلاً شرح حدیدی مروج الذہب للمسعودی۔ نیا بیع التودت۔ مناقب خطیب خوارزم اور سہر مکتوم وغیرہ جو ازہر تقیہ اہل سنت کی ظاہر کر کے حوالے دیے گئے اور بعض ایسی ہیں جو غیر معروف اور غیر متداول قسم کی کتابیں ہیں، جن کا معیارِ صحت یہ ہے کہ مستند اور متداول کتب کے مطابق ہوں تو درست اور مخالفت ہونے کی صورت میں غلط اور ناقابل اعتدال و اعتبار اور یہی حال ان معروف کتب کا ہے، جن کے مصنفین نے روایات کی صحت اور قوت کا

التزام نہیں کیا، مثلاً تاریخ طبری، درمنثور وغیرہ بلکہ اس عنوان پر جس قسم کی روایات ملیں، ان کو درج کر دیا اور سند ساتھ ذکر کر دی یا مآخذ کا حوالہ دے دیا تاکہ اسانید کی رصہ صحت و سقم کا فیصلہ ناظرین خود کر سکیں۔

لہذا ان میں بھی فیصلہ کن امر یہی ہے کہ جو روایات صحاح اور شیخین یعنی بخاری اور مسلم کی روایات کے خلاف نہ ہوں، وہ مقبول ہیں، ورنہ ناقابل قبول اور خود شیعی علماء کو اعتراف ہے کہ ان کی اپنی صحاح اربعہ میں منقول و مرقوم روایات بھی ساری صحیح نہیں ہیں، حالانکہ کافی کے متعلق بقول علماء شیعہ حضرت مہدی علیہ السلام کی مہر تصدیق بھی موجود ہے جیسے کہ کافی کے سرورق پر ان کا یہ دعویٰ مرقوم ہے: قال امام العصر و حجة الله المنتظر عليه سلام الله الملك الاکبر فی حقہ هذا کاف لشیعتنا۔ اور اسی لیے انہوں نے بھی ہمارے ائمہ حدیث اور اباب جرح و تعدیل کی تقلید کرتے ہوئے اپنی کتب احادیث کی درجہ بندی کی ہے اور ان میں مرقوم و منقول احادیث و روایات کی بھی درجہ بندی کی ہے اور اسماء رجال میں کتابیں تالیف کی ہیں اور اپنے راویوں پر جرح و تعدیل کی ہے۔

الغرض جب شیعہ علماء کے نزدیک یہ امر مسلم ہے کہ ہر روایت جو شیعہ مذہب کی کتابوں میں مذکور ہو تو ضروری نہیں کہ وہ صحیح بھی ہو تو دوسروں کو اس طرح تمیز اور تحقیق صحت کا حق کیونکر نہیں دیا جاتا، جو اس فن میں امام اور مقتدا ہیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ اپنی کتابوں کی نسبت ہماری طرف کر کے ہمارے خلاف الزامی کارروائی کی جاتی ہے۔ کما سبق منا تحقیقہ مراگا۔

منتقح دعویٰ اور مولیٰ بمعنی اولیٰ میں منشا غلط

علامہ موصوف کے بیان کردہ قرائن اور پیش کردہ روایات کی حقیقت جب بدیہ ناظرین ہو چکی، تو ہم اب ان کے اس دعویٰ کی حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کہ حدیث غدیر میں مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف ہی ہے تاکہ اس وہم کا ازالہ ہو جائے

کہ دلیل کے بطلان سے دعویٰ کا بطلان لازم نہیں آتا، بلکہ ممکن ہے کوئی دوسری دلیل موجود ہو جو اس کے اثبات کا فائدہ دے، کیونکہ جب ناظرین کرام یہ دیکھ لیں گے اور ان پر روزِ روشن کی طرح یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مولیٰ بمعنی اولیٰ ہی ثابت نہیں، تو پھر اس کے تعین پر اور مولیٰ کے دیگر معانی پر اس کی ترجیح کا دعویٰ کیونکر کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ شیعہ فاضل نے اس کا چوبیس معانی میں اشتراک تسلیم کیا ہے۔

فائدہ عظیمہ ۱: علامہ ڈھکو صاحب نے مولیٰ بمعنی اولیٰ بالبتہ پر کوئی لغوی شہادت پیش نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ قول باری تعالیٰ وَمَا وَلَكُمْ النَّاسُ هِيَ مَوْلَاكُمْ کو ہی اس کی دلیل بنایا ہے کہ اس آیت کریمہ میں مولیٰ بمعنی دوست تو ہو نہیں سکتا اور خود اہل سنت کے مفسرین نے اس کا معنی اولیٰ بیکم کیا ہے، لہذا مولیٰ بمعنی اولیٰ ثابت ہو گیا اور جب اتنا قدر ثابت ہو گیا اور یہ خود واضح تھا کہ آگ جنہیوں میں تصرف کریں گی، لہذا ساتھ بالتصرف بھی ملا دیا اور اس طرح مولیٰ بمعنی اولیٰ بالتصرف ثابت ہو گیا، لیکن علامہ صاحب نے اس میں لغت عربی میں لفظ کے موضوع لمعنی اور بطور مجاز مستعمل فیہ معنی میں فرق نہیں کیا، لہذا یہاں پر ساری تقریر کو امر فاسد پر موقوف کر دیا گیا ہے۔ اگر لغت عربی میں مولیٰ بمعنی اولیٰ ہو تو اولیت بیان کرتے وقت ہذا اولیٰ بذالک من فلان کی جگہ ہذا مولیٰ بذالک من فلان درست ہونا چاہیے، حالانکہ اہل لغت کے نزدیک بالاجماع اس طرح کہنا غلط اور باطل ہے اور ڈھکو صاحب اپنے رسالہ میں جب تسلیم کر چکے کہ لفظ مولیٰ مشترک ہے، تو اس پر کتب لغت سے استدلال کرنا لازم تھا اس مقام پر حضرت علامہ سید محمود آلوسی بغدادی کی تحقیق مدیہ ناظرین کی حاتی ہے تاکہ اس دلیل کا فساد مبین اور بطلان مار واضح ہو جائے۔ لایخفی ان اول الغلط فی ہذا الاستدلال جعلہم المولیٰ بمعنی الاولیٰ وقد انکرو ذالک اهل العربیة قاطبة بل قالوا الم یحیی مفعلاً بمعنی افعلاً اصلاً

ولم یجوز ذالک الا ابوزید اللغوی متمسکاً بقول ابی عبید فی
تفسیر قولہ تعالیٰ "ہی مولکم" ای اولیٰ بکم و رد بانہ یلزم علیہ
صحۃ فلان مولیٰ من فلان کما یصح فلان اولیٰ من فلان و
اللازم باطل اجماعاً فالملزوم مثله وتفسیر ابی عبید بیان
لحاصل المعنی یعنی النار مقرکم ومصیرکم والموضع اللائق
بکم و لیس نصاً فی ان لفظ المولیٰ شملہ بمعنی الاولیٰ (روح المعانی ص ۱۴۲)
یعنی اس استدلال میں پہلی غلطی شیعہ علماء کی یہ ہے کہ مولیٰ کو اولیٰ کے معنی میں کیا
جائے، حالانکہ تمام اہل عربیت نے اس کا انکار کیا ہے، بلکہ انہوں نے کہا کہ مکرر
مفعّل کا وزن کبھی افعّل کا معنی ادا نہیں کرتا اور مولیٰ مفعّل کے وزن پر ہے اور
اولیٰ افعّل کے وزن پر ہے اور سوائے ابوزید لغوی کے کسی نے بھی اس کو جائز نہیں
رکھا۔ اُس نے قول باری تعالیٰ "ہی مولکم" کی تفسیر میں ابوعبید کے قول اولیٰ بکم
سے استدلال کرتے ہوئے اس کو جائز رکھا، لیکن یہ قول مردود ہے، کیونکہ اگر یہ صحیح ہو
تو پھر فلان اولیٰ من فلان کی جگہ فلان مولیٰ من فلان درست ہونا چاہیے،
کیونکہ جب مولیٰ کا معنی موضوع لہ ہی یہی ہے، تو پہلے جملہ کا درست ہونا دوسرے جملہ
کی صحت اور درستگی کو مستلزم ہوگا، حالانکہ لازم بالاجماع باطل ہے، یعنی فلان مولیٰ
من فلان کہنا قطعاً درست نہیں ہے، لہذا ملزوم بھی باطل ہے، یعنی لفظ مولیٰ کا اولیٰ
کے لیے موضوع ہونا بھی باطل ہے اور جب سرے سے اس معنی کے لیے موضوع ہی نہیں
تو دہراتے اشتراک بھی لغو ٹھہرا۔

رہا ابوزید کے قول کا سہارا اور دارودار معنی ابوعبید کا قول تو اس میں حاصل
معنی اور معنی موضوع لہ کے لازم کا بیان ہے، یعنی آگ تمہارا ٹھکانا اور جائے
بازگشت ہے اور تمہارے لائق وہی جگہ ہے اور اس قول میں اس پر تفصیل نہیں ہے
کہ وہاں مولیٰ کا لفظ اولیٰ کے معنی میں ہے اور اس کے لیے وضع کیا گیا ہے تاکہ اس
قول کو سند بنا کر اشتراک کا دعویٰ کر دیا جائے۔

مناظر اسلام شیخ الحدیث
مدظلہ
محمد اشرف

سیالوی

کی قابل قدر تصانیف

تحفہ حسینہ

کوثر الخیرات

متعہ اور اسلام

جلاء الصدور

گلشن تو حید و رسالت

ہدایۃ المتدبذب البحران فی الاستعاذۃ بالیاء الرحمن

انبیاء سابقین اور بشارات سید المرسلین

تنویر الابصار بنور انبی المختار

دی ہولی بائبل اور شان انبیاء میں گستاخیاں

Printed By: M. Saghir Dina 0344-5751600, 0300-9536420

ایم ایل سنٹر سیالکوٹی شہر دینہ ضلع جہلم

Phone: 0321-7641096